خانہ بدوش

سفرنامہ

مُستنصر حسین تارڑ

"خانہ بدوش"

عکس چار سُو ہے

ہوا تیز ہے۔ اس کی شدت کے موہوم برچھے میری آنکھوں میں کھبتے چلے جاتے ہیں اور یوں میری نظر کے آگے نمی کی ایک جھلی نمودار ہونے لگتی ہے۔ محدود اور لامحدود فاصلوں پر ابھری اشیاء اس آبی پردے کے پار سراب کی صورت لرز رہی ہیں۔

نیچے، میرے قدموں میں بچھے سپاٹ میدان کی بنجر سطح میں سے ہوک کی مانند ایک بگولا اُٹھ رہا ہے۔ اس کے ان دیکھے دائروں میں ایک کانٹے دار جھاڑی آئی ہوئی ہے جو بھنور میں پھنسے کنڈیالے چوہے کی طرح بے بسی سے ایک میکانکی تواتر کے ساتھ گھومتی چلی جاتی ہے۔ ہوا کا زور لحظہ بھر کے لئے ٹوٹتا ہے اور کانٹے دار جھاڑی گردش کی اس قید میں سے نکل کر ٹھنڈی پڑتی لاش کی طرح ایک آدھ مرتبہ جھٹکوں سے حرکت کرتی ہے اور پھر میدان کی بنجر زمین پر ساکت ہو جاتی ہے... بگولا پیچ و خم کھاتا اب ایک اور جھاڑی کی جڑوں کو چوس کر اُسے اپنے متحرک جسم کا حصّہ بنا لیتا ہے۔

میں ایک مخصوص بلندی پر بیٹھا ان جھاڑیوں کی بے بسی کو جانتا ہوں۔ ان کی بے اختیاری سے واقف ہوں کہ میں خود اسی طور بے بس اور بے اختیار ہوں۔ میں جو ازل سے سفر کے اس بگولے کی زد میں ہوں جو کبھی میرے وجود کی جھاڑی کو ایک مقام پر جڑیں پکڑنے نہیں دیتا... ہر سال دو سال بعد مجھے اکھاڑ پھینکتا ہے اور میں بے اختیار ہو کر اس کی متعین کردہ سمتوں میں گردش کرنے لگتا ہوں، حرکت میں آ جاتا ہوں، سفر پہ نکل کھڑا ہوتا ہوں۔

ہوا بہت تیز ہے... فضا میں ایک متواتر گرج ہے جو شاید روزِ ازل کو ان ویرانوں

میں اٹھی، ان پر حاوی ہو گئی اور پھر اس کی شُوکتی ہوئی صدائیں کبھی مدھم نہ ہوئیں۔ میرے کانوں میں اُترنے والی یہ اداس گونج وہی ہے جو اس کائنات میں پہلا سانس لینے والے انسان کو سنائی دی تھی ... مگر میرے گرد سرسراہٹ کی یہ ماتمی سرگوشیاں مجھے آنے والے کن دُکھوں کا سندیسہ دے رہی ہیں جو ابھی میرے گمان میں نہیں۔ ماؤں کے ماتم کی سرگوشیاں؟ ان ماؤں کی جو پہلے پہل پچھاڑ کھا کر گرتی ہیں، پھر وہ دہائی دیتی ہیں۔ وقت گزرتا ہے تو لوگ ان کے ماتم سے تنگ آجاتے ہیں اور پھر وہ بند کمروں میں چھپ کر آہستہ آہستہ اُن بلیوں کی طرح روتی رہتی ہیں جن کے بچے بچھڑ جاتے ہیں۔

نیچے، بے آب و گیاہ میدان کی وسعتوں میں بگولوں کی منتظر چند جھاڑیاں اپنے ہی سایوں پر جھکی ہیں اور ان کے درمیان ایک سیاہ لکیر نظر آرہی ہے ... کابل سے ہرات جانے والی سڑک، اور اس لکیر پر میری بس یہاں سے ایک ڈِنکی کھلونے کی طرح دکھائی دے رہی ہے مختصر مگر مکمل جزئیات کے ساتھ۔ بس کا ڈرائیور اور کنڈکٹر نظر نہیں آرہے کیونکہ وہ اس وقت وہاں موجود نہیں۔ ڈرائیور سڑک کے نزدیک چرواہے کے ایک جھونپڑے میں سو رہا ہے اور کنڈکٹر ایک آئل ٹینکر پر لفٹ لے کر قندھار گیا ہوا ہے تاکہ وہاں سے وہ فالتو ٹائر خرید کر واپس آسکے جو اصولاً اسے آج صبح کابل سے حاصل کر کے چلنا چاہیئے تھا۔ وہ فالتو ٹائر جس کی غیر موجودگی اس بلند چوٹی پر میری موجودگی کا باعث بنی ہے۔

تہذیب کے کوکُون میں لپٹے ایک انسان کی حیثیت سے اگرچہ مجھے سویڈن اور سوئٹزرلینڈ کے منظم زمینی مناظر اپنی جانب کھینچتے ہیں مگر تہذیب کے اس مصنوعی درخت کی جڑیں اُسی وقت اُکھڑ جاتی ہیں جب میں اپنے آپ کو افغانستان کی وسیع اور بے قابو لینڈ سکیپ میں گھرا ہُوا پاتا ہوں۔ میرے اندر کا وحشی اُفق تک پھیلے ان بنجر پہاڑوں اور صحرائی وسعتوں کی گرفت میں جکڑا جاتا ہے، ان کا حصّہ بن جاتا ہے۔

میری پشت پر روس ہے، سامنے دشتِ مرگ کا کنارا اور چار چفیرے ایسے پُرجلال زمینی مناظر جن کے درمیان بیٹھے ہوئے مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے ابھی ... ایک لمحہ

پہلے ... کُن فیکون کہا گیا ہے۔ ان سر بلند پہاڑوں کے پتھروں کو کسی مجسمہ ساز کے ہاتھوں نے نہیں چھُوا۔ سوائے سب سے عظیم بُت تراش کے ایک لفظ نے ... کُن فیکون! یہ وسیع ویرانے، یہ ہیبت ناک سلسلہ کوہ اور ان میں سنسناتی ہوائیں ابھی وجود میں آئے ہیں۔ ابتدا آج ہی ہوئی ہے۔ مجھ میں ایک ایسے انسان کی پُرشوق حیرت ہے جو پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہے۔ مجھ میں ابھی استدلال کی قوت پیدا نہیں ہوئی۔ میں گنگ ہوں، صرف دیکھ رہا ہوں اور اپنے گرد پھیلے ہیبت ناک منظر کے رعب سے سحر زدہ مبہوت ہوں ... اور شاید میں تو ان سر بلند پتھروں کے درمیان گھرے کسی ڈیلفی کے معبد میں چلا آیا ہوں۔ جو کچھ مستقبل میں رُوپوش ہے اس میں جھانکنے کے لئے، اپنے انجام سے باخبر ہونے کے لئے۔ اے ڈیلفی کے اوریکل! مجھے خبر کر کہ میرا یہ سفر کیسا ہو گا؟ کیا میں ہمیشہ کی طرح خیر و عافیت سے گھر لوٹوں گا یا ان دیکھے دیوتاؤں کے غضب کا شکار ہو کر جہاں گرد اوڈیسس کی طرح ایک عمر سُرخ شراب ایسے سمندروں بھٹکتا رہوں گا؟ مجھے خبر کر۔

میرے اوپر نیلی اینٹوں کا آسمانی گنبد اتنا قریب لگ رہا ہے کہ شاید میں ہاتھ بڑھا کر اُسے چھُو بھی سکتا ہوں۔

آسمانی قربتوں نے ہمیشہ سے انسان کو اپنی جانب کھینچا ہے وہ تلاش کے لئے یا تو غاروں کے اندھیروں میں بسیرا کر کے اپنا اندر روشن کرتا ہے اور یا پھر بلندیوں پر ڈیرہ جما کر دُھونی رما لیتا ہے۔ کیا ہم اَن دیکھی حقیقتوں کی جستجو انسانوں سے کٹ کر ہی کر سکتے ہیں؟ اپنی پہچان کے لئے ذرّہ صحرا سے الگ ہو تبھی؟ میں خود سفر پر نکلتا ہوں تو شاید اس لئے کہ انسانوں کا ایک گروہ اور مخصوص معاشرہ اپنے زورِ حرکت سے میرے قدم اکھاڑ کر مجھے ایک مکانکی اور بے اختیار وجود میں بدل دیتا ہے ... لیکن میں اُن سے تا دیر جُدا بھی نہیں رہ سکتا۔ کچھ عرصے بعد گھر کی جانب کھنچا چلا آتا ہوں، چاہت کی اسی شدت کے ساتھ جو اُسے چھوڑتے ہوئے مجھ پر حاوی ہوئی تھی۔ کیا اس کا مطلب ہے کہ میں اپنے چار چفیرے میں ایک مس فٹ ہوں؟ مجھ میں ایک جگہ جم کر حقیقتوں کا سامنا کرنے کی جرأت

نہیں؛ وطن واپسی ہوتی ہے تو ایک مختصر مدت، پچھلے سفر کی یادوں میں غرق ہو کر گزرتی ہے مگر بالآخر مجھے سانس لینے کے لئے واپس اپنے ماحول میں، سطحِ آب پر آنا پڑتا ہے اور تب میری آنکھیں چندھیا جاتی ہیں، میں دیکھ نہیں سکتا اور ایک مرتبہ پھر ٹٹولتا ہوا نئی روشنیوں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہوں۔ یوں نہ تو میں مچھلی کی طرح تا دیر پانی سے باہر جی سکتا ہوں اور نہ ہی سفر کا سمندر مجھے ہمیشہ کے لئے قبولتا ہے۔ ایک معیّنہ عرصے کے بعد پھولتی ہوئی ایک لاش کی طرح خشکی پر پھینک دیتا ہے۔

طورخم سے سرحد پار کر کے میں نے افغانستان میں پہلا قدم رکھا تو کچھ بھی نہ ہوا۔ میں نے حیرت سے اپنے اندر جھانکا اور انتظار کرنے لگا۔ ان زنجیروں کے ٹوٹنے کے چھناکے کا جو ساکت رہنے سے میری رگوں کے گرد خود بخود لپٹتی جاتی ہیں۔ مہم جوئی کے اُس جھرنے کی ترل رِل کا جو ماضی میں ہمیشہ میرے روئیں روئیں سے پھوٹنے لگتا تھا مگر کچھ بھی نہ ہوا۔ میں منتظر تھا مگر کچھ بھی نہ ہوا۔ اِن پہاڑوں کی طرح جن کی رگیں خشک ہو چکی ہیں، میرا اندر بھی بنجر تھا۔ آخر اس مرتبہ ایسا کیوں ہوا ہے؟ کہیں ان رُتوں کی تعداد تو نہیں بڑھ گئی جنہیں شمار کر کے انسان اپنے آپ کو بوڑھا یا جوان سمجھتا ہے؟ لیکن سفر کی لاعلاج دیوانگی کا رُتوں کے گزر جانے سے کیا تعلق؟ پھر ایسا کیوں ہوا ہے؟ میں نے پیچھے مڑ کر پاکستان کی جانب دیکھا اور مجھے یوں لگا جیسے سرحد کے کھلے پھاٹک کا حجم بڑھتا چلا جا رہا ہے، اُوپر ہی اُوپر تا آنکہ اس کا آہنی وجود افلاک کے گنبد میں پیوست ہوا اور پھر ایک مہیب دھماکے سے مجھ پر بند ہو گیا۔ میری دھرتی کے تمام مناظر آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔ میری زمین نے رُخ پر ایک آہنی پردہ ڈال لیا۔ کہیں یہ دروازہ مجھ پر ہمیشہ کے لئے تو نہیں بند ہو گیا؟ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا کہ ماضی میں کبھی ایسا نہیں ہوا۔ میں نے منہ موڑا اور ان سرزمینوں کی جانب دیکھا جو ابھی تک میری نظروں کے سامنے تھیں میری منتظر تھیں۔ سفر کا سمندر عصائے مہم جوئی کے انتظار میں تھا اور یوں میرے سفر کا آغاز ہو گیا۔

کابل کے چاروں اور، وفادار خدمت گاروں کی طرح بے حس و حرکت کھڑے فلک بوس پہاڑوں پر ابھی تک موسم سرما کی برف چمک رہی تھی۔ چوٹیوں کی سفید وِگوں ایسی برفیلی جھالریں نیچے وادی کے دامن تک پہنچ رہی تھیں۔ مصوّروں کے ذہن میں نقش شانگری لا کے خیالی شہر کا نقشہ شاید کابل سے اتنا مختلف نہ ہو کہ میں نے کسی اور انسانی بستی کو اتنے دلفریب تصویری چارچفیرے میں گھرا ہوا نہیں دیکھا۔

کوُچ کرنے کے بعد اگلی منزل کی جانب سفر کرتے ہوئے اکثر اوقات طویل رفاقت کی بنا پر مختلف قومیتوں کے سیاحوں کا ایک ٹولا خود بخود تشکیل پا جاتا ہے جو بقیہ سفر کے دوران گروہ میں شکار کرنے والے جانوروں کی طرح مل جل کر ارزاں ہوٹلوں اور طعام کی سستی جگہوں کا کھوج لگاتے ہیں۔ پشاور سے کابل پہنچنے تک میں بھی ایک ایسے ہی گروپ کا حصہ بن چکا تھا۔ بس سے اتر کر ہم سب کندھوں پر اپنا اپنا بوجھ لادے اڈے کے نواح میں ایک ہوٹل کے اندر چلے گئے۔ یکایک اتنے بڑے ہجوم گاہکاں کو اپنے سامنے پا کر ہوٹل کا مالک پہلے تو بوکھلا گیا اور پھر فوراً ہی مسرت سے مغلوب ہو کر ہمارے نام پتے رجسٹر پر درج کرنے کا تردد کئے بغیر ہمیں کمرے کی چابی سے نواز دیا۔

"ہال کمرہ ہے۔ آپ سب حضرات... معاف کیجیے خواتین و حضرات کے لئے کافی ہو گا۔ گدّے نرم اور سپرنگوں والے۔" اُس نے آنکھ دبا کر ہمارے گروہ میں شامل نسوانی جمگھٹے کو نوید دی اور پھر پاسپورٹ جمع کر کے آرام سے ڈیسک تلے پوشیدہ بیئر کی بوتل کو گال پُھلا کر آدھا کر دیا۔ سفید جھاگ اس کی مونچھوں پر یوں نمودار ہوئی جیسے کسی جلی ہوئی جھاڑی پر تازہ تازہ برف گری ہو۔

"میرا ہاضمہ خراب ہے، صرف اسے درست رکھنے کے لئے پیتا ہوں اور ہمیشہ غیر ملکی پیتا ہوں، پاکستانی ہے۔"

مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ اب پاکستان ایک غیر ملک ہے۔

کمرے میں داخل ہو کر میں نے بالکونی کے قریب ایک بستر پر قبضہ جمایا اور پھر جیسا کہ

ان اجتماعی شب بسریوں میں دستور ہے، وہیں کھڑے ہو کر، صرف تصور کے پردے اپنے اردگرد گرا کر باہر جانے کے لئے لباس تبدیل کرنے لگا۔ جب میں اس نازک مرحلے کے قرب و جوار میں پہنچا جہاں آپ نظریں نیچی کر کے بہر طور یہ فرض کر لیتے ہیں کہ اب یقیناً آپ دوسروں کی نظروں سے اوجھل ہو چکے ہیں اور بہ کمال عجلت ستر سے پوشی کی جانب لپکتے ہیں، کمرے کا دروازہ بغیر دستک کے چوپٹ کھل گیا۔ ہوٹل کا مالک اپنی جھاگ آلود مونچھوں سمیت ہمارے درمیان کھڑا تھا۔ پہلے تو زپ ڈراپ خاموشی طاری ہوتی جس میں زپوں کے چڑھنے کی سرسراہٹ اور بٹنوں کی پچ پچ واضح طور پر سنائی دی اور پھر یکدم لڑکیوں نے اس مداخلت نیم برہنہ پر شور مچا دیا۔ ظاہر ہے ایک غیر مرد کی آمد پر ان کے گرد پڑے ہوئے تخیل کے پردوں میں چھید ہونے کے امکانات زیادہ تھے۔

جھاگ آلود مونچھوں نے ایک ایسے کھلونے کی طرح رُک رُک کر گردن گھمائی جس کی چابی ختم ہونے کو ہو، اور پھر سیدھا میرے پاس چلا آیا۔ میں نے نیچے کھسکتی ہوئی پتلون اُوپر کر لی۔

"پاکستانی؟" اُس نے جیب میں سے میرا سبز پاسپورٹ نکال کر یوں میری طرف اُچھال دیا جیسے سادہ کاغذ کی بجائے دہکتا ہوا انگارہ ہو اور دروازے کی سمت انگلی سیدھی کر دی۔ "باہر نکل جاؤ۔"

یہ صورتِ حال میرے لئے قطعی غیر متوقع تھی۔

"لیکن کیوں؟" میں نے ہونٹ بھینچ کر دریافت کیا۔

"بس تم اس ہوٹل میں شب بسری نہیں کر سکتے۔"

اس سے پیشتر کہ مزید کچھ کہنے کی نوبت آتی میرے ہم سفروں کا نیم برہنہ غول اس کے گرد ہو گیا۔

"ادئے بوڑھے مچھل کیا کہہ رہے ہو؟" ایک ننگ دھڑنگ سوا چھ فٹے جرمن نے اس پر منڈلاتے ہوئے دانت کچکچائے۔

"تم یقیناً ایک وحشی افغان لٹیرے ہو۔" تولیے میں ادھ لپٹی ایک سویڈش بی بی نے اسے جھاڑ پلائی۔

"یہ ہمارا ساتھی ہے۔ اگر تم اس کو جگہ نہیں دو گے تو ہم بھی یہاں سے چلے جائیں گے۔" ان سب نے فیصلہ سُنا دیا۔

اس کھُلی دھمکی سے جھاگ آلود مونچھوں کے اندر ذخیرہ شدہ بیئر فی الفور سادہ پانی میں بدل گئی۔ "میں تو صرف اتنا عرض کرنا چاہتا تھا کہ یہ ایک بستر میں پہلے ہی کرائے پر اُٹھا چکا ہوں۔ ہاضمے کے ساتھ میرا حافظہ بھی خراب ہے، بس اتنی سی بات تھی" اُس نے شفقت سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "ورنہ پاکستانی ... ہمارے برادر مسلمان، چشمِ ماروشن ... ہمارے ہمسائے ... میں بھلا ..."

"اور کمرے میں خالی پڑے ہوئے بقیہ دو بستر؟" ایک فرانسیسی خاتون نے اپنی سواتی شلوار اُڑستے ہوئے پوچھا۔

"وہ بھی کرائے پر اُٹھ چکے ہیں ... ورنہ پاکستانی، ہمارے برادر ..."

جھاگ آلود مونچھیں صریحاً جھوٹ بول رہی تھیں مگر میں نے ان کی دشمنی کو بنیاد بنا کر اپنے قیام کی عمارت کھڑی کرنے میں دانشمندی نہ سمجھی اور اپنے ہم سفروں کے پُرشور احتجاج کے باوجود سامان دوبارہ پیک کر کے خاموشی سے باہر نکل گیا۔ آخر کابل میں یہ واحد ہوٹل تو نہیں تھا۔

میں باہر آیا تو سورج غروب ہونے کو تھا۔ تھوڑی دیر پہلے چمکتی برف کی سفیدی اب ہلکی پیلاہٹ میں بدل رہی تھی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ زردی بھی گہری ہو کر تانبے ایسے رنگ میں ڈھل گئی جیسے چوٹیوں پر ایک خزاں رسیدہ جنگل بکھر گیا ہو۔

میں نے فٹ پاتھ پر بیٹھے ایک ہپی جوڑے سے کسی ارزاں قیام گاہ کے بارے میں پوچھا تو جواب ملا۔ "چکن مارکٹ چلے جاؤ۔"

"چکن مارکٹ" میں نے بے یقینی کے عالم میں سر کھجلایا۔ "کم بخت چرس میں جذب

ہیں اور مجھے سیاح کی بجائے مرغوں کا بیوپاری وغیرہ سمجھ رہے ہیں۔"

بعد میں معلوم ہوا کہ بیچارے درست کہتے تھے "چکن مارکٹ" سلیس ہی ترجمہ ہے کابل کے ایک علاقے "بازارِ مرغ" کا۔ جہاں شاید ایک زمانے میں اصیل مرغ وغیرہ بھی بکتے ہوں گے مگر ان دنوں یہ اُن زیرِ زمین قہوہ خانوں میں روست حالت میں ہی دستیاب ہوتے ہیں جہاں دیہاتی افغان سر نیوڑھائے سارنگیوں پر لوک موسیقی بجاتے ہیں اور ہپّی مخلوق حشیش کے زیرِ اثر اونگھتی، لیٹتی، لپٹاتی دنیا کا مدھم ترین رقص اونگھ کر بھی تو کیا جاتا ہے۔ بازارِ مرغ کی بیشتر دکانیں نوادرات کی ہیں۔ نیم تاریک کوٹھڑیاں جن کے اندر داخل ہوتے ہی پچھلی چند صدیاں باہر رہ جاتی ہیں۔ آپ قدیم افغانستان میں سانس لینے لگتے ہیں۔ چرواہوں کے بُنے ہوئے پہاڑی بکروں کی کھردری مگر گرم اُون کے موزے، سویٹر اور ٹوپیاں، انتہائی پرکشش کوہستانی نمونوں والے، قراقلی اور لومڑی کی کھال کی پوستینیں، وہ گھریلو اشیا۔ جو دُور افتادہ پہاڑی گھروں میں صدیوں سے زیرِ استعمال تھیں مگر اب وہاں کے باشندے انہیں پیٹ کے ہاتھوں مجبور ہو کر کابل میں نوادرات کے طور پر فروخت کر جاتے ہیں۔ پیتل کے پرانے سماوار، منقش چوبی دروازے، لکڑی کے سیاہ پڑتے صندوق، کٹورے، تھال، زرعی آلات اور قدیم عروسی جوڑے اور وہ تلّے دار پرکشش چولیاں جو نسل در نسل افغان خواتین نے زیبِ تن کیں اور جنہیں اب ہپّی لڑکیاں دھڑ سے اوپر واحد لباس کے طور پر بڑے دھڑلے سے پہنتی ہیں اور بےحد خوش لباس محسوس کرتی ہیں۔

"بازارِ مرغ" کے عجیب و غریب ماحول میں پہنچ کر میں کچھ دیر کے لئے بھول گیا کہ میرے کاندھوں پر بیس سیر وزنی سامان کا تھیلا ہے، میں یہاں شب بسری کے لئے کسی ٹھکانے کی تلاش میں آیا ہوں اور میرا بنیادی مقصد نوادرات کی دکانوں میں تانک جھانک کرنا یا ہپّی لڑکیوں کے جسموں پر کسے افغان عورتوں کے ملبوسات دیکھنا ہرگز نہیں ہے۔ چنانچہ میں مرکزی چوک کے پہلو میں ایک ایسے ہوٹل کے اندر چلا گیا جس

ظاہر اسی وضع اگرچہ میری جیب کے موافق نہ تھی مگر وطن سے باہر پہلی شب کسی آرام دہ ماحول میں بسر کرنے کی خواہش مجھ پر غالب آ گئی۔ ڈیسک کلرک نے انتہائی مؤدبانہ انداز میں میری فرمائش کی تعمیل کی اور پاسپورٹ رجسٹر پر رکھ کر مجھے ایک چابی تھما دی "دوسری منزل کمرہ نمبر بیالیس۔"

اس سے پیشتر کہ میں کمرہ نمبر بیالیس کے قفل میں چابی گھماتا وہ کلرک ہانپتا ہوا سیڑھیوں سے برآمد ہوا اور معذرتوں کا انبار مجھ پر لاد کر بولا "مجھے افسوس ہے کہ یہ کمرہ خالی نہیں ہے بلکہ اس ہوٹل میں کوئی بھی کمرہ... ابھی ابھی رجسٹر چیک کرنے پر معلوم ہوا" مجھے معلوم تھا کہ اس نے رجسٹر نہیں، پاسپورٹ چیک کیا تھا۔

سیڑھیوں سے اُترتے ہوئے اس غریب کا سر جھکا ہوا تھا اور وہ بار بار کسی فارسی شعر کا حوالہ دے رہا تھا جس میں "صد افسوس" تین مرتبہ آتا تھا۔ وہ مجھے صدر دروازے تک چھوڑنے آیا "آپ تو پاکستانی ہیں ہمارے مسلمان برادر... مگر مجبوری ہے۔ آج کل ٹورسٹ سیزن کی وجہ سے... ورنہ آپ تو... بہرحال کسی اور ہوٹل میں کوشش کر لیجئے۔"

کسی اور ہوٹل میں بھی یہی حشر ہوا۔ رات کے نو بجے تک میں نے اتنے ہی ہوٹلوں میں کوشش کی اور ہر جگہ "پاکستانی برادر، مسلمان، صد افسوس" کے بلڈوزروں سے باہر دھکیل دیا گیا۔

عام حالات میں شاید میں ایسی صورتِ حال سے بالکل ہراساں نہ ہوتا اور بڑے اطمینان سے کسی پارک یا پل کے نیچے ڈیرے ڈال دیتا مگر مجھے کابل کی خشک راتوں کی کاٹ کا علم تھا جنہیں اگر کھلی فضا میں بسر کیا جاتا تو بقول کسے صبح سویرے آپ کی بتیسی منہ سے باہر نکلی ہو گی اور آپ ہنستے ہوئے ہی اُٹھیں گے، اگر اُٹھے تو! چنانچہ اس وقت سر پر کسی چھت کی موجودگی ہی مجھے اس مزاحیہ انجام سے بچا سکتی تھی۔ اس کے علاوہ ایک عرصے کے بعد اپنا سامان اپنے ہی کندھوں پر اُٹھانے کا اتفاق ہوا تھا اور ڈی کلاس ہونے کے اس عمل نے مجھے تھکاوٹ سے چُور کر دیا تھا۔

اس مٹرگشت کے دوران ایک سنیما ہال کے قریب سے گزر ہوا جس کے باہر ایک افغان سکھ ہندوستانی ایکٹرسوں کی غیر شرعی تصاویر فروخت کر رہا تھا۔ گاہکی کا زور قدرے ٹوٹا تو میں نے اپنی بپتا بیان کی۔ "سردار جی کابل میں کوئی ایسا ہوٹل بھی موجود ہے جہاں مجھے مسلمان برادر کی بجائے صرف ایک سیاح کی حیثیت سے کمرہ مل جائے؟"

"پاکستانی ہو؟" سردار جی نے ایک کوہستانی افغان پر شرمیلا ٹیگور کی چمکیلی ٹانگوں کا لشکارا ڈالتے ہوئے لاتعلقی سے پوچھا۔

میں نے بے چارگی سے سر ہلا دیا۔

"پھر تو دریا کے اس کنارے تمہیں کوئی بھی ہوٹل جگہ نہیں دے گا.. بیس افغانی بابا!" اُدھر کوہستانی بابا صرف دس افغانی میں حسن ہندی کا خریدار تھا۔ "بھائی صاحب یہ افغان گورنمنٹ کا آڈر ہے۔ دریا کے پار چلے جاؤ وہاں دو ہوٹل ایسے ہیں جہاں قانونی طور پر پاکستانیوں کو رہنے کی اجازت ہے... اچھا بابا لاؤ دس افغانی۔" سردار جی نے شرمیلا کو بیچ کر تھیلے میں سے ہیما مالینی کا گٹھا ہوا جسم نکالا اور باریش افغانوں کے ایمان کو متزلزل کرنے لگا۔

صرف دریا کے پار۔ یعنی کابل میں پاکستانیوں کو دریا بدر کر دیا گیا تھا۔

میں اپنے قدموں کو جو لمبی مسافتوں سے پیشتر ہی تھک چکے تھے، گھسیٹتا ہوا جب دریائے کابل پر سے گزرا تو پل کے جابجا اکھڑے ہوئے تختوں میں سے نیچے بہتے پانی کی خنکی میرے ٹوٹتے جسم کو سرد تر کر گئی۔

دوسرے کنارے پر سردار جی کے بتائے ہوئے ہوٹل میں داخل ہوتے ہی میں نے اپنے سبز پاسپورٹ کا چہرہ مالک کے روبرو کر دیا۔ "میں پاکستانی ہوں، مسلمان برادر، ان قباحتوں کے باوجود مجھے کوئی کمرہ وغیرہ مل سکے گا؟"

اُس نے "میں سب سمجھتا ہوں" کی مسکراہٹ لبوں پر پھیلائی اور رجسٹر پر نام پتہ درج کر کے کمرے کی چابی میرے حوالے کر دی۔

"کرایہ کتنا ہو گا؟"

"دو سو افغانی۔"

"دو سو... تم یقیناً مذاق کر رہے ہو۔"

"میں ہوٹل چلاتا ہوں، سرکس نہیں۔" اُس نے مسکراہٹ جاری رکھی۔ "دو سو افغانی۔"

"میرا خیال ہے کہ مجھے کوئی اور ہوٹل تلاش کرنا پڑے گا۔" میں نے ڈرتے ڈرتے دھمکی دی۔

"میرا خیال ہے یہ تمہاری حماقت ہو گی۔" اُس نے اپنی مسکراہٹ کو فوراً نگل لیا اور ترشی سے کہا۔ "دوسرا ہوٹل جہاں تم قانونی طور پر شب بسر کر سکتے ہو بالکل فُل ہے اور اگر کوئی غیر ملکی جو کہ تم ہو، کابل کی سڑکوں پر رات کے گیارہ بجے کے بعد گھومتا ہوا مل جائے تو افغان پولیس اسے بخوشی گرفتار بھی کر لیتی ہے۔"

میں نے گھڑی پر نگاہ کی، ساڑھے دس بج رہے تھے۔

"گویا تم میری مجبوری کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہو؟"

"بس یہی سمجھ لو۔" اُس نے فلسفیانہ انداز میں سر ہلایا اور اپنی کائیاں مسکراہٹ کو دوبارہ جاری کر دیا۔ "ہاں البتہ ایک صورت ہو سکتی ہے... اگر تم کمرہ نمبر بیس میں رات گزار لو تو میں صرف پچاس افغانی چارج کر لوں گا۔"

"بات ہوئی ناں..." میں فوراً اُس کی شرافت اور اسلامی اخوت کا قائل ہو گیا۔ کمرہ خالی ہے نا؟"

"ہاں... تقریباً خالی ہی ہے۔" اُس نے قدرے تامل سے کہا۔ "اس میں صرف ایک جرمن ہپّی پڑا ہے۔"

"جرمنوں کے ساتھ ویسے بھی میری خوب گزرتی ہے۔" میں کھل اُٹھا۔ "مجھے منظور ہے۔"

"مُردہ جرمنوں کے ساتھ بھی؟"

"مُردہ؟" میرا مُنہ کھل گیا۔

"بس میری کم بختی... تین ہفتوں سے یہاں مقیم تھا... آج صبح ملازم کمرہ صاف کرنے کی غرض سے اندر داخل ہوا تو خنزیر کا بچہ مرا پڑا تھا.. جرمن سفارت خانے کو اطلاع کر دی ہے، لینے نہیں آتے... ابھی تک بستر پر پڑا ہے... میں پوچھتا ہوں اس کا کرایہ کون ادا کرے گا؟ مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ بدبخت صرف مرنے کے لئے کابل آیا ہے.."

ایک خدشہ نہ ہونے کا جو سفر میں ہمیشہ آس پاس رہتا ہے، میرے بدن میں سرایت کر گیا۔

"جو غیر ملکی یوں سفر کے دوران مر جاتے ہیں، انہیں کہاں دفن کرتے ہیں؟" میں نے گویا اپنے بارے میں ہی پوچھا۔

"ان ہپی سوروں کا یہاں ایک علیحدہ قبرستان ہے وہاں... تم تو خیر نوکری کی تلاش میں وطن سے نکلے ہو گے لیکن ان سفید چمڑی والوں کو دیکھو، اُدھر یورپ کا عیش چھوڑ کر دربدر کی ٹھوکریں کھاتے ہیں، اِدھر ویرانوں میں گھومتے رہتے ہیں۔"

"ہاں... صریحاً دماغ کا فتور۔" میں ہولے سے بولا۔

"تم کمرہ نمبر بیس میں ہی ٹک جاؤ... وہاں دو بستر ہیں... ڈیڑھ سو افغانی کی بچت... ویسے تم بیمار وار نہیں ہو ناں؟" اُس نے فکرمند لہجے میں سوال کیا۔

میں نے جیکٹ میں سے سو سو افغانی کے دو نوٹ نکال کر ڈیسک پر رکھ دیئے۔

"بطور ایڈوانس... تاکہ تمہیں میرے کرائے اور میری صحت کے بارے میں تشویش نہ رہے"۔

"تمہاری مرضی ہے۔" وہ اطمینان سے رقم جیب میں ڈال کر بولا۔ "ویسے آج تک کسی مُردے نے کسی زندہ انسان کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچایا... پڑا رہتا ساتھ والے بستر پر"۔

میں نے خاموشی سے سامان اُٹھایا اور سیڑھیاں طے کر کے دوسری منزل پر آ گیا۔

کمرہ نمبر بیس کا دروازہ کھُلا تھا۔

شیشے کی آدھ کھُلی کھڑکی میں سے ہلکی ہلکی بے نام روشنی اندر آ رہی تھی بستر کے پاس ہراتی فُل بوٹوں کا جوڑا پڑا تھا، یتیم بچوں کی طرح مُنہ کھولے منتظر۔ آس پاس دُھندلائی

ہوئی چیزوں کی شبیہیں تھیں، سگریٹوں کے ٹکڑے، بسوں کے ٹکٹ، ٹوتھ پیسٹ کی پچکی ہوئی ایک ٹیوب اور میلے کپڑے، ننگے فرش پر بکھرے سیاحتی کتابچے اور نقشے کھڑکی میں سے تیرتی ہوا کے لمس سے نیم بسمل پرندوں کی طرح پھڑپھڑا رہے تھے۔ کونے میں رکھے رُک سیک پر خیمہ بندھا تھا اور اس کے اُوپر ایک گٹار... اور بستر پر... مٹیالے کمبل تلے جانے کون لیٹا تھا... ہنری، آندرے، گیراڈ، مستنصر، کوئی بھی مِس فٹ، سرپھرا، آوارہ گرد، ذود رنج خنزیر، سوّر کا بچہ، جس نے مادہ پرستی سے فرار ہو کر، چوہوں کی دوڑ سے الگ ہو کر ان دیکھی ہواؤں میں آزاد سانس لینے کا جتن کیا۔ کار، کوٹھی، کلرٹی وی ایسی نارمل اور قابلِ احترام خواہشوں کا تعاقب کرنے کی بجائے اپنے بدن کو انجانے تجربوں کے لمس کے لئے اجنبی راہوں پر ڈال دیا۔ میرے ایک عمر رسیدہ جرمن ہم سفر نے سیاحت کو دیوانگی کہا تھا، دیوانگی جو فصلِ گُل کے آتے ہی عود کر آتی ہے۔ بستر پر پڑے اس سیاح کے لئے فصلِ گُل کے پہلو میں اجل بھی آئی اور کہاں آئی؟ کابل میں۔

میں سر جھکا کر آگے بڑھ گیا اور اپنے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔ جب میں نے اپنا سامان کھولا تو میرے کمرے کا بھی وہی نقشہ تھا۔ کونے میں رکھے رُک سیک پر بندھا خیمہ، سیاحتی کتابچے اور نقشے۔ البتہ بستر ابھی تک خالی تھا۔ اَن کھُلے سرمئی کمبل پائینتی پر ابھی تہہ شدہ حالت میں تھے۔

کپڑے بدل کر کھانے کی غرض سے جب نیچے اُترا تو ہوٹل کا مالک برآمدوں کی روشنیاں گُل کر رہا تھا۔ میں نے کمرے کی چابی اس کے حوالے کی تو نرمی سے کہنے لگا۔ مجھے خوب معلوم ہے کہ دو سو افغانی بہت زیادہ ہیں مگر میں کر بھی کیا سکتا ہوں۔ بی کلاس ہوٹلوں کی آدھی آمدنی تو ٹیکس میں اُٹھ جاتی ہے۔ میرے بارے میں دل صاف رکھنا۔ کتنے روز ٹھہرو گے؟"

"میں کل صبح ہی ہرات چلا جانا چاہتا ہوں، اگر بس میں نشست مل گئی تو..."

"کیوں نہیں ملے گی؟" اُس نے ٹکٹوں کا ایک پلندہ دراز میں سے نکال کر ڈیسک پر رکھ دیا۔ "میرے دوست سیّد خاں کی اپنی بس سروس ہے، بے شک کمرے کی کھڑکی میں سے

جھانک کر دیکھ لو، نیچے کھڑی ہے، نہایت عمدہ اور ایرانی ٹاٹاپ کی بس صبح چار بجے روانہ ہو گی ... ساڑھے تین سو افغانی ہرات کے لئے ...“

”ساڑھے تین سو؟“

”تم تین سو دے دو ... ٹھیک ہے؟“ اُس نے ٹکٹ کاٹ کر مجھے تھما دیا ”میں ملازم کو ہدایت کر دیتا ہوں کہ صبح تین بجے تمہیں بیدار کر دے۔“

”شکریہ“۔ رقم ادا کر کے میں نے ٹکٹ جیکٹ میں محفوظ کر لیا۔

”اس کافر کے بچّے نے بھی مجھ سے ٹکٹ خریدا تھا ...“ اُس کے درشت چہرے پر اب تأسف کی ہلکی سی پرچھائیں تھی۔ ”میں نے ٹکٹ کی رقم لوٹا دی ہے۔ بے شک اس کے رُک سیک کی جیب میں چیک کر لینا ... میں بُرا آدمی نہیں ہوں۔“

ایک نواحی چپلی کباب ریستوران سے تن تندور میں کچھ الا بلا جھونک کر میں فوراً ہوٹل جانے کی بجائے چہل قدمی کی خاطر دریا کی سمت چلا گیا۔ کابل رات کو جاگنے والے شہروں میں سے نہیں ہے۔ پانیوں کی ہلکی سرسراہٹ کے علاوہ ہر سُو خاموشی تھی۔ اندھیرے کی مُہر ثبت تھی۔ البتہ شہر کے درمیان اُبھرے ہوئے کچّے پہاڑ پر چند روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں جیسے کسی غریب عقیدت مند نے ایک دیوزاد قبر پر ناکافی تیل کے چند دیے روشن کر دیتے ہوں۔ ایک لیمپ پوسٹ کے سہارے، ہاتھ جیبوں میں اُڑسے، ہونٹوں میں سگرٹ دباتے ایک افغان سپاہی کھڑا تھا۔ مجھے دیکھ کر اُس نے کچھ کہا اور میں جواباً صرف ہاتھ ہلا کر آگے بڑھ گیا۔ ایک تنگ گلی کے آخر میں ایک قہوہ خانہ ابھی تک کھُلا تھا۔ دھوئیں سے بھرے کچّے کمرے کے فرش پر قدیم ازبک قالین تہہ در تہہ بچھے تھے جن پر آلتی پالتی مارے چند عمر رسیدہ افغان بیٹھے قہوہ پی رہے تھے۔ ایک کونے میں الاؤ روشن تھا۔ روشنی کی حدّت سے لبریز لہریں ان کے چہرے پر پھیلتیں تو یوں لگتا جیسے ازمنۂ قدیم کے افغانستان کا کوئی گم شدہ منظر فلم پر دیکھ رہا ہوں۔ تیکھے آریائی نقوش، چمکتی آنکھیں، بے ترتیب داڑھیاں، کاڑھے ہوئے لمبے ازبک چوغے اور کالے فُل بوٹ۔ وہ بے حد متانت اور آہستگی سے مصروفِ گفتگو تھے۔

کبھی کبھار وہ خاموش ہوتے تو قہوے کو چھُوتے ہوئے لبوں کا ہلکا سا ارتعاش سُنائی دیتا۔ میں اندر داخل ہُوا تو انہوں نے اپنی سفید بھنویں سکیڑ کر میری جانب دیکھا اور پھر کھسک کر آتش دان کے قریب جگہ بنا دی۔

”ہندی؟“ جھکی ہوئی کمر والے ایک خوبرو بوڑھے نے اپنا ہاتھ میرے کندھے پر رکھ دیا۔

”پاکستانی“۔ میں نے پچھلے تجربے کی بنا پر ڈرتے ڈرتے کہا۔

”الحمدللہ“۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر مزید جھک گیا۔

اجنبی چہروں پر اپنائیت اور محبت کی کونپلیں پھوٹنے لگیں۔ میں جو کچھ ٹوٹی پھوٹی فارسی میں کہتا وہ الحمدللہ کہہ کر سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے جُھک جاتے۔ اُٹھنے سے پیشتر میں نے قہوے کی قیمت ادا کرنی چاہی تو انہوں نے باقاعدہ خفا ہو کر سرزنش کی۔ ”پاکستانی برادر، مہمان۔“

میں اس مہمان نواز قہوہ خانے سے باہر نکلا تو اپنے ان جذبات پر نادم تھا جو اس شب ہوٹل والوں کے ناروا رویّے کی بنا پر افغانوں کے بارے میں میرے دل میں کدورت بھر چکے تھے۔ ایک قوم ٹیکسی ڈرائیوروں اور ہوٹلوں کے مالکان سے نہیں پہچانی جا سکتی جن کے ساتھ ایک عام سیاح کا سابقہ پڑتا ہے بلکہ یہ وہ عام لوگ ہوتے ہیں جو آپ کو قہوہ خانوں، چوراہوں اور کھُلی فضاؤں میں ملتے ہیں۔ ایسے محبتوں والے لوگ جو اپنے گرد کھڑی سیاسی اور مذہبی دیواریں مسمار کر کے آپ کو صرف ایک انسان کی حیثیت سے گلے لگا لیتے ہیں۔

واپسی پر اسی لیمپ پوسٹ کے قریب سے گزر ہُوا جس کے ساتھ ایک افغان سپاہی سگرٹ ہونٹوں میں دباتے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ وہ اب بھی اسی حالت میں موجود تھا مجھے دوبارہ دیکھ کر میرے قریب آ گیا اور گھڑی دیکھ کر بولا ”کون ہو؟“

مجھے ہوٹل کے مالک کی وارننگ یاد آ گئی، اگر کوئی غیر ملکی جو کہ تم ہو، رات کے گیارہ بجے کے بعد کابل کی سڑکوں پر ...“ مسافر ہوں، کھانا تناول کر کے میں ذرا قہوے

کی چسکی لگانے گیا تھا، الحمدللہ، شب بخیر۔" اس سے پیشتر کہ وہ مزید پوچھ گچھ کرتا میں بظاہر لاپروائی سے تیز تیز قدم اٹھاتا ہوٹل کی جانب چل دیا۔ میرے کان بھاری بوٹوں کی چاپ کے منتظر تھے مگر میرے پیچھے بچھی سڑک پر خاموشی سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ میرا تعاقب نہیں کر رہا۔

کمرہ نمبر بیس کا دروازہ ابھی تک کھلا تھا۔ فل بوٹ، رک سیک، گٹار اور ہوا کے زور سے لرزتے فرش پر بکھرے کاغذ، سرمئی کمبل بستر پر ابھرا ہوا، ادھ کھلی کھڑکی میں سے کابل شہر کے بالائی حصے پر ٹمٹماتی روشنیاں، ایک بے نام قبر پر جلتے بجھتے چراغ۔

اس شب مجھے اپنا بستر بے حد سرد لگا۔

باہر ابھی تک گھپ اندھیرا تھا۔ ہوا کی غیر موجودگی کے باوجود خنکی اتنی شدید تھی کہ شاید اگر میں اپنے سر کو زور سے جھٹکتا تو میری ناک اور کان فی الفور پکے ہوئے سرخ بیروں طرح جھڑ کر میری جھولی میں ٹپ ٹپ گر جاتے۔ میں نے کپکپاتے ہاتھوں سے بمشکل سگرٹ سلگایا اور باہر کھڑے کنڈکٹر سے کہا "آغا خیلے خنکی است۔"

اُس نے ہاتھ بڑھا کر چابی گھما دی اور ساکت بس کا انجن رُک رُک کر سسکیوں کی طرح ہولے ہولے چلنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد انجن گرم ہوا تو خوشگوار حدت کے ہلکورے میری جانب جھولنے لگے۔ میں نے اس پاؤں کی طرح آرام دہ اور گرم محسوس کیا جو تازہ پالش کئے ہوئے بوٹ میں داخل ہوتا ہے تو پالش کرنے والے غریب ہاتھ کی گرمی ابھی اندرونی حصے کے چمڑے میں سے پھوٹ رہی ہوتی ہے اور وہ انگلیاں پھیلا کر اس پرائی حدت سے لطف اندوز ہونے لگتا ہے۔

چار بجنے کو تھے مگر ابھی تک میرے سوا اور کوئی مسافر بس میں سوار نہیں ہوا تھا۔

"خان بابا! کوچ کب ہوگا؟" میں نے کنڈکٹر سے پوچھا۔

"صبر صبر۔" اُس نے خاصی بے صبری سے تلقین کی۔

باہر چند مزدور ڈرائیور اور کنڈکٹر کی زیر نگرانی روئی کی بڑی بڑی گانٹھیں رسوں کی مدد سے چھت پر باندھ رہے تھے۔ چھت پر روئی کا پہاڑ تعمیر کرنے کے بعد بقیہ گانٹھوں کو بس کے اندرونی حصے میں سارڈین مچھلیوں کی طرح پیک کیا جانے لگا۔ میرے برابر خالی نشست پر بھی تیل کے کنستر جما دیئے گئے تاکہ سفر کے دوران میری لوز شنٹنگ کا امکان باقی نہ رہے۔ لوڈنگ مکمل ہونے پر سید خاں بس سروس کا ڈرائیور جو خود سید خاں ہی تھا اپنی نشست پر دھپ سے بیٹھا اور گیئر کھینچ کر بس کو حرکت میں لے آیا۔ اڈے سے نکلنے کے بعد ہم دریا کے کنارے واقع بڑی سڑک پر آتے اور پھر دائیں ہاتھ پر ہرات جانے والی شاہراہ پر مُڑ گئے۔ چند فرلانگ طے کرنے کے بعد بس ایک وسیع میدان میں بکھری بکرا منڈی میں گھس گئی اور کنڈکٹر "غزنی غزنی" کی دہائی دینے لگا۔ مجھے اب اپنی حماقت کا بھرپور احساس ہوا یعنی میں کسی مسافر ٹرین کی بجائے مال گاڑی میں سوار ہو چکا تھا۔ اس قسم کی بسیں کابل سے ہرات تک کے لئے سامان لوڈ کرتی ہیں اور پھر ہر دس بارہ میل پر بریک لگا کر مختصر فاصلوں پر جانے والے مسافروں کو ٹھونس کر بغیر کسی متعینہ شیڈول کے دھیرے دھیرے اپنی من مرضی سے جائے مقصود پر پہنچتی ہیں۔ اگر میں عام بس پر سوار ہوتا تو رات تک ہرات پہنچنا یقینی تھا مگر اب میں حضرت سید خاں کے رحم و کرم پر تھا کہ وہ دو روز میں پہنچاتے ہیں یا ایک ہفتے میں۔ بہرحال اب کیا ہو سکتا تھا، میں صابر و شاکر چپکے سے بیٹھا باہر دیکھتا رہا۔ میدان میں پھیلے ہجوم میں افغانستان کی مختلف قومیتوں کے افراد اپنے الگ الگ لباس اور ناک نقشے کی بنا پر صاف پہچانے جا رہے تھے۔ چپٹی ناکوں والے ترکستانی، لمبے چغوں میں حرکت کرتے ہوئے تاجک اور ازبک، جہازی پگڑیوں کے بوجھ تلے دبے پٹھان اور وحشی آنکھوں والے ہزارے۔

"بخیر مے روی مومناں۔" کھڑکی سے باہر ایک آشنا چہرہ تھا۔

وہی فقیر جو آج سے چھ برس پیشتر اس چمکیلے روز ہماری بس میں داخل ہوا تھا، جب میں "نکلے تری تلاش میں" کے آغاز میں علی کے ہمراہ ہرات جا رہا تھا، وہی فقیر

باکم از کم اس کا کوئی ہمزاد۔ میں نے جلدی سے ایک سکہ اس کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ اُس نے ایک مرتبہ پھر "بخیر مے روی" کا وِرد کیا اور چلا گیا مگر اس فقیر کی دُعا اس مرتبہ تو قبول نہ ہوئی۔ میں گیا تو خیریت سے مگر واپسی . . خیر یہ بعد کی باتیں ہیں اور شاید اس لئے بھی کہ دُعا صرف بخیر مے روی کے لئے تھی، اس میں خیریت سے واپسی کا ذکر نہ تھا۔

کابل کی نواحی بستیوں سے نکل کر افغانستان کے وحشی مناظر نے ہمیں اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

میں نے آغازِ گفتگو کے لئے سید خاں سے کہا . . "آغا ایں بس خیلے خوب است"

آغا یعنی سید خاں میری اس مقفیٰ و مسجع فارسی سے بے حد متاثر ہوا اور کہنے لگا۔

"خو ہم بیس سال پنجور میں ڈرائیور رہا، اردو میں بات کرو۔"

"ہم ہرات کب پہنچیں گے؟"

"اللہ مالک ہے۔" اُس نے انگلی سیدھی کر کے پہنچے ہوئے بزرگوں کی طرح بشارت دی۔

"آغا تم تو ادھر پشور میں رہا، ہمارا بھائی ہے۔"

"بالکل بھائی ہے۔" وہ سر ہلا کر بولا۔

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم مجھے غزنی میں اتار دو تاکہ میں وہاں سے ہرات کے لئے مسافر بس میں سوار . . ."

"اتار دوں گا . . . مگر ٹکٹ کا پیسہ واپس نہیں ملے گا۔"

"خیر یہ بس بھی اتنی بُری نہیں ہے، کبھی نہ کبھی تو پہنچ ہی جائے گی۔" میں نے کھسیانے ہو کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "سگرٹ پیو گے؟"

"اوئے کندھے پر ہاتھ مت رکھو، ایکسیڈنٹ کرواتے گا۔" وہ رُکھائی سے بولا۔

طویل سفر کے دوران ڈرائیور کو سگرٹ پلاتے رہنا خاصا سُود مند ثابت ہوتا ہے۔ کسی خوبصورت منظر کو کیمرے میں اتارنے کو جی چاہے یا خوراک کی تبدیلی کی وجہ سے پیٹ میں ہلچل مچ جائے تو بس بآسانی رُکوائی جا سکتی ہے مگر سید خاں صرف پتھر ہی پتھر تھا اس

کے اندر دوستی کا وہ بارود موجود نہ تھا جسے سگرٹ کی پیش کش سے بھک سے اڑایا جا سکتا ہو۔

میرے اس سست رَو ہچکیاں لیتے ہوئے سفر کی کیفیت سے صرف وہی لوگ لطف اندوز ہو سکتے ہیں جنہوں نے کبھی مقامی اومنی بس پر پشاور سے ملتان تک سفر کیا ہو، اگر کوئی ایسی سروس چلتی ہے تو۔ غزنی تک تو ہم اتنی جگہوں پر رُکے کہ اگر میں چاہتا تو مزے سے سگرٹ پھونکتا، گرد کے مناظر سے لطف اندوز ہوتا پیدل غزنی پہنچ جاتا اور آدھے گھنٹے بعد آنے والی اسی بس پر دوبارہ سوار ہو جاتا۔ ہر سٹاپ پر بے شمار بوڑھے، بچے عورتیں دروازے میں سے داخل ہو کر چھت اور گانٹھوں کے درمیانی خلا میں رینگ کر فِٹ ہو جاتے۔ منزل آنے پر یا تو خود بمشکل آڑھے ترچھے ہو کر نکل آتے ورنہ کنڈکٹر پیچھے سے ان کے پاؤں پکڑ کر گھسیٹ کر باہر لے آتا۔ ایک فربہ گدھا بھی دو میل تک میرا ہم سفر رہا۔ جسے چھت پر گانٹھوں کے درمیان رسوں سے باندھ دیا گیا تھا۔

سلطان محمود کے مقبرے کا سفید گنبد درختوں میں سے نظر آیا تو سید خاں نے بس روکے بغیر دونوں ہاتھ فضا میں بلند کر کے فاتحہ پڑھی۔ اس دوران میں اگلی نشست کو اتنی مضبوطی سے تھامے رہا جیسے سٹیرنگ وہیل اب میرے ہاتھوں میں منتقل ہو چکا ہے۔ غزنی بنجر پہاڑوں کے پس منظر میں سرو کے درختوں میں سے کچے گھروں اور پرانے حصار کے بام و در ایک معدوم ہوتے ہوئے خواب کی طرح گزر گئے۔

سید خاں نے بتایا کہ اب ہم قندھار تک بغیر رُکے سفر کریں گے۔ لیکن یہ صرف سید خاں کا خیال تھا۔

میں نے سگرٹ سلگایا اور تھیلے میں سے پاکٹ ٹرانسسٹر نکال کر آن کر دیا۔ پتہ نہیں کونسا پاکستانی سٹیشن تھا۔ ستار پر ایک فلمی دُھن بج رہی تھی۔ جانی پہچانی دُھن جو مجھے ویرانوں میں تیرتی اس بس میں سے نکال کر واپس اپنے گھر لے گئی۔ بے تحاشا جی چاہا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کابل واپس چلا جاؤں اور وہاں سے . . . مگر میرے اندر کا سیاح اس مرتبہ اتنا بُزدل اور رقیق القلب کیوں ہو گیا ہے، ستار پر بجنے والی یہ ایک عامیانہ قسم کی

دھن نصف دُنیا کی سیاحت پر حاوی ہوتی چلی جا رہی ہے، کیوں؟ سانس لینے میں
دُشواری کیوں پیش آ رہی ہے؟ جوں جوں ہم غزنی سے دُور ہوتے گئے، میرے ریڈیو پر
بجنے والی دُھن کے درمیان فاصلے حائل ہوتے چلے گئے اور سُر مدھم سے مدھم تر ہونے
لگی اور پھر یکدم ایک پُرشور کھڑکھڑاہٹ اس پر چھا گئی۔ بہتر آواز کے لئے میں نے بیتابی
سے سوئی گھمائی تو مدھم آواز بھی ایک چکنی مچھلی کی طرح میری انگلیوں میں سے پھسل کر شور
کے سمندر میں اُتر گئی جیسے ایک رشتہ جاں منقطع ہو گیا۔

نیم بیداری کے عالم میں میرے کانوں میں انجن کے باقاعدہ مکانکی ایکشن کی بجائے
تیز ہوا کا شور گونجا۔ سنسناتی ہوئی آوازوں کا شور۔ ایک طویل "ہُو" کی صدا جیسے لاکھوں
درویش وِرد کر رہے ہوں۔ ہُو، ہُو، ہُو۔ بس ساکت کھڑی تھی۔ سید خاں اور کنڈکٹر اپنی
نشستوں پر موجود نہ تھے۔

بس سے باہر آیا تو تیز ہوا نے یوں قدم لئے کہ مجھے ایک جگہ جم کر کھڑے رہنے کے لئے
اپنی تمام تر قوت بروئے کار لانا پڑی۔ ہوا کا ریلا ڈوبتی آبدوز میں شرلاٹے بھرتے ہوئے
پانی کی طرح میرے لباس میں داخل ہوا اور مجھے ایک خلانورد کی طرح ڈولنے پر مجبور کر دیا۔
ایک جانب تاحدِ نظر پُرشکوہ مگر ہیبت ناک صحرا اور دوسری طرف ایک بنجر میدان کے آخر
میں کھڑے بلند پتھریلے تودوں نے مجھے بھی حیرت سے پتھر کر دیا۔ میں نے آنکھوں سے رِستے
پانی کو پونچھ کر اس طویل سڑک کو دیکھا جو سامنے کے پہاڑی سلسلے میں گم ہو رہی تھی اور
جس پر جابجا رُوئی کی گانٹھیں بکھری پڑی تھیں۔ سڑک پر ٹائروں کے کالے زِگ زیگ
نشانوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ بس کسی خرابی کے باعث بے قابو ہو کر گھسٹتی ہوئی یہاں
تک آن پہنچی ہے۔ میں کہ اتنی ہلکی نیند کا مالک ہوں جانے کیوں اتنے بڑے حادثے کے
باوجود بیدار نہ ہو سکا۔ دُور دُور تک کسی آبادی کا نام و نشان نہ ملتا تھا، سوائے ایک
کچی کوٹھڑی کے جو سڑک سے کچھ فاصلے پر میدان کے بنجر سمندر میں کسی وہیل مچھلی کے کوہان

کی طرح اُبھری ہوئی تھی۔ کوٹھڑی کے سُوراخ نما روشن دان سے دھواں اُٹھ رہا تھا
جو ہوا کی پاگل مسافت میں حائل ہوتے ہی منتشر ہو جاتا۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد میں
سڑک پر سے اُترا اور کانٹے دار جھاڑیوں اور نوکیلی گھاس سے دامن بچاتا کوٹھڑی کی
جانب چل دیا۔

اندر داخل ہوتے ہی ہوا کا شور بالکل مدھم پڑ گیا جیسے کسی نے سوئچ گھما کر اسے
دھیما کر دیا ہو۔ میرا اندازہ درست تھا۔ سید خاں کچے فرش پر بچھی ایک بوسیدہ دری پر
نیم دراز قہوہ پینے میں مشغول تھا۔ کونے میں ایک افغان چرواہا تپسیا کرتے کسی جوگی کی
مانند ہاتھ باندھے، آنکھیں بند کئے چُپ چاپ بیٹھا ہوا تھا۔ وہ کبھی کبھار اُٹھتا اور انگیٹھی
پر دھری کیتلی میں چمچہ ہلا کر پھر اپنی جگہ پر واپس چلا جاتا۔ ایک طرف سُوکھی ہوئی کانٹے دار
جھاڑیوں کا ایک ڈھیر تھا جو شاید سرد راتوں میں اُسے موسم کی شدت سے بچاتا تھا۔ ایک
تختے پر چند پیالیاں اور سُوکھے پنیر کے چند پیڑے رکھے تھے۔ بھربھری دیوار پر ۱۹۵۲ء کا
ایک بوسیدہ کیلنڈر لٹک رہا تھا جس پر خانہ کعبہ کی تصویر تھی۔ سید خاں مجھے دیکھ کر سفر
کے دوران پہلی دفعہ مسکرایا۔

"اگلا ٹائر پھٹ گیا ہے۔ اتنے ٹکڑے ہیں کہ کسی پیر فقیر کے مزار پر لٹکتی دھجیاں بھی
کم ہی ہوں گی۔ میں نے کنڈکٹر کو نیا ٹائر خریدنے کے لئے قندھار بھیج دیا ہے۔ پانچ چھ
گھنٹوں میں لوٹ آئے گا... آؤ قہوہ پیو..."

افغان چرواہا قہوے کا نام سُن کر مراقبے سے بیدار ہوا اور مجھے گرم گرم قہوے
کی ایک ایسی پیالی تھمادی جو درجنوں مرتبہ ٹوٹنے کے باوجود اس مشاقی سے جوڑی گئی تھی
کہ سبحان اللہ۔ موزیک کے کسی شاہکار کا گمان ہوتا تھا۔ پیالی میری ہتھیلیوں کے درمیان
ایک پرندے کے جسم کی طرح گرم تھی۔ میں نے قہوے کا ایک گھونٹ بھرا۔

"کیا ہم آج رات قندھار پہنچ جائیں گے؟"

"اللہ مالک ہے۔" سید خاں نے قہوہ ختم کیا اور چہرے پر پگڑی کا پلّو اوڑھ کر دری

پر لپیٹ گیا۔

بوڑھا چرواہا جانے کس افغان قومیت سے متعلق تھا کہ میری مختصر فارسی کا ایک لفظ بھی سمجھ نہ پاتا اور جواب میں کسی نامانوس زبان کا ایک فقرہ ادا کر کے میری پیالی خالی ہونے سے پہلے ہی گرم قہوے سے بھر دیتا۔ انگیٹھی میں پڑے اُپلوں پر سفید راکھ نمودار ہونے لگی تو اس نے انہیں اپنی کھُردری انگلیوں سے چھید کر پھر سے دہکا دیا اور اپنے کونے میں براجمان ہو کر اُونگھنے لگا۔ میں دروازہ کھول کر باہر آگیا۔

چرواہے کے کچے جھونپڑے کے گرد فطرت کے پُرشور عناصر کا راج تھا۔ اُن کا بس چلتا تو اس جھونپڑی کو بھی مسمار کر کے میلوں پھیلے اس میدان کی طرح ہموار کر دیتے جس میں جگہ جگہ بگولے اُٹھ رہے تھے۔ چند گھومتے رَتیل سانپوں کی طرح پھنکارتے، اپنے دامن میں سمیٹے ہوتے گھاس اور جھاڑیوں کو پٹختے، اُچھالتے ہوئے۔ اور کچھ ایک ہی جگہ پر سحر زدہ، ساکت یوں جیسے موہنجو داڑو کے کھنڈروں میں پڑے کنوئیں کی گول عمارت نمایاں کھڑی نظر آتی ہے۔ ان سے پَرے وہ ویران اور خشک پہاڑ تھے جنہیں کئی مرتبہ میں نے چلتی بس میں سے حیرت سے دیکھا اور ان سے قربت کی خواہش کو دل میں دبائے گزر گیا۔

"کنڈکٹر شام سے پہلے قندھار سے واپس نہیں آسکتا۔" قربت کی خواہش نے مجھے راہ دکھائی۔ "اس عرصے میں یہ مختصر میدان عبور کر کے اگر تھوڑی سی کوہ پیمائی کر لی جائے تو کیا ہرج ہے؟"

اگر میں سید خاں کو اپنے ارادے سے باخبر کرتا تو وہ یقیناً مجھے خبطی سمجھتا کیونکہ اُسے اس کوہ پیما سے ملنے کا اتفاق نہیں ہُوا ہو گا جسے ایک ذی ہوش انسان نے پوچھا تھا۔ "آخر تم لوگ ان پہاڑوں پر چڑھتے کیوں ہو؟"

جواب تھا۔ "کیونکہ یہ پہاڑ یہاں موجود ہیں اس لئے۔"

موجود کی یہی منطق میرے سامنے بھی تھی۔ میں نے جیکٹ کی زِپ گلے تک چڑھالی اور ہوا کی تندی سے بچنے کی خاطر سر نیچا کر کے ان بگولوں کی جانب چلنے لگا جو میرے بدن کی جھاڑی کو اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔

اور اب پچھلے تین گھنٹوں سے میں اس پُرشور بلندی پر بیٹھا نیچے پھیلے وسیع میدان کے درمیان کھڑی اس بس کو دیکھ رہا تھا جو یہاں سے ایک ڈِنکی کھلونے کی طرح لگ رہی تھی مختصر مگر مکمل جزئیات کے ساتھ۔ دائیں ہاتھ پر بھُورے پہاڑوں کی کوکھ میں سے پھوٹتی سیاہ سڑک میں سے ایک نکتہ نمودار ہُوا۔ ایک ٹرک جو نسبتاً بڑے نکتے یعنی میری بس سے ابھی کم از کم پانچ میل کے فاصلے پر تھا۔ جونہی یہ فاصلہ طے ہُوا، ٹرک رُکا اور اس میں سے ایک منحنی سا پتلا برآمد ہُوا جو یقیناً کنڈکٹر تھا کیونکہ اس ویرانے میں آباد اس چرواہے کو ملنے کون آتا ہو گا؟

میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ آنکھوں کے آگے آئی ہوئی نمی کی جھلی کے پار تین کا ہندسہ تیرنے لگا۔ سورج جس نے تین گھنٹے پیشتر مجھے اپنے عین نیچے پایا تھا، اب ترچھا ہو کر ڈھل رہا تھا۔ ان سرزمینوں پر چمکنے کے لئے جدھر مجھے سفر کرنا تھا . . . ہرات کے قدیم شہر کی جانب، گِل آبِ ایران کی طرف، ترکی کے بوڑھے پہاڑ آرارات کی چوٹی کے قریب، شام کے صحراؤں میں کھڑے ہجوم نخیل کے سروں پر، مصری صحرا میں بکھرے فرعونی تہذیب کے کھنڈروں پر، سُرخ شراب ایسے اُن ایجئین سمندروں پر جن میں جہاں گرد اوڈیسس ایک عمر بھٹکنے کے باوجود بالآخر اپنے وطن واپس پہنچ گیا تھا۔

نیچے اُترتے ہوئے میرا سایہ میرے آگے چل رہا تھا، مجھے راہ دکھانے کے لئے، سفر پر نکلنے سے بیشتر اور اب تک جو خدشات میرے دل میں بد رُوحوں کی طرح مکین تھے، بے گھر ہو چکے تھے۔ میں ایک ایسے موسےٰ کی مانند اس پہاڑ پر سے اُترا جسے تمام جواب مل چکے ہوں، جس نے سچائی کو پالیا ہو۔ مجھے معلوم تھا کہ میری واپسی پر سرحد پر کھڑا بند دروازہ میرے چھُونے سے ہی وا ہو جائے گا، میں گھر پہنچ جاؤں گا۔ اگرچہ میرے ایسے لوگ کبھی گھر نہیں جاتے، ہمیشہ جلاوطن ہی رہتے ہیں۔ میرا بدن آئندہ سفر کے خوشگوار اضطراب

سے یوں ہولے ہولے دہکنے لگا جیسے سگار کا آخری کش لگاتے ہوئے آگ کا قرب ہونٹوں کو ایک جلتی ہوئی آسودگی بخشتا ہے۔

میدان عبور کر کے سڑک کے قریب پہنچا تو سید خاں اور کنڈکٹر کولہوں پر ہاتھ رکھے میری جانب یوں بھوکی نگاہوں سے گھور رہے تھے جیسے ایک درندہ اپنی طرف بے خبری میں بڑھتے شکار کو دیکھتا ہے۔

"خو تم نے بس کے ٹکٹ کی قیمت ادا کی ہے، بس نہیں خریدی۔"

"میں ذرا ان پہاڑوں میں گیا تھا۔" میں نے حیرت سے اس بلندی کو دیکھا جو ایک گھنٹہ پیشتر میری آماجگاہ تھی۔

"اُدھر... اُس پہاڑ میں؟" سید خاں نے بے یقینی سے مجھے دیکھا۔ "ادہ اُدھر تو غاروں میں بھیڑیا رہتا ہے۔ گرمیوں میں روس کے ملک سے آکر ادھر سوتا ہے۔"

"اللہ مالک ہے۔" میں بے اختیار ہو کر مسکرا دیا اور بس میں سوار ہو گیا۔

:———:

آپریشن افغانستان

قندھار کا "ہوٹل پامیر" اُجڑے ہوئے ایک ایسے قصبے سے مشابہ تھا جو ویرانے میں راتوں رات صرف اس لئے اُبھر آتا ہے کہ اس کے آس پاس انسانی آنکھ سونا دریافت کر لیتی ہے اور یوں اس چمکتی دھات یا بقول گورکی "پیلے شیطان" کی آماجگاہیں، قمار خانے، ہوٹل، شراب خانے، رقص گھر خود بخود ہر سُو جنم لینے لگتے ہیں۔ اِدھر سونے کی کان اپنی آخری ڈلی انسانی ہاتھوں میں تھماتی ہے، اُدھر چمکتا دمکتا قصبہ اُسی طور راتوں رات ویرانیوں کو لوٹ جاتا ہے۔ قصبے کے کناروں پر رُکا مگر منتظر صحرا رینگتا ہے۔ اُسے اپنی ریتلی لپیٹ میں لیتا ہے، اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ ہوا بند دروازوں اور کھڑکیوں کو کھول کر اس اپنائیت سے عمارتوں میں واپس لوٹ آتی ہے جیسے ایک رئیس زادی ایک عرصہ شہر میں قیام کے بعد اپنے قصباتی مینشن میں داخل ہوتی ہے۔ گلیوں میں دھول اُڑنے لگتی ہے۔ سنہری چھتوں کو چمگادڑوں کے پر سیاہ کرتے ہیں اور ویرانیوں کا محبوب پرندہ کلیسا کی صلیب پر براجمان اپنی گول گول آنکھیں گھماتا ہے۔

"ہوٹل پامیر" کا گولڈ رش ان دنوں شروع ہوا جب متحدہ ہندوستان کی تمام تر مشرقی تجارت قندھار کے راستے گزرتی تھی۔ اور یہ سنہری دَور تقسیم کے ساتھ ہی زوال پذیر ہو گیا۔ اب اس ہوٹل کے طویل برآمدوں میں خوشحال تاجروں کی بجائے قندھاری سیبوں ایسے پھولے ہوئے صحت مند چہرے چہل قدمی کرتے ہیں۔ لائونج میں بچھا ٹاٹ کسی قالینِ رفتہ کی یادگار ہے۔ پھول بوٹوں کی بجائے سوراخوں سے مزین، جن میں سے اُکھڑا ہوا

سیلن زدہ فرش نظر آتا ہے۔ کمروں میں جا بجا جالے تنے ہیں جن کے پُرسکون وجود میں خفیف سا ارتعاش صرف اس وقت پیدا ہوتا ہے جب چھت سے اُکھڑا ہوا چونا ان پر گرتا ہے، چند لمحے جھولتا ہے اور پھر نیچے بستر پر آگرتا ہے۔

میں صرف دو وجوہ کی بنا پر اس ویرانے کا اسیر ہوا، ایک تو سید خاں کی بس اُس کے سامنے آکر رُکی تھی اور دوسرے ایک شب کے لئے کرایہ صرف آٹھ روپے تھا۔

"ہوٹل پامیر" کے بھائیں بھائیں کرتے برآمدے میں چلتے ہوئے یوں محسوس ہوا جیسے شہرِ خموشاں میں چل رہا ہوں۔ بیشتر کمروں کے دروازے چوپٹ کھلے تھے اور ان کے اندر چھت سے گرا ہوا چونا رینگتے صحرا کی مانند فرنیچر کو خاموشی سے چاٹ رہا تھا۔ چند ایک پر قفل پڑے ہوئے تھے جن میں سے پھوٹتی ہوئی زنگ کی بھربھری تہیں گواہی دیتی تھیں کہ ان میں آخری مرتبہ چابی گھمانے والے ہاتھ اب زیرِ زمین ہوں گے۔ میں نیم تاریکی میں سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ڈیسک تک پہنچا۔ وہاں تاریکی مکمل تھی۔

"کوئی ہے؟" میں نے ڈیسک پر دستک دے کر ہولے سے پوچھا۔

کچھ فاصلے پر ایک ٹیبل لیمپ نیم روشن ہوا۔ ناکافی روشنی میں ڈیسک کے پیچھے دبکا ایک ایسا کلرک دکھائی دیا جو "ہوٹل پامیر" کے زوال پذیر ماحول کا ایک لازمی جزو بن چکا تھا، شکستہ اور سیلن زدہ، چہرے پر لرزتی جھریاں چھتوں سے گرنے والے چونے کی طرح کسی لمحے بھی جھڑ سکتی تھیں۔ بوسیدہ سوٹ میں پھنسا ایک پوپلے مُنہ والا افغان دونوں ہاتھوں سے اپنی بڑھی ہوئی داڑھی کھجلانے میں مصروف تھا۔

"ہاں ہے۔" اُس کی آواز جیسے کسی تاریک غار میں سے برآمد ہوئی۔

"کیا ہے؟"

"تم پوچھ نہیں رہے تھے کہ کوئی ہے؟" وہ بے چارگی سے بولا۔

"ہاں... میں باہر جا رہا ہوں، اپنے کمرے کی چابی جمع کروانا چاہتا ہوں۔"

"رہنے دو... یہاں چوری چکاری کا امکان نہیں، تم ہی واحد مسافر ہو۔"

کھانے کے بارے میں پوچھا تو بولا "ہوٹل کا باورچی خانہ تو پچھلی بارشوں میں منہدم ہو گیا تھا۔ ساتھ والے تنور سے کھا لو... اور کچھ؟"

میں نے انکار میں سر ہلایا۔ ٹیبل لیمپ گویا اسی اشارے کا منتظر تھا، فوراً گُل ہو گیا، مجھے اس آسیب زدہ ہوٹل اور پوپلے بوڑھے سے سخت دحشت ہونے لگی۔ پوپلا بوڑھا جو یقیناً گئی رات اس کے تاریک برآمدوں میں ٹہلتا ہوگا۔ گھنے جنگلوں اور خاموش ویرانوں میں تن تنہا رات گزارنا میرے جیسے آوارہ گرد کے لئے ایک کاروباری معمول تھا مگر اس قسم کی نامعقول عمارت میں شب بسری کے خیال سے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ پچھلے سفر میں قندھار میں سے آیا تو علی کے ہمراہ پاکستان کونسلیٹ کے آرام دہ ریسٹ ہاؤس میں قیام کیا تھا۔ "کیوں نہ اس مرتبہ بھی وہیں شب بسری کی جائے؟" میں نے سوچا "مگر ہوٹل چھوڑنے سے پیشتر تصدیق ضرور کر لینا چاہیے، مبادا وہاں جگہ نہ ملے اور میں کابل کی طرح قندھار میں بھی آدھی رات تک دھکے کھاتا پھروں۔"

"آپ کے پاس فون ہے، ٹیلی فون؟" میں نے اندھیرے میں پوشیدہ بابے سے پوچھا۔

"ہے!" اس نے ٹیبل لیمپ پر ہاتھ مارا اور پھر دراز میں سے گراہم بیل کا اوریجنل ٹیلیفون نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔

"ڈائرکٹری بھی ہوگی؟"

اس نے چپکے سے دو صفحوں کا ایک کتابچہ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے کونسلیٹ کا نمبر تلاش کر کے ڈائل گھمایا۔

"ہیلو، کون بول رہا ہے؟" ایک نپی تلی احتیاط پسند آواز سنائی دی۔

"پاکستان کونسلیٹ..."

"کون بول رہا ہے؟" پھر اُسی انداز میں سوال دہرایا گیا۔

"اگر یہ پاکستان کونسلیٹ ہے تو میں قونصل جنرل سے بات کرنا چاہتا ہوں..."

"ہاں پاکستان کونسلیٹ ہے۔"

"تو میں قونصل جنرل سے بات۔۔۔"

"کیا بات کرنا چاہتے ہیں؟"

میں نے مختصراً اپنا تعارف کرایا اور ریسٹ ہاؤس میں شب بسری کی خواہش کا اظہار کیا۔

"وہ تو بند کر دیا گیا ہے۔۔۔ لیکن ٹھہریئے آپ فون مت بند کیجئے گا۔ آپ اسی وقت یہاں تشریف لائیے، ہم آپ کو چائے پلانا چاہتے ہیں۔"

"شکریہ مگر۔۔۔"

"مگر کیا، میں کہہ جو رہا ہوں کہ فوراً آئیے اور چائے پیجئے۔"

چائے کی دعوت میں درخواست کی بجائے صریحاً حاکمانہ رویّہ تھا۔ اپنے پاکستانی بھائی بندوں کے گلے کا کالر ملک سے باہر جا کر بھی نرم نہیں پڑتا، اکڑا ہی رہتا ہے۔ میں بھی اکڑ گیا

"اس وقت۔۔۔؟ جی نہیں۔۔۔ نہیں آسکتا۔"

"آپ نے فون کیا ہے تو آ کر چائے بھی پیجئے۔" جواب آیا۔

"صاحب اگر ریسٹ ہاؤس نہیں مل سکتا تو میں آ بھی نہیں سکتا۔ تھکا ہوا ہوں، کھانا کھا کر آرام کرنا چاہتا ہوں۔"

"صاحب آپ کو آنا پڑے گا۔۔۔ میرا مطلب ہے پلیز آجائیے۔۔۔ پلیز ہم انتظار کر رہے ہیں، چشم براہ ہیں۔۔۔ مہربانی ہوگی۔۔۔" اُن حضرت نے تو باقاعدہ آہ وزاری شروع کر دی۔

"کھانے کے بعد حاضر ہو جاؤں گا۔" میں نے جھلا کر فون بند کیا اور اس قندھاری ممی کے آگے رکھ دیا جو ایک ہاتھ سے بدستور داڑھی کھجلا رہا تھا اور دوسرے کی انگلیاں ٹیبل لیمپ کے سوئچ پر رکھے اس انتظار میں تھا کہ میں گفتگو ختم کروں اور وہ اسے گل کر کے ایک مرتبہ پھر تاریکی میں رُوپوش ہو جائے۔

قندھاری ممی کے تجویز کردہ تنور پر چاول گوشت کی رکابی میں انگلیاں چلاتے ہوئے بھی میرا ذہن پاکستانی کونسلیٹ کی دھونس آمیز دعوت کی گتھیوں میں الجھا رہا۔ آخر وہ اتنے بضد کیوں ہیں؟ پھر خیال آیا کہ یہ تو اپنی تحریروں کی بین الاقوامی شہرت اور بے مثال

اداکاری کا کرشمہ ہے کہ قونصل جنرل مجھ ایسے آگسٹ، وی وی آئی پی مہمان کو قندھار سے چائے پلائے بغیر رخصت نہیں کرنا چاہتے۔ نوکری نہیں کرنی انہوں نے؟ مگر اس مفروضے سے بھی تسلی نہ ہوئی۔ قہوے کی دو پیالیاں اور متعدد مفروضے حلق سے اتارنے کے بعد میں تنور سے باہر آیا اور تانگے پر سوار ہو گیا۔ کوچوان نے پہلے تو مجھے کوئی ڈھوں لگا فرنگی جان کر اپنی کبوتری انگریزی آزمائی اور پھر مجھے غور سے دیکھ کر چابک لہراتے ہوئے بولا۔ "صاحب انگریزی فلم دیکھے گا؟"

"نہیں، پاکستانی کونسلیٹ جائے گا۔"

اُس نے چابک نیچی کر کے باگیں کھینچ لیں۔ "اُدھر نہیں جائے گا۔"

"کیوں؟"

"بس نہیں جائے گا۔"

میں نے اُس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر سرگوشی کی "برادر پچاس افغانی دوں گا۔"

اُس نے باگیں ڈھیلی چھوڑ دیں اور چابک لہرا دیا۔ "جائے گا مگر گیٹ پر نہیں آئے گا۔"

ہم احمد شاہ ابدالی کے مزار کے قریب سے گزرے تو کوچوان نے دونوں ہاتھوں کی اُنگلیوں کو بوسہ دیا اور انتہائی عقیدت کے ساتھ آنکھوں سے لگا لیا۔

"ادھر شاہ ابدالی سوتا ہے نا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ بھی سوتا ہے مگر۔۔۔" مزید کچھ کہنے سے پیشتر اُس نے دوبارہ انگلیاں چومیں اور انہیں آنکھوں سے لگایا۔ "مگر اس کے مقبرے کے پیچھے، اُس بڑے گنبد کے نیچے اُدھر ہمارے نبی سرکارؐ کا خرقہ شریف ہے جسے جنّت میں فرشتوں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا۔ پہلے بخارا میں تھا، وہاں سے ابدالی ادھر لے آیا۔ قندھار خرقہ شریف کی برکت سے قائم ہے اور قیامت تک قائم رہے گا۔"

استنبول میں حضورؐ کے لبادہ مبارک کے صندوق نے مجھے چشم نم کی جس کیفیت میں ڈبو دیا تھا، وہی رواں جذبے اس قندھاری تانگے والے کی آنکھوں میں سے چھلک رہے تھے۔

کیا خرقہ شریف اصلی ہے؟ اس سوال کا جواز تو تب پیدا ہوا اگر اس ہستی سے موسوم کوئی بھی شے کسی اور کی ہو سکتی ہو تو!

بجھی بجھی تنگ گلیوں میں سے جھولتا ہوا تانگہ بالآخر ایک کشادہ چوک کے درمیان میں رُک گیا۔ "برادر جلدی سے اُتر جاؤ، وہ اُدھر تمہارا جھنڈا نظر آرہا ہے۔"

کرایہ ادا کرنے کے بعد میں نے کونسلیٹ کی عمارت پر پھڑپھڑاتے چاند ستارے کی جانب نگاہ کی تو بے اختیار مسکرا دیا۔ وطن میں تو صرف سبز کپڑے کا ایک ٹکڑا مگر اجنبی آسمانوں میں لہراتا دکھائی دے تو ایک ہمدم دیرینہ جس سے لپٹ جانے کو جی چاہتا ہے۔

میں کونسلیٹ کے پھاٹک سے اندر داخل ہوا تو پورچ میں پورا عملہ میرے استقبال کے لئے دست بستہ کھڑا تھا۔ ایک دُبلے پتلے صاحب آگے بڑھے۔ "آپ ہی مستنصر حسین ... تا۔ تا.." اُنہوں نے پھرتی سے کوٹ کی جیب میں سے ایک چٹ نکال کر دیکھی "تارڑ۔"

"جی تارڑ۔"

"بالکل ... آپ ہی ہیں؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو انہیں اطمینان ہوا۔ گرمجوشی سے ہاتھ ملایا، باقی عملے سے تعارف کروایا اور لان میں لے گئے جہاں پُر تکلف چائے کے تمام تر لوازمات نفاست سے سجے تھے۔

"آپ نے انتہائی دانشمندی کا ثبوت دیا جو ہمارے بُلانے پر یہاں تشریف لے آئے ورنہ ..."

"ورنہ کیا؟"

"آپ پہلے چائے تو پیجئے۔"

چائے کی پہلی پیالی سے فارغ ہو کر میں نے سلسلہ کلام "ورنہ کیا؟" سے شروع کیا۔

"آپ جانتے ہیں کہ دونوں برادر ملکوں کے درمیان دوستانہ تعلقات کی بنیاد رکھی جا چکی ہے مگر پھر بھی شک کی ایک خاص فضا بدستور قائم ہے ... آپ نے فون پر جو بھی

گفتگو کی وہ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت قندھار کے محکمہ جاسوسی کا سربراہ بنفس نفیس سُن رہا تھا... ہمارا فون ٹیپ ہے ... اب اگر کوئی پاکستانی قندھار آ کر خواہ کسی اشد ضرورت کے تحت ہی) کونسلیٹ سے رابطہ قائم کرے تو اُن کے ذہن میں خواہ مخواہ یہ شبہ تقویت پکڑتا ہے کہ ہو نہ ہو یہ شخص قندھار میں کسی خاص مشن کے لئے آیا ہے ... چنانچہ اس کا پیچھا کیا جاتا ہے بلکہ بعض اوقات تو گرفتار کر کے پُوچھ گچھ بھی کی جاتی ہے۔"

"اوہ واقعی؟" میں نے لاپرواہی سے چائے کا ایک گھونٹ بھرا۔ ہتھکڑی کی طرح سر تھا۔ "لیکن صاحب اگر وہ جاسوس ... میرا مطلب ہے وہ شخص کھُلے بندوں کونسلیٹ آجائے اور میری طرح دعوتیں اُڑانے لگے تو کیا اُن کے خدشات کو مزید تقویت نہیں ملتی؟"

"آپ کو اس طرح تقریباً زبردستی چائے پر مدعو کرنے کا واحد مقصد ہی یہ تھا کہ اگر کل کلاں آپ کو غائب کر دیا جائے ..."

"کہاں غائب کر دیا جائے ...؟" میری اُنگلیوں میں جکڑی تھالی پر چائے کی پیالی باقاعدہ جلترنگ بجانے لگی۔

"خیر غائب تو نہیں ..." ایک اور صاحب نے لقمہ دیا۔ "ویسے ہی اگر گڑبڑ ہو جائے تو کم از کم انہیں یہ تو معلوم ہو گا کہ قندھار میں آپ کی موجودگی پاکستان کونسلیٹ کے علم میں ہے اور ہم ایسی صورت میں اپنے ایک شہری کی گمشدگی ... میرا مطلب ہے اُس کے بارے میں سرکاری سطح پر باقاعدہ جواب طلبی کر سکتے ہیں ..."

"یعنی باقاعدہ گمشدگی ..." میں ایک ہنسی ہنسا جسے صرف کھسیائی ہوئی کہنا بھی خوشگوار تاثر دیتا ہے۔

"اگر خدانخواستہ ایسا ہوا تو ہم نہ صرف سرکاری طور پر جواب طلبی کریں گے بلکہ یقین جانیئے شدید احتجاج بھی کریں گے۔" دُبلے پتلے صاحب نے تسلی دی۔ اُن کی گہری سنجیدگی سے یوں معلوم پڑتا تھا جیسے میں فی الحال اُن کے سامنے براجمان نہیں ہوں غائب کر دیا گیا ہوں اور وہ اس وقت ذہن میں احتجاج کا سرکاری نوٹ ترتیب دے رہے ہیں ... حکومت پاکستان کے علم میں یہ بات لائی گئی ہے کہ ہمارا ایک معزز شہری

جناب مستنصر حسین ... تا تا تا ...

"آپ کچھ کھائیں نا؟" انہوں نے انتہائی محبت سے کیک کا ایک ٹکڑا پلیٹ میں رکھ کر مجھے دیا۔ پلیٹ پسینے سے تر انگلیوں میں سے پھسلتے پھسلتے بچی۔ "بہرحال فکرمند ہونے کی قطعی ضرورت نہیں۔ آپ اگر کل ہرات کے لئے روانہ ہو رہے ہیں تو ہم ہوٹل فون کر کے تسلی کر لیں گے کہ آپ واقعی روانہ ہو گئے ہیں یا ..." انہوں نے ایک عمدہ قسم کی ڈپلومیٹک کھانسی کھانس کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

دفتر خارجہ میں ڈپلومیٹک ٹریننگ کے دوران کسی شہری کو کوئی بری خبر سنانے کا سلیقہ بھی سکھایا جاتا ہوگا جو ان صاحب نے تو نہیں سیکھا تھا۔

چائے کے پہلے دور کے بعد نسبتاً کم پُرخطر گفتگو کا دور چلا۔ مجھے بتایا گیا کہ قندھار میں تعیناتی ہونے اور کالے پانی کی سزا پا جانے میں بس اُنیس بیس کا ہی فرق تھا۔ عملے کا بیشتر وقت کونسلیٹ کی چار دیواری میں اُٹھتے بیٹھتے اور سیر کرنے میں گزرتا ہے۔ باہر قدم رکھیں تو رکھوالے ساتھ ہو لیتے ہیں اور کہیں بھی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے۔ قومی تہواروں پر جو تقریبات منعقد کی جاتی ہیں، اُن کے دعوت نامے چونکہ افغان دفتر خارجہ کے توسط سے تقسیم کئے جاتے ہیں اس لئے اکثر دوست افغانوں تک پہنچ ہی نہیں پاتے۔ یوں ان موقعوں پر پاکستانی عملہ خود ہی "ہلاّ گلاّ" کر کے خوش ہو لیتا ہے۔ اُن کے خیال کے مطابق اگر کوئٹہ میں ایک طاقتور "ٹیلیویژن بوسٹر" نصب کر دیا جائے تو یہاں پاکستان کے بارے میں ایک انقلابی تبدیلی رونما ہو سکتی ہے۔

اس گفتگو کے دوران دُبلے پتلے صاحب نے ایک دم قریب کھڑے چوکیدار سے پوچھا۔ "مونچھوں والا ہے؟"

اُس نے جھک کر کہا۔ "صاحب، دیکھ کر آتا ہوں۔"

وہ پھاٹک تک گیا، باہر تانک جھانک کی اور واپس آ کر بولا۔ "نہیں صوفی صاحب ہیں۔"

"ہاں آج تو انہی کو ہونا چاہیئے تھا۔"

ان مسائلِ تصوّف پر میری حیرت کو بھانپتے ہوئے دُبلے پتلے صاحب مسکراتے اور ابرو کے اشارے سے بیرونی دیوار کے ساتھ ٹہلتے ہوئے ایک درویش نما شخص کو میرے علم میں لا کر بولے۔ "ہمارے کونسلیٹ پر نظر رکھنے کے لئے جو نظرباز حضرات متعین ہیں، عملے کے ارکان نے اُن کی پہچان کے لئے اُن کی شکل و شباہت اور عادات کے مطابق کچھ نام رکھ چھوڑے ہیں۔ چنانچہ جو حضرت کونسلیٹ کی بیرونی دیوار پر نسوار کی پیکیں نچھاور کرتے اِدھر آنکھ رکھتے ہیں وہ 'نسوار خان' ہیں۔ مونچھوں والے کا نام ظاہر ہے اُس کی دبیز مونچھوں کا مرہونِ منت ہے اور صوفی صاحب ... یہ اپنی طویل داڑھی اور کمبل کی مخصوص بُکّل کی بنا پر اس لقب کے حقدار ٹھہرے ہیں۔ موصوف مشتبہ حضرات کا پیچھا کرنے میں ماہر مانے جاتے ہیں۔ آج خاص طور پر آپ کے لئے تشریف لائے ہیں۔"

"میں اس نظرِ خاص کے لئے افغان سی آئی ڈی کا تہہِ دل سے ممنون ہوں۔" میں نے ایک جعلی قہقہہ لگانے کی کوشش کی اور پھر پھیکا پڑتے ہوئے پوچھا۔ "گویا صوفی صاحب صرف مجھ پر نظر رکھنے کے لئے سایۂ دیوار بنے ہوتے ہیں؟"

"قرائن سے تو یہی معلوم ہوتا ہے ورنہ عام طور پر مونچھوں والا ہوتا ہے۔ لیکن آپ حوصلہ رکھیئے نہایت معصوم قسم کا انسان ہے۔ آپ کی موجودگی رپورٹ کرنے آیا ہے، باہر جانے پر کچھ نہیں کہے گا۔"

"اس بے چارے کو تو ہم کبھی کبھی اندر بُلا کر چائے بھی پلا دیتے ہیں۔" کونسلیٹ کے ہنس مکھ ڈاکٹر صاحب مسکرا کر بولے۔ "کریم بسکٹ بے حد رغبت سے کھاتا ہے۔"

اس گفتگو کے دوران ایک مرتبہ جب صوفی صاحب بڑی شانِ بے نیازی سے دیوار پر سے جھانکتے گزرے تو ڈاکٹر صاحب نے ہاتھ ہلا کر صدا بلند کی "صوفی یار یہ کام تو ہوتا ہی رہے گا، آؤ چائے پیو۔"

صوفی نے بمشکل اپنی ہنسی ضبط کی اور بُکّل میں منہ چھپا کر اُسی لاتعلقی سے چلتے رہے۔ اس کے بعد گفتگو کا رُخ بین الاقوامی سیاست، خشک میوے کے بھاؤ اور

بزکشی سے ہوتا ہوا میرے سفر کی جانب مڑ گیا مگر خوف کا منہ زور گھوڑا ایک ہی سمت میں رواں رہا۔ باہر ٹہلتے صوفی صاحب کو دیکھتا تو بے اختیار ہنہنانے لگتا۔

رات گہری ہونے لگی تو میں نے دھڑکتے دل سے جانے کی اجازت چاہی، حالانکہ میرا بس چلتا تو شب بسری کے لئے قندھار کی تاریک سڑکوں کو ماپنے کے بعد آسیب زدہ ہوٹل پامیر پہنچنے کی بجائے وہیں کونسلیٹ کے کسی کونے کھدرے میں پڑ رہتا۔ "کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ آپ عملے کا کوئی رکن میرے ہمراہ کر دیں جو مجھے ہوٹل پامیر تک چھوڑ آئے؟" میں نے باہر نکلنے سے پیشتر درخواست کی۔

"ہمیں تو کوئی اعتراض نہیں لیکن ایسا کرنا شاید آپ کے لئے مصیبت کا باعث بن جائے۔" دبلے پتلے صاحب کان میں انگلی چلاتے ہوتے بولے۔ "اگر ہمارا کوئی آدمی آپ کے ساتھ ہوٹل تک جاتا ہے تو انہیں یقین ہو جائے گا کہ آپ سچ مچ ــــ بہرحال آپ فکر نہ کریں، آپ کی روانگی کے پورے تیس منٹ بعد ہم آپ کو فون کر کے تصدیق کر لیں گے کہ آپ بحفاظت ہوٹل پہنچ چکے ہیں یا....؟" فقرہ ادھورا چھوڑ دینے کا رجحان پھر اُن پر غالب آگیا۔

کونسلیٹ کے پھاٹک سے باہر آتے ہی جسم میں ہمکتا خوف کا بوجھ میرے پیروں میں منتقل ہو گیا۔ مجھے یقین تھا کہ اس وقت میرے پاؤں کسی آئرش گھوڑے کی طرح پھول چکے تھے اور اُن کے گرد واہموں کی دبیز جھالریں لٹک رہی تھیں۔ خوش قسمتی سے فوراً ہی ایک تانگہ دستیاب ہو گیا۔

"ہوٹل پامیر"۔ پچاس افغانی کا نوٹ تانگے والے کو تھما کر میں نے جلدی سے کہا۔ اُس نے معمول سے چوگنا کرایہ شلوار کے نیفے میں اُڑسا اور گھوڑے کو چابک دکھا دیا۔

چوراہے سے نکلتے ہی میں نے ڈرتے ڈرتے پیچھے نگاہ کی۔ سنسان سڑک پر دُور دُور تک صوفی صاحب، مونچھوں والے یا نسوار خاں کی تبیل کی کوئی شئے

حرکت نہیں کر رہی تھی۔ اطمینان کا ایک گہرا سانس سوکھتے حلق میں اترا اور میں نے سگرٹ سلگا کر وائلن کے تاروں کی طرح تنے ہوتے اعصاب کو معمول پر لانے کا جتن شروع کر دیا۔

اگلے چوک پر دائیں ہاتھ سے ایک تانگہ اس خاموشی سے مڑا جیسے اس کا گھوڑا سڑک پر پاؤں رکھنے کی بجائے فضا میں تیرتا چلا آرہا ہے، آسمان سے اترتے ایک کھٹولے کی طرح بے آواز.... اور پھر چھم چھم کرتا ہمارے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ اگلی نشست پر محترم بزرگ صوفی صاحب براجمان تھے، کمبل میں لپٹے، اور اُس چوپر نظریں جمائے جو فی الحال اُن کی بغل کی بجائے اگلے تانگے میں تھا۔ قندھار کی خنک شب بھی اُس پسینے کی راہ نہ روک سکی جو میرے پورے بدن میں سے یوں پھوٹا جیسے لبِ دریا چکنی مٹی پر ہتھیلی دبانے سے اس کے گرد بلبلے پھوٹنے لگتے ہیں۔ "آپریشن افغانستان" شروع ہو چکا تھا۔

کچھ فاصلے پر چیڑ کے درختوں کے درمیان ایک کچی سڑک نظر آئی۔ "خان بابا بائیں ہاتھ مڑ جاؤ۔"

"لیکن ہوٹل پامیر تو....؟"

"بائیں ہاتھ....!"

ہمارے مڑتے ہی صوفی صاحب کا تانگہ لحظہ بھر کے لئے اٹکا اور پھر جھولتا ہوا ہمارے پیچھے کچی سڑک پر آگیا۔ صوفی صاحب اپنی شہرت کے مطابق ایک مشتبہ حضرت کا پیچھا نہایت ماہرانہ انداز میں کر رہے تھے۔ اُس لمحے میں نے آئن فلیمنگ کے تمام تر ناولوں کے وہ حصے یاد کرنے کی کوشش کی جہاں ہر قدم پر مخالف گروہ کا ایک آدھ آدمی جیمز بانڈ کے پیچھے ہو لیتا ہے اور سپر سپائی بانڈ نہایت اطمینان سے اپنی سپورٹس کار کا ایکسلریٹر دبا کر اسے غچہ دے جاتا ہے۔ یہاں صورتِ حال اتنی جدید اور رومانوی نہ تھی۔ میری سپورٹس کار کا انجن ریامریل گھوڑا تھا جس کے لشتی ایکسلریٹر

سے بے پناہ بُو آ رہی تھی، اور میرا پیچھا کرنے والا، کالے چشمے چڑھائے، سفید سوٹ میں ملبوس کوئی اطالوی یا ترک نہ تھا بلکہ باریش حضرتِ صوفی تھے، شلوار قمیض پہنے، کمبل میں لپٹے ہوئے۔ خطرے اور خوف کے ملے جلے احساسات اپنی جگہ مگر صورتِ حال کی مضحکہ خیزی مجھے محظوظ بھی کر رہی تھی۔ کیوں نہ صوفی صاحب کی ماہرانہ شہرت کو پرکھا جاتے اور اسی بہانے قندھار کی سیر بھی کی جاتے۔ مہم جوئی کی حس نے مجھے بھی اُس سکھ کی مانند ٹھوکا دیا جس نے بعد میں پوچھا تھا کہ بہادری کی داد دینے سے پیشتر یہ فرمائیے کہ مجھے دھکا کس شریف آدمی نے دیا تھا؟

"خان بابا، مرکزی چوک کی جانب...."

"لیکن ہوٹل یا میر تو...."

"مرکزی چوک۔"

تانگہ چھوڑ کر جب میں قندھار کے مرکزی چوراہے میں آیا تو بیشتر دکانیں بند ہو چکی تھیں مگر فلمی گیتوں سے گونجتے قہوہ خانے ابھی تک بارونق تھے۔ فٹ پاتھ پر ہندوکش کی بلندیوں سے آئے ہوئے چرواہے وحشی جانوروں کی کھالیں فروخت کر رہے تھے۔ بھوری، چتکبری کھالوں کے درمیان خاموش بیٹھے یہ افغان راہ گیروں پر اپنی تند نگاہیں ایک وحشی جانور کی طرح ہی جمائے ہوئے تھے۔ چھوٹے چھوٹے بچے گلے میں طشتریاں لٹکائے پھر رہے تھے جن میں امریکی سگرٹ، روسی ماچسیں اور ایرانی چیونگم کے پیکٹ سجے تھے۔ وہ بآوازِ بلند ان اشیاء کے برانڈ پکار پکار کر لوگوں کو متوجہ کر رہے تھے۔ بنیسن اینڈ ہیجز سگرٹ اُن کی زبان میں صرف "بانسن" تھے، ۵۵۵ کو "پنج پنج پنج" اور کیمل کو "کامل" کا نام دیا گیا تھا۔ ایک دکان کے تھڑے پر ایک عمر رسیدہ افغان لکڑی کے مرتبان میں بھنگ گھوٹنے کے انداز میں ایک مکدر قسم کی شے گھما رہا تھا اور اس کا بیٹا سامنے فٹ پاتھ پر کھڑا راہ گیروں کو آستینوں سے کھینچ کھینچ کر اپنے باپ کی بنائی ہوئی آئس کریم کی خوبیوں سے مطلع کر رہا تھا۔ قبل اس کے کہ وہ میرا دامن بھی

تھام لیتا میں خود ہی دکان کے اندر چلا گیا۔

آئس کریم آ تو گئی مگر اسے "آئس آئس" کہنا زیادہ مناسب ہو گا، کریم نام کی کوئی شے اسے چھو کر بھی نہیں گئی تھی۔

میں اس برفیلی خوراک کو ابھی دانتوں تلے کڑکڑا رہا تھا کہ اپنے صوفی صاحب وارد ہو گئے۔ انہوں نے بھی آئس کریم منگائی جس کی قیمت ظاہر ہے حکومت افغانستان کی خفیہ فائلوں میں "پوشیدہ اخراجات" کے زمرے میں ڈالی گئی ہو گی مگر صوفی صاحب ابھی پہلا چمچہ بھر کر اپنے جھاڑ میں سے منہ تلاش کر ہی رہے تھے کہ میں دکان سے باہر آ گیا۔ پہلو میں ایک پنساری کی دکان تھی۔ میں شترِ بے مہار کی طرح اس کے اندر جا گھسا۔ وہاں سے الائچیاں خرید رہا تھا کہ صوفی صاحب نے قدم رنجہ فرمایا اور ادرک کی ایک گانٹھ کا آرڈر دے دیا۔ میں نہایت اطمینان سے الائچیاں چباتا باہر نکلا اور فٹ پاتھ اور سڑک کے درمیان ایستادہ ریلنگ پر براجمان ہو کر سگرٹ سلگا لیا۔ صوفی صاحب بھی کچھ فاصلے پر آسمان کی جانب منہ اٹھا کر بظاہر لاتعلقی سے کھڑے ہو کر جماہیاں لینے لگے۔ نصف شب قریب تھی اور اگر میں یوں قندھار میں نہ آ ٹپکتا تو وہ اس وقت اپنی رضائی میں دبکے خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے ہوتے۔ سگرٹ ختم کرنے کے بعد میں خاصی دیر اِدھر اُدھر بے مقصد ٹہلتا رہا اور انہیں اپنے ہمراہ بامقصد ٹہلاتا رہا۔ کبھی راہ چلتے لوگوں کو خواہ مخواہ ٹھہرا کر ــــ ابدالی کا مزار کدھر ہے، چہل زینے کو نسا راستہ جاتا ہے ــــ قسم کے سوالات پوچھتا اور اُدھر صوفی صاحب ان بے گناہ حضرات کے بارے میں بھی اپنی پاکٹ بک پر نوٹس تیار کرتے جاتے۔ مجھے یقین ہے کہ بعد میں ان میں سے ایک آدھ شخص کی ضرور شامت آئی ہو گی کہ فلاں دن اتنے بجے، بمقام مرکزی چوک قندھار ایک غیر ملکی جاسوس نے تم تک رسائی حاصل کر کے کون سے سرکاری رازوں کے بارے میں استفسار کیا تھا۔

مجھے بہر طور واپس جانا تھا چنانچہ میں نے مزید ایک شخص کا مستقبل تاریک کر کے

اُس سے ہوٹل کا راستہ دریافت کیا اور اُس جانب پیدل چلنے لگا۔ راستے میں ایک سنیما گھر پڑتا تھا، میں پھر نچلا نہ بیٹھ سکا، صوفی صاحب بھی کیا یاد کریں گے آج ان کو فلم بھی دکھا دی جائے۔

بکنگ آفس میں اُونگھتے افغان نے مجھے بتایا کہ فلم تو کب کی شروع ہو چکی۔ میں نے کہا کوئی مضائقہ نہیں، تم دو ٹکٹ کاٹ دو، ایک میرے لئے اور دوسرا ایک دوست کے لئے جو ابھی آکر تم سے ٹکٹ طلب کرے گا۔ میں نے ٹکٹوں کی رقم ادا کی اور سنیما ہال میں داخل ہو کر کہیں بیٹھنے کی بجائے دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد حسبِ توقع صوفی صاحب ہانپتے ہوئے اندر آئے اور ہال کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سر جھکائے، کسی لاغر مینڈک کی طرح پھدکتے، چندھیائی ہوئی آنکھوں سے گوہرِ مقصود تلاش کرنے لگے۔ اس دوران وہاں بیٹھے ہوئے تماشائیوں نے انہیں بے تحاشا ہوٹ کیا کیونکہ وہ اُن کے اور نیتو سنگھ کے درمیان بُری طرح حائل ہو رہے تھے، مگر وہ بدستور کبڑے ہو کر زرافے کی مانند گردن آگے بڑھائے قطاروں کے درمیان چلتے رہے۔ ایک آدھ جگہ کوئی خفیف سا جھگڑا بھی ہوا۔ مجھے ہال میں نہ پا کر وہ قابلِ فہم طور پر بے حد مضطرب ہوئے۔ عالمِ وحشت میں داڑھی کھجلائی بلکہ نوچی اور پھر کچھ سوچتے ہوئے صدر دروازے پر تعینات ہو گئے یعنی خو کبھی تو ادھر آئے گا۔ اب وہ باقاعدگی سے سانسوں کی بجائے جماہیاں لے رہے تھے۔ میں نے انہیں مزید پریشان کرنا مناسب نہ سمجھا، سوچا غریب کے بال بچے انتظار کر رہے ہوں گے اس لئے چھٹی کر دی جائے۔ چنانچہ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا ہال سے باہر نکل آیا۔ مجھے دیکھ کر صوفی صاحب کے چہرے پر رونق آگئی۔ مجھے راستہ دینے کے لئے پیچھے ہٹ رہے تھے کہ میں نے نہایت عاجزی سے پوچھا "ہوٹل پامیر کو کونسا راستہ جاتا ہے... صوفی صاحب!"

صوفی صاحب اس طرح شناخت ہو جانے پر خاصے برہم نظر آئے مگر ایک منجھے ہوئے جاسوس کی مانند بولے نہیں، چپکے سے آنکھیں جھکائے ادرک کی گانٹھ کترتے رہے۔

سنیما کے باہر ایک کشادہ مگر سنسان شاہراہ پھولوں کی بے ترتیب کیاریوں اور مختلف قسم کی جھاڑیوں سے اَٹی میری منتظر تھی۔ اختتام پر ایک مدھم سا بلب ہوٹل پامیر کے صدر دروازے کی نشاندہی کر رہا تھا۔ میں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا، نظرِ عنایت جوں کی توں مجھ پر تھی۔ خطرے کا پُرشور اضطراب نصف شب کی لایعنی مسافت کے بعد اب اپنی سوہانی کیفیت کھو چکا تھا۔ میں تھکے قدموں سے جھاڑیوں کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

جب بھی مڑ کر دیکھتا تو صوفی صاحب کے پاؤں کی بریکیں گویا میری گردن میں نصب تھیں، فوراً ساکت ہو جاتے۔ راستے میں ایک بوجھل احساس نے کونسلیٹ میں پی ہوئی چائے کی متعدد پیالیوں کا حوالہ دیا جو اب رواداری کے شدید حقوق کا تقاضا کر رہی تھیں۔ چنانچہ ایک نسبتاً "گھنی جھاڑی" کی اوٹ میں کھڑے ہو کر میں ان انتظامات میں مشغول ہو گیا۔ اسی لمحہ صوفی صاحب پریشان حال، کمبل دریدہ، دونوں ہاتھوں سے جھاڑیوں کو تاخت و تاراج کرتے میرے سر پر آن وارد ہوئے۔ پیغام رسانی کی بجائے آب رسانی کی غیر متوقع حالت میں پاکر قدرے شرمندہ ہوئے اور خفت مٹانے کی خاطر ایک طرف ہو کر اُسی فعل میں شریک ہو گئے۔

ہوٹل کے صدر دروازے پر پہنچ کر میں نے آخری مرتبہ پیچھے نگاہ ڈالی۔ صوفی صاحب جھاڑیوں کے نواح میں ڈانواں ڈول ہو رہے تھے۔ ایک ہوائی سلام اُن کی خدمت میں پھینک کر میں اطمینان سے دوسری منزل پر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ بستر پر دراز ہوا تو قندھار کے قدیم شہر میں ایک پُرخطر مگر گدگدی کرنے والے تجربے کے بعد ہوٹل پامیر کا آسیب زدہ کمرہ بھی ایک بے مثل گوشۂ عافیت لگ رہا تھا۔

ابھی سفر کا آغاز ہوا تھا۔ صرف دو روز ہی تو ہوئے تھے اور طلوع و غروب کی صرف چار ساعتوں میں کیا کچھ نہ ہوا تھا... عمر کے تمام ہونے کا صبح شام ہونے کا عمل تو ہر جگہ یکساں طور پر جاری رہتا ہے مگر ایک بھرپور زندگی کی علامت ان گزرتی صبحوں شاموں میں ہونے والے تجربوں سے ہی وجود میں آتی ہے۔ وطن میں بھی حیات کے

پلکوں تلے وقت کا پانی اسی رفتار سے بہتا چلا جاتا ہے مگر اس کا تفصیلی حساب کبھی یاد نہ رہا۔ فلاں تاریخ کو میں کہاں تھا؟ فلاں روز کیا ہوا؟ اُس ہفتے کس سے ملاقات ہوئی تھی، فلاں مہینے ۔۔۔ ؟ دنوں اور مہینوں کا تو ذکر ہی کیا، اکثر اوقات تو پورے برس کا سراغ کہیں نہیں ملتا۔ شک ہونے لگتا ہے کہ زندگی کا یہ سال بیتا بھی یا صرف واہمہ ہے کہ شاید گزرا۔۔ مگر جب سفر کا سمندر رواں ہو تو دن اور مہینے کیا ایک ایک لمحے کا حساب ملتا ہے، یاد رہتا ہے۔ مثلاً پچھلے دو روز لمحوں کی جزوی تفصیل کے ساتھ ذہن پر ثبت ہو چکے تھے، انمٹ، ہمیشہ کے لئے۔ کل شب کابل میں ایک سر پھرے آوارہ گرد کا کمرہ جس میں صرف اُس کا جسم تھا، سانس نہیں تھے۔ آج دوپہر ایک عظیم، کوہستانی بلندی پر لرزہ خیز لمحہ کن فیکون۔ اور ابھی ابھی آپریشن افغانستان کا ہیجان خیز تجربہ۔ سانس کی ڈوری چاہے ابد تک طول کھینچ لے، کیا مجال جوان دنوں کا ایک ایک پل میرے سامنے جوابدہ نہ ہو یعنی زندگی وہ کہ گزرے تو اس کا حساب بھی یاد رہے نہ کہ اُس پر واہموں کا گمان ہو۔

نیند کی وادی میں اُترتے اُترتے مائل خواب ذہن میں جو بے نام شکلیں اور رنگین دائرے بکھرتے سمٹتے چلے جاتے ہیں۔ میں ابھی اُن کے گنجلک جنگل میں تیر رہا تھا کہ دُور سے ایک مدھم دستک کی آواز آئی۔ آہستہ آہستہ یہ دستک نیم خوابیدہ خیالوں کی دنیا سے ناطہ توڑ کر حقیقت میں بدلی تو میں آنکھیں کھولنے پر مجبور ہو گیا۔ کمرے کا دروازہ بُری طرح لرز رہا تھا۔

"صوفی صاحب!" میری چھٹی یا ساتویں حس نے دُہائی مچا دی۔

سلیپنگ بیگ کی آغوش سے نکل کر میں ایک ہی جست میں دروازے تک جا پہنچا

"کون ہے؟"

"دروازہ کھولئے۔" گھٹی گھٹی نیند آلود آواز آئی۔

"نہیں کھولوں گا۔" میں نے کُنڈی کو مضبوطی سے تھام لیا۔

"نہیں کھولیں گے تو فون کیسے سنیں گے، کوئی صاحب آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

آواز تو قندھاری ممی کی تھی مگر رات کے اس پہر یہ کون کرم فرما ہیں جو شہر قندھار میں مجھ سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔۔۔۔ ہا ہا۔۔۔۔ یقیناً پاکستانی کونسلیٹ، میری خیریت نیک مطلوب چاہتا ہے۔

"اُن صاحب سے کہہ دیجئے کہ شکریہ، میں بفضلِ خدا خیریت سے پہنچ گیا ہوں اور۔۔"

"یہ تو میں انہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں مگر وہ بضد ہیں کہ۔۔۔"

میں نے دروازہ کھول ہی دیا۔ قندھاری ممی نے نیند سے بند ہوتی آنکھوں کو قدرے قہر آلود بنایا اور راہداری میں چلنے لگا۔ اس کے ازار بند کا پھندنا ٹانگوں کے درمیان میں سے لٹک کر فرش پر گھسٹتا چلا جا رہا تھا۔ اپنے آگے آگے سرسراتے پھندنے پر یک دم پاؤں رکھ دینے کے خیال کو میں نے بڑی مشکل سے دبایا۔

"گفتگو کے خاتمے پر لیمپ گل کر دینا۔" وہ داڑھی کھجلاتا اپنے کمرے کی جانب چلا گیا۔

"ہیلو" میں نے چونگا اٹھایا۔ "صاحب میں تو بالکل خیریت۔۔۔"

"کیا میں مسٹر مستنصر حسین ترار سے مخاطب ہوں؟" اُدھر سے امریکی لہجے کی لٹکتی ہوئی انگریزی میں کسی نے ملائمت سے پوچھا۔

"ترار نہیں۔۔۔ تارڑ۔۔۔ بہرحال بول رہا ہوں۔"

"مجھے بے حد افسوس ہے کہ آپ کو زحمت ہوئی، مگر کیا آپ اس وقت پولیس سٹیشن تشریف لا سکتے ہیں؟"

"پولیس۔۔۔" سٹیشن کو میں وحشت کی تھوک سمیت نگل گیا۔

"صرف روٹین۔ آپ سے چند سوالات پوچھے جائیں گے۔ چونکہ آپ قندھار میں اجنبی ہیں اس لئے میں اپنے آدمی ہوٹل بھیج دیتا ہوں وہ۔۔۔"

"جناب میرے سفری کاغذات بالکل مکمل ہیں۔ ویزا، پاسپورٹ، ہیلتھ سرٹیفکیٹ وغیرہ اور میں تو جناب کل صبح ہی یہاں سے جا رہا ہوں، سویرے سویرے۔"

"جی آپ درست فرما رہے ہیں آپ کی نیت پر شک نہیں کر رہا مگر چند معاملات

ایسے ہیں جو آپ کی روانگی سے پیشتر ہی طے پا جائیں تو مناسب ہے۔ آپ اسی وقت...!"

"اس وقت؟ بے حد تھکا ہوا ہوں۔ پچھلے دو روز سے مسلسل سفر میں ہوں انشاءاللہ بشرطِ زندگی صبح سات بجے آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا... اب اجازت دیجئے۔"

مگر اجازت نہ ملی۔ شاید وہ بھی جانتے تھے کہ سید خاں کی بس صبح چھ بجے ہی قندھار سے روانہ ہو جاتی ہے۔

"میں پہلے ہی معذرت کر چکا ہوں مگر کیا کیا جائے مجبوری ہے۔ میں جیپ بھیج رہا ہوں۔"

فون میں سے برآمد ہونے والی آواز انتہائی شستہ اور دھیمی تھی مگر اس کے پس منظر میں دھمکی کا عنصر بھی خاصا واضح تھا... اب یا کبھی نہیں والا معاملہ تھا۔ اگر چپکے سے پولیس سٹیشن چلا جاتا ہوں اور وہاں مجھ ان پڑھ پر پہلی نہ دوسری بلکہ تیسری ڈگری کا برتاؤ شروع ہو جاتا ہے تو... نہیں جاتا تو ظاہر ہے لینے آ جائیں گے۔ بالآخر میں نے پگھلتے ہوئے اعصاب میں سے بمشکل قوتِ گویائی کشید کی اور پھُس ہوتے ہوئے ٹھٹے سے بولا "نہیں آؤں گا۔"

"پھر یہ معاملہ آپ اور سپاہی طے کریں گے جنہیں آپ کی خدمت میں روانہ کر رہا ہوں۔"

"اس معاملے میں ایک فریق پاکستانی کونسلیٹ بھی ہے جسے میں فوری طور پر اطلاع دینے کا حق رکھتا ہوں۔ میں پاکستانی ہوں، جائز طریقے سے، جائز کاغذات پر سفر کر رہا ہوں۔ آپ کو مجھے یوں ہراساں کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں... نہیں آؤں گا پولیس سٹیشن۔" میں اس کمزور جانور کی طرح غصے سے پھٹ پڑا جو پیچھا کرتے ہوئے درندے کی وحشی طاقت کو جانتے ہوئے بھی مجبوراً خم ٹھونک کر میدان میں کھڑا ہو جاتا ہے۔

ادھر فارسی میں کچھ کھسر پھسر ہوئی اور پھر وہی شائستہ امریکن لہجہ گویا ہوا "پاکستانی کونسلیٹ کو اس معاملے میں الجھانے کی چنداں ضرورت نہیں، آپ ہمارے مہمان ہیں۔ میں تو صرف یہ چاہتا تھا کہ پولیس سٹیشن کے آرام دہ اور صاف ستھرے ماحول میں بیٹھ کر باہمی دلچسپی کے چند امور پر تبادلہ خیالات کر لیا جاتا۔ بہرحال آپ مسلسل سفر

کے باعث یقیناً تھکے ہوئے ہوں گے، ہم آپ کے آرام میں مخل ہونا نہیں چاہتے بس اپنا پاسپورٹ نمبر اور ویزے کی تاریخ وغیرہ لکھوا دیجئے..."

میں نے مطلوبہ معلومات فراہم کر دیں۔

"بہت بہت شکریہ مستنصر صاحب... آپ کا نام مجھے بے حد پسند آیا۔ ویسے سُنی افغانستان میں تو بے شک مستنصر ہی رہیے گا مگر شیعہ ایران میں صرف حسین کہلائیے گا۔ ایرانی بنو عباس کو پسند نہیں کرتے... میرے ایک دادا جان کا نام بھی... بہرحال پھر کبھی سہی... لیکن آپ کل صبح قندھار ضرور چھوڑ دیجئے ورنہ... گہری نیند سوئیے اور سہانے خواب... خدا حافظ۔"

خاک سہانے خواب، میں بڑبڑاتا ہوا واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ میرے رگ وپے میں ایک عجیب سا احساس کلبلایا، میں قندھار میں سے کبھی نہ نکل پاؤں گا۔ قندھاریوں میں ایک مشتبہ شخص تھا۔ یقیناً اس صوفی کے بچے کی کارستانی تھی جس نے صرف کارروائی ڈالنے کی خاطر نہ جانے میرے بارے میں کیسی خوفناک رپورٹ اپنے افسروں کو دی تھی۔

بستر میں پاؤں پھیلانے سے پیشتر میں نے کھڑکی سے نیچے جھانکا، ہر سُو تاریکی کا راج تھا۔ صرف صدر دروازے کا بلب ابھی تک ٹمٹما رہا تھا... اوہ مجھے یاد آیا میں ڈیسک پر رکھے لیمپ کو گل کرنا بھول گیا تھا، مگر اب مجھ میں اتنی جرأت باقی نہ تھی کہ صرف ایک بٹن دبانے کی خاطر دوبارہ اُن سحر زدہ برآمدوں کو طے کرتا۔ سلیپنگ بیگ میں لیٹ تو گیا مگر نیند کہاں سے آتی، آنکھوں کے سامنے مفرور مجرموں اور خطرناک قاتلوں کو زندہ یا مردہ پیش کرنے والے وہ پوسٹر گھومتے رہے جن پر جلی حروف میں WANTED لکھا ہوتا ہے اور تصویر کے نیچے انعام کی رقم کے بڑے بڑے ہندسے نمایاں نظر آتے ہیں... ایسے پوسٹر پر وہ میری کس قسم کی تصویر شائع کریں گے؟ وہ چھاپ دیں ناں سوئمنگ کاسٹیوم پہنے جھیل جنیوا کے نیلے پانیوں کے کنارے... وہ شاید اس قسم کے پوسٹر کے لئے مناسب نہ ہو... البتہ وہ کالی جیکٹ اور سیاہ چشمے

والی بہتر رہے گی جس میں امریکی گینگسٹر آل کاپون کا بھائی بند لگ رہا ہوں . . . یا پھر وہ تصویر بھی تو موزوں رہے گی، اُس ٹیلی ویژن ڈرامے کی جس میں مجھے قید خانے کے اندر پابندِ سلاسل قتل کیا جا رہا ہے۔ قتل؟ لاحول ولا . . . یہ میں کیا سوچ رہا ہوں بھئی بیسویں صدی کا قندھار ہے، کوئی عہدِ قدیم تو نہیں کہ بے گناہ مسافر کو پکڑا اور سُولی پر چھلا دیا۔ اُس وقت مجھے وہ پاکستانی صاحب یاد آ گئے جو افغان سرحد کے قریب ذرا کی ذرا ٹہلتے ہوئے دو قدم اندر آ گئے اور دھر لئے گئے۔ اسی جرم میں، اسی قندھار کے جیل میں ایک طویل عرصہ مہمان رہے۔ دن بھر مشقت لی جاتی اور شام کو انہیں بقیہ قیدیوں کے ہمراہ کشکول تھما کر شہر بھیج دیا جاتا تاکہ پیٹ بھرنے کے لئے روٹی مانگ لائیں اب یہ بھیک کیسے مانگی جاتی ہے، یقیناً فارسی میں ہی مانگتے ہوں گے اور میری فارسی تو . . . لیکن میرا خیال ہے کہ صرف "بخیر مے ردی مومناں" کہنے سے ہی گزارہ ہو جائے گا۔ "مجھے بہت بھوک لگی ہے" کو فارسی میں نہ جانے کیا کہتے ہیں، خیر وہی بخیر بخیر . . . .

اس مرتبہ جو دستک ہوئی تو میں لاشعوری طور پر صوفہ پھلانگ کر کھڑکی کے قریب جا پہنچا۔ پردہ ہٹا کر نیچے جھانکا۔ صدر دروازے کے بلب تلے دو افغان سپاہی کھڑے تھے . . . یہ تو لے جائیں گے۔ اُدھر دروازے پر کسی رُکتے ہوئے دل کی طرح وقفوں سے مگر ایک تواتر کے ساتھ دھک . . . دھک . . . دستک ہو رہی تھی۔ میں نے ایک ہارے ہوئے جواری کے لرزتے ہاتھوں سے دروازہ کھول دیا۔

ایک طویل قامت دبلا سا نوجوان ہاتھ میں ایک فائل تھامے کھڑا تھا نقوش جیسے کیکر کا چھلا ہوا تنا، تیکھے اور شفاف، تانبے کے پتلے فریم کی عینک کے پیچھے اُس کی آنکھیں بے حد روشن اور ذہانت سے بھرپور تھیں۔

"میں بے حد شرمندہ ہوں"۔ اُس نے ایک ایسے مہمان کی طرح معذرت میں ڈوب کر کہا جو دعوت کے خاتمے پر پہنچا ہو۔ "ٹیلی فون کی لائن میں خرابی کے باعث آپ کی گفتگو کے کچھ حصے مجھ تک نہ پہنچ پاتے۔ صد افسوس! . . . تشریف رکھیئے۔" وہ مجھے دعوت دے کر جھجکتا ہوا صوفے پر بیٹھا، فائل کھولی اور ایک فارم نکال کر پڑھ کرنے لگا۔

فرار کے تمام راستے مسدود ہو چکے تھے۔ صدر دروازے پر سپاہی تعینات تھے اور کمرے میں یہ فرشتہ اجل جو شکل سے محکمہ جاسوسی کے افسر کی بجائے ایک پڑھاکو طالب علم لگ رہا تھا۔

"اوہ! میں نے اپنا تعارف تو کروایا ہی نہیں . . . مجھے "جیم" کہتے ہیں۔" وہ گردن جھٹک کر میری جانب دیکھنے لگا۔ "آپ نے کونسلیٹ سے رابطہ قائم کیا؟"

"جی نہیں۔"

"بہت خوب۔"

مجھے فوراً ہی اپنی حماقت کا احساس ہو گیا۔ میں اب سراسر ان کے رحم و کرم پر تھا۔ یعنی اگر مجھے یہاں سے کسی انجانے جرم کی پاداش میں گرفتار کر کے قندھار کے کسی نیچے تہہ خانے میں نظر بند کر دیا جاتا ہے تو کونسلیٹ والوں کو خبر تک نہ ہو گی۔

"آپ کو جو کچھ دریافت کرنا ہے ازراہِ کرم پوچھ لیجئے میں صبح ہرات روانہ ہو رہا ہوں۔"

"صبح؟" اُس نے ایک بے یقین مسکراہٹ لبوں پر پھیلائی۔ "وہ تو بہت بعد کی بات ہے۔"

میری انتڑیوں میں کچھ کلبلاہٹ سی ہوئی۔

"صرف چند سوالات ہیں، خالص روٹین۔ آپ ان کے جوابات دے دیجئے . . . قندھار آپ کس مقصد کے لئے آئے ہیں؟"

"میں یہاں آیا نہیں لایا گیا ہوں۔ اگر میں سید خاں بس سروس کی بجائے کسی اور مسافر بس میں سوار ہوتا تو اس وقت میں آنکھیں جھپکنے کی بجائے ہرات میں سو رہا ہوتا۔ یہاں میری موجودگی کا باعث صرف سید خاں اور اُس کی بس کا پنکچر شدہ ٹائر ہے ورنہ مجھے قندھار سے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔"

"آپ ہم قندھاریوں کا دل دُکھا رہے ہیں۔" وہ بچوں کی طرح ہنس دیا۔

اُس کی ہنسی مجھے زہر لگی، یعنی میرا باقاعدہ مسلح قسم کا محاصرہ کیا جا رہا ہے اور ان کا دل دُکھ گیا ہے، صاحب کے جذبات کو ٹھیس پہنچی ہے۔

"یہاں کتنی دیر قیام کا ارادہ ہے؟"

"چار گھنٹے اور تقریباً دس منٹ..."

"آج شام قندھار میں کس کس جگہ پر گئے؟"

"برابر کے تنور سے کھانا کھا کر پاکستان کونسلیٹ میں چائے پینے کے لئے گیا تھا۔"

"اُس کے بعد؟"

"اُس کے بعد... آپ کو صوفی صاحب نے نہیں بتایا؟"

اُس کا قلم لحظہ بھر کے لئے اٹکا اور پھر رواں ہو گیا۔

"کیا آپ قندھار میں کسی صاحب کو ذاتی طور پر جانتے ہیں؟ اگر جانتے ہیں تو اُن صاحب یا اصحاب کے نام اور مکمل پتے...." وہ نہایت روانی سے انگریزی بول رہا تھا۔ سرکاری نوعیت کی گفتگو بھی اُس کے اندر کے تہذیب یافتہ اور پڑھے لکھے انسان کو دبا نہیں پائی تھی۔

"انگریزی زبان پر آپ کو خاصا عبور حاصل ہے۔" میں نے سوال کا جواب دینے کی بجائے گفتگو کا رُخ موڑنے کی کوشش کی۔

"اوہ شکریہ۔" اُس نے فائل پر سے نظریں اُٹھا کر انگلی سے عینک کی کمانی کو ٹھوکا دیا۔ "میں نے ماسٹرز کی ڈگری امریکہ کی مشی گن یونیورسٹی سے حاصل کی ہے... صرف دو ماہ پیشتر وطن واپس آیا ہوں۔"

"کمال ہے۔" میں نے ایک کائیاں جاسوس کی طرح اُس کی توجہ بہکانے کی خاطر کہا۔ "کون سے مضمون میں؟"

"نفسیات میں آنرز کے ساتھ۔"

"ایک نفسیات دان پولیس کے محکمے میں کیا کر رہا ہے؟"

وہ سر کو پیچھے ڈال کر معصومیت سے ہنس دیا۔ "اُن کا خیال ہے کہ جاسوسوں کو پکڑنے کے لئے نفسیات دان مناسب رہتے ہیں کیونکہ جاسوس... میرا مطلب ہے... خیر تو میں پوچھ رہا تھا کہ قندھار میں کن لوگوں کے ساتھ آپ کی آشنائی ہے؟"

"ایک تو صوفی صاحب ہیں...."

وہ اس انتظار میں تھا کہ میں مزید کچھ کہوں مگر میں جان بوجھ کر خاموش رہا۔

"کونسے صوفی صاحب؟" بالآخر اُس نے لاتعلقی سے کہا۔

"جیم صاحب، کیوں نہ ہم دونوں اپنے اپنے کارڈز میز پر رکھ دیں... بسم اللہ میں کرتا ہوں۔ میں نے آج شب صرف اس مقصد کے لئے پاکستان کونسلیٹ کو فون کیا تھا کہ مجھے شب بسری کے لئے مناسب جگہ کی تلاش تھی۔ آپ کے محکمے نے وہ فون سُنا پھر میں قونصل جنرل کی دعوت پر اُن کے ہاں چائے کے لئے گیا جو کوئی جرم نہیں۔ پاکستانی ہونے کی حیثیت سے میں اپنے کونسلیٹ میں جب جی چاہے، چائے پینے یا اُن کے برآمدے میں رکھی ٹیبل پر پنگ پانگ کھیلنے کے لئے جا سکتا ہوں۔ وہاں سے واپسی پر آپ کے تین پیشہ ور جاسوسوں یعنی مونچھوں والے، انسوار خاں اور صوفی صاحب میں سے مؤخرالذکر نے میرا پیچھا کیا۔ ایک آئس کریم کی دکان، پنساری کی دکان، ایک سینما ہال اور چند جھاڑیوں کے بعد انہوں نے مجھے یہاں تک چھوڑنے کی تکلیف گوارا کی۔ صوفی صاحب نے واپسی پر آپ کو رپورٹ دی اور یہ اُسی رپورٹ کی کارستانی ہے کہ آپ اس وقت یہاں موجود ہیں... مزید کوئی سوال؟"

جیم آخر نفسیات کا ماہر تھا۔ چہرے کے تاثرات منجمد کئے میری تقریر یوں سُنتا رہا جیسے میں اُسے ایلس اِن ونڈر لینڈ کی کہانی سُنا رہا ہوں۔

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، ہم قندھار میں داخل ہونے والے ہر غیر ملکی سے روٹین قسم کے بے ضرر سوال پوچھا ہی کرتے ہیں۔"

"میں اس سے پیشتر دو مرتبہ قندھار سے گزرا ہوں، پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا...."

سگرٹ پیجیے گا؟"

"شکریہ، میں ڈیوٹی پر نہیں پیتا۔"

"مجھے اجازت ہے؟"

"پلیز" اُس نے دونوں ہاتھ اُٹھا کر کہا۔ میں اُٹھ کر میز تک گیا اور بینسن کا پیکٹ کھول کر سگرٹ سلگا لیا۔ وہ اس دوران خاموش بیٹھا رہا۔ میں واپس صوفے پر آکر بیٹھا تو اُس نے ناک کی پھننگ کو ناخن سے کریدتے ہوئے آہستہ سے پوچھا "آپ کا پیشہ کیا ہے؟"

"ویگا بانڈ بائی پروفیشن۔"

"کیا بانڈ؟" جیم قدرے چونکا۔ شاید وہ ویگا بانڈ کو جیمز بانڈ کا کوئی قریبی کزن سمجھا چنانچہ میں نے فوراً وضاحت کر دی۔

"پروفیشنل آوارہ گرد۔"

"اور اس پروفیشنل آوارہ گردی کے درمیان میں پڑتے ہوئے وقفوں میں آپ کیا کرتے ہیں؟"

یہ سوال اہم ہونے کے ساتھ ساتھ پیچیدہ بھی تھا۔ اگر میں یہ کہہ دوں کہ چھوٹا موٹا دکاندار ہوں، بیج وغیرہ بیچتا ہوں تو جیم نے میرے مستقبل کے بارے میں جو خوفناک منصوبے بنا رکھے ہیں، یہ پیشہ اُن پر بالکل اثر انداز نہیں ہوتا اور اگر قلم کے ذریعے روزی کمانے کا اقرار کرتا ہوں تو شاید صرف اس خوف کے زیر اثر کہ میں وطن واپسی پر ان واقعات کی تفصیل اخباروں میں نہ لکھ دوں، وہ مجھے ہمیشہ کے لئے غائب کر دینے کے بارے میں مزید سنجیدہ ہو سکتا ہے، یا شاید نہ بھی ہو۔

"ادیب ہوں۔ کتابیں وغیرہ لکھتا ہوں۔"

"آپ ایک ادیب ہیں؟" اُس نے فائل اتنے زور سے بند کی کہ میں اُچھل پڑا۔ غلطی ہو گئی۔ میں نے سوچا کہیں نہ کہیں قسمت ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ دیوانگی ہے سفر کی قیمت ادا کرنی ہی پڑتی ہے۔ بخیرمی ردی مومناں .... میں قندھار کی قدیم گلیوں

میں جھولی پھیلاتے بھیک مانگتا ہوا، یا کوہ ہندوکش میں پوشیدہ کسی ایسے غار میں مقید جہاں افغانستان میں عمر قید بھگتنے والے مجرموں کو بند کر دیا جاتا ہے۔ بدن پر چیتھڑے گھٹنوں پر سرسراتی داڑھی۔ میرے تلووں میں پسینہ یوں پھوٹا کہ میں چاہتا تو بے شک اُس پر تیر سکتا تھا۔ جیم صوفے پر سے اُٹھا، یقیناً کھڑکی میں سے اُن سپاہیوں کو اشارہ کرنے کے لئے جو اسی مقصد سے وہاں تعینات تھے... مگر اُس کی آنکھوں میں تو ایک فاتح کی چمک کی بجائے ایک ٹین ایج مداح کی سی معصوم حیرت تھی۔ میرے پہلو میں بیٹھ کر اُس نے عینک اُتار دی اور چندھیائی آنکھوں سے میری جانب دیکھنے لگا "کیا آپ واقعی مشہور ادیب ہیں؟"

"مشہور؟" میں نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔ اب میں حیرت زدہ تھا مگر جلد ہی سنبھل گیا۔ تیر نشانے پر بیٹھا تھا "ہاں مشہور، بہت ہی مشہور، اتنا مشہور کہ بس یوں سمجھ لیجئے کہ اگر خدانخواستہ میں اپنے سفر کے دوران اِدھر اُدھر ہو جاتا ہوں تو پورے پاکستان میں تہلکہ مچ جائے۔ اخبار والے اداریے لکھیں گے، ریڈیو اودھم مچائے گا، ٹیلی ویژن کی باقاعدہ نشریات روک کر بار بار میری گم شدگی کا اعلان کیا جائے گا۔ ہم عصر ادیبوں کے علاوہ بقیہ ادیب پُرزور احتجاج کریں گے اور وزارت خارجہ.... ہاہا میری گم شدگی کو ٹاپ پرائرٹی دے گی.... مثلاً... مثلاً اگر میکسم گورکی اپنے امریکہ کے سفر کے دوران گم ہو جاتا تو آپ کا کیا خیال ہے کہ روسی حکومت ...؟"

"گویا آپ پاکستان کے گورکی ہیں؟" اُس کی تھرتھراہٹ میں لبریز آواز میں عقیدت بدستور قائم تھی۔

"بس انیس بیس کا فرق ہی سمجھیں۔" میں ایک ایسی ہنسی ہنسا جو اپنے کھوکھلے پن کی وجہ سے کسی بھی باہوش انسان کو یہ یقین دلانے کے لئے کافی تھی کہ میں بیہودہ ڈینگیں مار رہا ہوں، مگر جیم .... وہ تو مکمل طور پر میرے سحر میں گرفتار ہو چکا تھا، اُس کا منہ کھل گیا اور پھر ایک مجرم کی طرح سر جھکا کر کہنے لگا "میں بھی ادیب ہوں۔"

”کیا؟“ اب میرا منہ کھل گیا۔

”ادیب ہوں۔“ اُس نے شرما کر کہا۔

”واللہ جیم صاحب!“ میں نے ایک مربیانہ تھپکی اُس کی پیٹھ پر رسید کی، گرم لوہے پر ایک ضرب کی طرح۔ ”مجھے ایک ادیب بھائی سے مل کر بے حد خوشی ہوئی۔ جناب آپ کبھی لاہور تشریف لائیں، ہم آپ کے ساتھ شامیں منائیں گے، آپ کی مدح سرائی میں ٹھیکے پر کالم لکھوائیں گے کہ ان دنوں بہت فیشن ہے اور جیم صاحب یہ بندۂ حقیر بقلم خود آپ کی نگارشات کو اردو اور پنجابی میں منتقل کرے گا اور پھر... اور پھر کم از کم پاکستان میں آپ افغانستان کے سب سے بڑے ادیب کی حیثیت سے پہچانے جائیں گے۔“

شاید یہ متوقع شہرت کی اوور ڈوز کا نتیجہ تھا کہ جیم ایک عرصہ تک بت بنا بیٹھا رہا اور پھر سر جھٹک کر بے یقینی کے عالم میں بولا۔ ”آپ مذاق کر رہے ہیں۔“

”یقین مانیے کہ میں موجودہ حالات میں تو اس بارے میں بے حد سنجیدہ ہوں... ویسے آپ کس صنفِ سخن میں طبع آزمائی کرتے ہیں؟“

”افسانے لکھتا ہوں۔“ اُس نے جھجک کر اقرار کیا۔

”طبیعیاتی یا مابعد طبیعیاتی؟“

”پتہ نہیں وہ کیسے ہوتے ہیں۔“ وہ یکایک مجھ سے لاتعلق ہو کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ ”بہرحال میرے افسانے اُن بزرگ ادیبوں لیسے نہیں ہوتے جو لوگوں کو ادب کی افیون کھلا کر سُلا دیتے ہیں۔ آپ نے تو افغانستان میں صرف بڑی شاہراہوں پر ہی سفر کیا ہے مگر اس کے گرد پھیلے پہاڑوں اور اُن سے پرے دُور افتادہ وادیوں اور صحراؤں میں سسکتے وہ قصبے نہیں دیکھے جو اصل افغانستان ہے۔ غربت ایسی کہ آپ دیکھ کر بھی یقین نہ کر سکیں۔ انسانی سطح سے نیچے نہیں، وہ تو حیوانی سطح سے بھی کہیں پست مقام پر کچلے ہوتے پڑے ہیں۔ وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ ہم کس صدی میں سانس لے رہے ہیں، انہیں یہ نہیں معلوم کہ دن، مہینے، سال کیا ہوتے ہیں۔ وہ وقت کا تعین صرف خوراک

کے درمیان وقفوں کی طوالت یا اختصار سے کرتے ہیں.... میں انہی لوگوں کے بارے میں لکھتا ہوں۔“

”یہ افسانے کہیں شائع بھی ہوتے ہیں؟“

”افغانستان میں جرائد کا سلسلہ محدود ہے بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ سرے سے یہ بدعت موجود ہی نہیں۔ چنانچہ مجبوراً مجھے اپنی تخلیقات ایرانی رسالوں میں چھپوانی پڑتی ہیں۔“

”ایران میں تبدیلی کی خواہش رکھنے والی کہانیاں کیسے چھپ جاتی ہیں؟“

”وہ انہیں صرف اپنی امارت کے چاؤ میں، دولت کے گھمنڈ میں چھاپ دیتے ہیں، تقابلی جائزے کے طور پر۔“

جیم جو کچھ دیر پہلے جسمانی اذیت اور پردیس میں موت کی علامت بن کر میرے کمرے میں داخل ہوا تھا، اب ایک مختلف انسان تھا۔ وہ تیسری دنیا کے ایک ایسے فرد کی مانند گفتگو کر رہا تھا جو معاشرے میں زبردست تبدیلی کی خواہش کے باوجود اسی معاشرے میں ایک ناپسندیدہ کردار ادا کرنے پر مجبور تھا۔ جیم کا آہنی ہاتھ صرف مشتبہ سیاحوں کو تو نہیں دبوچتا ہو گا، کسانوں اور مزدوروں کی گردنوں تک بھی تو پہنچتا ہو گا۔

”کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ ایک ماہرِ نفسیات، ایک ترقی پسند ادیب ہونے کے باوجود آپ نے اس.... اس کھردرے کام کو کیوں ترجیح دی؟“

”ترجیح میں نے نہیں دی، حکومت نے دی ہے۔ ہمارے ہاں قانون ہے کہ ہر شخص کو تعلیم کے اختتام پر ایک برس کے لئے لازمی طور پر عسکری تربیت حاصل کرنا پڑتی ہے اور جیسا کہ میں بتا چکا ہوں مجھے انہوں نے فوج کی بجائے اِدھر بھیج دیا کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ میں ....“ اُس نے ہنس کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ علمِ نفسیات کو بروئے کار لا کر کوئی چھوٹا موٹا جاسوس دبوچ لینا تو خیر آپ کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہو گا.... مجھے یقین ہے کہ آپ اس میں کامیاب بھی رہتے ہوں گے۔“

"اکثر، مگر آج کی شام نہیں۔" وہ بے اختیار ہنسنے لگا اور پھر ہاتھ بڑھا کر بولا "اب میں آپ کی سگرٹ والی دعوت قبول کرتا ہوں۔"

سگرٹ سُلگا کر وہ اُٹھا اور پھر اپنے رجسٹر کی ورق گردانی کرنے کے بعد میرے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔ "یہ میری خوش قسمتی ہے کہ مدتوں بعد مجھے ایک ایسا شخص ملا ہے جسے ادب سے لگاؤ ہے۔ اگر آپ پسند کریں تو میں آپ کو اپنی ایک مختصر کہانی سناؤں؟ ... میں آپ کی رائے جاننا چاہتا ہوں ... کیا آپ سنیں گے؟"

"مجھ ایسا پرفیکٹ سامع آپ کو پھر کبھی نصیب نہ ہوگا۔ ایک ایسا سامع جو اگر بھاگ جانے کی کوشش بھی کرے تو باہر کھڑے آپ کے سپاہی اُسے پکڑ کر واپس آپ کے سامنے بٹھا دیں گے۔"

جیم نے فارسی سے ترجمہ کر کے جو افسانہ مجھے سنایا وہ آج بھی میرے ذہن میں محفوظ ہے اور اُس وقت تک محفوظ رہے گا جب تک جیم کے چار چوفیرے اُس قسم کا معاشرہ جنم نہیں لے لیتا جس کی خواہش کا اظہار اُس نے اپنی کہانی میں کیا تھا۔ جو وعدے کچھ دیر قبل میں نے اپنی جان بچانے کی خاطر کئے تھے، اُس کی تخلیق سننے کے بعد میں انہیں واقعی عملی جامہ پہنانا چاہتا تھا۔ میں نے جیم سے اُس کا پتہ دریافت کیا تو کہنے لگا "میں ابھی اپنے آپ کو ظاہر نہیں کرسکتا۔ میری اس سروس میں ابھی چند ماہ باقی ہیں، اس کے بعد ایک آزاد انسان کی حیثیت میں آپ سے خود رابطہ قائم کروں گا۔"

ہم پرانے دوستوں کی طرح دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اپنے خوابوں، اپنی آرزوؤں کی باتیں، یہاں تک کہ کھڑکی سے باہر تاریکی میں رُوپوش قندھار کے گلی کوچے اور اُن پر سایہ فگن کچے گنبد آہستہ آہستہ اپنا آپ ظاہر کرنے لگے جیسے اُنھوں نے بھی جیم کی کہانی سُن لی ہو۔ تاریکی میں سے نکل آنے کی آرزو کی شدت محسوس کرلی ہو۔ باہر روشنی تھی، باہر صبح ہو رہی تھی۔

جیم نے اپنا رجسٹر اٹھایا جس میں سرکاری نوٹس کے ساتھ ساتھ اُس کے آئیڈیلز بھی بند تھے اور کہنے لگا "اب مجھے چلنا چاہیئے، ابھی مجھے سٹیشن پر جا کر تفصیلی رپورٹ بھی لکھنی ہے۔"

"میرے ساتھ چلنے کی ضرورت تو نہیں؟" میں نے خوش دلی سے کہا۔

"نہیں"۔ وہ جھینپ گیا اور پھر بالوں میں اُنگلیاں پھیرتا ہوا بولا "آپ واقعی جان گئے تھے کہ کونسلیٹ سے نکلتے ہی آپ کا پیچھا کیا جا رہا ہے؟"

میں نے اُسے صوفی صاحب کے ہمراہ چہل قدمی کی پوری تفصیل سنائی۔

"نہایت نالائق آدمی ہے .... اُس کے بارے میں سوچنا پڑے گا۔"

"پلیز صوفی صاحب کو کچھ نہ کہئے گا" میں نے جیسے ایک دوست کی سفارش کی۔ "انہوں نے نہایت شرافت اور تندہی سے میرا پیچھا کیا۔"

"ایک درخواست ہے۔" وہ میرا کندھا دبا کر متانت سے بولا "اس رات کی بات صرف ہم دونوں کے درمیان ہی محدود رہے، کم از کم اگلے چند ماہ کے لئے .... ویسے صرف روٹین کی خاطر بتا دیجئے کہ اگر کسی نے پوچھا کہ آج کی شب کیسے گزری تو آپ کا جواب کیا ہوگا؟"

"کہانیاں کہتے اور کہانیاں سنتے۔" میں مسکرا دیا "چلئے میں آپ کو نیچے چھوڑ آتا ہوں۔"

"نہیں! وہاں میری حیثیت بدل جائے گی۔ میں یہیں ایک رفیق کی مانند آپ کو خدا حافظ کہوں گا، اس خواہش کے ساتھ کہ آئندہ ملاقات آج سے مختلف اور خوش بخت ماحول میں ہو۔"

اُس نے بے حد گرمجوشی سے ہاتھ ملایا اور دروازہ کھول کر جانے لگا۔

"جیم!" میں نے کچھ سوچ کر آہستہ سے کہا۔

اُس نے مڑ کر سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھا۔

"اگر ہمارے درمیان ادب کی مشترک قدر دریافت نہ ہوتی، کیا اس صورت میں کسی گڑبڑ کا احتمال تھا؟"

"تھا۔" اُس نے مختصراً کہا اور کھلے دروازے میں سے باہر نکل گیا +

کاروان سرائے

جیم کے رخصت ہونے پر میں ایک ایسے شخص کے محسوسات سے دوچار ہوا جس کا عزیز دوست گاڑی پر سوار ہو کر جا چکا ہوا اور وہ پلیٹ فارم پر چپ چاپ کھڑا، رنجیدہ ہونے کے باوجود طمانیت سی محسوس کر رہا ہو کہ چلو بالآخر جدا ہونے کا لمحہ تو ختم ہوا۔ مگر میری زندگی میں پلیٹ فارم پر ساکت پیکر ہمیشہ دوسرے تھے۔ میں نہ تھا کہ میں تو ہمیشہ اسی گاڑی کا مسافر رہا جو مجھے ان سے دور لے جاتی تھی۔ کاش میں ان درجنوں ساعتوں میں سے صرف ایک مرتبہ صرف ایک بار سفر کو چھوڑ کر اس چاہت کو اپنا لیتا جو پلیٹ فارم پر کھڑی تھی اور اس کے پھڑپھڑاتے ہوئے ہاتھ مجھے اپنی جانب لوٹتے دیکھ کر جدائی کی تپش کی بجائے چکیلی ٹہنیوں کے اندر کی ٹھنڈک سے مس ہو جاتے، صرف ایک بار۔

میں نے کپڑے تبدیل کئے، سلیپنگ بیگ لپیٹ کر رک سیک پر باندھا اور کمرے سے باہر آ گیا۔ پوپلا افغان راہداری کے درمیان میں رکھی ایک کرسی پر آلتی پالتی مارے نیم خوابی میں جھول رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ مجھ پر افغان پولیس کی نظر خاص نے اسے بھی چوکنا کر دیا تھا اور وہ اپنے بستر کی راحت چھوڑ کر شب بھر راہداری میں اپنے تئیں ایک مشتبہ شخص کے فرار کے راستے مسدود کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے کمرے کی چابی اور کرائے کی رقم دانت صاف کرنے سے پیشتر کی باسی مسکراہٹ میں لپیٹ کر اس کے حوالے کی اور سیڑھیوں سے اتر کر

کے سامنے کھڑی سید خاں کی بس میں جا بیٹھا۔

رُوئی کی گانٹھوں نے صبح کی کاٹتی ہوئی سردی کو جذب کر کے بس کے اندر کو بے حد نکھا اور رکوزی بنا دیا تھا۔ میں اپنی نشست میں فٹ ہو کر بیٹھ گیا اور سگرٹ سُلگا کر دھوئیں کی بے نام حدت نگلنے لگا۔ کشادہ شاہراہ دھیرے دھیرے روشنی کی زد میں آ رہی تھی۔ صدر دروازے کا بلب بھی گُل ہو گیا۔ تنوری ہوٹل کا دروازہ اندر سے کھُلا اور دو پٹھان بچّے جھاڑو بغل میں دابے باہر نکلے اور تنور کے سامنے پھیلے کچّے راستے کو صاف کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد وہ گرد میں گم ہو گئے۔ شاہراہ پر ایک ٹرک آیا اور گزر گیا مگر اس کے ماتھے پر نصب لاؤڈ سپیکر میں سے اُبلتے نغمے کے لفظ دیر تک اِدھر اُدھر بھٹکتے رہے۔ ہم تم اِک کمرے میں بند ہوں ... بند ہوں ... کمرے میں بند۔

"جیل میں بند مور لائیکلی ... جیم کی جگہ کوئی میم آجاتا تو اس وقت ہم ہی ہم جیل میں بند ... ہیلو جیل برڈ!" میں ابرو چڑھا کر لایعنی خود کلامی میں محو ہو گیا۔ "ہاں تو جیل برڈ آج کدھر جائے گا، ہرات جائے گا؟ ناٹ لائیکلی یو اولڈ گوٹ ناٹ اِف سید خان کین ہیلپ اِٹ ... سید خان، سانچی کا پان ... گدھے کا۔"

سید خان نے شاید میری لاؤڈ تھنکنگ کو سُن لیا۔ فوراً ہشاش بشاش چہرہ لئے کھڑکی کے باہر نمودار ہو گیا۔

"آ گئے ہو؟" وہ اپنی نشست پر گر کر زور زور سے ہارن بجانے لگا۔

"سید خان تمہارا اکلوتا مسافر تو بس میں موجود ہے اور میری معلومات کے مطابق رُوئی کی کوئی گانٹھ ناشتہ کرنے کے لئے باہر بھی نہیں گئی، پھر ہارن کاہے کو بجا رہے ہو خان بابا؟" میں نے نئے دن کا خوشگوار آغاز کرنے کی خاطر ہانک لگائی۔

"اوئے کیا کہتا ہے، کنڈیکٹر کو ادھر قندھار میں ہی چھوڑ جاؤں؟" مُنہ پچکا کر نسوار کو ڈیش بورڈ پر پھینکتے ہوتے وہ بیزاری سے بولا۔ میں نے بھی برابر کی بیزاری

سے مگر زیرِ لب "جہنّم میں جاؤ" کہا اور پاکٹ ٹرانسسٹر آن کر کے "دغا دغا دئی وئی" قسم کا کوئی افغان نغمہ سُننے لگا۔

ہم قندھار سے باہر آئے تو دھوپ ایک عمر رسیدہ گڈریے کی طرح آہستہ آہستہ پہاڑوں سے اُتر رہی تھی۔ دامنِ کوہ میں پھیلے میدان ابھی تمازت سے محفوظ تھے۔ شہر سے کچھ فاصلے پر ہم نے ایک ندی عبور کی جس کے کناروں پر انار کے درخت دُور تک چلے گئے تھے۔ اناروں کے سبزے میں گھِرے مسافر خانے کی چمنی سے دھُواں اُٹھ رہا تھا۔ ندی کے تیز پانیوں میں دو غیر مُلکی جسم تیرتے دکھائی دیئے۔

سید خان نے بس آہستہ کی اور بولا "کافر کے بچّے ننگے نہا رہے ہیں۔"

"بچّیاں ہیں۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"اچھا۔" اُس کا مُنہ لٹک گیا۔

دو سنہرے بدن جڑواں وہیل مچھلیوں کی طرح ڈبکی لگاتے اور پھر سطحِ آب پر نمودار ہو جاتے۔ میں ان کے لمبے بالوں کی وجہ سے دھوکہ کھا گیا تھا، لڑکی صرف ایک ہی تھی۔

"سید خان"۔ میں نے پھر اطلاع کی۔ "بچّہ بھی ہے۔"

سید خان کا مُوڈ فی الفور درست ہو گیا اور اُس نے بس کی رفتار تیز کر دی۔

"رات کیسے گزری؟" اُس نے گنگناتے ہوئے پوچھا۔

"کہانیاں لکھتے اور کہانیاں سنتے ... اور ہاں سید خان آج تو ہم ہرات پہنچ ہی جائیں گے ناں؟"

"اللہ مالک ہے۔" حسبِ سابق بیزاری میں لپٹا ہُوا جواب آیا۔

دوپہر کے وقت ہم سڑک کے کناروں پر جھانکتے دس بارہ کچّے مکانوں پر مشتمل ایک قصبے میں رُکے۔ کچھ فاصلے پر پہاڑوں میں گم ہوتی ایک پگڈنڈی کے پہلو میں ایک کچّی چار دیواری تھی۔ جب ہم ایک شکستہ حصّے کو پھلانگ کر اندر داخل ہوئے تو وحشی

نقوش کے حامل چند افغان اُون کے ایک بڑے ڈھیر پر بیٹھے قہوہ پی رہے تھے۔
سید خان کو دیکھتے ہی وہ اُٹھے اور معانقے وغیرہ سے فارغ ہو کر ایک بڑے ترازو
پر اُون تولنے لگے۔ تیز ہوا کی وجہ سے انہیں اس کام میں بے حد دشواری پیش آ رہی
تھی۔ پلڑے پر رکھتے ہی آدھی سے زیادہ اُون ہوا ہو جاتی۔ ان میں سے دو افغان پتنگیں
لُوٹنے والے بچوں کی طرح فوراً ہاتھ اُٹھا کر ہوا سے چھینا جھپٹی شروع کرتے اور اُون
کو قابو کر کے واپس پلڑے پر رکھنے کی سعی کرنے لگتے۔ وزن کے بعد اُون کو ایک بڑے
گٹھے میں باندھ دیا گیا۔ سید خان نے افغانی نوٹوں کا ایک بنڈل بطور قیمت ادا کیا اور
پھر گٹھے کو قصبے میں کھڑی بس کی چھت پر رکھوا لیا۔

اُون کی خریداری کے بعد بس پورے دو گھنٹے بلا رُکے سفر کرتی رہی اور پھر
اچانک سڑک سے اُتر کر دائیں ہاتھ پر پھیلے چٹیل میدان میں ہچکولے کھانے لگی۔ خوابیدہ
سناٹوں میں کسی سانس کی لو نہ تھی۔ بے آباد اور زندگی سے عاری زمین، تاحدِ نظر خالی
زمین، کارڈیوگرام پر ڈوبتی، تیرتی برقی لہروں کی مانند گرمی کے سُلگتے جھولے پھیل رہے
تھے، سُکڑ رہے تھے۔ ہوا کی تنوری تپش اس امر کا پتہ دے رہی تھی کہ ہم ایران اور
افغانستان میں پھیلے عظیم صحرا دشتِ مرگ کی جانب بڑھ رہے ہیں۔

"یہ ہرات کے لئے شارٹ کٹ ہے کیا؟" ڈرتے ڈرتے سید خان سے استفسار کیا
مگر اُسے جواب دینے کے لئے اتنا مجبور نہ پایا۔ وہ جھاڑیوں اور ٹیلوں کو روندتا اسی
سمت بس چلاتا رہا۔

"اللہ مالک ہے، کیوں خان صاحب؟" میں نے جھلا کر بآوازِ بلند کہا اور
صابر و شاکر دھکے کھانے لگا۔

نصف گھنٹے کی مسافت کے بعد ایک بلند ٹیلا نظر آیا جس کی اوٹ میں سے ہلکا
ہلکا شور بہتا چلا آ رہا تھا۔ بھیڑ بکریوں کے ممیانے اور کتوں کے بھونکنے کی ملی جلی
آوازیں پھر اُونٹوں کے جُگالی کرتے ہوئے چند جبڑے دکھائی دیتے۔ ایک سیاہ خیمہ

جیسے ٹیلے کے پہلو میں سے فرار ہو کر یکدم سامنے آیا اور پھر جونہی ہم دوسری جانب
پہنچے اس کے دامن میں پوشیدہ خیموں کا ایک شہر آنکھوں کے آگے پھیل گیا۔ انجن کی
آواز سنتے ہی خیموں میں سے مختلف جسموں کے سر نمودار ہوتے اور ساتھ ہی بقیہ ماندہ
دھڑ بھی باہر آ گئے۔ بس کے پیچھے پیچھے بچوں اور کُتوں کا ایک جمِ غفیر بھاگ رہا تھا جو
شور مچا رہا تھا اور بھونک رہا تھا، اسی ترتیب سے۔ اس عارضی قصبے کے درمیان میں
پہنچ کر سید خان نے بس کھڑی کر دی اور مجھ سے ہم کلام ہوئے بنا نیچے اُتر گیا۔

خانہ بدوشوں نے اسے یوں ہاتھوں ہاتھ لیا جیسے ایک ویران جزیرے میں پھنسے
ہوئے مُسافر کسی جہاز کے کپتان کا استقبال کرتے ہیں۔ سید خان اس ہجوم میں گھرا ایک
خصوصی طور پر خوفناک کی پیٹھ پر پے در پے جھانپڑ رسید کرتا ہُوا چل رہا تھا۔ ایک نسبتاً
بڑے خیمے کے قریب جا کر وہ رُکا، مڑ کر میری جانب دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔ "لے چلیں گے
ہرات، کوئی بات نہیں۔" اور پھر اپنے یارِ خونخوار کے ہمراہ پردہ اُٹھا کر اندر چلا گیا۔

چمگادڑ نما خیموں کا یہ عارضی شہر کوچی خانہ بدوشوں کا تھا جو ہمیشہ بہار کے لئے
پا بہ رکاب رہتے ہیں۔ کجاووں پر بندھا سامان اس بات کی گواہی دیتا تھا کہ ان کے مالک
چند دنوں میں شمالی کوہساروں کی جانب کوچ کرنے والے ہیں جہاں ان دنوں بھی
چراگاہیں سرسبز ہیں اور ان کے درمیان پگھلتی برفوں کا پانی سفید ندیوں کی صورت
آئینہ بکف ہے۔

آج سے پچیس تیس برس بیشتر واخان کوریڈور کے کسی گوشہ میں روس، چین، پاکستان
کے چٹانی سلسلوں میں پوشیدہ ایک افغان وادی میں خانہ بدوشوں کا ایک عظیم اجتماع
ہُوا کرتا تھا۔ ایک صُبحِ بہار وادی میں آنے والے پُرپیچ راستوں سے، بلند دروں سے
روسی، پاکستانی، افغان، ایرانی اور چینی خانہ بدوشوں کے قافلے اُترتے، قافلے مسرتوں
اور بے باک آزادیوں کے بھی اُترتے اور بیابان زندہ ہو جاتا۔ آئندہ چند روز میں باہمی
جھگڑے بزورِ خنجر نپٹائے جاتے۔ گھوڑوں اور اُونٹوں کی دوڑیں ہوتیں اور تجارتی معاہدے

ٹے پاتے۔ یہ سب کچھ ہوتا مگر تہذیب یافتہ دُنیا کی نظروں سے اوجھل ہو کر، پھر ایک صُبح تمام خیمے اُکھڑ جاتے کہ دل کا بے چین اصل خانہ بدوش اپنے خیمے کے نیچے تازہ گھاس اُگنے نہیں دیتا، اس سے پہلے ہی کُوچ کر جاتا ہے۔ اور اِدھر تو بدن کے خیمے کے اندر چاروں اور مدت ہوئی کسی بے نام قبر کی طرح جھاڑ جھنکار اور گھاس اُگی ہوئی ہے۔ چاہت کے منظروں کو تکے ایک عرصہ ہُوا۔ محبت کی سراؤں میں قیام ایک خواب ہُوا، چہروں پر بکھری سُرخ خوشی کب کی نظروں سے اوجھل ہو چکی، صرف گھاس ہے، سرکنڈے ہیں جو چاروں طرف سے محاصرہ کیے ہوئے ہیں اور ہم ہیں کہ پھر بھی اپنے آپ کو خانہ بدوش کہتے ہیں۔

بس میں رُوئی کی موجودگی جو صُبح سویرے آرام دہ گرماہٹ کا باعث تھی، اب دشتِ مرگ کے نواح میں سفید آگ بنی ہوئی تھی۔ میں نے تر بتر جسم کو ایک نچڑتے کپڑے کی طرح گردن آگے کر کے جھٹکا، پسینے کے قطرے پیٹھ پر سے پھسلتے جین کے کھردرے کپڑے میں جذب ہو گئے۔ گرمی ناقابلِ برداشت ہو رہی تھی۔ میں نے کیمرے کا کیس کھولا، اس کی تھوتھنی گھُما کر اپرچر سیٹ کیا اور تصویر کشی کی نیت سے نیچے اُترنے کو تھا کہ خیموں کے سائے میں اُونگھتی ہوئی چند بھیڑوں نے کان کھڑے کیے اور اُچھل کر میری جانب لپکیں۔ قریب آنے پر وہ یکدم جھالر دار کُتوں میں بدل گئیں۔ میں نے ایک اُلٹی چل جانے والی فلم کے کسی کردار کی طرح بیک گیئر لگایا اور وہیں آن بیٹھا جہاں سے اُٹھا تھا۔ بس کے گرد منڈلاتے چھوٹے شیطان یعنی بچے میری اُلٹی چھلانگ سے بے حد پُرمسرت ہوئے اور کُتوں کو اس کرتب پر تھپکنے لگے۔ ان میں سے ایک بچے نے کُتے کو تھپکتے تھپکتے کان سے پکڑ لیا اور اسے باقاعدہ گھسیٹتا ہُوا میری کھڑکی کے عین نیچے لے آیا۔ کان پر اپنی گرفت مضبوط رکھتے ہوئے اُس نے دوسرا ہاتھ ماتھے پر جا کر مجھے سلام کیا۔ میں نے اس نوازش کی رسید کے طور پر دو افغانی کا سکہ بچے اور کُتا لوگ کی نذر کیا۔ یہ پہلا قطرہ ثابت ہُوا، اس کے بعد باری باری ہر بچہ اپنے اپنے حصے کے کُتے کا کان پکڑ کر گھسیٹتا ہُوا

میرے پاس لاتا اور دو افغانی وصول کر کے خوش خوش واپس چلا جاتا۔ کان کھینچنے کے لئے کُتوں کا سٹاک ختم ہو گیا تو بچے بھی تتر بتر ہو گئے۔

خانہ بدوشوں کا یہ سیاہ شہر جس ٹیلے کے دامن میں بے ترتیبی سے بکھرا پڑا تھا اس سے پرے کائنات کی طرح بے انت فاصلوں تک پھیلا ایک چٹیل میدان تھا۔ گرم آسمان میں اُونٹوں کی اِکّا دُکّا گردنیں معلق تھیں جو کبھی کبھار جھلکتیں اور آسمانی نیلاہٹ کو خالی کر کے زمین کے بھُورے پس منظر میں مدغم ہو جاتیں۔ سُرخ چھینٹ کی چادر میں لپٹی ایک نوخیز خانہ بدوش ہانپتی ہوئی ایک خیمے سے نکلی اور ہاتھوں میں پکڑی چھڑی کو فضا میں گھما کر چاروں طرف دیکھا اور لب بھینچتی ہوئی واپس چلی گئی۔ یہ ایک ایسا چہرہ تھا جو مطمئن تھا اور دوسروں کو صرف خوشی دے سکتا تھا۔ میں نے کلائی پر پھسلتے گھڑی کے سٹریپ کو گھُما کر وقت دیکھا۔ چار بجنے کو تھے۔ نظروں سے گزرنے والے آخری سنگِ میل پر "ہرات ۰ ۵ اکلومیٹر" کے الفاظ دیکھے گئے تھے۔ معلوم نہیں سید خاں کا ان خانہ بدوشوں سے کس قسم کا تعلق تھا مگر میں اس خیال سے دہشت زدہ ہو گیا کہ کہیں مجھے آج کی شب ان سیاہ خیموں میں ہی نہ بسر کرنی پڑے۔ شاہراہ سے میلوں دُور دشتِ مرگ کے کنارے خانہ بدوشوں اور ان کے وحشی کُتوں کے درمیان۔

بالآخر تنگ آ کر میں نے ہارن پر ہاتھ رکھ دیا اور تب تک نہ اُٹھایا جب تک کہ سید خان بڑے خیمے میں سے آنکھیں ملتا ہُوا نمودار نہ ہو گیا۔ اس کا برہنہ پا خانہ بدوش یار بھی پہلو میں چلا آ رہا تھا۔ سید خان نے گانٹھوں کے درمیان خرّاٹے لیتے ہوئے کنڈکٹر کو ایک واجبی سی گالی دے کر بیدار کیا۔ وہ پگڑی کے پلّو سے پسینہ پُونچھتا ہُوا نیچے اُترا اور پھر چھت پر چڑھ کر ایک بڑا سارا بنڈل اُتار لایا۔ سید خان نے بنڈل خانہ بدوش کے حوالے کیا اور اس کے عوض وصول کردہ نوٹوں کا پلندہ شلوار کے نیفے میں اُڑستا ہُوا اپنی نشست پر آ بیٹھا۔ "تم اِدھر ہی بیٹھا رہا؟ اُدھر خیمے میں آ جاتا، بہت ٹھنڈا ہوا چل رہا تھا۔" اُس نے بس سٹارٹ کر دی۔

ہرات جانے والی شاہراہ جب ہماری بس کے ٹائروں تلے آئی تو سورج ڈھل رہا
تھا۔ آج صبح کی طرح دھوپ پہاڑوں کی چوٹیوں پر آہستہ آہستہ سرک رہی تھی مگر اب
گڈریا واپس لوٹ رہا تھا۔

صبح ہو رہی ہے یا شام ہونے کو ہے؟ میں نے اپنے آپ سے پوچھا۔ تکلیف دہ
مسافت کے تسلسل نے میرے بدن میں ایک گونجتی ہوئی سنسناہٹ چھوڑ رکھی تھی۔ بس
آج صبح کابل سے روانہ ہوئی تھی یا پچھلے ہفتے چلی تھی! وقت کے تعین کا پیمانہ اس
سنسناہٹ کے گونجتے چکر میں پھنس کر بیکار ہو چکا تھا۔ ایسے لمحوں میں نہ منزل پر پہنچنے کی
آرزو سرگوشی کرتی ہے اور نہ ہی گھر کو واپس چلے جانے کی چاہت کا شور برپا ہوتا ہے۔
مسافر ایک پتھرائے بدن کے ساتھ اپنے سامنے سرکتے سڑک کے سیاہ فیتے پر نظریں جمائے
بے حس بیٹھا رہتا ہے۔ بس بے شک ساکت ہو جائے مگر انجن اسی طور کانوں کے پردوں
پر دندناتا رہتا ہے، سڑک حرکت میں رہتی ہے۔

"بابا آج شب تو ہم ہرات نہیں پہنچتا" سید خان نے میری بے چارگی پر ترس کھاتے
ہوئے اطلاع کی۔ میرے لب مکانکی طور پر کچھ کہنے کے لئے لرزے مگر ان میں سے آواز
برآمد نہ ہوئی۔

"ہرات سے ادھر ٹھہرنے کا بندوبست نہیں، یہاں سے کچھ فاصلے پر ایک
کاروان سرائے ہے، رات اُدھر ٹھہر جائے گا، ٹھیک ہے؟" وہ بولا۔

مجھے برسوں پیشتر اس کاروان سرائے کا کھنڈر یاد آگیا جسے دیکھنے کے شوق میں شہباز
بیگ اور علی اپنے سامان سے محروم ہوتے ہوتے بچے تھے۔ اس روز میری شدید خواہش
تھی کہ میں ماضی کی ان چھتوں تلے ایک رات بسر کروں مگر اس وقت ... اس وقت
تو بقول امریکیوں کے مجھے ایک ڈیم کی اور بقول انگریزوں کے دو پینی کی بھی پروا نہ
تھی کہ ہم یونہی ساری رات سفر کرتے رہیں یا کسی گاڈ فارسیکن یعنی اللہ ماری سرائے
میں سر چھپا کر تاریکی کی چادر لپیٹ دیں۔ ایک موڑ پر بس سڑک سے اُتری اور ایک مرتبہ

پھر چٹیل میدان میں اٹک اٹک کر چلنے لگی۔ ہمارے گرد پھیلے ہوئے میدان میں بچھی
ہوتی جھاڑیاں ابھی مکمل طور پر تاریکی کی زد میں نہیں آئی تھیں۔ دُور سے کسی خانہ بدوش
کے خیمے کی طرح زمین پر اُبھری دکھائی دیتیں مگر قریب آنے پر اُن کے ٹھوس حجم کو بے نام
سی روشنی چھیدتی اور وہ ٹہنیوں اور پتوں کے چیتھڑوں میں بکھر جاتیں۔

"اترو بھائی" بس رُک چکی تھی اور سید خان جانے کب کا میری کھڑکی کے قریب کھڑا
تھا۔ "آگے ٹیلہ ہے، بس سرائے تک نہیں جا سکتی، تم اپنا سامان لے کر چلو اُدھر"
میں نے اس مجسمے کی طرح جس کا پتھر بدن صدا دینے سے گوشت پوست میں بدل جاتا
ہے، اپنے جامد پاؤں بس کے فرش سے اُکھاڑے اور رُک سیک لے کر باہر آگیا۔ سید خان
نے بس مقفل کی اور چھت پر چڑھ کر شب بسری کے لئے ضروری سامان اُتارنے لگا۔

"تم چلو اُدھر ..." اُس نے کیتلی کنڈکٹر کی طرف پھینکی اور نیم تاریکی میں پنہاں
فاصلوں کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے رُک سیک بدن پر بوجھ کیا۔ سر جھکایا اور آہستہ آہستہ سپاٹ میدان پر اپنا
بوجھ ڈالنے لگا۔ تھوڑی دُور چلنے کے بعد میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو بس تاریکی میں رُوپوش
ہو چکی تھی، البتہ سید خان کی کرخت آواز کبھی کبھار میدان پر تیرتی ہوئی مجھ تک پہنچ
جاتی۔ میرے سامنے بھی ہلکی تاریکی کا ایک غبار تھا۔ میں سر جھکائے چلتا رہا۔ ایک
مقام پر میرے قدموں تلے بچھی ہموار سطح ایک خفیف سے اُٹھاؤ کے ساتھ بلند ہونے
لگی۔ غالباً کسی ٹیلے کا آغاز تھا۔ اسی لمحے یک لخت ایک مدھم سے دھماکے کی آواز
مجھے سُنائی دی اور پھر ڈوبتی چلی گئی، یہاں تک کہ خاموش ہو گئی، جیسے کھلے منہ سے
اُبلنے والی چیخ کو ایک ہتھیلی مقفل کر دے۔ پھر آنکھوں کے سامنے روشنی کا ایک شائبہ
سا گزرا اور ساتھ ہی گرج کا ایک پردہ پوش رُخ کہیں دُور سے تیرتا ہوا میری جانب
بڑھا مگر راستے ہی میں دم توڑ گیا۔ ٹیلے کے عقب میں بجلی چمک رہی تھی۔ ایک بے آواز
قدموں والے چور کی طرح، جیسے ایک بلی اُون کے گولے کے ساتھ خاموشی سے کھیلتی ہے

دانت پیستی ہوئی ہلکی چمک پھر نمودار ہوئی تو میں نے ٹیلے پر بکھرے کاروان سرائے کے کھنڈر کے خطوط اُفق پر سیاہی میں نقش دیکھے۔ میں تھکے قدموں سے اس کی جانب بڑھ رہا۔ اگر آسمانی بلندیوں سے جھانکا جاتا تو نیچے پھیلے اس منظر کی ایک عجیب سی لینڈسکیپ بنتی ہو گی۔ چٹیل وسعت کے بیچ ایک ٹیلا جس پر گئے وقتوں کی ایک عمارت کا کھنڈر اور اس کھنڈر کی جانب بوجھل قدموں سے بڑھتا ایک پیکر، ایک مسافر۔ ایک ایسی تصویر جو وقت کے کسی بھی پس منظر میں قابلِ یقین ہی رہتی ہے بدلتی نہیں، اسے دوام حاصل ہے۔ دو ہزار برس پہلے بھی تصویر یہی تھی اور آج بھی منظر وہی ہے۔ شب بسری کے لئے ایک چھت کی جانب بڑھتا ہُوا ایک تھکا ماندہ جسم اور چھت منتظر۔

کاروان سرائے کا مہیب دروازہ اندھیرے میں سے کچھ اس طرح میرے سامنے آ کھڑا ہُوا جیسے یکدم ایک عفریت سمندر کی سیاہی میں سے نمودار ہو جائے۔ میں رُک گیا، اس لئے نہیں کہ دروازہ بند تھا کہ وہ تو کبھی کا اپنے قدیم مسکن سے جُدا ہو کر میرے پاؤں کی مٹی میں بدل چکا تھا بلکہ اس لئے کہ اندر گھٹا ٹوپ تاریکی تھی اور مجھ میں حوصلہ نہ تھا کہ تن تنہا اس کھنڈر میں داخل ہو جاتا۔ میں نے اپنا بوجھ زمین پر منتقل کیا اور بلند محراب سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ بجلی کی چمک اب قدرے دیرپا ہوتی چلی جا رہی تھی۔ روشنی پھیلتی تو سرائے کا ہیولٰے ازمنہ وسطےٰ کے کسی مشرقی شہر کی طرح سامنے آتا۔ گنبدوں سے ڈھکی چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیاں، بلند فصیلیں اور ایک وسیع صحن کانٹے دار جھاڑیوں، گھاس پھونس سے اَٹا ہُوا۔ دو خاموش سائے میری طرف بڑھ رہے تھے۔ سید خان اور کنڈکٹر۔

"آؤ۔" سید خان ایک وہم کی طرح قریب سے گزر گیا۔

صدر دروازے میں سے داخل ہو کر ہم سرائے کے دالان میں آ گئے۔ سید خان نے چند بکھری ہوئی سُوکھی جھاڑیاں جمع کر کے انہیں دیا سلائی دکھا دی اور سرائے کے دُھندلے نقوش روشن ہو کر جھلملانے لگے۔ اس دوران کنڈکٹر سامان رکھ کر ایک

جھاڑو کی مدد سے دالان کا درمیانی حصّہ صاف کرنے میں مشغول ہو گیا۔ اکثر کوٹھڑیوں کی چھتیں ڈھے چکی تھیں اور ان کے گنبد شکستہ پیالیوں کی طرح اوندھے پڑے تھے۔

جھاڑیوں کا الاؤ جس شتابی سے روشن ہُوا تھا، اسی تیزی سے یکدم مدھم پڑنے لگا۔ سید خان اسی اثنا میں ایک لالٹین جلا کر دالان کے درمیان ایک اینٹ پر جما چکا تھا۔ الاؤ کے بجھنے کے بعد بھی جھاڑیاں خاصی دیر تک جگنوؤں کے ایک جمگھٹے کی طرح اٹک اٹک کر دمکتی رہیں اور پھر بالکل مدھم ہو کر راکھ میں بدل گئیں۔ میں نے رُک سیک کھول کر سلیپنگ بیگ کھولا اور اسے لالٹین کے قریب بچھا کر دراز ہو گیا۔ سرائے کی ماتمی تاریکی سے اُوپر آسمان میں چھدرے ستارے کسی عرب حمام کی چھت میں جڑے چمکدار پتھروں کی طرح جگمگا رہے تھے۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا جس میں نمی کی خوشبو تھی اور میرے چہرے پر راکھ کی ایک تہہ جم گئی۔

کنڈکٹر نے صدر دروازے کے قریب دو اینٹوں پر ایک دیگچی رکھی اور آگ جلا کر گوشت کو دم پخت کرنے لگا۔ یہ گوشت غالباً خانہ بدوشوں سے خرید کیا گیا تھا۔ سید خان اچھی طرح جانتا تھا کہ ہم آج شب ہرات نہیں پہنچ پائیں گے۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں نے دونوں حضرات کو نہایت تیز کافی تیار کر کے پلائی۔

"سید خان! اس خانہ خراب میں شاید ہم پہلے مسافر ہیں جو کئی صدیوں کے بعد یہاں رات گزارنے آ نکلے ہیں۔" میں نے جسم میں اُترتی کافی کی حدّت اور گرد پھیلی خوشگوار خنکی کا مزا لیتے ہوئے پُوچھا۔

"نہیں برادر، ہم تو تیسرے چوتھے ہفتے اِدھر ہی ہوتا ہے۔ خاص کر جب ہم کوچی خانہ بدوشوں کے لئے کابل سے لالٹین، نمک، سُوئی دھاگہ وغیرہ لاتا ہے تو رات یہیں گزارتا ہے۔ بابا تم صدیوں کی بات کرتا ہے، ابھی ساٹھ ستّر سال بھی نہیں ہُوا جب افغانستان میں بالکل سڑک وغیرہ نہیں تھا۔ تمام کاروبار اُونٹوں کے کاروان سے ہوتا تھا۔ ہمارے دادا کا ایک بھائی جو اب بھی بامیان کے قریب ایک پہاڑی قصبے میں

کھیتی باڑی کرتا ہے اسی کاروان سرائے میں ٹھہرا کرتا تھا۔ ان دنوں ملکوں کے درمیان سرحدیں صرف نقشوں پر تھیں ورنہ تبریز سے تاشقند جانے کے لئے پاسپورٹ کی بجائے صرف اُونٹ درکار ہوتا تھا۔"

بجلی اس مرتبہ خاصی شدت سے چمکی اور اس کا دمکتا غبار دیر تک سرائے کی تاریکی میں معلق رہا۔

کنڈکٹر نے چپکے سے اپنی چادر اور چند برتن اُٹھائے اور ایک کوٹھڑی میں غائب ہو گیا۔

"بارش آئے گی۔" سید خان نے فضا میں ایک شکاری کُتے کی طرح سُونگھا۔ "اندر چلیں، کسی بھی کوٹھڑی میں سو جاؤ۔ یہاں رہائش کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔"

میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ "اندر؟ کوٹھڑیوں میں؟ محفوظ ہیں ناں؟"

سید خان نے ایک ہچکی لی اور پورے دن کا ذخیرہ شدہ قہقہہ فضا میں انڈیل دیا۔ "اتنے ڈرپوک ہو تو سفر کیوں کرتے ہو؟ کوٹھڑی پر اگر چھت قائم ہے تو محفوظ ہے... البتہ چوہے ہوں گے۔" اُس نے لالٹین اُٹھائی اور اپنا بستر سمیٹ کر اسی طرح قہقہے لگاتا ہوا دالان عبور کرنے لگا۔

میں نے ماچس جلا کر چند کوٹھڑیوں میں جھانکا۔ اکثر کی چھت آسمان تھا۔ بہرحال ایک نسبتاً خوش حال کوٹھڑی تلاش کرنے کے بعد میں نے اس کا فرش صاف کیا اور سلیپنگ بیگ بچھا کر لیٹ گیا۔ اگرچہ باہر اب بھی تاریکی تھی مگر کوٹھڑی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے کے باعث آہستہ آہستہ دالان کی شکل واضح ہونے لگی۔ بجلی وقفوں کے ساتھ باقاعدگی سے چمکنے لگی اور دُور سے آتی گرج کی گھٹی گھٹی آواز اب قدرے کھُل کر بات کرنے لگی۔

قندھار میں رت جگے اور تھکاوٹ کے باوجود میرے پپوٹے لوہے کی مانند بھاری نہیں ہو رہے تھے بلکہ پروں کی مانند تھے، ہلکے اور کھُلے ہوئے۔ متعدد پلسیٹے مارنے کے

بعد مجھے یقین ہو گیا کہ نیند ابھی نہیں آئے گی۔ چنانچہ میں نے سگریٹوں کا پیکٹ جیب میں ٹھونسا اور باہر آ گیا۔ سید خان کے مسکن میں تاریکی تھی۔ لالٹین بجھ چکی تھی سگریٹ سُلگا کر میں صدر دروازے سے باہر آیا اور اس کی منقش اینٹوں سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

میرے سامنے وسیع میدان تھا جس کے کنارے دشتِ مرگ سے ملتے تھے۔ اگرچہ اندھیرا تھا مگر اندھیرے کی بھی ایک اپنی مٹیالی سی روشنی ہوتی ہے جو بتدریج آنکھوں کو گم شدہ شبیہوں سے رُوشناس کرواتی چلی جاتی ہے۔ یکدم میرے سامنے بیکراں وسعتیں چمکیں جیسے دِیے کی لَو تیز ہوا کے تھپیڑے کے فوراً بعد لرز کر یکایک بھڑکتی ہے اور پھر ایسے ہوا کہ کائنات کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک ایک اندھا کر دینے والی چمکیلی نیلاہٹ پھیل گئی۔ میدان اور پہاڑی سلسلے ایک لمحے کے لئے سامنے آئے، ایک لمحے کے لئے تاریکی کے اس پردے کو اُتارا جس میں وہ رُوپوش تھے۔ اور ان کے سینے پر بکھرے پتھر، پودے، جھاڑیاں، کنکر سب نیلے ہو گئے۔ بجلی مسلسل ایک بھُوکے درندے کی طرح اُفق پر غرا رہی تھی۔ دُور کہیں بھڑکتی اور پھر ایک آتشیں گیند کی طرح کمتی ہوئی پورے آسمان پر پھیل جاتی۔ کچھ دیر پہلے تک تو وہ ایک حیادار خاتون کی طرح اپنے حسُن کی پرچھائیاں کبھی کبھار ہی زمین پر ڈالتی تھی مگر اب وہ ایک کسبی کی مانند برہنہ ہو کر سامنے آ رہی تھی۔ ایک ہولناک گرج میرے کانوں میں تھی، آسمان جیسے کانپنے لگا ہو، پھر ایک نیلا شعلہ زمین کی جانب آہنی قوت کے ساتھ لپکا۔ میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ کاروان سرائے ایک نیلے نیگیٹو کی مانند دکھائی دے رہی تھی اور پھر خاموشی کے عمیق کفن میں جیسے کسی نے ڈبکی لگائی ہو، بارش کا پہلا قطرہ... چند ڈبکیوں کی بُڑبُڑاہٹ کے بعد موٹے موٹے قطرے زمین پر پڑنے لگے اور بے آواز ریت میں جذب ہوتے گئے۔

ابھی باقاعدہ بارش شروع نہیں ہوئی تھی البتہ مجھ سے دُور افق کے اُس حصے تلے جو طوفان کا مرکز تھا، بے پناہ بارش ہو رہی تھی اور اس کا دبا دبا شور لہروں میں پوشیدہ کسی آبشار کی طرح مسلسل مجھ تک پہنچ رہا تھا۔ آسمان کے مختلف حصے اتنی دہشت اتنی

باقاعدگی سے چمک رہے تھے جیسے ایک دوسرے کے مقابلے پر اُتر آئے ہوں۔ بجلی کے لپکتے کوندے آسمان کو یوں چیرتے جیسے جگر گوشے کے دفن ہونے پر جگر کٹتا چلا جاتا ہے۔ میدان اور پہاڑ بار بار نیلے شعلے کی زد میں آتے اور پھر خنک تاریکی میں ڈوب جاتے۔ بھاری بارش یکدم ایک شکستہ چھت کی طرح زمین پر آگری۔ میں اُس کی زد سے محفوظ ہونے کی خاطر صدر دروازے کے عین نیچے آ کھڑا ہُوا۔ کچھ دیر بعد مجھے اپنے گرد ہلکی ہلکی آہٹیں سُنائی دیں جیسے کوئی چپکے چپکے نیند میں چل رہا ہو، جیسے درجنوں بالشتیے میرے آس پاس سے گزُر رہے ہوں۔ پہلے تو میں اسے واہمہ سمجھا مگر پھر کبھی کبھار میرے پاؤں سے کوئی لڑھکتا ہُوا چھوٹا سا جسم چھُو جاتا۔ یہ وہ جانور تھے جو بارش سے بچنے کے لئے کاروان سرائے میں پناہ لینے کی خاطر رینگتے چلے آ رہے تھے، بالکل میری طرح۔ قدرے تہذیب یافتہ مگر ایک جانور جو آج کی رات کے لئے اس سرائے کی پناہ میں تھا۔ رات گئے میں اپنی پناہ گاہ کو لَوٹا اور موت کے عارضی ذائقے سے رُوشناس ہُوا، سو گیا۔

ٹیلے سے اُترتے ہوئے میں نے ہمیشہ کی طرح پیچھے مُڑ کر دیکھا تو کاروان سرائے اس دُنیا کی طرح دکھائی دی جسے میں نے چھوڑ جانا تھا۔ اسرار کی ہلکی دُھند میں شکستگی کے باوجود دلآویز اور بدن کو کھینچنے والی۔ میرا ہر قدم زندگی کی طرح مجھ میں اور دُنیا کی اُس سرائے کے درمیان جدائی کی منزل قریب تر لاتا گیا۔ ہموار میدان تک پہنچتے پہنچتے وہ میری نظروں سے رُوپوش ہو گئی، دُھند میں تحلیل ہو گئی۔ میرا اور اُس کا رشتہ ہمیشہ کے لئے منقطع ہو گیا اور اُس عمارت کے لئے میرا وجود اس کائنات میں ختم ہو گیا۔

میرے گرد میدان کی سطح پر گہری دُھند سلو موشن میں آہستہ آہستہ اُبل رہی تھی۔ دُھند کے اس سفید کفن میں سے سوگوار کے آنسوؤں کی طرح بارش ابھی تک سرائت کر رہی تھی۔ سید خان اور کنڈکٹر شاید بس تک پہنچ چکے تھے کیونکہ ہارن کی مسلسل آواز بارش کے ہلکے شور میں مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ سرد ملکوں میں تو دُھند ایک آسیب کی طرح ذہن پر مسلّط

ہو جاتی ہے مگر ایک نیم صحرائی خطے میں اس کا ظہور بے حد دلکش ہوتا ہے۔ پودے، جھاڑیاں، پتھر یوں دکھائی دیتے ہیں جیسے کسی بچے نے انہیں باریک ململ میں لپیٹ کر اِدھر اُدھر بکھیر دیا ہو۔ میں احتیاط سے قدم رکھتا ہُوا چلتا رہا۔ "اے فاگی ڈے اِن لنڈن ٹاؤن" کی بجائے "اے فاگی ڈے ان افغانستان"۔ ہارن کی آواز نسبتاً صاف سنائی دی تو بس کا پیکر بھی دُھند میں سے اُبھرا اور زیرِ آب پڑے کسی جہاز کے ڈھانچے کی طرح دکھائی دینے لگا۔

کسی من چاہے چہرے کا پرتو کب تک یوں سامنے آتا رہتا ہے جیسے وہ سامنے ہو، صرف چند برسوں کے لئے۔ پہلے بدن کا لمس ساتھ چھوڑتا ہے پھر آواز معدوم ہوتی چلی جاتی ہے۔ کچھ عرصے بعد آنکھیں بھُولتی ہیں مگر مسکراہٹ بہت دیر تک ساتھ دیتی ہے اور ایک روز وہ بجھتی لَو کی طرح تھرتھراتی ہوئی تاریک ہو جاتی ہے۔ میں نے آخری بار کاروان سرائے کی جانب دیکھا تو میں بھُولنے کے یہ تمام مراحل طے کر چکا تھا۔ سرائے کی مسکراہٹ بھی دُھند کے پردے میں چھُپ چکی تھی۔ تم ایک بستی کو، ایک لڑکی کو تو نہیں چھوڑتے بلکہ وہ بستی وہ چہرہ تمہیں چھوڑ دیتا ہے کہ تمہاری عدم موجودگی میں بھی ان کا وجود برقرار رہتا ہے۔ یوں ایک دُھند آلود صبح میں افغانستان کے صحراؤں میں پنہاں جانے کہاں اُس کاروان سرائے نے مجھے چھوڑ دیا۔

:•▬▬▬▬▬•:

سُنہری کُونج

خراسانی دوپہر کی سفید تمازت ہمارے چار چفیرے پھیلے چٹیل میدان اور خشک پہاڑیوں پر بڑی خاموشی سے پگھل رہی تھی۔ پسینے کے قطرے چیونٹیوں کے ایک ریوڑ کی طرح میری بنیان کے نیچے رینگتے ہوئے جین کے کھردرے کپڑے میں جذب ہو رہے تھے۔ آنکھیں کھلی رکھنا محال ہو رہا تھا کہ ماتھے کی ٹپکتی چھت سے پسینہ ٹپ ٹپ ان میں گر رہا تھا۔ کارواں سرائے، دھند آلود صحرائی صبح اور ہلکی ہلکی بارش کا تصوّر، ہولناک گرمی کے بخارات میں تحلیل ہو چکا تھا۔ جانے کون سے زمانوں کی کہانی تھی۔ کن خطوں میں اس عمارت کا وجود تھا جس کی قدیم چھت نے مجھے پچھلی شب اپنی پناہ میں لے لیا تھا۔ میں نے سر اٹھا کر تپتی ہوئی ونڈ سکرین کے پار دیکھا۔ دور خالی سڑک پر بیابان کے خلا میں دو پیکر پیٹھوں پر رُک سیک اٹھائے گرمی کے بوجھ تلے تُوستے ہوئے قدم گھسیٹ رہے تھے۔ بس کی آواز سُن کر ان کے جھکے ہوئے جسم ایک دم سیدھے ہو گئے جیسے کسی خاموش جنگل میں ایک شاخ کے ٹوٹنے کی آواز جانوروں کو ہوشیار کر دیتی ہے۔ انہوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور پھر سڑک کے درمیان میں کھڑے ہو کر آؤٹ آف کنٹرول پتلیوں کی طرح بے تحاشا ہاتھ ہلانے لگے۔ سید خان نے قریب جا کر بریک پر پاؤں رکھ دیا۔

نیکر اور بنیان پہنے ہوئے ایک چھریرا سا زرد رُو لڑکا چندھیائی ہوئی آنکھوں سے ہماری جانب دیکھ رہا تھا۔ اس کی ساتھی لڑکی نیلی جیکٹ اور جین میں پھنسی ہوئی تھی۔ بار بار سانس روک کر کبڑی سی ہوتی اور جیکٹ کے کھلے بٹنوں میں رومال گھسیڑ کر سینے پر رواں پسینہ پونچھنے لگتی۔ اس کا بدن خراسانی دوپہر کی سفید تمازت کا ایک حصہ دکھائی دیا۔

"ہی رات ۔ ہی رات ۔ ۔ ۔" زرد رُو نوجوان نے اطمینان سے بس کے اندر قدم رکھتے ہوئے کہا مگر فوراً ہی ایک ہلکے سے دھکے نے اسے پسپائی پر مجبور کر دیا۔

"فرسٹ ۔ ٹو ہنڈرڈ افغانی ۔ ۔ ۔" کنڈکٹر نے بند مٹھی کھول کر مطالبہ کیا۔

چھریرے نوجوان نے نیکر کی جیب میں سے چند بوسیدہ اور پسینے سے بھیگے ہوئے نوٹ نکالے ۔ لڑکی نے بھی ان تمام جیبوں کی تلاشی لی جو اُس کے بدن نے اگرچہ بھر رکھی تھیں مگر ویسے خالی تھیں ۔

"ون ہنڈرڈ ۔ ۔ ۔" لڑکے نے کل پونجی اپنے راستے میں حائل شنا ئیلاک کی ہتھیلی پر رکھ کر لجاجت سے کہا۔ "باقی رقم ہرات پہنچ کر ۔ ۔ ۔"

وہ اتنا سہما ہوا تھا کہ بقیہ سو افغانیوں کے عوض وہ باقاعدہ کنڈکٹر کا منہ چومنے پر تیار نظر آتا تھا۔ کنڈکٹر نے لڑکی کی طرف دیکھا مگر وہ بالکل تیار نظر نہیں آتی تھی۔ چنانچہ اس نے ہتھیلی پر رکھے نوٹ نفرت سے اُن کے منہ پر دے مارے اور سید خاں نے فی الفور بریک پر سے پاؤں اُٹھا لیا۔ بس حرکت میں آگئی۔ ہپی جوڑا "ہے ہے، م، سنو سنو" کا شور مچاتا بس کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگا۔

میں نے کنڈکٹر سے کہا "بھلے آدمی ان غریبوں کو اس ویرانے کے دہکتے ہوئے تندور میں تو نہ چھوڑو، بٹھا لو، بقیہ رقم ہرات پہنچ کر وصول کر لینا۔"

"بابا وہاں جا کر بولے گا خلاص، پیسہ نہیں ۔ ہم ان ہپی خانہ خراب کو جانتا ہے ہمیشہ ایسا کرتا ہے۔"

"بٹھاؤ ان سؤر کے بچوں کو ۔ ۔ ۔" سید خاں جانے کیوں موم ہو گیا اور ایک دم بس روک دی۔

وہ دونوں گرتے پڑتے پہنچ تو گئے مگر بس میں سوار ہونے کی بجائے باہر کھڑے بُولی کتّوں کی طرح ہانپنے لگے۔

جین سوٹ میں پیک شدہ لڑکی نے بمشکل سانس درست کیا اور مجھ سے مخاطب

ہو کر نہایت عاجزی سے کہا۔ "سپیک انگلش ؟ ۔ ۔ ۔ اچھا تو پھر پلیز ہمیں سو افغانی ادھار دے دو، ہرات پہنچتے ہی لوٹا دیں گے ۔"

"نقد یا جنس میں ؟" میں نے مذاق سے کہا۔

"جس طرح تم پسند کرو ۔" وہ بے تابی سے بولی ۔

میں نے جھینپتے ہوئے ہامی بھر لی ۔ وہ دونوں خوفزدہ بھیڑوں کی شکلیں بنائے جھکتے ہوئے بس میں داخل ہو گئے ۔ سو افغانی کا نوٹ کنڈکٹر کے حوالے کرتے ہوئے میں نے پیچھے مڑ کر لڑکے کی جانب دیکھا جو اس اثنا میں پچھلی نشست پر روئی کی ایک گانٹھ سے ٹیک لگا کر اپنے آپ کو آرام دہ حالت میں استوار کر چکا تھا۔ "بقیہ سو افغانی ؟"

"ضرور ۔ ضرور ۔" اُس نے فوراً اُٹھ کر رقم ادا کر دی ۔ وہ اس خیال میں تھا کہ شاید میں اس کی ہم سفر لڑکی کے جُثے کی آنچ سے پگھل کر پورا کرایہ ادا کر چکا ہوں کہ وہ ننگی لباس کا شاکی بدن اب میرے پہلو میں بیٹھ چکا تھا۔

بس سٹارٹ ہوئی تو لڑکے نے اپنے رُک سیک میں سے ایک بنسری برآمد کر کے اُسے لبوں سے لگا لیا اور ایک نہایت اٹکتی اٹکتی بے کیف دُھن بجانے لگا۔

"ایک بنڈل شکریوں کا ۔" وہ حسب معمول ماتھے کی بجائے شانوں سے نیچے بلند ہونے والی سطح میں سے پسینہ پونچھتے ہوئے بولی ۔ اس کا گٹھا ہوا جسم بالکل غیر متحرک تھا، ساکن اور گونگا، جیسے لکڑی کے کسی متناسب مجسمے پر جین اور جیکٹ فٹ کر دی گئی ہو، شوکیس میں ایستادہ بے جان ڈمی ۔ "تم ہماری مدد کو نہ آتے تو جانے رات تک ہمارا کیا حشر ہو جاتا ۔ پچھلے برس دو امریکی بھائی جو خچروں پر سفر کر رہے تھے، اسی علاقے میں افغان ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ گئے، اُن میں سے ایک کو ہلاک کر دیا گیا تھا ۔"

"ایک خچر کو ؟"

"ایک خچر کو بھی ۔ سگرٹ ہو گا ؟"

سگرٹ سُلگا کر اس نے اتنا لمبا کش لگایا کہ سارا دُھواں اس کے بدن کے

اندر ہی کہیں تحلیل ہو گیا۔ کھلے مُنہ سے صرف گرم سانس بر آمد ہُوا۔
ٹوں... ٹوں... ٹیں... ٹاں... ہیری کی بنسری کے سوراخوں میں شاید دھول جمی ہوتی تھی۔ بے حد بے سُری اور پھنسی پھنسی آوازیں آ رہی تھیں۔
''ہیری! تم اس کے علاوہ اور کوئی دھن نہیں بجا سکتے؟'' اُس نے پیچھے دیکھے بغیر اپنے ساتھی کو ڈانٹ پلائی۔ ''ہیری نے یہ دھن نیپال کے ایک چرواہے سے سیکھی تھی۔ کہتا ہے اس کے بجانے سے مجھے شانتی ملتی ہے مگر میں تو اسے بار بار سن کر یہاں تک...'' اس نے اپنے ٹھوس ابھاروں پر ہتھیلی سلیوٹ کرنے کے انداز میں جما کر کہا۔ ''یہاں تک فیڈ اپ ہو چکی ہوں۔''
ہیری بدستور وہی دھن بجاتا رہا۔
''ہم دونوں آج صبح قندھار سے روانہ ہوئے تھے...''
''پیدل؟'' میں نے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔
''اوہ نہیں، قادری بس سروس سے... سفر کے دوران ہیری کی ٹمی اپ سیٹ ہو گئی۔ یہ افغان فوڈ ناں... ڈائیریا کے جراثیم کلبلاتے ہیں اس میں۔ ہر دس پندرہ منٹ کے بعد ہیری کے اندر اتھل پتھل شروع ہو جاتی اور وہ پیٹ دباتے ہوئے شور مچا دیتا کہ فوراً بس روک لو ورنہ میں یہیں سب کے سامنے بیٹھ جاؤں گا... بقیہ مسافر تو اس حال دہائی سے بے حد لطف اندوز ہو رہے تھے کہ سفر کاٹنے کے لئے اچھا تماشا مل گیا مگر ڈرائیور تو یہاں تک...'' اس نے ایک مرتبہ پھر کراٹے کا وار کرنے کے انداز میں ہتھیلی سینے پر جمائی۔ ''فیڈ اپ ہو گیا۔ جہاں سے تم نے ہمیں پک کیا ہے وہاں سے تقریباً دو میل پیچھے ہیری کے معدے میں پھر دھینگا مشتی شروع ہو گئی... قندھار سے روانہ ہونے کے بعد یہ تقریباً بارہویں ایمرجنسی تھی، مگر اس مرتبہ تو ڈرائیور نے بس روکنے سے سو فی صد انکار کر دیا۔ قریب تھا کہ ہیری مجبوراً وہیں فرش پر بیٹھ جاتا مگر خاتون مسافروں کے اصرار پر بس روک دی گئی۔ نیکر پر ہاتھ رکھے یہ ڈارلنگ لڑکا کود کر باہر نکلا اور سرپٹ بھاگتا ہُوا ایک قریبی

جھاڑی کے پیچھے روپوش ہو گیا اور کیا تم خیال بھی کر سکتے ہو کہ اُس افغان باسٹرڈ نے کیا کیا؟ نہیں کر سکتے۔ اُس نے بس چلا دی۔ میں نے بہتیرا شور مچایا کہ ہم مفت میں سفر نہیں کر رہے، ٹکٹ خرید کر سوار ہوئے ہیں مگر وہ کم بخت یہی کہتا رہا کہ ہمیں بس کی بجائے کسی ٹائلٹ میں سفر کرنا چاہیئے تھا۔ اب ہیری کوئی برا انسان بھی نہیں کہ میں اسے اس گاڈ فار سیکن صحرا میں ایک جھاڑی کے پیچھے معصومیت سے بیٹھا چھوڑ کر چلی جاتی۔ چنانچہ میں نے اپنے رُک سیک سنبھالے اور بس رکوا کر خود بھی اتر گئی۔ واپس اس مقام پر آئی تو ہیری ابھی تک مزے سے وہیں بیٹھا راحت محسوس کر رہا تھا، اسے بس کے چلے جانے کی خبر تک نہ تھی... بہر حال اب ہم پچھلے دو گھنٹوں سے پیدل چل رہے تھے کہ یہ بس آ گئی۔''
''ہیری...'' اُس نے پیچھے مڑ کر اس سفید فام کرشن کو دیکھا جو آنکھیں نیم وا کئے بنسری بجاتے جا رہا تھا۔ ''تمہیں اب تو کچھ... کچھ محسوس تو نہیں ہو رہا؟''
''یہاں کچھ باقی ہی نہیں جو باہر آ سکے۔'' وہ لاپروائی سے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ہنسا۔ ''تم فکر نہ کرو سویٹ ہارٹ۔''
''اور ہم کوئی گداگر قسم کے ٹورسٹ بھی نہیں ہیں۔'' سویٹ ہارٹ نے کنڈکٹر کی طرف قہر آلود نظر ڈالتے ہوئے ناک چڑھائی ''ٹکٹوں کے علاوہ ہمارے پاس راستے کی خوراک کے لئے سو افغانی بھی تھے، خیال تھا کہ ہرات پہنچ کر ٹریولرز چیک بھنوا لیں گے مگر وہ باسٹرڈ ڈرائیور... خیر... ایک مرتبہ پھر بہت بہت شکریہ۔''
''ویسے تم اس گاڈ فار سیکن صحرا میں چلتے چلتے فیڈ اپ نہیں ہوئیں؟''
''ہوئی۔''
''کہاں تک؟''
''یہاں تک...'' اُس نے کراٹے کی کھلی ہتھیلی اپنے چوبی سینے پر جما دی اور پھر میری طرف دیکھ کر یکدم ہنس دی۔

دریائے ہری رود کے اُس کنارے خراسان کی تپتی دوپہر تھی۔ اِس پار ہوئے
کہیں پیچھے رہ گئی۔ ایک خفیف سا جھونکا گرمی کے جھلستے سرابوں میں تیر گیا۔ پھر چیڑ کی
خوشبو، جیسے گرمیوں کی اندھیری شب میں مائلِ پرواز پرندوں کی ہلکی سرسراہٹ سنائی دے
ہے اور گذشتہ چاہتوں کا نم بوسہ بدن کو چھوتا ہے۔ ہمارے سامنے چیڑ کے درختوں کے
سبز غار میں ایک طویل سڑک تھی جس کے دونوں طرف سبزہ تھا، باغ تھے، یخ پانیوں
والی چھوٹی چھوٹی ندیاں تھیں۔ بس صحرا نہ تھا۔ تیمور کے قہر، شاہ رخ اور گوہر شاد کے
مہر کا شہر، ہرات!

ہم ایک ایسے بازار کے بیچ میں سے گزرے جسے میں جانتا تھا، ہراتی پوستینوں اور
قالینوں کا قدیم بازار، اور ایک ایسے ہوٹل کے سامنے جا رُکے جو مجھ سے آشنا تھا، ہوٹل
بہزاد۔ میں نے بس کی چھت پر چڑھ کر اپنا رُک سیک اور بیگ ردی کی گانٹھوں میں سے
دریافت کیا اور نیچے اتر کر بس کے اندر جھانکا۔

"کم عقل اُدھار دیتے ہیں اور احمق اُس کی واپسی کی امید رکھتے ہیں۔" سید خاں
نے دانائی سے سر ہلایا۔ "تم اپنے سو افغانی ڈھونڈ رہے ہو ناں؟ وہ تو بس کے رکتے ہی
غائب ہو گئے۔"

"سید خاں صرف ایک سو افغانی کی حقیر رقم کی خاطر تم نسلِ انسانی پر میرا ایمان متزلزل
نہیں کر سکتے۔ بہرحال صرف ایک دن کے سفر کو تین روز تک طول دینے کے لئے میں تمہارا
بھی شکر گزار ہوں۔" میں نے سید خاں کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو تھاما تو اس کے پُرجوش
دباؤ تلے پچھلے تین دنوں کی سرد مہری تحلیل ہو گئی۔ میں نے رُک سیک کاندھے پر ڈالا اور
ہوٹل بہزاد کے کھلے دروازے میں سے اندر داخل ہو گیا۔

ڈیسک پر ایک نوجوان لڑکا اخبار پڑھ رہا تھا۔ اس نے قدرے لاپرواہی سے
میرا پاسپورٹ جمع کر کے رجسٹر پر اندراج کر لیا۔ "کمرہ نمبر چار۔"
"چابی؟"

"ڈبل بیڈ کا ہے۔ آپ اسے ایک پاکستانی برادر کے ساتھ شیئر کر لیجئے۔ وہ اس وقت
کمرے میں موجود ہیں۔"

میں سیڑھیوں کی جانب بڑھا تو میری نظر دیوار پر نصب ہوٹل کے نوٹس بورڈ پر
پڑی۔ ہرات کے سیاحتی کتابچوں، تصویروں اور شہر کے نقشوں کے درمیان صادقین
کی تخلیق کردہ ایک تصویر بھی چسپاں تھی۔ ببول کے خاردار ہاتھ چاند کو چھونے کی جستجو میں
اور ان کے درمیان ایک ایسا چہرہ جس کی تلاش کبھی ختم نہیں ہوتی۔ میری پہلی کتاب
"نکلے تری تلاش میں" کا سرورق۔

"یہ سرورق آپ نے کہاں سے حاصل کیا؟" میں نے ایک عجیب سی کسک محسوس
کرتے ہوئے نوجوان سے دریافت کیا۔

"اوہ یہ ... ایک پاکستانی لڑکا دے گیا تھا۔ کہتا تھا کہ اس سفرنامے میں شامل
"ہرائے" کا باب اسی ہوٹل کے ایک کمرے میں لکھا گیا تھا۔ ہم نے اسے پبلسٹی کے طور پہ
لگا رکھا ہے۔ آپ بھی تو پاکستانی ہیں، اس کے مصنف کو جانتے ہیں؟"

"وہ ادیب ہے، شہرت کا بھوکا، اور میں ایک آوارہ گرد، گمنامی کا متلاشی...
میں اُسے کیسے جان سکتا ہوں۔" میں اداس ہو کر بولا۔

"سیڑھیوں کے خاتمے پر دائیں ہاتھ پر آمدے میں..."

"میں راستے سے واقف ہوں۔" میں نے تیزی سے کہا اور سیڑھیاں طے کرنے لگا۔

کمرہ بھی وہی تھا جس میں مَیں اور علی ٹھہرے تھے۔ صرف ایک فرق کے ساتھ کہ اب
کرسی پر علی کی بجائے ایک پاکستانی صاحب سلیپنگ سوٹ پر باقاعدہ ڈریسنگ گاؤن
پہنے تشریف فرما تھے۔ میرا موڈ آف ہو گیا۔ جانے کیا چیز ہیں! ایک واجبی سا "ہیلو" بڑبڑا کر
میں نے رُک سیک خالی بستر پر رکھا اور دھول سے دھولیں اڑاتے جین سوٹ کو اتارنے
کے بعد بنیان اور انڈرویئر میں ہی لیٹ گیا۔ وہ صاحب اس کھلی بے حیائی کی تاب نہ
لا سکے اور فوراً ایک انگریزی رسالے کی اوٹ ہو گئے۔

پچھلے پہر جب میری آنکھ کھلی تو اُن صاحب کو ایک سیاہ سوٹ ڈانٹے آئینے کے
سامنے جھکے ٹائی کی گرہ کو اتھل پتھل کرتے پایا۔ میرا شک درست ثابت ہوا تھا۔ موصوف
ایک "تہذیب یافتہ" انسان تھے۔ سفر کے دوران میں استری شدہ کپڑوں میں ملبوس اور
آفٹر شیو سے مہکتے ہوئے حضرات سے بے حد بدکتا ہوں۔ ایسے لوگ جن کے ماتھے پر
پسینہ نہ چمکے، جن کے پیراہنوں پر سفر کی دھول نہ ہو وہ مجھ میں سے نہیں ہیں۔

"آپ اگر پاکستان سے ہیں تو ہم بھی پاکستان سے ہی ہیں۔" وہ آئینے سے چہکے۔

"جی۔" میں اخلاقاً اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ "کہاں کا ارادہ ہے؟"

"چائے وائے پینے جا رہے ہیں، چار بجنے کو ہیں۔" وہ کسی اشتہاری ماڈل کی طرح
اپنی گھڑی کی نمائش کرتے ہوئے چہکے۔

"میرا مطلب ہے کس سمت میں سفر کا ارادہ ہے؟"

"ہم تو پیرس جا رہے ہیں اور آپ؟"

"ہم لبنان جا رہے ہیں۔"

"لبنان؟ لیکن صاحب وہاں تو ان دنوں سخت گڑبڑ ہے، خانہ جنگی وغیرہ۔"

"اللہ مالک ہے۔" سید خاں کا تکیہ کلام کام آگیا۔

مزید گفتگو کے دوران کھلا کہ جاوید صاحب کسی سرکاری محکمے میں اچھے خاصے افسر
ہیں۔ ریٹائرمنٹ سے پیشتر کی چھٹی پر یورپ جانے کی سوجھی۔ کسی نے پٹی پڑھائی کہ خشکی کے
راستے سدھاریئے، خرچ کم اٹھے گا اور سیر بھی ہو جائے گی۔ اب اپنی قسمت کو رو رہے تھے
کہ صاحب ہم تو پھنس گئے۔ خدا دشمن کو بھی افغانستان نہ دکھائے۔ ہر طرف اللہ مارے صحرا
موئے چٹیل میدان اور پٹھان ہی پٹھان۔ نہ ہوٹل کام کے نہ خوراک، ڈبل روٹی تک نہیں
ملتی نرم والی۔ ہم تو تہران پہنچتے ہی ڈائریکٹ فلائٹ لیں گے انشاء اللہ۔"

میں نے ہرات کے بارے میں تاثرات دریافت کیے۔

"ہرات؟ بیہودہ شہر... صاحب شہر کہاں قصبہ ہے بدو ملہی ٹائپ کا... آج صبح

اِدھر اُدھر گھومتا رہا، ایک بھی کام کی عمارت نظر نہیں آتی یعنی جدید قسم کے سکائی سکریپر وغیرہ
شیشے کی کھڑکیوں والے..."

انہیں گلہ تھا کہ شہر بہزاد کی اس مختصر تصویر میں ابھی تک قدیم رنگتیں کیوں چمکتی ہیں؛
ان کی جگہ آنکھوں کو چبھنے والے سائیکاڈیلک رنگ کیوں نہیں لگائے گئے۔

"آپ اگر ملکہ گوہر شاد کے مقبرے کا نیلا گنبد دیکھ لیں تو...؟"

"ہاں وہ بھی دیکھا... ٹوٹا ہوا تھا۔"

"اور بیچارہ مدرسے کے وہ مینار جو شہر سے باہر زرّافوں کی طرح گردنیں اٹھائے
کھڑے ہیں؟"

"وہ بھی دیکھے مگر صاحب ان کے تو سر کٹے ہوتے ہیں، بلکہ سچ پوچھیے تو مجھے کچھ فحش
لگے... بہرحال اپنا ٹیسٹ نہیں ان کھنڈروں وغیرہ کے لئے... خیر یہ فرمایئے کہ یہاں
شاپنگ کس قسم کی ہو سکتی ہے، یعنی ہرات کی کوئی سوغات وغیرہ؟"

"ہراتی پوستین۔"

"ایک وہ بھی سونگھی تھی، بکرے کی بو آ رہی تھی۔"

"پوستین سونگھنے کی نہیں، پہننے کی چیز ہے۔" میں نے جھلّا کر کہا۔ "اور پھر بکرے کی
کھال سے بنی ہوئی پوستین میں بکرے کی بو ہی آئے گی، اُلّو کی تو نہیں آئے گی۔"

"یہ بھی درست ہے۔" اُنہوں نے نہایت سنجیدگی سے سر ہلایا۔ "اور کچھ؟"

"لومڑ کی کھال کے کمبل بھی ملتے ہیں، نہایت نرم اور بہت ہی گرم۔"

"لومڑ؟" انہوں نے قدرے ناراضگی سے میری طرف دیکھا۔ "بہرحال اگر چائے
کا موڈ ہو تو...؟"

"شکریہ مگر میں فی الحال آرام کرنا چاہتا ہوں۔"

جاوید صاحب نے کالر پر سے کسی غیر مرئی دھول کے ذرّے کو جھاڑا، پتلون کی
جیبوں میں ہاتھ ٹھونسے اور اکڑے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے، مگر فوراً ہی واپس

آ گئے۔ کن انکھیوں سے میری جانب دیکھا اور پھر اپنے سوٹ کیس میں سے چند قیمتی اشیا نکال کر ساتھ لے گئے۔ میری ہیئت کو دیکھ کر انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ میں اور نیک نیتی ہم سفر نہیں ہو سکتے۔

میں نے پہلو بدل کر ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کی طرف دیکھا۔ آئینہ صاف تھا کوئی ایسا نقش نہ تھا جو خبر کرتا کہ آج سے چھ برس پیشتر جب میں اس کمرے میں آیا تھا تو اس کی سطح پر کسی من چلی سیاح لڑکی نے سرخ لپ سٹک سے "ہوٹل بہزاد" لکھا ہوا تھا مگر لپ سٹک کے یہ سرخ پھول ایک عرصہ تک سفر کی یادوں کے اس شہتیر پر کھِلے رہے جسے بوریت اور تنہائی کے لمحوں میں سوچ کا رندہ آہستہ آہستہ چھیلتا رہتا ہے۔ ایک بھوکے فقیر کی طرح جو روٹی کے ٹکڑے کو دانتوں تلے چبا چبا کر نگلتا ہے کہ کہیں یہ جلدی ختم نہ ہو جائے یوں یادوں کا وہ شہتیر جو سفر کی محبتوں اور اذیتوں اور رعنائیوں کے تن آور درختوں میں سے نکلتا ہے، وقت کے گزرنے سے دھیرے دھیرے برادے میں بدلتا رہتا ہے اور ایک شب ایسی آتی ہے جب سوچ کے رندنے کے لئے کچھ باقی نہیں رہتا اور بے بسی کے سانس برادے کے ڈھیر کو بھی ہواؤں میں بکھیر دیتے ہیں۔ بس اسی شب نارمل ذہن پر دیوانگی سفر پر پھیلا دیتی ہے اور آوارہ گرد ایک نئے شہتیر کے لئے دکھوں کی تلاش میں سفر پر نکل کھڑا ہوتا ہے۔ میرے رُک سیک میں پڑی ڈائری ابھی تک آئینے کی طرح شفاف تھی۔ اس کے کورے صفحوں پر عبارت ہوں گی موسموں کی راحتیں اور شدتیں۔ انجانے بدنوں کی نفرتیں اور محبتیں۔ ان پر سفر کی دھول ہو گی۔ اس کے آخری صفحے پر کیا تحریر ہو گا، اس کی مجھے خبر نہ تھی کہ ڈیلفی کے اوریکل نے مجھے میرا مستقبل بتانے سے انکار کر دیا تھا۔

میں نے رُک سیک میں سے ڈائری نکالی اور پچھلے تین روز کو اس کے منتظر صفحوں پر منتقل کرنے لگا۔ ابھی صرف دو صفحے ہی لکھنے پایا تھا کہ جاوید صاحب دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوتے اور میری کمر پر ایک دھپ لگا کر بولے۔ "آپ بڑے حضت ہیں۔"

ان کی اس بے تکلفی نے مجھے بے حد حیران کیا کہ موصوف باہر تو خاصے سنجیدہ موڈ

میں گئے تھے۔

"میں بڑا حضت ہوں؟" میں نے احمقوں کی طرح کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

"اور کیا؟" وہ دروازے کی جانب آنکھوں سے اشارہ کرتے ہوئے چہکے۔ "آپ کو ایک لونڈیا ملنے آئی ہے۔"

"مجھے؟ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں ہرات میں کسی لونڈیا... میرا مطلب ہے لڑکی وغیرہ کو نہیں جانتا۔"

"باہر کھڑی ہے۔" وہ مسرت سے ہاتھ ملتے ہوئے بولے۔

"آپ کو یقین ہے کہ وہ مجھے ہی ملنا چاہتی ہے؟" میں نے بے یقینی سے پوچھا۔

"موٹی موٹی خوفناک آنکھوں اور گھنگھریالے بالوں والا پاکستانی... یہی کہہ رہی تھی۔"

میں بے دلی سے دروازہ کھول کر باہر جانے لگا تو انہوں نے لپک کر مجھے بنیان سے پکڑ لیا۔ "صاحب یوں ننگ دھڑنگ... پتلون تو زیب تن کر لیجئے۔" میں نے جین پہن کر دروازے میں سے جھانکا، وہی لکڑی کے جسم والی سخت سی لڑکی کولہوں پر ہاتھ دھرے کھڑی تھی۔

"اوہ تھینک گڈنیس تم مل گئے..." وہ کولہوں کو تھپکتی کمرے میں چلی آئی۔ "یہ لو تمہارے سو افغانی... اُس نے تنگ جین میں جانے اپنے آپ کو کیسے مزید تنگ کیا اور جیب میں سے چند نوٹ کھینچ کر میری جانب بڑھا دیئے۔

میں نے انہیں گنے بغیر جیب میں ڈال لیا اور بستر پر بیٹھ گیا۔ "میں انتظار کر سکتا تھا۔"

اس نے جھک کر بستر کے گدے میں انگلی چبھوئی اور میرے برابر بیٹھ گئی۔ "تمہارے ہوٹل میں گدے نہیں ہیں۔"

جاوید صاحب ایک کونے میں کھڑے بڑے معنی خیز انداز میں مسکرا رہے تھے جیسے کہہ رہے ہوں، گویا آپ ہرات میں کسی لونڈیا کو نہیں جانتے... حضت!

"ہاں تو ایسا ہوا کہ بس رُکتے ہی تم اپنا رُک سیک اتارنے کے لئے چھت پر چڑھ گئے

اور اسی وقت ہیری نے شور مچا دیا۔ تمہیں پتہ ہے اس کا پیٹ... مجھے بھی ساتھ جانا پڑا، فارغ ہو کر آئے تو تم وہاں موجود نہ تھے۔ اب تمہاری رقم لوٹانے کی خاطر پچھلے تین گھنٹوں میں دس بارہ ہوٹلوں میں جا کر تمہارے بارے میں دریافت کر چکی ہوں۔ تم اپنا نام تو بتا کر نہیں گئے تھے اس لئے بے حد دقت ہوئی، صرف حلیہ بتا کر...،،

"موٹی موٹی خوفناک آنکھوں...،، جاوید صاحب نے بیتابی سے لقمہ دیا۔

"ہاں۔" وہ کھل کر ہنس دی۔ مجھے بڑے عجیب تجربے ہوتے۔ ایک ہوٹل والا کہنے لگا کہ موٹی موٹی آنکھوں والا صرف پاکستانی چاہیئے یا افغان سے بھی گزارہ ہو سکتا ہے، باسٹرڈ، میں تو ان افغانوں سے فیڈ اپ ہو چکی ہوں...،،

"کہاں تک؟"

"یہاں تک...،، اُس کی ہتھیلی سینے پر جم گئی۔

"ہیری اب کیسا ہے؟"

"سو رہا ہے۔" وہ بیزار ہو کر بولی "بڑے بازار میں ایک افغان نے اسے تقریباً نصف کیلو حشیش صرف دس ڈالر میں سپلائی کر دی۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے تین سگرٹ بھرے، پھونکے اور اب سو رہا ہے۔ سگرٹ ہوں گے؟ نارمل سگرٹ۔"

اتنے میں دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور ڈیسک والا نوجوان اندر آ گیا "مجھے بے حد افسوس ہے مگر کمروں میں خواتین کا داخلہ منع ہے... مردانہ کمروں میں۔"

"یہ خاتون ہماری مہمان ہیں۔" جاوید صاحب نے "ہماری" پر خاصا وزن ڈالتے ہوئے گلوگیر آواز میں کہا۔

"پچھلی مرتبہ جب میں یہاں ٹھہرا تھا تو ایک صاحب نے کمرے میں بکرا پال رکھا تھا، اب خاتون پر بھی پابندی ہے۔"

"تب یہ ہوٹل پرائیویٹ تھا، اب سرکاری تحویل میں ہے...،، اُس نے پُر وقار انداز میں سنجیدگی سے مطلع کیا۔

"ہم ویسے بھی باہر جا رہے تھے۔" میں نے بستر سے جیکٹ اٹھائی اور لڑکی کا بازو تھام لیا۔ بیشک سونی صد لکڑی کا تھا سخت اور کسرتی۔

"لے چلے حضت؟" جاوید صاحب شرارت سے بولے۔

"آپ بھی چلیں۔" میں نے تکلفاً دعوت دے ڈالی۔

آدمی عقلمند تھے، کھانس کر کہنے لگے "ایک وہ قبلہ ہیری ہیں، دوسرے آپ ہیں، بیچ میں ہم بڑے بوڑھے کہاں دھکے کھاتے پھریں گے، آپ ہو آئیے۔"

ہوٹل سے باہر تاریخی عمارتوں کی شکستہ اینٹوں کی پرانی باس تھی، چیڑ کی تازہ خوشبو تھی۔ پوستینوں اور کھالوں کی مخصوص بُو جو کہ ہرات ہے، جو کہ ہرات میں ہونے ــــ اس شہرِ بہزاد میں سانس لینے کا پتہ بتلاتی ہے۔ دکانوں کے باہر خراسانی قالین اور لومڑ کی کھالوں سے بنے ہوئے کوٹ اور کمبل لٹک رہے تھے۔ سیاح لڑکیاں انہیں رخساروں سے رگڑتیں اور پھر قیمت پوچھ کر کندھے سکیڑتی ہوئی آگے بڑھ جاتیں۔ بڑے بازار کی یہ دکانیں اب پہلے کی نسبت قدرے جدید ہو چلی تھیں کہ ان میں سے چند ایک کے ماتھے شیشے کے شوکیسوں سے سجے ہوئے تھے۔ میں بے اختیار اس دکان کے اندر چلا گیا جہاں سے میں نے چھ برس پہلے ایک ایسی پوستین خریدی تھی جس نے طویل سفروں میں ایک ذی روح رفیق کی مانند میرا ساتھ دیا تھا۔ دکان کا ان دنوں کا نوجوان اور اب جوان مالک ایک جرمن لڑکی کا گورا چِٹا پاؤں گود میں رکھے اس پر ایک فل بوٹ مڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

بوٹ فٹ کر کے اس نے چمڑے پر پیار سے ہاتھ پھیرا "سو فی صد اونٹ کا چمڑا، بیس ڈالر۔" اس کا سرکتا ہاتھ جب حیوانی کی بجائے انسانی چمڑے تک آیا تو لڑکی فوراً اٹھ کھڑی ہوئی "بہت مہنگا ہے۔" اور پاؤں پٹخ کر دکان سے نکل گئی۔

"ہاہا۔ بہت سالوں کی بات ہے مگر مجھے یاد ہے، تم نے مجھ سے ایک پوستین خریدی تھی۔" مجھے دیکھ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور کندھے پر ہاتھ رکھ کر بے حد محبت سے بولا "کیسی تھی؟

"وہ جرمن لڑکی؟... غصیلی ہوتی ہیں۔"

"نہیں"۔ اس کے آریائی نقوش ہنسنے لگے "میں اپنی پوستین کا پوچھ رہا تھا ، کیسی تھی ؟"

"بے حد خوش قسمت "۔ میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا "ہسپانیہ میں تو اس پر ایک جیتی جاگتی بکری عاشق ہو گئی تھی "۔

"خیر تم بھی اتنے بد قسمت نہیں ہو۔" اُس کی چمکتی آنکھیں میری ساتھی لڑکی پر جھک گئیں ۔ لڑکی نے تیز آنکھوں کو اپنے بدن پر کھبتے محسوس کیا اور میرے بازو پر اپنی گرفت مضبوط کر دی ۔

"تمہیں ایک اور پوستین دکھاؤں ؟" وہ بدستور اُسے گھورتا رہا اور پھر ایک سیڑھی پر چڑھ کر گیلری میں پڑے ڈھیر میں سے ایک پوستین اتار لایا "خان زمان کے مشاق ہاتھوں کی بنی ہوئی نادر پوستین .... ہرات میں اس سے بڑا کاریگر کوئی نہیں .... پہن کر دیکھو گے ؟"

پوستین کی پُر پیچ اور باریک کڑھائی خان زمان کے قدیم فن کی گواہی دے رہی تھی۔

"نہیں ، اس مرتبہ میرا رخ ان خطوں کی طرف ہے جہاں شاید مجھے اس کی گرم رفاقت کی ضرورت پیش نہ آئے "۔

" تو پھر یہ فل بوٹ لے جاؤ۔ طویل مسافتوں کے لئے بے حد موزوں "۔ اس نے مجھے کرسی پر بٹھا کر وہی اونٹ کا چمڑا میرے پاؤں میں فٹ کر دیا۔ جرمن لڑکی کے پاؤں کی گرمی ابھی تک اُس کے اندر کلبلا رہی تھی۔

"کیسے ہیں ؟" میں نے پاؤں اٹھا کر لڑکی سے پوچھا۔

وہ جیسے چونک گئی۔ اس کی نگاہیں پوستین پر جمی تھیں "اوہ ... سُوپر ..."

بوٹوں کی مناسب قیمت ادا کرنے کے بعد ہم دکان سے باہر آئے تو اس نے پھر میرا بازو تھام لیا "تم مائنڈ تو نہیں کرو گے اگر میں اس پوستین کو صرف پہن کر دیکھ لوں ... پلیز !"

اُس کی چربی انگلیاں میرے ماس میں کھبتی چلی گئیں ۔ میں نے کندھے اچکائے اور ہم دوبارہ اندر چلے گئے۔

پوستین پہن کر اُس نے میری جانب دیکھا ۔ اُس کی آنکھوں میں سے آسودگی کا ایک ایسا بھرپور اور شہوت انگیز حیوانی جذبہ اُبل رہا تھا کہ میں سناٹے میں آ گیا ۔ وہ اپنے رخسار اس پر اتنی بے چینی سے رگڑ رہی تھی جیسے اُس کے ساتھ ہم آغوش ہو رہی ہو۔ اُس کی پوری شخصیت بدل چکی تھی ۔ لکڑی کا مجسمہ ایک خوبصورت پوستین کے لمس سے زندہ ہو گیا تھا، تیز تیز سانس لے رہا تھا۔

"کیا قیمت ہے ؟" اُس نے بیٹھی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"سیونٹی ڈالرز..." دکاندار نے اُس کے جنسی اشتیاق کو ڈالروں میں تول کر قیمت لگا دی۔

"سیونٹی ؟" وہ ایک مفرور مجرم کی طرح بدک کر بولی ۔ میں یہ پوستین کبھی نہیں خرید سکتی ... میرے پاس تو صرف چالیس ڈالر ہیں ... اوہ کرائسٹ یہ میری کیوں نہیں ہو سکتی ... اوہ کرائسٹ "۔

اُس نے تھمتے ہاتھوں سے پوستین کو ایک کانچ کے لبادے کی طرح احتیاط سے اتارا، اپنے سامنے پھیلا کر ایک نظر دیکھا اور پھر نا امیدی کا ایک گہرا سانس بھر کے دکاندار کے حوالے کر دی۔ ہم باہر نکلے تو وہ ہمارے ساتھ ہی باہر چلا آیا اور ٹوٹی پھوٹی اردو میں مجھ سے کہنے لگا "یہ لڑکی اگر تمہارے لئے کوئی خاص چیز نہیں ہے تو ایک بات کہوں "۔

میں خاموش رہا تو وہ ہونٹ بھینچ کر ایک سازشی سرگوشی میں بولا "اسے کہو آج رات میرے پاس آ جائے صبح پوستین اس کی ہو گی "۔

سودا بازی کے اس کھلے مظاہرے پر میں بے اختیار مسکرانے لگا۔

"یہ تو ایک عام امریکی لڑکی ہے ... خان زمان کی بنی ہوئی پوستین کے لئے تو صوفیہ لورین بھی ..." فقرہ ادھورا چھوڑ کر وہ مسکراتا ہوا واپس چلا گیا۔

"کیا کہہ رہا تھا؟" لکڑی کا مجسمہ اپنی اصلی ہیئت میں واپس آ چکا تھا۔

"اوہ کچھ نہیں، پوچھ رہا تھا ان دنوں کابل میں فلمیں کون کون سی لگی ہوئی ہیں!"

"ہاں صوفیہ لورین کا فین لگتا ہے۔"

"فین تو وہ پتہ نہیں کس کا ہے بہرحال۔۔۔" میں نے جیب میں سے سو افغانی کے نوٹ نکال کر اُس کے چہرے کے سامنے کر دیئے۔ "سچ پوچھو تو مجھے ان کی واپسی کی قطعی اُمید نہ تھی، آؤ انہیں کسی ریستوران میں جلا دیں۔"

"مجھے الزبتھ کہتے ہیں، تمہارے لئے لیزا۔۔۔"

"اور مجھے مستنصر کہتے ہیں، تمہارے لئے بھی مستنصر ہی۔"

"بہت مشکل نام ہے، صرف "مُس" نہ کہہ لیا کروں؟"

"مُس؟" میں بدک گیا۔ "نہیں اس میں سے کچھ کچھ چوہا پن دُم ہلاتا ہے۔۔۔ میرا نام پکارنا بے حد آسان ہے۔ تم لوگ انگریزی میں MUST ANSWER نہیں کہتے بس وہی چیز ہے۔"

"مستانسر؟"

"تقریباً تقریباً۔"

ریستوران میں بڑے گوشت کے ریشہ دار تکّے اور فرائی انڈے پڑے ٹھنڈے ہوتے رہے اور لیزا گم سم بیٹھی رہی۔ میں اس کی پُراشتیاق آنکھوں میں خان زمان کی پوستین کی کڑھائی کے نقوش دیکھ رہا تھا۔

ہوٹل واپسی پر اُس نے مجھے ہیری کا حدود اربعہ بتایا۔

"ہماری ملاقات لندن میں ہوئی تھی۔ انہی دنوں ہم نے سنے راما تھیٹر میں "جنّت کی تلاش" نامی ایک فلم دیکھی جسے نیپال، کشمیر اور ہنزہ میں شوٹ کیا گیا تھا۔ جنّت کے ان مناظر کی غیر زمینی خوبصورتی نے ہمیں بے جان کر دیا اور ہم سنیما سکرین پر دکھائے جانے والے رنگوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لئے سفر پر نکل کھڑے ہوئے۔

نیپال پہنچتے ہی ہیری کھٹمنڈو کے نواح میں ایک پرانے مندر میں مقیم چند ہپیوں کے گروہ میں شامل ہو گیا اور پورے دو ماہ حشیش کے نشے میں آنکھیں بند کئے پڑا رہا اور اب ہمارے پاس اتنی رقم نہیں کہ کشمیر اور ہنزہ جا سکیں، چنانچہ واپس لندن جا رہے ہیں۔ اُس نے مجھے بے حد مایوس کیا ہے۔ آج بھی یہی ہُوا، ہوٹل پہنچنے سے پہلے اُسے گھاس دستیاب ہو گئی اور اب وہ بے سُدھ پڑا ہے۔ اگلے بیس تیس روز وہ ایک اوندھے پڑے مینار کی طرح گزارے گا اور میں نرس بنی اس کی دیکھ بھال کرتی رہوں گی۔"

وہ گلی بالکل تاریک تھی۔ ایک تنگ کوٹھڑی کے کھلے دروازے میں سے لالٹین کی مدھم روشنی باہر آ رہی تھی، اندر ایک بوڑھا کاریگر چمڑے کے چوکور ٹکڑے کاٹ کر انہیں ایک ہینڈ بیگ پر ایک مخصوص ڈیزائن سے جوڑ رہا تھا۔ کل یہی بیگ بڑے بازار کا کوئی دکاندار اونے پونے داموں خرید لے جائے گا اور کسی یورپی خاتون کے ہاتھوں من مانی قیمت پر فروخت کر دے گا اور پھر ناتواں ہاتھوں کی یہ خوبصورت تخلیق یورپ کے بازاروں اور اونچے درجے کے ہوٹلوں میں ہر ایک کی نگاہوں کا مرکز بنے گی۔۔۔ ہاں مگر بوڑھی ہڈیوں کا گودا جو محنت کی صورت میں اس پر صرف ہو رہا ہے اُس کی کیا قیمت پڑی؟ مشقت اور بھوک! خان زمان بھی اس وقت اسی طور کسی کوٹھڑی میں پوستین پر جھکا ہُوا ہو گا۔

ہم تھوڑی دیر تک اُس کے تیزی سے چلتے ہاتھوں کو حیرت سے تکتے رہے اور پھر آگے بڑھ گئے۔ گلی کے ناہموار پتھروں پر لیزا کے ٹینس شوز اور میرے ہراتی بوٹ آہستہ آہستہ چلتے رہے۔

"تم اکیلے ہی سفر کر رہے ہو؟"

"میں ہمیشہ اکیلے ہی سفر کرتا ہوں۔"

"سنو اب میں مزید بند کمروں کی اذیّت برداشت نہیں کر سکتی۔ دن رات ہیری کی نرسنگ نہیں کر سکتی۔ میں فوراً گھر لوٹنا چاہتی ہوں۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ ہم دونوں اکٹھے سفر کریں؟"

"ہوں!" میں نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔

لکڑی کا یہ جسم دراصل اندر سے کیا ہے؟ سفیدا ہے تو نرم، خوشبودار گودے پر
پھسلنے کا امکان ہے اور اگر کیکر ہے تو زخمی ہونے کا اندیشہ ہے۔ اگر میں اُسے رفیقِ سفر
بنالوں تو کیا میں انہی شکنجوں کو تو قبول نہیں کر رہا جنہیں میں دیوانگی سفر کی ریتی سے کاٹ کر
وطن سے نکلتا ہوں؟ لیزا یقیناً ہر صبح ایک خاص وقت پر بیدار ہوتی ہوگی۔ چیزوں کے
بارے میں پسند، ناپسند کا ایک مخصوص رویّہ ہوگا۔ ہو سکتا ہے خرّاٹے بھی لیتی ہو۔ بہرحال
یہ تو ایک باہمی سمجھوتہ ہے جسے کسی وقت بھی یک طرفہ طور پر مفلوج کیا جا سکتا ہے۔

"کل صبح ایرانی سرحد کو جانے والی پہلی ویگن میں اگر تم میرے برابر کی نشست پر آبیٹھو
تو میں تمہیں منع نہیں کر سکتا لیکن . . ."

اوہ تھینکس مسٹا نسر . . ."

"لیکن اتنا بتا دوں کہ بندھنوں سے دل برداشتہ ہو کر گھر چھوڑتا ہوں تو سفر کے دوران
انہیں کیسے برداشت کر سکتا ہوں۔ ہم صرف سفری رفیق ہوں گے اور یہ رفاقت کسی بھی بس
سٹاپ یا ریلوے سٹیشن پر خود بخود ختم ہو سکتی ہے . . . مگر ہیری کا کیا ہوگا؟"

"وہ بچہ نہیں، ہوش میں آئے گا تو پہنچ ہی جائے گا گرتے پڑتے۔"

لیزا کا ہوٹل پستہ قد دیواروں اور نیچی چھتوں میں جکڑی ہوئی چند کوٹھڑیاں تھا۔
قرائن سے ظاہر تھا کہ ماضی قریب میں اس عمارت میں مویشی بندھتے تھے۔ ہر کوٹھڑی کے
سامنے باقاعدہ ایک ایک کھرلی بھی تھی جن کے اندر لیٹے ہوئے متعدد حضرات کی دو
ٹانگیں نظر آ رہی تھیں یا دھوئیں کے سُستی سے اُٹھتے مرغولے۔ ہیری بھی کسی کھرلی
میں دھرا تھا کہ اُس کی بنسری کی بے سُری دُھن دھوئیں میں سے فلٹر ہوتی ہوئی
پہنچ رہی تھی۔

"سنو!" وہ اندر جانے سے پیشتر سر جھٹک کر بولی "مجھے صرف سچ بتاؤ، اس افغان
نے دراصل کیا کہا تھا تم سے؟"

"کون سے افغان نے؟"

"وہی خوبصورت پوستین والا دکاندار۔ اُس نے تمہیں کابل میں دکھائی جانے
والی فلموں کا تو نہیں پوچھا تھا، یہ تو مجھے معلوم ہے۔"

"اُس نے ایک پیشکش کی تھی . . ." میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر میں
نے وہ پیشکش مہذب الفاظ میں لپیٹ کر لیزا کے حوالے کر دی۔

"واقعی؟" اُس نے یکدم اپنی کاٹھ کی انگلیاں میرے بازو میں پیوست کر دیں۔

"کیا کیا جا سکتا ہے؟" میں نے شرمندہ ہو کر کہا "یہ دکاندار ہر ٹورسٹ لڑکی کو
ایک جیسا ہی سمجھتے ہیں . . ."

"ویسے میں اس سے ناراض نہیں ہوں۔" وہ زیر لب بڑبڑائی "کم از کم اس نے
میری قیمت تو لگائی، ایک خوبصورت پوستین کے قابل تو گردانا اور ہیری . . ."
وہ چپکے سے اندر چلی گئی۔

واپسی پر بوڑھے کاریگر کی کوٹھڑی میں سے روشنی آ رہی تھی۔ وہ اسی طور جھکا
ہوا تھا اور اس کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے۔ مگر اب وہ کھانا کھا رہا تھا۔

ہرات کے کوچہ و بازار تاریک ہو چکے تھے مگر پوستینوں والے بازار کے اختتام
پر پھیلے مرکزی چوک کی ٹیوب لائٹس ابھی تک روشن تھیں۔ سبزہ زار کے مختلف حصوں
میں بجلی کے کھمبوں تلے افغانوں کی ٹولیاں حسب پسند حقے یا نسوار سے شغل کر رہی تھیں۔
ابھی صرف دس بجے تھے اور میں فی الحال ہوٹل نہیں لوٹنا چاہتا تھا یا یوں کہیے کہ اس
وقت لوٹنا چاہتا تھا جب اکڑے ہوئے جاوید صاحب نیند سے مدہوش پڑے ہوں۔
میرے چاروں طرف بے فکرے، آزاد چہرے تھے۔ میں ایک قریبی بنچ کی جانب بڑھا،
جس پر ایک قدرے فربہ، سفید بالوں والا غیر ملکی بوڑھا ہاتھوں کے پیالوں میں چہرہ
لیے گم سم بیٹھا تھا۔ اس کے قدموں میں گھاس پر براجمان ایک نوخیز افغان سر جھکائے

ایک سارنگی نما ساز بجا رہا تھا۔

"کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟" میں نے سارنگی کی روتی ہوئی رُوں رُوں میں ڈوبے ہوئے بابے سے دریافت کیا۔

"ضرور، ضرور۔" وہ چہرہ بلند کر کے بڑی گرمجوشی سے بولا۔ الفاظ کی ادائیگی میں غراہٹ نمایاں تھی۔ یقیناً جرمن تھا۔

"میرے افغان دوست سے ملو۔" اُس نے شاہانہ انداز میں ہاتھ لہرایا۔ نوخیز افغان نے ساز پر سے گز اٹھایا اور ایک صاف اور کھری خوشی اُس کے چہرے پر پھیل گئی۔

"زیاگوٹ۔ زیاگوٹ۔" جرمن نے اس کی حوصلہ افزائی کی اور وہ پھر جھک کر ساز بجانے لگا۔

"ہرات خوبصورت ہے۔" جرمن کے لرزتے باریک ہونٹوں سے یہ الفاظ ایک نظم کی طرح ادا ہوتے۔ ہرات، جرمن لہجے میں، غیرات بن کر سامنے آیا۔ "میں پچھلے ماہ سے یہاں ہوں اور اس دوران ایک لمحہ ایسا نہیں آیا جب میں اس کی قدیم گرفت سے آزاد ہُوا ہوں، تم کب آئے؟"

"آج۔"

"اور کب جا رہے ہو؟"

"کل۔"

"ہاہا۔ خالص دیگا بانڈ... مگر یہ تو ہرات کے ساتھ زیادتی ہے۔" وہ خاموش ہُوا، چند لمحوں کے لئے سارنگی کی دُھن میں ڈوبا رہا اور پھر آہستہ سے بولا۔

"ہاں یہ ہرات کے ساتھ زیادتی ہے، صرف ایک روز کے لئے یہاں آنا... ذرا گھاس پر بیٹھے اُس افغان کو تو دیکھو جس کے بدن سے چیتھڑے لٹک رہے ہیں۔ وہ پچھلے ایک گھنٹے سے گلاب کا ایک پھول اتنی نزاکت سے سونگھ رہا ہے جیسے دنیا کی بنائی ہوئی کسی مختصر تصویر کا الف لیلوی بادشاہ ہو۔ ترک بایزید کو جب تیمور نے

شکست فاش دی تو تاریخ دان گبن کہتا ہے کہ وہ اُس کے دربار میں اس طرح داخل ہُوا کہ اس نے اپنی شکست خوردہ موجودہ حالت کو فراموش کر دیا اور اپنے وقار کو یاد رکھا۔ افغان چاہے کتنا ہی غریب اور پسماندہ کیوں نہ ہو وہ اپنے وقار کو یاد رکھتا ہے۔ اس قوم کی چال ڈھال میں ایک ایسی شان ہے جو میں نے ہسپانویوں کے سوا اور کہیں نہیں دیکھی اور پھر ہرات کے ریگ آلود تاریخی کھنڈروں کا طلسم... اور اس کے یخ بستہ پانی... اور اس کی بدن کو چھونے والی ہوا... تمہیں شاید معلوم ہی نہیں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ تم نے اگر زندگی کے بہترین تیس برس برلن کی کسی پچاس منزلہ عمارت کے ایک کمرے میں تن تنہا بسر کئے ہوں، تب تمہیں معلوم ہو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں..."

بوڑھا جرمن نیم خود کلامی میں اتنا ڈوبا ہُوا تھا کہ میں اُسے اتنا بھی نہ بتا سکا کہ ہرات سے یہ میری تیسری ملاقات ہے۔

سارنگی پر بجنے والی دُھن میں بجھی بجھی اداسی کے وہ گہرے بوجھ تھے جو انسان کو چند لمحوں کے لئے بے حس کر دیتے ہیں اور وہ تاریک پانیوں کی جھیل میں گرتا چلا جاتا ہے جیسے لاش کے ساتھ بھاری پتھر باندھ دیا جائے۔ مگر جونہی بدن تہہ کو چھوتا ہے تو رُکے ہوئے دل والے مریض کو بجلی سے جھٹکا نہیں دیا جاتا، اُس کی حرکت واپس لانے کے لئے، اُسی طور ایک جھٹکا سا لگتا ہے اور انسان دھڑکتا ہُوا، زندہ ہو کر ایک مرتبہ پھر جھیل کی سطح پر اُبھر آتا ہے۔ ہرات میں بجنے والی اس دُھن میں مشرقی یورپ کی موسیقی کی پرچھائیاں تھیں۔ سُرخ چوک میں بجنے والے اکارڈین کے نغموں کی طرح۔ اور ہم روس کی سرحد پر ہی تو سانس لے رہے تھے۔

"آپ اپنا دن کیسے گزارتے ہیں؟"

"میں...؟" وہ چونک گیا۔ "میں صبح سویرے تانگے کی سواری کرتا ہوں۔"

"تانگے کی؟"

"ہاں ایک ایسا تجربہ جس نے مجھے زندگی سے آشنا کیا۔ صبح کی تانگہ رائڈ کے بعد میں

سارا دن اُس کے نشے میں گزار دیتا ہوں۔ شام کو یہاں آبیٹھتا ہوں اور یہ دو ر
صرف تیس افغانی کے عوض مجھے خراسانی موسیقی سناتا رہتا ہے۔ کیا زندگی اس س
ہو سکتی ہے؟"

پچھلے تین ماہ سے روزانہ تانگے کی سواری اور سارنگی ... یورپ کے مکانکی معا
نے شاید اس جرمن کے کل پُرزوں میں فتور پیدا کر دیا تھا۔

ہمارے قریب سے ایک لمبا تڑنگا باریش افغان مٹکتا ہوا گزرا۔ اس کی دراز زلفیں
پگڑی میں سے نکل کر شانوں پر پھیلی ہوئی تھیں۔ گھاس پر بیٹھے منچلے نوجوانوں نے اُسے
دیکھ کر "قربان جاواں" اور "دلدار صدقے" قسم کے نعرہ ہائے تحسین بلند کئے اور خوب خوب
سیٹیاں بجائیں۔ اُس نے ایک ادا سے پگڑی کا پلّو دانتوں تلے دبا کر شرماتے ہوئے فارسی
میں کچھ کہا اور اسی طور لچکتا مسکراتا چلا گیا۔ خواجہ سرا کسی بھی قومیت سے متعلق ہو، ایک
عجوبہ ہوتا ہے مگر پٹھان خواجہ سرا ... ایک انگریزی محاورے کے مطابق یہ تو حد ہے
میں بے اختیار مسکرانے لگا۔

"میرا خیال ہے تم میری تانگہ رائڈ کے بارے میں سوچ کر مسکرائے جا رہے ہو۔"
جرمن مایوسی سے سر ہلانے لگا۔ "اور تم حق بجانب ہو بالکل۔"

"آپ کس جگہ قیام پذیر ہیں؟" میں نے صرف موضوع بدلنے کی خاطر بابے سے پوچھا۔

"پہلے چند روز تو ایئرپورٹ کے نواح میں ایک جدید ایئرکنڈیشنڈ ہوٹل میں پڑا رہا
مگر اب شہر سے باہر جہاں کچی پہاڑیاں شروع ہوتی ہیں۔ سر کٹے میناروں کے پہلو میں ایک
چرواہے کے گھر میں مقیم ہوں، پے انگ گیسٹ کے طور پر، صرف پچاس ڈالر ماہانہ میں
رہائش اور خوراک اور ایک گدھا سواری کے لئے مفت۔ کیا خیال ہے، ونڈر بار...
یہ ونڈرفل نہیں ... گھر سے بالی جزیرے کے لئے رختِ سفر باندھا تھا۔ ہرات جس کے نام
سے آشنا تک نہ تھا، راستے میں آ گیا اور اب یہیں سے واپسی ہو گی۔"

"کب؟"

"جس روز میری جیب میں صرف واپسی کا کرایہ رہ گیا۔"

سارنگی نواز لڑکے کی انگلیاں اب تاروں پر تیرتی تیرتی بھکنے لگیں۔ اُن وقفوں
میں جب وہ سر اٹھا کر باغ کے درمیان میں شور مچاتے آئس کریم والے کی جانب للچائی
نظروں سے دیکھنے لگتا۔ جرمن بوڑھے نے اس کی بے چینی کا جواز پا کر طے شدہ معاوضہ اس
کے حوالے کر دیا اور وہ سلام کر کے آئس کریم والے کی جانب چلا گیا۔ خنکی بڑھنے لگی۔ جرمن اپنے
بوڑھے بازوؤں کے بے جان لٹکتے گوشت پر ہاتھ پھیرتا رہا اور باتیں کرتا رہا۔ ہر دوسرے
فقرے میں تانگہ رائڈ کا ذکر آ جاتا۔ وہ یہ لفظ ادا کرتے ہوئے ہر مرتبہ چھوٹے بچوں کی مانند
مسکرا دیتا، جیسے کہہ رہا ہو، یہ ایک خفیہ نقشہ ہے میرے خزانے کے جزیرے کا، بتاؤں گا نہیں
آہستہ آہستہ سبزہ زار میں بیٹھے لوگ اُٹھنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد ٹیوب لائٹس بھی
گُل ہو گئیں۔ بوڑھا جرمن جس کا نام ہنرخ تھا، مجھے ہوٹل تک چھوڑنے آیا، اپنے گھسٹتے
پاؤں کے باوجود۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران برلن کے محاذ پر کسی روسی مشین گن سے
نکلنے والی چند گولیوں کی یادگار۔

"تم کل صبح میرے ہمراہ تانگہ رائڈ پر جانا پسند کرو گے؟" وہ اُسی بچگانہ شرارت سے بولا۔

"میں کل صبح چھ بجے کی ویگن سے ایرانی سرحد کو جا رہا ہوں۔"

"لیکن تانگہ رائڈ تو چار بجے شروع ہوتی ہے۔" وہ کھکھلا کر ہنس دیا۔ "میں تمہیں
لینے آ جاؤں گا۔" اور پتھر کے فٹ پاتھ پر لنگڑاتا ہوا مگر ایک پُرمسرّت چال سے واپس
چلنے لگا۔

کمرے میں پہنچ کر میں کپڑے بدل رہا تھا کہ جاوید صاحب نے کمبل سے سر نکالا۔

"اچھا نواب تک ... ہم نہ کہتے تھے آپ بڑے حضرت ہیں۔"

میں خاموش رہا۔

"لونڈیا کو چھوڑ آئے؟"

"جاوید صاحب، یہ آپ ایک اچھی بھلی لڑکی کو لونڈیا ایسے بیہودہ لفظ سے کیوں

پکارتے ہیں؟" میں نے جھلّا کر کہا۔

"اس لئے کہ صرف لڑکی کہنے سے میرے ذہن میں سکول کو جاتی، ربن باندھے ہوئے ایک بھلی سی بچّی اُبھرتی ہے۔ البتہ لونڈیا . . ." وہ ایک لمبا چٹخارہ لے کر کمبل میں رُوپوش ہو گئے۔

نامعلوم سی دستک ہوئی۔ میں نے روشنی جلائے بغیر جلدی سے کپڑے پہنے اور دبے پاؤں باہر آ گیا۔

"آجاؤ۔" ہنرخ نے ہوٹل بہزاد کے تاریک برآمدے میں گھومتے ہوئے سرگوشی کی ــــ ایک ایسا بچّہ جو بزرگوں سے چھپ کر خفیہ خزانے کی تلاش کو جا رہا تھا۔

ہوٹل کے رُوبرو اندھیری سڑک پر ایک تانگہ کھڑا تھا بالکل ساکت، موہنجوڈارو کے مٹی کے کھلونے ایسا۔ ہم قریب پہنچے تو گھوڑے کے نتھنے تھرتھرائے اور اس نے لمحہ بھر کے لئے اپنے لمبے کان سیدھے کر کے ہماری آمد کی تصدیق کی۔ افغان کوچوان اگلی نشست پر نیم دراز سگرٹ کے کش لگا رہا تھا۔ ہنرخ اس کے پہلو میں بیٹھ گیا اور مجھے پیچھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ کوچوان نے گھوڑے کے جسم پر کپکپاتی لہروں کو تھپکا اور وہ کیچڑ میں پھنسے ایک جانور کی طرح گردن آگے نکال کر زور لگاتے ہوئے پہیوں کو حرکت میں لے آیا۔

میں نے ایک طویل سانس ہرات کی اُس صبح میں لیا جو خراسان کی نیم صحرائی وسعتوں پر محیط ہو رہی تھی۔ شہر سے پرے خشک پہاڑیوں کے سلسلے میں سے ہمارے دونوں طرف کھڑے چیڑ کے درختوں میں سے اُتر کر ہر سُو پھیل رہی تھی۔ شفّاف خنکی میں گندھی چیڑ کی مہک بدن کے ٹھہرے پانیوں پر جھکی تھی۔ ایک گھنے پتوں والی سرسبز ٹہنی مجھے چھُو رہی تھی ہلکے ہلکے۔ خوشبو کی سرد ہوا جو ہونٹوں کو یخ کر رہی تھی، کسی سرد الپائن جھیل میں غوطہ زن بدن کا زیرِ آب بوسہ۔

ہنرخ اپنی نشست پر ایک یوگی کی طرح آلتی پالتی مارے گم سُم بیٹھا تھا۔

"ہنرخ!"

"ششی"۔ اُس نے ہونٹوں پر انگلی جما کر خاموشی کی تلقین کی "گفتگو بعد میں ہو گی۔"

اُس شہرِ قدیم کی صبح میں گھوڑے کے پاؤں میں چھنکتے گھنگھرو اور ترکی میں شہزادوں کے جزیروں میں رواں بگھی کی چھن چھن، ایک ہی حسین تجربہ جو اب ایک مختلف جغرافیائی سمت میں ظہور پذیر ہو رہا تھا، حسین تجربے بھی تو حسین عورتوں کی طرح ہوتے ہیں جن میں صرف ایک قدر مشترک ہوتی ہے، حُسن۔ البتہ اُن میں سے گزرنے کا عمل، اُس عمل کا ذائقہ ہمیشہ مختلف ہوتا ہے۔

دائیں ہاتھ پر سنگِ سیاہ کا ایک تاج محل گزرا۔ یہ مسجدِ جامع تھی جس کے گنبد اور مینار تاریکی میں تاریک ہو رہے تھے۔

مجھے معلوم نہیں کہ تانگہ کن بازاروں، کون سی گلیوں میں سے گزرا۔ صرف چیڑ کی خوشبو اور یخ ہوا مجھے اُس سفر کے ہونے کا پتہ دیتی تھی۔ ایک دم گھنگھروؤں کی چھناکُ رکی، تانگے کے پہیے ایک مختصر وقفے کے لئے جامد ہوئے اور پھر ایک دھچکے سے ہم تارکول کی سڑک پر سے اُتر کر ایک کچّے راستے پر رواں ہو گئے۔ تاریکی اگرچہ اب بھی مکمل تھی مگر اس کی وسعت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ہم شہر سے باہر آ چکے تھے۔ تانگے کی رفتار بتدریج کم ہوتی گئی۔ گھوڑے کے بدن پر زور اور کوشش کے آثار نمایاں تھے۔ اس کے پٹھے کھنچ رہے تھے۔ کوچوان نیچے اُترا اور حیوان کے ساتھ باتیں کرتا ہُوا ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ رُخ بلندی کی جانب تھا۔ ایک نامعلوم فاصلہ طے کرنے کے بعد تانگہ کھڑا ہو گیا۔

"یہاں سے پیدل جانا ہو گا۔" ہنرخ ایک نوعمر لڑکے کی طرح چھلانگ مار کر نیچے اترا اور اپنا ناکارہ پاؤں گھسیٹتا ہُوا آگے چلنے لگا۔

یہ خراسانی صحرا کی ریت سے اَٹی ہوئی ایک خشک پہاڑی تھی۔ ہوا یہاں قدرے تیز تھی اور ہمارے قدموں تلے بچھی ریت پر سرسراتی ہوئی گزر رہی تھی۔ جابجا بڑے بڑے پتھر یوں پڑے تھے جیسے خشک ہوتے ہوئے دریا میں سے مُردہ آبی جانوروں کے دھڑ

اُبھرتے ہیں۔ ہنزخ ایک تجربہ کار کوہ پیما کی طرح معتدل مگر باقاعدہ رفتار سے چلتا جا رہا تھا۔ پھر وہ سانس لینے کے لئے رُکا، مگر نہیں، ہم ایک ایسی جگہ پہنچ چکے تھے جسے وہ اپنے گھر کی طرح جانتا تھا۔

"تم بُرا نہ مانو تو میں اپنے پتھر پر بیٹھ جاؤں؟" وہ کمال پھُرتی سے ایک ہی جست میں قریبی پتھر پر چڑھا اور اس کی ہموار سطح پر دھرنا مار کر بیٹھ گیا "میں ہمیشہ اسی پتھر پر بیٹھتا ہوں۔"

"میں یہیں کھڑا رہوں؟" میں نے نیچے سے دُہائی دی۔

"نہیں نہیں"۔ وہ پُرمسرت لہجے میں بولا "تم یہ برابر والے پتھر پر بیٹھ جاؤ۔ میرا خیال ہے مناسب رہے گا۔"

میں جب برابر والے پتھر کے اوپر پہنچا تو میرے گوڈے گِٹّے چھِل چکے تھے اور اُن میں سے ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔

"اور اب؟" میں نے ہانپتے ہوئے اُس کی جانب دیکھ کر پوچھا۔

"اوہ خدا کے واسطے"۔ وہ چلّایا "میری جانب رخ کر کے مت بیٹھو، سامنے دیکھو۔"

سامنے بالکل تاریکی تھی۔ بہر حال میں نے سامنے ہی دیکھتے ہوئے اپنا سوال دہرایا کہ "اب؟"

"اب"۔ اُس نے فاتحانہ انداز میں کہا "انتظار"۔

میں گھڑی کے چمکتے ڈائل کو آنکھوں کے قریب لایا، چار بجے تھے۔ ہوا کی خنک چادر اس بلندی پر بے تحاشا پھڑپھڑا رہی تھی۔ اس کی سرد آسودگی نے مجھ پر غنودگی طاری کر دی۔ میں کبھی کبھار آنکھیں کھول کر ہنزخ کو دیکھ لیتا۔ وہ اپنے پتھر پر اُسی حالت میں گم سم بیٹھا تھا، البتہ اُس کے ہاتھ تیزی سے حرکت کرتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ یونہی گمان گزرا کہ یہ صاحب کسی ایسے قدیم مذہب کے پیروکار ہیں جس میں مُنہ اندھیرے تانگے پر سوار ہو کر آبادی سے باہر نکل جانا اور پھر نزدیکی پہاڑی کے سب سے بڑے پتھر پر براجمان ہو کر صرف ہاتھوں سے کوئی عبادتی رقص کرنا کارِ ثواب ہے۔ مگر اس کی نقل و حرکت کا جواز

وہ سگرٹوں میں چرس بھر رہا تھا۔
بے حد سادہ تھا، دو تین سگرٹ کھینچنے کے بعد ہنزخ حواس باختہ ہو کر چلّایا "مستنصر!"

"کیا ہے؟" میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔

"سامنے دیکھو۔"

سامنے کچھ بھی نہ تھا۔ تاریکی تھی۔ میں نے بے یقینی کے عالم میں ہنزخ کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں ایک ڈرے ہوئے جانور کی طرح کھلی تھیں اور وہ اپنے سامنے نظریں جمائے بیتابی سے سگرٹ پھونک رہا تھا۔ میں نے پھر سامنے دیکھا۔ تاریکی ہی تھی مگر قدرے ہلکی، اور یہ مزید ہلکی ہوتی چلی گئی جیسے سیاہ روشنائی میں ہولے ہولے پانی ملایا جا رہا ہو اور پھر نیچے پھیلا میدان ایک سیاہ نقشے کی صورت دکھائی دیا۔ اس نقشے پر لکیریں اُبھریں میدان نیم سیاہ ٹکڑیوں میں بٹنے لگا خطوط واضح ہونے لگے۔ جس کسی نے ڈارک روم میں بیٹھ کر نیگیٹو سے پرنٹ بنایا ہے وہ شاید میرے سامنے لمحہ بہ لمحہ اُبھرتی تصویر کا بھید آسانی سے پا جائے نیگیٹو پر ایکسپوز کرنے کے بعد جب آپ بظاہر سادہ تصویری کاغذ کو کیمیائی محلول میں ڈبو کر آہستہ آہستہ ہلاتے ہیں تو تھوڑی دیر میں صاف چمکیلی سطح پر ہلکے ہلکے دھبے اُبھرتے ہیں۔ کاغذ کو محلول میں ڈبونے والا ہاتھ حرکت کرتا رہتا ہے اور دھبے خدوخال میں بدلنے لگتے ہیں۔ بالآخر ایک ایسا لمحہ آتا ہے جب پوری تصویر واضح ہو کر سامنے آ جاتی ہے۔ کچھ اسی طور نیچے پھیلے میدانوں کی سپاٹ سطح پر مسجد جامع کے مینار، مدرسے کے کھنڈر اور گوہر شاد کے مقبرے کا گنبد تاریکی میں سے وجود کی منزل کی جانب بڑھ رہے تھے۔ شہر ہرات کی تصویر دھیرے دھیرے صاف ہو رہی تھی۔ چند لمحوں تک یہ تصویر ہلکی بے نام روشنی میں نظر آتی رہی اور پھر الحمرا کے رنگ بدلتے ایوانوں کی طرح گلاب ہونے لگی۔ میری نگاہ شہر سے پرے کچے ٹیلوں اور صحرا کے آخر میں نمودار ہونے والے اُس نقطے پر ٹھہر گئی جو بتدریج بڑھتی ہوئی روشنی کا منبع تھا۔ اُبلتے ہوئے لاوے کا ایک نشان۔ طلوع کا لمحہ قریب تھا۔

پہلی کرن اس نقطے میں سے پھوٹی، ایک سنہری کونج جس نے زمین اور آسماں
کے ملاپ سے جنم لیا، اور پھر ایک تیر کی طرح تیرتی ہمارے سروں پر سے پرواز کر گئی،
پھر ایک اور زرد پہلی پرندے نے اپنے آپ کو اُفق کی قید سے آزاد کیا اور سنسناتا
ہُوا ہم دونوں کے اُوپر سے گزر گیا... پھر ایک اور...

میں نے شاید آنکھیں جھپکیں کہ ان کے دوبارہ کھلنے تک ہمارے سروں پر سے
سنہری کونجوں کی ڈاریں اڑان کر رہی تھیں جیسے گندم کی سنہری بالیوں کو پر لگ گئے
ہوں اور دیکھو، اب وہاں روشنی تھی۔ مقدس بائبل میں آیا ہے:

"زمین ابھی ایک خطۂ ویراں تھی
اور تاریکی گہرائیوں تک چلی گئی تھی
پھر رب نے کہا، روشنی ہو جا
اور دیکھو، اب وہاں روشنی تھی۔"

ہاں، اب وہاں روشنی تھی۔ یہ دنیا کی پہلی صبح تھی۔

سنہری کونجوں کی ڈاریں ہمارے سروں پر سے پرواز کرتی رہیں اور بالآخر ان کا
ہجوم بڑھنے لگا۔ کرنیں آپس میں مدغم ہو کر چمکتی روشنی میں بدل گئیں۔ ایک بہت بڑی
سنہری کونج جس نے پورے آسمان کو اپنے چمکتے پروں سے ڈھانپ رکھا تھا۔ ہنرخ
کا نشہ آور سگرٹ اُس کی جامد انگلیوں میں پھنسا سلگ رہا تھا مگر وہ اس سے بے خبر
ایک مجسمے کی طرح ساکت اُفق پر نظریں جمائے بیٹھا رہا۔ مجھے معلوم ہے کہ میری کھلی آنکھوں
باہوش نظروں نے طلوع کے اس منظر کو جتنا سحر آگیں اور زرفشاں دیکھا، چرس کا
دُھواں بدن میں پھیلا کر بھی اس کے سحر، اس کی چمک میں کمی تو شاید آجاتی مگر اضافہ
ناممکن تھا۔ مگر مجھے بالآخر اس پتھر سے اٹھنا تھا، سامنے ظہور پذیر ہوتے تجربے سے دور
ہونا تھا اس لئے میں اپنے آپ کو فریب دے رہا تھا کہ میں بھی ہنرخ کی طرح نشے میں
ہوں۔ یہ سب کچھ اصل نہیں، ایک شعبدہ ہے۔

خراسان کے ویرانوں میں بکھرے کھنڈروں کی نیلی اینٹیں نیلگوں آئینوں کی طرح
چمک رہی تھیں۔ سورج کا زرد گلاب کھلتا چلا گیا اور میں مبہوت ہو کر دیکھتا رہا۔
ہرات میں دل کو لبھانے والے عناصر ناپید تھے۔ نہ کوئی سپر مارکیٹ، سکائی سکیپر
اور نہ نائٹ کلب۔ پھر یہ ہر ملاقات پر دل میں کھُب کیوں جاتا ہے۔ خشک پہاڑیوں،
کھنڈروں، بنجر ٹیلوں اور کچے کوٹھوں ایسے کند مظاہر میں سے چاہت کے نیزے تیکھے
ہو کر کیوں نکلتے ہیں؟ شاید یہ میرے اندر کا اجڈ دیہاتی ہے جو دھرتی کی خوشبو کو اُن
تمام کاغذی خوبصورتیوں پر ترجیح دیتا ہے جو مکانکی اندازِ زندگی کے کارخانے میں تیار
ہوتی ہیں۔ اس چمکیلے لمحے سے پیشتر میں غرناطہ کا وہ اندھا فقیر تھا جس نے الحمرا کے سُرخ
قصر میں اُبلتے فواروں کی سرگوشیاں تو سنی تھیں مگر رنگ بدلتے ایوانوں سے ناآشنا تھا۔
میں بھی ابھی تک ہرات کو صرف محسوس کرتا رہا تھا مگر آج اُسے پہلی بار دیکھ رہا تھا۔

اُفق پر دائرے میں گھری روشنی نظروں کو خیرہ کرنے لگی تو ہنرخ نے آنکھوں پر
ہتھیلی جما کر میری طرف دیکھا "میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ سورج کو طلوع ہوتے ہرات
میں دیکھا تھا۔ یہیں اسی مقام پر، اسی پتھر پر سے۔ اپنی ساٹھ سالہ زندگی میں پہلی مرتبہ۔
اس سے قبل برلن میں سورج کے طلوع ہونے کے اوقات رات کو مجھے ٹیلی ویژن کی
اناؤنسر بتاتی تھی اور صبح کو میرا ٹیبل کلاک۔ مستقبل میرے لئے ایک نیم تاریک برآمدہ تھا،
جس کے آخر میں ایک مقفّل دروازہ تھا بس۔ ناامیدی کے اس قفل کو اب سورج کی ان
کرنوں نے پگھلا دیا ہے۔ طلوع کا یہ لمحہ مجھے روحانی مسرت کے پہلو بہ پہلو تمام تر جسمانی
لذتوں سے بھی ہمکنار کرتا ہے۔ یہ میرے لئے عورت کے جسم کا لمس بھی ہے اور شراب کی
مدہوشی بھی۔ وہاں مجھے الیکشن کے نتائج، برلن کی دیوار، سیاسی اغوا اور ڈش مارک
کے اتار چڑھاؤ کے بارے میں تشویش رہتی تھی۔ ٹیلی ویژن کے پروگرام میری خوشیوں کے
ترازو تھے لیکن پچھلے تین ماہ سے میں نے اخبار یا ٹیلی ویژن کی شکل تک نہیں دیکھی اور
تمہیں پتہ ہے پاکستانی نوجوان کہ اس سے میری زندگی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی... آدھ

اب واپس چلیں۔"

ہم اپنے پتھر کے سنگھاسنوں سے اترے اور نشیب میں کھڑے تانگے کی جانب چلنے لگے۔ ہنرخ کی آنکھیں سُرخ تھیں، نشہ آور گھاس کے اثر سے مگر اس کے چہرے کی سرخی انہی آنکھوں کے سامنے بدلنے والے منظر کی مرہونِ منت تھی۔

"میں پہلی مرتبہ سفر پر نکلا ہوں مگر تم تو شاید ایک عادی آوارہ گرد ہو۔ مجھے بتاؤ کہ جب میں واپس برلن جاؤں گا اپنے پچاس منزلہ کمرے میں، تو زندگی کیسی ہو گی؟" وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ اُس کے گھسٹتے پاؤں کا بوجھ میرے کندھے نے محسوس کیا۔

"آپ پھر سے کنڈیشنڈ ہو جائیں گے۔ عادی ہو جائیں گے ٹیلی ویژن اناؤنسر کے اُسی چہرے کے، اُس کلاک کے جو آپ کی سائڈ ٹیبل پر اس وقت بند پڑا ہے اور اخبار کی اُنہی شہ سرخیوں کے، کیونکہ ایک انوکھا تجربہ، ایک ایڈونچر تو بدن میں آزادی، خوف اور محبت کے جذبوں کا گندھا ہُوا بارود ہے جو بس ایک لمحے میں ہی بھک سے اُڑ جاتا ہے۔ بعد میں صرف دُھواں رہ جاتا ہے اور یہ لمحے آپ کے کسی کام نہیں آسکتے۔ کسی بھی انوکھے تجربے کو آپ توسیع نہیں دے سکتے۔ ایک معیّنہ وقت کو کھینچ کر اپنی پوری زندگی پر محیط نہیں کر سکتے۔ وہ ایک خاص لمحے کے بعد آگے نہیں بڑھتا، مر جاتا ہے۔ اسی لئے تجربہ کہلاتا ہے۔ اس آخری لمحے کے بعد وہ ایک سوکھی ٹہنی کی طرح ہمارے بدن کے شجر سے ٹوٹ کر ماضی کی بنجر زمین میں گر جاتا ہے۔ ہاں اگر ہم میں تخیل کی بے پناہ صلاحیت ہو تو وہ ہمارے سامنے پھر سے پھوٹتا ہے۔ ہم اسے تھوڑی دیر کے لئے زندہ کر کے دیکھ سکتے ہیں... ورنہ وہ ماضی کی گہری دُھند میں ہمیشہ کے لئے رُوپوش ہو جاتا ہے۔"

"لیکن اس بات کا تعین کیسے ہو گا کہ تجربہ ختم ہو چکا، وہ آخری لمحہ آن پہنچا؟"

"جونہی ہم سکوت کے سمندر میں سے نکل کر اُس کے بارے میں باتیں کرنے لگتے ہیں جیسے اب..." میں ریت میں پاؤں جما جما کر آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ "جونہی اُس کی حرارت بدن چھوڑنے لگتی ہے۔ اُسی وقت جب ہم میں اس تجربے میں سے دوبارہ گزرنے کی خواہش سر اٹھاتی ہے... جونہی نارمل زندگی شروع ہو جاتی ہے۔"

"میرا خیال ہے تم درست نہیں کہہ رہے۔" وہ میرے کندھے پر مزید دباؤ ڈالتے ہوئے بولا۔ اُس کا ناکارہ پاؤں اسے اذیت دے رہا تھا۔ "مجھ میں صلاحیت ہے کہ میں آج کے لمحے کو اپنی پوری زندگی پر محیط کر لوں کیونکہ جب میں واپس جاؤں گا تو میری جیب میں طلوع کے ایسے سینکڑوں لمحے ہوں گے۔ تم نے وہ گیت نہیں سنا کہ ایک گرتے ہوئے ستارے کو پکڑ کر اپنی جیب میں ڈال لو اور اُسے کبھی بجھنے نہ دو تاکہ خزاں کی تاریک راتوں میں وہ تمہیں روشنی دے۔ بس اسی طرح میری جیب میں بے شمار ستارے ہیں، یادیں ہیں۔"

"ہنرخ یادیں تو ایسے کھوٹے سکے ہوتی ہیں جو صرف اتنی تسلی دے سکتی ہیں کہ تم دوسروں کی نسبت تجربے میں زیادہ امیر ہو۔ ان کھوٹے سکوں سے دُنیادی طور پر کوئی منافع بخش کاروبار تو نہیں کیا جا سکتا۔"

"بہر حال تم تو آج ہرات چھوڑ رہے ہو۔ ہو سکتا ہے تمہیں راستے میں کوئی کھرے سکّے مل جائیں۔ فی الحال مجھے ایسے ہی کھوٹے سکّے جمع کرنے دو۔"

تانگے کے پہیے حرکت میں آئے اور ہم ایک مرتبہ پھر نارمل زندگی کی جانب رواں ہو گئے۔ یوں تجربے کا آخری لمحہ بھی ختم ہو گیا۔ ہمارے بدن کے درخت سے ایک سوکھی ٹہنی ٹوٹی اور ماضی کی بنجر زمین پر گر گئی۔

باہر رات ہے

آسمانوں پر محیط سنہری کُونج پرواز کر چکی تھی اور اُس کی جگہ ایک سفید چمکتا آسمان تھا، تیز دھوپ تھی۔

"ہیلو مسٹانسر" ہرات سے ایرانی سرحد تک جانے والی ویگن کے باہر لیزا کھڑی تھی۔ میں نے برابر کی خالی نشست پر نگاہ ڈالی اور باہر آگیا۔

"بخار ہے کیا؟" اس کی چوبی انگلیاں میرے گال پر ثبت ہو گئیں۔ "تمہاری آنکھیں سُرخ کیوں ہو رہی ہیں؟"

"میں نے اس کائنات کے پہلے طلوع آفتاب کو ننگی آنکھوں سے دیکھا ہے اس لئے..... اور دیکھو اب وہاں روشنی ہے۔"

"کہاں؟" اس کے چہرے سے تحیّر کی کونپل پھوٹی۔

"وہاں۔" میں نے شہر سے فرار ہوتی سڑک کا راستہ روکے کھڑی بھوری پہاڑیوں کی طرف دیکھا۔

"تم یقیناً میری کی طرح افغانی چرس کے کش لگاتے رہے ہو۔" وہ ایک پشیمان سی ہنسی ہنس دی۔ "دیکھو مجھے تم سے کچھ کہنا ہے..... اور جو کچھ میں تم سے کہنا چاہتی ہوں اسے سن کر تم مجھ سے فیڈ اپ ہو جاؤ گے۔"

"کہاں تک؟"

"یہاں تک" اُس کی ہتھیلی ایک مکانکی سپاہی کی طرح سیلوٹ کر
سینے پر جم گئی "لیکن ...."

"تم نے میرے ہمراہ سفر کا ارادہ ترک کر دیا ہے"

"ہاں .... اور مجھے افسوس ہے" اُس نے نظریں نیچی کر لیں "
ہو ناں کہ میں ہیری کو اس طرح نہیں چھوڑ سکتی۔ وہ ایک چھوٹا سا بچہ ہے جو
سہارے کے بغیر یہیں کہیں مشرق میں گم ہو جائے گا مر جائے گا"

"ہاں میں سمجھتا ہوں لیزا ...." میں نے اپنا ہاتھ آگے کر دیا "خدا حا
اور خوش نصیبی تمہارے ساتھ ہو"

"مجھے خوش نصیبی کی کیا ضرورت ہے" وہ اپنے سیاہ پیراہن پر ہاتھ پھیر
ہوتے تلخی سے بولی "میسر نہ ہو تو میں اس کی قیمت ادا کر کے خرید بھی تو سکتی
...." اس نے جیبوں میں ہاتھ ٹھونسے اور سر جھٹک کر چلی گئی۔

افغان دکاندار نے کہا تھا، لیزا تو ایک عام سی امریکی لڑکی ہے۔ خان
کی پوستین کے لئے تو الزبتھ ٹیلر بھی .... ! لیزا واقعی ایک عام سی امریکی لڑ
وہ بازار کے درمیان میں چل رہی تھی اور خان زمان کی سیاہ پوستین اُس کے
جسم کے ساتھ بڑے وحشیانہ انداز میں لپٹتی چلی جا رہی تھی۔

بقارہ مدرسے کے سر بریدہ میناروں نے مجھ پر اپنا ہیبت کے نیلے نشا
ڈالے کہ اُن کی نیم شکستہ نیلی ٹائلیں دھوپ میں چمک رہی تھیں اور ہماری و
دھول اُڑاتی ہوئی اُن میں سے گذر گئی۔ ایران سے آنے والے سیاحوں پر
ہرات کے پہلے سائے انہی میناروں کے پڑتے ہیں۔ میناروں سے پر
کے ایک ڈھیر میں سے دھواں اُٹھ رہا تھا اور اُن کے باہر چند آسودہ مزاج
منہ اُٹھائے سڑک کی جانب دیکھ رہے تھے۔ جیرالڈ ایئر کنڈیشنڈ ہوٹلوں کی

چھوڑ کر یہیں کہیں کسی کچی کوٹھڑی میں سنہری کونج کے پروں میں گم مزے سے
سو رہا تھا۔

ہرات سے باہر نکلتے ہی سائیکل سواروں کا ایک جوڑا ہمارے ساتھ ہو
لیا۔ مشقت کرتے ہوئے جسم پسینے سے چمک رہے تھے اور وہ اپنے پہیوں پر ایک
ایسی سنڈی کی طرح کُبڑے ہو رہے تھے۔ جسے تنکے سے چھوا جائے تو وہ اپنا درمیانی
دھڑ فوراً اوپر اُٹھا کر وہیں جم جاتی ہے۔ ہالینڈ کے رہنے والے اس جوڑے
سے یہ میری پہلی ملاقات نہ تھی۔ سید خاں کی بس کا ٹائر پنکچر ہونے پر جب میں قریبی پہاڑی
سلسلے پر جا براجمان ہوا تھا۔ اس روز پہلی مرتبہ میں نے انہیں اپنے نیچے پھیلی طویل سڑک پر دو نقطوں
کی صورت میں رینگتے دیکھا تھا۔ پھر صحرائے مرگس کے ایک قہوہ خانے میں اُن سے ملاقات ہو گئی۔ دونوں میاں
بیوی سنگاپور سے ہالینڈ تک سائیکلنگ کر رہے تھے۔ وہ پاکستان کے بارے
میں بے حد شاکی تھے کہ وہاں ایک علاقے میں سے گذرتے ہوئے ایک باریش
بزرگ کی قیادت میں لوگوں نے خاتون کی اس "بے حیائی" پر اُسے پتھر مارے
کہ وہ چادر اوڑھ کر سائیکلنگ کیوں نہیں کرتی، نیکر اور ٹی شرٹ کیوں پہنے
ہوئے ہے۔ اُسے یوں نیم برہنہ دیکھ کر پورے ملک کا اخلاق خطرے میں پڑ
سکتا تھا۔ نیم خواندہ افغانستان انہیں پسند تھا۔ جس کے وسیع صحراؤں میں وہ
تن تنہا سفر کرتے رہے اور کسی نے اُن کی جانب آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ ایک
جگہ چڑھائی شروع ہوئی تو وہ مجھے خدا حافظ کہہ کر ویگن سے پرے ہو گئے اور
سائیکلوں سے اُتر کر انہیں بلندی کی طرف دھکیلنے لگے۔

ہرات سے دو گھنٹے کی مسافت پر اسلام قلعہ کی سرحدی چوکی تھی۔ جہاں پر
ویگن ڈرائیور نے ہمارا سامان چھت سے اتارا اور کسٹم ہاؤس کے ایک بوسیدہ کمرے
میں ڈھیر کر دیا۔ کسٹم افسر صاحب چونکہ ابھی ناشتہ کرنے میں مصروف تھے۔ اس
لئے حکم ہوا کہ آپ لوگ اتنی دیر میں وہ سامنے جو خیمہ ہے اُس میں براجمان ہیلتھ
افسر سے اپنے ہیلتھ سرٹیفکیٹ پر مہر ثبت کروا لیں۔ ہیلتھ افسر شلوار اور بنیان

پہنے ایک بینچ پر بیزار بیٹھا تھا اور اس کے آگے میز پر رنگ برنگی دوائیوں کی
بکھری پڑی تھیں۔ وہ ہر ایک کے ہیلتھ سرٹیفکیٹ پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر مہر لگا دیتا
البتہ جونہی کوئی پاکستانی سامنے آتا اُسے خیمے کے ایک کونے میں کھڑے ہو جانے کا
دے دیا جاتا۔ جب دیگر قومیتوں کے سیاح فارغ ہو کر خیمے سے باہر نکل گئے تو اُس
نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں انتہائی بیزاری سے کہا "تمہارے سرٹیفکیٹ نامکمل ہیں،
ان پر ٹی بی کے ٹیکوں کی مہریں نہیں ہیں۔"

"لیکن جب میں طورخم کے راستے افغانستان میں داخل ہوا تھا تو اُس بارڈر
تو اس سرٹیفکیٹ پر کسی قسم کا اعتراض نہیں کیا گیا تھا۔" میں نے آگے بڑھ کر کہا۔

"مجھے اعتراض ہے۔" اُس نے یکدم گرج کر کہا۔ "آئی ایم ہیلتھ آفیسر۔"

"لیکن جناب...." میں ابھی ایک انتہائی عاجزانہ قسم کی گفتگو کا آغاز کرنے کو
تھا کہ اُس نے باہر کھڑے سپاہی کو اشارہ کیا اور اُس نے ڈنڈا لہرا کر ہم سب کو خیمے سے
خارج کر دیا۔

صورتِ حال تشویشناک تھی۔ ہیلتھ سرٹیفکیٹ پر مُہر کے بغیر ہم سرحد عبور نہیں کر سکتے
تھے۔ سارے پاکستانی بھائی بند سہمے ہوئے کھسر پھسر کر رہے تھے کہ اب کیا کیا جائے۔ ان
میں سے بیشتر لوگ نوکریوں کی تلاش میں جلاوطن ہوئے تھے اور سفر کے دوران ذرا
برابر قانونی یا غیر قانونی دشواری بھی انہیں ہراساں کر دیتی تھی۔ فیصلہ ہوا کہ ہم میں سے
ایک شخص ہمت کر کے دوبارہ اندر جائے اور افسر صاحب سے اس مشکل کو حل کرنے
کا طریقہ دریافت کرے۔ مجھے اس مشن کے لئے متفقہ طور پر چن لیا گیا۔ میں اندر جانے
کے لئے کمر کس رہا تھا کہ ملیشیا کی شلوار قمیض میں ملبوس ایک وجیہہ نوجوان نے جھجکتے
ہوئے مجھ سے کہا "صاحب میرا نام غلام محمد ہے، مجھے بھی لے چلو۔ پشتون ہوں اور فارسی
میں بات کر سکتا ہوں۔"

خیمے کے اندر داخل ہوتے ہی افسر صاحب گرجنے کیلئے پر تول رہے تھے کہ میرے

ساتھی نے انتہائی لجاجت سے فارسی میں کوئی داستان شروع کر دی۔ اُدھر سے
کوئی سخت سا جواب آیا۔ کیونکہ غلام محمد کا منہ لٹک گیا۔

"کیا کہتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کہتا ہے کہ ٹی بی کے ٹیکوں کے بغیر آپ سرحد عبور نہیں کر سکتے، اس کا واحد حل
یہ ہے کہ آپ سب کو ٹیکے لگائے جائیں گے ....."

"تو لگوا لیتے ہیں۔"

"چار مرتبہ لگیں گے۔" غلام محمد نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ہر ہفتے کے
بعد۔ یوں پورا کورس ایک ماہ میں مکمل ہو گا اور یہ عرصہ ہمیں کسٹم ہاؤس سے باہر واقع
خاردار تار میں گھرے کورنٹین کیمپ میں گذارنا ہو گا...."

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" میں نے ہراساں ہو کر کہا۔

"ہو سکتا ہے۔" غلام محمد آرام سے بولا۔ "افغانستان ہے بابا.... اور کہتا ہے
کہ ایک ماہ بعد آپ بے شک ہنسی خوشی سرحد عبور کر جائیے گا۔"

"ایک ماہ؟" میں نے سراسیمگی کا تھوک نگلنے کی ناکام کوشش کی۔ "یہاں اس
ویرانے میں؟ واپس پاکستان جانا پڑے گا۔"

"کہتا ہے واپس بھی نہیں جا سکتے۔"

"پھر؟"

"پھر آپ باہر چلیں میں دوبارہ کوشش کرتا ہوں۔"

ایک طویل وقفے کے بعد ایک مسکراتا ہوا غلام محمد باہر آیا اور مخلوق کے سوکھے
حلقوں اور کپکپاتی انگلیوں کو نوید دی کہ صاحب کہتا ہے میں ابھی تمام ٹیکے لگا کر مہر
لگا دیتا ہوں البتہ اس رعایت کے لئے سو افغانی فی کس ٹیکوں کی قیمت ادا کرنی ہو
گی۔ ہم اطمینان کے گہرے سانس لیتے ہوئے خیمے میں داخل ہوئے۔ شتابی سے سو سو
افغانی صاحب کی ہتھیلی پر رکھے اور آستینیں چڑھا کر بازو آگے کر دیئے۔ صاحب نے

اپنی زنگ آلود سرنج میں کوئی رنگدار شے بھری، ہمارے بازوؤں کی جانب دیکھا اور پھر اُسے میز پر رکھ کر ہمارے سرٹیفکیٹوں پر مہریں لگا دیں۔

"اور ٹیکے ؟"

"تم سب خاصے صحت مند ہو، تمہیں ٹی بی نہیں ہو سکتی"۔ وہ بیزاری سے بولا

"لیکن اگر کسی نے اعتراض کیا تو ؟"

"آئی ایم ہیلتھ آفیسر" وہ گرج کر بولا۔

ہم اپنے سرٹیفکیٹ سمیٹ کر فوراً باہر آ گئے۔ کسٹم ہاؤس میں پہنچے تو ہمارا سارا سامان پڑتال کے بعد ویگن کی چھت پر باندھا جا چکا تھا۔ غلام محمد نے ازراہِ شکایت کسٹم آفیسر سے کہا کہ ہیلتھ آفیسر نے بڑی بدتمیزی کا مظاہرہ کیا ہے اور ہم سے ناجائز طور پر سو سو افغانی وصول کر کے مہر لگائی ہے۔

"بہت بُرا آدمی ہے، بہت بُرا" اُس نے ایک چوڑی مسکراہٹ کو گالوں تک پھیلایا" میرا خیال ہے میں تمہارا سامان دوبارہ چیک کروں۔ اُس میں سے ضرور کوئی قابلِ اعتراض شے برآمد ہو جائے گی"

میں نے غلام محمد کو اشارہ کیا اور ہم دونوں جلدی سے باہر آ کر ویگن میں سوار ہو گئے۔ اِدھر ہماری ویگن اسلام قلعہ کی عمارت سے نکل رہی تھی اور اُدھر وہی سائیکل سوار جوڑا سیٹیاں بجاتا ہوا کسٹم ہاؤس کے اندر داخل ہو رہا تھا۔

ایرانی سرحد پر طیب آباد کے دھول آلود قصبے کی بجائے اب ایک نیا نکور شیشے اور المونیم کا بنا ہوا وسیع کسٹم ہاؤس تھا جہاں پاسپورٹ اور چیکنگ کے مراحل بڑی خوش اسلوبی سے طے ہو گئے۔ کسٹم ہاؤس کے شو کیسوں میں وہ سوٹ کیس، ٹائر اور مختلف اشیاء بھی سجی تھیں جن میں چرس وغیرہ چھپا کر سمگل کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اِن شو کیسوں کے اوپر سمگلر حضرات کی تصاویر آویزاں تھیں اور اُن پر بڑے حروف میں قومیت درج تھی۔ فرطِ جذبات سے مغلوب ہوتے ہوئے میں

دیکھا کہ اس شعبے میں ہم ایک مثالی ملک بن کر ابھرے تھے۔ بیشتر تصاویر اپنے پاکستانی بھائیوں کی تھیں۔ دس شو کیسوں میں سے سات پر ہمارے پیارے ملک کا نام جگمگا رہا تھا۔ یعنی ساری دنیا ایک طرف اور ہم ایک طرف۔ اللہ کرے زور .....

کسٹم ہاؤس کے باہر مشہد جانے والی ہوائی جہاز نما بس کھڑی تھی۔ کنڈکٹر بے حد رقیق القلب واقع ہوا تھا، چنانچہ اُس نے ہر مسافر سے اُس کی حیثیت کے مطابق کرایہ وصول کیا جو معمول سے دگنا تھا۔ مسافروں میں سری لنکا کی رہنے والی ماں بیٹی بھی شامل تھیں جو مدراس سے یہاں تک مسلسل سفر کرتے کرتے اتنی چکرا چکی تھیں کہ ہر بات پر کہتیں "بھائی ہمیں تو کچھ پتہ نہیں چلتا کہ ہم جا رہے ہیں کہ آ رہے ہیں"۔ قد بُت اور چہرے میں ایک دوسرے سے اتنی مشابہ تھیں کہ تعین کرنا مشکل ہو جاتا تھا کہ کونسی ماں ہے اور بیٹی کونسی ہے۔ چنانچہ ایک سرسری سی نشانی یہ تھی کہ اگر اُن کی طرف دیکھا جائے تو جو مسکرائے گی وہ بیٹی ہو گی اور .... ظاہر ہے دوسری ماں ہو گی۔

اُسی شام ہم مشہد پہنچ گئے۔ تہران کے لئے بس سات بجے روانہ ہونی تھی، ابھی دو گھنٹے باقی تھے۔ میں نے اپنی نشست مخصوص کروائی، سامان لگج کمپارٹمنٹ میں رکھا اور اڈے سے باہر آ گیا۔

ایک مرتبہ پھر میرا رُخ اُن نیلے گنبدوں اور میناروں کی جانب تھا۔ جن کے سائے تلے ایک ایسی ہستی محوِ خواب ہے جس کے دم سے ایران سانس لیتا ہے، زندہ ہے، ہم ایسے لوگ تو کائنات کی ناقابلِ فہم وسعت میں خوردبین سے بھی نظر نہ آنے والے جرثومے ایسی زندگیاں رکھتے ہیں۔ ہم شہروں کی جانب جاتے ہیں کہ اُن میں آباد ہو سکیں۔ مگر کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے سامنے خود کائنات سمٹ کر جرثومہ بن جاتی ہے۔ شہر اُن لوگوں کی طرف آتے ہیں تاکہ خود کو آباد رکھ سکیں۔ بلخ کے ایک

بزرگ خواب میں دیکھتے ہیں کہ حضرت علیؓ اُن سے مخاطب ہیں "میرا جسدِ خاکی شہر سے دس کوس کے فاصلے پر دفن ہے۔ اُس مقام کو پہچانو"۔ یہی خواب جب مسلسل سات روز تک وارد ہوتا رہا تو بزرگ نے اُس مقام پر جا کر کھدائی کی، چند ہڈیاں برآمد ہوئیں اور ایک قرآنِ پاک جو حضرت علیؓ کے ہاتھوں کا تحریر کردہ تھا۔ اُس ویرانے میں ایک عالی شان مزار تعمیر ہوا۔ آہستہ آہستہ بلخ کے باسی اس مزار کی جانب کھنچنے لگے۔ بلخ ویران ہوا اور مزار شریف کا ویرانہ آباد ہو گیا۔ اسی طرح مشہد ایک ویران گاؤں تھا اور چند کوس کے فاصلے پر فردوسی کا شہر طوس بے مثل تھا۔ امام رضا نے گنبدِ شاہی کی بجائے عوام کی سانسوں میں سانس لے کر زندہ رہنے کا قصد کیا اور شہید کر دیئے گئے۔ مشہد میں دفن ہوئے اور اُن کی ابدی بادشاہت کا اقرار کرنے کے لئے طوس اُجڑا اور مشہد کا بے نام قصبہ اُن کے دم سے آباد ہو گیا۔

روضے کی پُرپیچ جالی بھنور کی آنکھ ہے جس کے گرد جم کر کھڑا ہونا ناممکن ہے۔ ہجوم کی لہروں کا زور آپ کو گردش میں لے آتا ہے اور آپ آنسوؤں سے بھیگے چہروں، جالی کی جانب پھڑپھڑاتے بازوؤں میں شامل ہو کر طواف کرنے لگتے ہیں۔ میں کائنات کا ایک چھوٹا سا جرثومہ اُس ہستی کے مرقد کے گرد بہہ رہا ہوں جو خود ایک کائنات تھی ..... دہقان تھا آذربائی جان کا اور اُس سیاہ چادر میں اُس کی بیوی بند تھی۔ یہ صاحب تہران کے کروڑپتی سوداگر تھے اور اس جدید لباس میں اُن کی سوس سکول میں اخلاق یافتہ بیٹی۔ یہ ایک تبریزی مُلّا تھا اور اُس کے ساتھ قم کے مدرسے کا ایک طالب علم، اِدھر ایک فلسفی تھا اور اس کے قریب شیراز کا ایک حکیم۔ مگر یہ ظاہری پہچان چاندی کے ان دبیز دروازوں میں داخل ہونے سے پیشتر تھی۔ اس وقت وہ صرف آنسوؤں سے بھیگے چہرے ہیں، پھڑپھڑاتے بازو ہیں۔ یہ سب ہیریں ہیں جو دریا پار کر کے رانجھن کے ڈیرے تک پہنچنا چاہتی ہیں۔

میں نے ایک نوجوان کو دیکھا۔ جس کے دونوں بازو فضا میں بلند تھے اور

اور ان میں جکڑا ہوا ایک پانچ سالہ گول مٹول بچہ لوگوں کے سروں کے اُوپر معلق تھا۔ بچے کی چھوٹی چھوٹی ہتھیلیاں روضے کی جالی چھونے کے لئے بے چین تھیں۔ جالی اُس کی کانپتی انگلیوں کے قریب آتی تو نیچے ہجوم میں پھنسے ہوئے اُس کے باپ کے پاؤں بے اختیار اکھڑ جاتے اور پھر دور سا ہو جاتا۔ بچہ مایوس ہو کر زور زور سے سر ہلاتا اور پھر جدوجہد میں مصروف ہو جاتا۔ ایک مرتبہ خاصی دیر تک روضے کی جالی اس کی پہنچ سے صرف چند انچ کے فاصلے پر رہی اور وہ اپنے آپ کو کھینچ کھینچ کر اُس کی جانب بڑھنے کی کوشش کرتا رہا، مگر اس بار بھی ہجوم نے اُس کو دور کر دیا۔ بالآخر تھک ہار کر وہ واقعی بچہ بن گیا۔ وہ اپنی ہتھیلیوں کو بھینچ کر جیسے جالی کو اپنے پاس بلانے لگا۔ التجا کرتے ہوئے، ضد کرتے ہوئے، غصّے میں بڑبڑاتے ہوئے، امام سے ناراض ہوتے ہوئے ..... اور پھر اس کی کھلی انگلیاں جالی کی جانب مقناطیس کی طرح تیرنے لگیں یا شاید جالی اُن کی جانب کھنچتی چلی گئی اور پھر دو نارنگی کی پھانکوں ایسے ہونٹ اس پر ثبت ہو گئے۔ میری آنکھوں کے کونوں میں نمی کے دو نقطے پھوٹے اور ایک لکیر کی طرح پھیلتے چلے گئے، مجھے اپنے بیٹے یاد آ رہے تھے۔

میں روضے سے باہر نکلا تو ایک جمِ غفیر امام کے حضور پناہ لینے جا رہا تھا تاکہ خود کو آباد رکھ سکے۔

میں نے پینک میں مست ایک معجونی کی طرح دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں۔ بس کی ونڈسکرین پر پھوار پھیل رہی تھی۔ وائپر کا سہاگہ شیشے پر پھسلتا تو لمحہ بھر کے لئے صبح کی ہلکی سفیدی نظر آ جاتی۔ میرے برابر کی نشست پر تہران یونیورسٹی کا طالب علم رضا ابھی تک گہری نیند سو رہا تھا۔ پچھلی شب مشہد سے روانگی کے بعد ہم دیر تک مختلف موضوعات پر تبادلۂ خیالات کرتے رہے تھے۔ مگر جونہی میں اُس سے شاہ کے بارے میں کچھ پوچھتا تو وہ جبڑا مقفل کر کے بس سے باہر دیکھنے

لگتا۔ قدرے توقف کے بعد وہ منہ پھیرتا اور کہتا "باہر رات ہے۔"

ایک مقام پر بس نے سڑک کو چھوڑا اور ایک پہاڑی کے پہلو میں بیٹھے چند قہوہ خانوں کے جھرمٹ کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ میں باہر نکلا، بارش رک چکی تھی۔ ہوا میں نم آلود بو سے کی سی تازگی تھی۔ مسافر قہوہ خانوں کے باہر کرسیوں پر بیٹھنے لگے ان میں کچھ سڑک سے نیچے اُتر کر ایک ندی کے کنارے اپنے چہروں پر چھینٹے مار مار کر رات کی تھکن کو اُتارنے لگے۔ میں بھی گیلی زمین پر احتیاط سے قدم رکھتا ندی تک گیا۔ پانی میں ہاتھ ڈالا تو اُس کی یخ بستگی نے میرے انگلیوں کو باقی بدن کی سستی سے کاٹ کر زندہ کر دیا۔ میں نے پورے بدن کو اسی طور زندہ کرنے کا سوچا اور ندی کے ساتھ ساتھ پہاڑی کے اُوپر چڑھنے لگا۔ ایک مقام پر جہاں ندی خم کھا کر نیچے آ رہی تھی، مسافر نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ میں نے جلدی سے کپڑے اُتارے اور مایا برف کے اُس جھنجھناتے تھال میں اتر گیا۔ دو چار ڈبکیوں نے ہی کپکپی طاری کر دی اور میں باہر آ گیا۔ جب میں ناشتے کے لئے قہوہ خانوں کی جانب آیا تو میرا بدن ٹکسال میں سے نکلے نویں نکور سکے کی طرح کھنک رہا تھا۔ میں نے پہلے دو کپ میٹھا دہی کھایا اور پھر قہوے کی چسکیاں لینے لگا۔ اتنے میں تہران کی جانب سے ایک بس نمودار ہوئی اور سڑک سے اُتر کر ہماری بس کے شانہ بہ شانہ کھڑی ہو گئی۔ اونگھتے آنکھیں ملتے مسافر باہر نکلتے اور تھکے جسموں کو گھسیٹتے یا تو ندی کا رخ کر لیتے اور یا اِدھر اُدھر کرسیوں پر پھیل جاتے۔ ان میں تین پاکستانی لڑکے بھی تھے جو مجھے دیکھ کر میری میز پر چلے آئے۔ سلام دعا کے بعد وہ ناشتے میں مشغول ہو گئے۔ گفتگو کے دوران معلوم ہوا کہ لاہور کے باسی ہیں اور تین چار ماہ کی آوارہ گردی کے بعد وطن واپس جا رہے ہیں۔

"آپ حضرات روزگار کی تلاش میں یورپ گئے تھے؟" میں نے سگرٹ جلاتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہم حضرات ''نکلے تری تلاش میں'' کے سلسلے میں یورپ گئے تھے۔" اُن میں سے ایک منہ بنا کر بولا۔

"جی؟" میرا سگرٹ لبوں تک جاتے جاتے رُک گیا۔

"آپ مستنصر حسین تارڑ کو جانتے ہیں؟" بڑھی ہوئی داڑھی والے لڑکے نے دہی کا چمچہ منہ میں گھسیڑتے ہوئے غصے سے پوچھا۔ "یہ اُسی گدھے کے..... کی کارستانی ہے۔"

اب میں باقاعدہ نروس ہو گیا۔ مگر میں جاننا چاہتا تھا کہ آخر وہ اس گدھے کے..... میرا مطلب ہے میرے بارے میں اتنے پُرخلوص جذبات کیوں رکھتے ہیں۔ مگر وہ تو یہ بیان دے کر مزے سے دہی کھانے لگے تھے۔

"یہ جو..... بہت ٹیڑھے نام والے حضرت کا حوالہ آپ نے دیا ہے تو انہوں نے یقیناً آپ پر بہت بڑا ظلم وغیرہ کیا ہے۔"

"ظلم؟" وہی پُرخلوص نوجوان چمک کر بولا۔ "ہماری بیڑیوں میں بیٹھ گیا جی۔ سفرنامے وغیرہ لکھتا ہے۔ اس کا ایک سفرنامہ پڑھ کر ہم تینوں دوستوں کی عقل کا میٹر مخالف سمت میں گھوم گیا اور ہم اپنے اپنے دھندے چھوڑ، اُس کی کتاب بغل میں داب آوارہ گردی کے لئے نکل کھڑے ہوئے..... اب پتہ نہیں واپسی پر اسے موٹر مکینکی کا کام ملتا ہے یا نہیں۔ میرے بینک والے بغیر چھٹی کے چلے جانے کے باوجود مجھے واپس لیتے ہیں یا نہیں اور اس کو تو اِس کا ابا کپڑے کی دوکان پر بیٹھنے کی اجازت بالکل نہیں دے گا، بہت منع کیا تھا اُس نے۔" وہ پیالی پر جھکا اور قہوہ پینے لگا۔

میرا سگرٹ انگلیوں میں سلگ کر بے چارگی سے راکھ گراتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے پھر ہمت کی۔ "اچھا تو یہ صاحب آپ کی بیڑیوں میں بیٹھ گئے..... کیسے؟"

"جھوٹ بولتا ہے جی۔" وہی نوجوان اپنا ہونٹ چباتے ہوئے کہنے لگا۔ "ایسے ایسے قصے جوڑ کر سناتا ہے کہ بندہ پاگل ہو جائے ..... اوئے" اس نے ساتھی کو مخاطب کیا۔ "کیا لکھا ہے اُس نے نوح کے پہاڑ کے بارے میں کرچکا ہے کا بنا ہوا ہے۔ اپنی شملہ پہاڑی جتنا ہے اور وہ جو شہزادوں کے جزیرے تھے اللہ بچائے۔ اتنی مکھیاں اور مری ہوئی مچھلیوں کی بُو ....."

"یار اُسے اچھی لگی ہوں گی یہ جگہیں ....." تیسرے صاحب نے بے چارگی سے کہا۔ میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ "اب وینس اور ایلپس کے قصبے اپنی خوبصورتی اور ہیبت سے بندے کو پاگل نہیں کرتے، اور سٹاک ہوم ....."

"ہاں ہاں ..... لیکن ٹوٹی پھوٹی دیواروں اور ملبے کے ڈھیروں کو دیکھ کر جو فدا ہوتا ہے تو جان عذاب میں ڈال دیتا ہے۔"

"اپنا اپنا تجربہ ہوتا ہے پیارے۔" میرا حمایتی ہنس کر بولا۔ "اب ہمیں بھی تو ایسے تجربے ہوئے ہیں جو اُس کے خواب میں بھی نہیں آسکتے۔ وہ جب سویڈن میں ....." اس کے بعد وہ اپنے سفر کے واقعات دہرانے میں اتنے مگن ہوئے کہ میری موجودگی سے غافل ہو گئے۔

تھوڑی دیر بعد میری بس کا ہارن بیتابی سے بجنے لگا اور میں جانے کیلئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ تینوں مجھے انجان جان کر یورپ تک کے رُوٹ کے بارے میں تفصیلات سمجھانے لگے اور میرے ساتھ ہی چلے آئے۔ میں بس میں سوار ہونے لگا تو انہوں نے اپنا مختصر سا تعارف کروایا کہ جی میرا نام یہ ہے اور یہ ہیں میرے ساتھی ..... واپسی پر ملاقات ضرور ہونی چاہیے اور ..... آپ کا اسم شریف؟ میں چپکا کھڑا رہا کہ مجھ میں ہمت نہ تھی انہیں اپنا نام بتانے کی ..... میں جانتا تھا کہ اُن کا ردِ عمل شرمندگی کا ہو گا اور ..... ہوا۔ میرا نام سُن کر کچھ دیر کے لئے تینوں جیسے فضا میں معلق ہو گئے اور پھر انہوں نے خالص لاہوری انداز میں

معافیاں مانگنی شروع کر دیں ..... سرجی معاف کر دیجئے ہم تو آپ کے بچے ہیں۔ اور ہمیں تو پہلے ہی کچھ کچھ شک ہو رہا تھا مگر آپ کا لباس ..... بڑھی ہوئی شیو اور پھر ایران کے اس قہوہ خانے کے باہر آپ سے ملاقات ..... ہم تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ میں نے ڈھارس تو بہت بندھائی مگر وہ شرمندگی کی چادر اوڑھے رہے جب تک بس حرکت میں نہ آگئی وہ قطار باندھے منہ بسورے کھڑکی کے باہر کھڑے رہے۔

"یہ نوجوان غالباً تمہیں کوئی بہت برگزیدہ ہستی سمجھتے ہیں۔" علی رضا جو اس صورتِ حال کا بغور جائزہ لیتا رہا تھا۔ سر ہلاتے ہوئے گویا ہوا۔

"ان نوجوانوں نے چند لمحے پیشتر مجھے خرِ عیسےٰ کے خاندان کا ایک فرد قرار دیا تھا۔"

"بالے بالے" اُس نے سر زور زور سے ہلایا۔ "مگر کیوں؟"

میں نے روئداد بیان کر دی۔ علی رضا بے پناہ محظوظ ہوا اور اُس کے ہونٹ ربڑ کی طرح پھیلتے چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے کھڑکی سے باہر دیکھا اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ "باہر رات ہے۔"

"رات؟" میں نے اچنبھے سے پوچھا۔ "بادلوں کی وجہ سے قدرے تاریکی ہے ورنہ تو ....."

"تم میری آنکھوں سے نہیں دیکھ رہے۔" اُس کا سر جھکا، ٹھوڑی سینے پر ٹک گئی اور اُس نے ناک کی بنسی کو چٹکی میں دبا کر اپنے آپ کو سوچ کے حوالے کر دیا۔ خاموشی کے ایک مختصر وقفے کے بعد اُس نے سر اُٹھایا۔ "پچھلی شب تم شاہ کے بارے میں مجھے کرید رہے تھے ..... میں گریز کر رہا تھا۔ صرف اس لئے کہ تم خفیہ پولیس ساواک کے ایجنٹ بھی تو ہو سکتے تھے ....."

"مگر میں تو پاکستانی ہوں۔"

"وہ پیسے کے پجاری ہیں، اُن کی کوئی قومیت نہیں، پاکستانی بھی ہو سکتے ہیں۔

"پھر؟"

"پھر یہ کہ تم نے ابھی اپنے ادیب ہونے کا ذکر کیا ہے۔ میں تم پر بھروسہ
کرتا ہوں۔ کوئی بھی سچا تخلیقی ذہن ظلم کا ایجنٹ نہیں ہوسکتا..." علی رضا کے
چہرے پر بوڑھی سوچوں کا جال سا بچھ گیا "میرا نام علی رضا نہیں ہے۔ میرا
"الف" ہے، میں ایران کا پہلا نصف ہوں، میں آغاز ہوں مگر میرے آغاز اور
انجام پر لکڑی کے چہرے والے اُس عفریت کا سایہ ہے جو شاہ ہے۔ اُس کے پاؤں
ہمیشہ گیلے رہتے ہیں، جرنیلوں، سرمایہ داروں اور ساواک کے ایجنٹوں کے بوسوں
سے۔ ایک روز ہم بھی اُسے بوسہ دیں گے، ایک بوسۂ مرگ۔ ایشیا کی سب سے
بڑی اور جدید ترین آلاتِ قتل سے لیس فوج وہ دیوار ہے جو شاہ اس آخری
بوسے سے بچنے کے لئے اپنے آگے تعمیر کر رہا ہے۔ مگر ہم دھات اور بارود کی
اس دیوار کو چاٹ لیں گے اور پھر وہ ہمارے سامنے ننگا کھڑا ہوگا.... پچھلے
میں اور میرا ایک عزیز ترین دوست یونیورسٹی سے واپسی پر ملکی حالات کے
بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ ہم قدرے لاپروا ہوگئے اور بس میں سوار ہو
بھی وہی باتیں کرتے رہے۔ ہمارے پیچھے بیٹھا ہوا مسافر ساواک تھا.... دوسرے
روز میرا دوست یونیورسٹی جانے کے لئے گھر سے نکلا اور اُس کے بعد آج تک
اس کی کوئی خبر نہیں ہے۔ اُس کے بوڑھے والدین اپنے بیٹے کی گمشدگی کی رپورٹ
لکھانے کے لئے پولیس سٹیشن بھی نہیں گئے۔ جانتے ہو کیوں؟ پولیس انہیں گرفتار
کر لیتی۔ اِس بوڑھے اور اِس کی بیوی نے الزام لگایا ہے کہ اُن کے بیٹے کی گمشدگی
میں شاہ کا ہاتھ ہے اور یہ صفِ اوّل کی غداری ہے۔ چنانچہ وہ اپنا کمرہ مقفل کر کے
چپکے چپکے بین کرتے رہتے ہیں اور وہ اکیلے نہیں ہیں۔ ایران کے ہزاروں گھروں
میں ایسے مقفل کمرے ہیں۔ جن کے فرشوں پر ماتم کے سیاہ قالین بچھے ہیں۔
علی رضا بلکہ ایران کا الف، ایران کا آغاز اپنے انجام کو آزاد کرانے کی جدوجہد

بارے میں دیر تک گفتگو کرتا اور میں دم بخود، رنجیدہ سنتا رہا۔

ہم تبرستان کے صدر مقام آمل میں پہنچ گئے۔ آمل بہت دیدہ زیب
شہر تھا مگر "الف"، کی گفتگو کے بعد اُس کی کنکریٹ کی عمارتیں اور سمینٹ کے
فٹ پاتھ ایک ایسے مورچے کی صورت میں نظر آئے جو شاہ نے حفاظت کی خاطر
اپنے دیہات کے اور اپنے درمیان تعمیر کر رکھے ہیں بچے اور پس ماندہ ایرانی دیہات
جو شہروں کے مورچوں کے عقب میں منتظر ہیں.... شہر ہمیشہ آسائش کی افیم پیے
اونگھتے رہتے ہیں اور دیہات جفاکشی کے ہتھوڑے ہاتھ میں لئے چوبی چہروں
والے عفریتوں کو توڑ پھوڑ دیتے ہیں[1]۔

ایرانی لینڈ اسکیپ دو قسم کی ہے۔ ایک وہ جو ہمیں فارسی شاعری میں ملتی
ہے اور دوسری وہ جو ہمیں دیکھنے میں ملتی ہے۔ دونوں میں خاصا طویل فاصلہ ہے۔
ایک طرف رکنا باد ہے، گلاب کھلتے ہیں اور دوسری جانب چٹیل میدان، بنجر
ٹیلے اور بے آب و گیاہ صحرا پھیلتے ہیں۔ اس تفاوت کی وجہ شاید یہ ہے کہ ایران
(جتنا کہ میں نے دیکھا) میں سبزہ و آب قدرے کم کم ہیں اور ایک ایرانی شاعر
جونہی ایک سبز پتے یا پانی کی بوند کو دیکھتا ہے تو بلا تامل بے قابو ہو جاتا ہے....
ہمارے ایک عزیز دوست جو تہران میں قیام پذیر تھے اپنے لئے کسی بہتر رہائش گاہ
کی تلاش میں تھے۔ اُن کے دفتر میں کام کرنے والے ایک ایرانی نے انہیں ایک
قیام گاہ کے بارے میں بتایا جو اتفاقاً کرائے کے لئے خالی تھی اور ساتھ ہی مسرت
سے لبریز ہوتے ہوئے خوشخبری سنائی کہ گلشن دار یعنی ساتھ میں گلشن بھی ہے۔

---

[1] سفرِ ایران، جون ۱۹۷۵ء

ہمارے دوست جو خود بھی شاعر ہیں گلشن کے نام پر حافظؔ و سعدیؔ کے دیوانوں
غرق ہو گئے اور فوراً حامی بھر لی۔ چونکہ وہ قیام گاہ صرف چھٹی کے روز ملاحظہ کی جا
تھی۔ اس لئے پورا ہفتہ وہ ایرانی صاحب ہر دوسرے فقرے میں اُن کی ارتو
پر رشک کرتے کہ انہیں ایک ایسی قیام گاہ ملنے والی ہے جو کہ ... گلشن دارد۔
کے روز انہیں ایک تنگ گلی میں لے جایا گیا۔ ایک بوسیدہ کواڑ کھول کر ہم
کے اندر داخل ہوئے۔ ایک مختصر سا صحن اور ایک چھوٹا سا تاریک کمرہ، ہمارے
دوست نے بے صبری سے پوچھا، گلشن کجا است؟ اس پر ایرانی نے دروازے
ساتھ زمین میں گڑی ہوئی ایک پژمردہ ٹہنی پر قربان ہوتے ہوئے اعلان کیا
"گلشن! ....." یہ بھی عین ممکن ہے کہ ایران واقعی قدرے سر سبز ملک ہو مگر پنجاب
ہریاول سے نچڑتے میدانوں کی عادی آنکھیں ہی ادھر سبزہ و آب کم کم دیکھتی ہیں
بہر طور تہران سے تقریباً سو میل دور ایک وادی میں سے گذر ہوا جس میں پنجاب
سبز خوبصورتی کا عکس تھا۔ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں میں گھرا ایک خطۂ زمین جس پر چا
کے کھیت بچھے ہوئے ہیں اور ان کی نم خوشبو کے درمیان آپ کی بس ناک اٹھا
سونگھتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ یہاں دھوپ اور بادلوں کا ایک مسلسل کھیل رونما ہو
رہتا ہے۔ ابھی بس کی ونڈ سکرین پر بارش کے قطرے پھوٹ رہے ہیں اور اگ
دھوپ کے تیز فلیش آنکھوں کو چندھیانے لگتے ہیں۔ وادی کے خاتمے پر ایک
پہاڑی سلسلہ شروع ہو گیا اور ہم ایک تیراک کی طرح بریسٹ سٹروک کی طرز پر
سرنگوں میں ڈبکیاں لگاتے اور پھر چمکتی سڑک پر نمودار ہوتے آگے بڑھنے لگے
ایک سرنگ کے دہانے پر ٹریفک رکی ہوئی تھی۔ ڈرائیور نے بریک پر پا
رکھ دیا۔ سب مسافر کھڑے ہو گئے۔ کھائی کی جانب سڑک کے گرد کا حفاظتی جنگلہ
ہوا تھا اور نیچے گہرائی میں کئی ہزار فٹ نیچے ایک دریا کی چمکتی لکیر تھی اور اُس لکیر
ایک ڈنکی کھلونا تھا، کھلونا تھا نہیں اس بلندی سے لگ رہا تھا۔ وہ کسی غیر ملکی

کی مائکرو بس تھی۔ کسی پالتو کتے کی طرح دریا کے بیچ اوندھی پڑی ہوئی، پانی کا ریلا ٹوٹی ہوئی کھڑکیوں میں سے گذرتا تو وہ یوں دھیرے دھیرے ہلتی جیسے اس کتے کو بوٹ کی نوک سے گدگدی کی جا رہی ہو۔ امدادی پارٹیاں رسّوں کی مدد سے نیچے اُتر رہی تھیں، سیاحوں کی لاشیں نکالنے کے لئے۔

سرنگ کے اس پار اُترائی شروع ہو گئی۔ ڈرائیور نے انجن بند کر دیا اور ہم بوئنگ جیٹ کی طرح بیٹھتے دلوں کے ساتھ نیچے ہوتے چلے گئے۔

تہران پہنچ کر علی رضا مجھ سے جُدا ہوا "میں تمہیں ضرور اپنے گھر میں ٹھہرنے کی دعوت دیتا ....." وہ رنجیدہ ہوا، مسکرایا اور چار چفیرے نگاہ ڈال کر بولا۔ "مگر ان دنوں .... باہر رات ہے۔"

ایران کا آغاز مجھ سے ہاتھ ملا کر اُس رات میں گم ہو گیا، اس ضمانت کے بغیر کہ وہ اپنا انجام آزاد دیکھنے کے لئے زندہ رہے گا یا اُس کی لاش بھی دریائے خراج کی تہہ میں ہزاروں ایرانی نوجوانوں کے گلتے جسموں کو نوید دے گی کہ ابھی رات کے خلاف جنگ مسلسل ہے اور لکڑی کے چہرے والے شاہ اور بوسۂ مرگ کے درمیان ایک دن مزید کم ہوا۔

:———————:

مائی پھیرے باز

میں نے اپنا سامان کاندھے پر بوجھ کیا اور قیامِ تہران کے لئے کسی رہائش گاہ کی تلاش میں بس سٹیشن سے باہر آ گیا۔

"مسافر خانہ دہقانِ نو" کی عمارت ایک پرانی کاروان سرائے تھی جو شائد کسی زمانے میں شہر سے باہر ویرانے میں ہوگی مگر اب شہر رینگتا ہوا اُس کے چاروں طرف پھیل چکا تھا۔ دالان عبور کر کے مینجر کے دفتر میں پہنچا اور سوالِ رہائش دراز کیا۔ اُس نے چابیوں کا ایک گچھا دراز میں سے نکالا اور مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

"تخت ندارد"۔ وہ دوسری منزل پر واقع ایک بوسیدہ دروازہ دھکیلتے ہوئے بولا۔

"ہم گداگر لوگ ہیں۔ ہمیں تخت کی خواہش بھی نہیں"، میں نے خوش دلی سے کہا۔

"بالے"، اُس نے سر ہلایا۔

کمرے میں واقعی کوئی تخت نہ تھا، یعنی چھت کے علاوہ صرف فرش ہی فرش تھا۔ چارپائی، میز کرسی وغیرہ ندارد۔ میرے جسم کی تھکاوٹ نے اِسی کو غنیمت جانا اور میں اپنا سلیپنگ بیگ فرش پر بچھا کر اُس میں ڈھیر ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں ایک اجنبی ملک کی بجائے ایک ایسی وادی میں پہنچ چکا تھا جس میں

دنیا بھر کے انسان اپنی زندگی کا نصف حصّہ گزارتے ہیں۔ موت کے عارضی تجربہ
روشناس ہوتے ہیں۔ میرا جسم آہستہ آہستہ تھکاوٹ کی کینچلی اُتارتا رہا۔ جانے اس
میں کتنا عرصہ گذرا مگر جب میں اُس وادی سے واپس آیا تو اپنے آپ کو ایک اور د
پایا۔ باہر واقعی رات تھی اور اندر میں ایک بھرے پُرے ایرانی گاؤں میں سانس لے
تھا، بے شمار بچے تھے۔ جو مجھے پھلانگتے اِدھر اُدھر کھیل رہے تھے، چند مرد تھے
میرے پہلو بہ پہلو ٹانگیں پھیلائے سو رہے تھے، ایک دہقان خاتون پولکا ڈاٹ چادر
میں روپوش چولہے پر ایک چھوٹی سی دیگ چڑھائے کسی طعام کی تیاری میں مشغو
تھی۔ سلگتی لکڑیوں کا دھواں پورے کمرے کو ایک دھندآلود پہاڑی قصبے کا روپ
دے رہا تھا۔ میں قدرے ہراساں ہو کر اُٹھ بیٹھا۔ کونے میں اونگھتے ایک سفید ری
دہقان نے مجھے دیکھ کر ایک چوڑی مسکراہٹ میرے سامنے رکھ دی اور خان
خاتون سے مخاطب ہو کر کچھ کہا۔ اس نے چادر کا پلّو چہرے پر کھینچا، دیگ میں ڈوئی ڈ
کر ایک محلول نکالا اور ایک پیالے میں گرا کر میرے سامنے رکھ دیا۔ سبزیوں اور گوشت
گاڑھا سوپ تھا جس کا مزا دھواں دھواں تھا۔ سوپ ختم کر کے میں نے بڑے میاں
خاتون کا شکر ادا کیا اور پھر اُٹھ کر کھولتا ہوا مینجر کے پاس جا پہنچا "میرے کمرے
ایک ایرانی گاؤں آباد ہو گیا ہے"

"ہونا بھی چاہئیے" وہ ایرانیوں کی روایتی لاتعلقی سے بولا۔

"کیوں؟"

"انہوں نے کرایہ ادا کیا ہے"

"اور میں نے؟"

"تم نے بھی ادا کیا ہے"

"تو پھر؟"

"پھر یہ کہ تم سب نے کمرے میں سونے کا کرایہ ادا کیا ہے، جا کر سو جاؤ"

یہ گفتگو جیسا کہ ظاہر ہو رہا ہے اتنی رواں نہ تھی بلکہ نیم فارسی میں بمشکل تمام
ان خیالات کا اظہار ہوا، مینجر کا سٹینڈ یہ تھا کہ اس مسافر خانے میں کمرے کرائے پر
نہیں ملتے بلکہ صرف سونے کی جگہ کرائے پر ملتی ہے اور وہ مجھے ملی ہوئی ہے چاہے
اُس کے گرد ایک ایرانی گاؤں آباد ہے چنانچہ میں اسی طور کھولتا ہوا اُس کے کمرے
سے باہر نکل گیا۔ میں اس موڈ میں ہرگز نہیں تھا کہ تہران کے قیام کی چند راتیں اجتماعی
کھیتی باڑی کے ماحول میں گذاروں چنانچہ میں نے خیابانِ امیر کبیر کا رُخ کیا جو دنیا بھر
کے سیاحوں میں اپنے سستے مسافر خانوں کی وجہ سے مشہور ہے۔ وہاں پہنچ کر معلوم
ہوا کہ دنیا بھر کے سیاح مجھ سے پہلے ہی وہاں پہنچ چکے ہیں اور مسافر خانوں کے مالک
کمرہ پُری کے بعد اب انہیں دو ڈالر فی کس کے حساب سے غسل خانوں، برآمدوں،
چھتوں اور تہہ خانوں میں فٹ کر رہے ہیں۔ رہائشی صورتِ حال تشویشناک تھی خاصی
تگ و دو کے بعد خیابان کے آخر میں "مسافر خانہ نادر" ملا جو بے حد چپ چاپ اور
خالی خالی سا نظر آ رہا تھا مگر یہاں سوال سے پیشتر ہی جواب مل گیا۔ میں مایوس ہو کر
جانے کو تھا کہ ایک خوش باش کِھلے ہوئے سفید چہرے والی بڑی اماں سفید چادر اور
شلوار قمیض میں ملبوس سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی نمودار ہوئی جسے دیکھتے ہی ادھیڑ
عمر مینجر بچوں کی طرح کلکاریاں مارنے لگا۔ بڑی اماں نے بزبان فارسی اسے بے شمار
دعاؤں سے نوازا اور اُس کے جھکے ہوئے گنجے سر پر بڑی شفقت سے ہاتھ پھیرا۔
مینجر مؤدب ہو کر سر جھکائے بدستور کلکاریاں مارتا رہا۔ بڑی اماں وہاں سے فارغ
ہوئیں تو میرے سر پر دستِ شفقت پھیرنا شروع کر دیا۔ "پُتر تمہیں پہلے نہیں دیکھا"

"جی میں ابھی آیا ہوں"

"کون سے کمرے میں ہو؟"

"جی کمرہ تو۔۔۔" میں نے بڑی اماں کو ہمدرد پا کر پوری کتھا بیان کر دی۔ اُس
نے مینجر کے جھکے ہوئے سر پر ایک اور پیار دیا اور پھر اُس سے کچھ کہا۔ جواب میں

وہ دیر تک لکتے کبوتر کی طرح گنگناتا رہا۔ پھر بڑی اماں مجھ سے مخاطب ہوئیں
"یہ شہدا بھی ٹھیک کہتا ہے پتر، واقعی کوئی جگہ نہیں ہے۔ کل صبح کویت وا...
جا رہے ہیں۔ تم آ جانا بستر مل جائے گا۔" میں شکریہ ادا کر کے جانے کو تھا کہ بڑی...
نے پھر میرے سر پہ ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا "کل ناشتہ میرے ساتھ کرنا پتر
جیتے رہو۔"

کھلی کھڑکی میں سے ہلکے بخار ایسی سست حدت والی دھوپ آ رہی تھی
میں اطمینان سے اُبلی ہوئی سویوں اور دودھ کا ناشتہ کر رہا تھا۔ سویوں پر چھڑکی
ہوئی چینی میرے دانتوں تلے کڑکڑا رہی تھی۔ سامنے بڑی اماں میرے لئے...
بنانے میں مصروف تھیں اور بار بار پوچھتیں "بیٹے چینی اور چاہیے، سویاں ا...
بہت ہیں تم نے ہی ختم کرنی ہیں۔۔۔۔" پچھلی شب تو میں نے جوں توں کر کے...
گاڑی میں گزاری اور آج صبح سویرے "مسافر خانہ نادر" میں چلا آیا جہاں حسب...
مجھے ایک خوبصورت ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں بستر الاٹ کر دیا گیا اور اب میں بڑی
اماں کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

"اماں جی آپ ایران میں زیارتیں کرنے آئی ہیں؟" میں نے سگریٹ سلگاتے
ہوئے دریافت کیا۔

"پُتر میں تو پھیرے باز ہوں۔"

"کیا باز ہیں؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"پھیرے باز پتر" بڑی اماں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "سب لوگ
مجھے مائی پھیرے باز کہتے ہیں۔ یہ کاروبار ہوتا ہے پتر۔ میرے دونوں بیٹے بھی
اسی کاروبار میں ہیں۔ ہمارا ہیڈ کوارٹر بغداد میں ہے اور چھوٹا وہیں رہتا ہے
بڑا بیٹا جرمنی سے مرسیڈیز گاڑیاں لا کر بیروت میں فروخت کرتا ہے۔ میں...

ایران، شام اور ترکی سنبھالا ہوا ہے۔ بڑے سے تو پچھلے ماہ انقرہ میں ملاقات ہوئی
تھی مگر چھوٹا چھ ماہ سے پھیرے پر ہے۔ میں تہران آتی ہوں تو وہ دمشق چلا جاتا ہے
دمشق پہنچتی ہوں تو وہ جدہ بیٹھا ہوتا ہے۔ خیر رب سچا کبھی نہ کبھی تو میل کرائے گا۔
اللہ حیاتی دے بڑے سچے اور بیبے بیٹے ہیں۔۔۔۔" اُس کی بوڑھی آنکھوں میں نمی
آ گئی اور وہ سنہرے فریم کی عینک اُتار کر آنسو پونچھنے لگی "یہ بہت کہتے ہیں کہ مائی جی
آرام کرو۔ ہم جو ہیں کمانے والے۔۔۔ مگر دیکھو ناں پُتر رزق وہی حلال ہوتا ہے جو
انسان خود کمائے۔"

"بے شک، بے شک۔" میں نے سویاں نگلتے ہوئے کہا "مائی جی ایران،
شام اور ترکی آپ نے سنبھالا ہوا ہے۔"

"آہو پتر۔"

"کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کس طرح سنبھالا ہوا ہے؟"

"بس پتر، ترکی سے مال خریدا اور ایران لے آئے۔ یہاں سے مال ڈالا تو
شام لے گئے۔ ہر جگہ پھیرے بازوں کے مخصوص مسافر خانے ہیں۔ وہاں مقامی
لوگ آ کر مال خرید لیتے ہیں۔"

"لیکن مائی جی یہ تو۔۔۔ کچھ غیر قانونی سا سلسلہ نہیں ہے۔ سمگلنگ وغیرہ
۔۔۔؟" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"ناں پتر۔۔۔"، مائی جی نے کانوں کی لویں چھوتے ہوئے سر ہلایا "ہم کسٹم
والوں کو اُن کا حق دیتے ہیں۔۔۔ کوئی چھپا کر تھوڑا لاتے ہیں۔۔۔ بڑا کرم ہے
رب سچے کا، مجال ہے کسی سرحد پر یا ایئر پورٹ پر کوئی کسٹم افسر مائی پھیرے باز
کے مال کو ہاتھ لگائے۔ سبھی دید لحاظ کرتے ہیں۔"

"سرحد عبور کرتے ہوئے اتنے سامان کے ساتھ کبھی کوئی دشواری پیش نہیں
آئی؟"

"ہاں ایک مرتبہ شام کے بارڈر پر عملہ تبدیل ہو گیا تھا تو اُن پکڑ… روک لیا تھا۔"

"پھر؟"

"پھر ہم نے پورے کسٹم ہاؤس کے شیشے توڑ دیئے.... پولیس آئی پھر فو… بہر حال مال ہم نے پھر بھی نکال لیا۔"

میں مائی پھیرے باز کی شخصیت سے خاصا متاثر ہو چکا تھا، قدرے غیر قا… ہی سہی مگر اس عمر میں بین الاقوامی سرحدوں کے آر پار یوں دندناتے پھرنا بہر… ایک کارنامہ تھا۔ "آپ سارا سال پھرتی ہی رہتی ہیں؟"

"نہیں پتر، حج کے دن تو میں سوہنے سرکار کے پاس مکے اور مدینے میں گز… ہوں...." مائی جی کی آنکھوں میں نمی نے پھر یلغار کر دی۔ "بس ایک ہی ارمان ہ… پتر کہ اللہ توفیق دے۔ عمر دے تو پورے بارہ حج کر لوں، دس تو ہو گئے...."

"ہو گئے؟"

"ہاں ہو گئے۔"

"کبھی پاکستان جانے کا خیال نہیں آیا مائی جی؟"

"پتر وطن وطن ہوتا ہے، خیال کیوں نہیں آتا، یہ تو رزق کی خاطر ٹھوکریں ک… رہی ہوں۔ اخیر عمر تو وہیں گزرے گی۔ بری امام کی درگاہ کے آس پاس.... بس… بیٹے کچھ نرم دل ہیں۔ کاروبار کو سمجھتے نہیں۔ پچھلے دنوں چھوٹے نے کویت کا و… لگوا لیا...."

"کویت کا؟ سنا ہے مشکل سے ملتا ہے۔"

مائی جی کا دین دار چہرہ مسکرانے لگا۔ "نہیں پتر، بڑے اچھے لوگ ہیں.... سفارت خانوں والے۔ کل عراق کا ویزا لگوانے گئی تو بڑی خلقت تھی۔ سفارت خا… کے باہر۔ سب کو جواب مل رہا تھا۔ مجھے تو اندر بلا لیا۔ کرسی دی۔ اُن کو بھی ہم ن…

کا حق دیتے ہیں پتر۔"

"تو آپ کا چھوٹا بیٹا کویت چلا گیا؟"

"نہیں پتر یہی تو بتانے لگی تھی۔ اُسے بغداد میں ایک غریب شخص ملا، بے یارو مددگار، ضرورت مند تھا بے چارہ۔ میرے بیٹے نے ترس کھا کر اپنا ویزا اُسے دے دیا، صرف دس ہزار میں۔ بڑا نرم دل والا ہے۔ اللہ حیاتی دے۔"

اتنے میں دستک ہوئی اور ایک غیر معمولی ایرانی یعنی طویل قامت، چوغے میں حرکت کرتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اُس نے قریب پہنچ کر سر جھکا دیا۔ مائی جی نے حسبِ عادت اُس کے سر پر دستِ شفقت پھیرا اور پھر دونوں شدھ فارسی میں گفتگو کرنے لگے۔ ایرانی نے چوغے کی جیب میں سے ایک کاغذ نکال کر مائی جی کی خدمت میں پیش کیا۔ اُس پر مختلف اشیاء کی فہرست تھی جو وہ اگلے پھیرے میں مائی جی سے خریدنا چاہتا تھا۔ مائی جی نے بڑی پھرتی سے سب اشیاء کے آگے قیمتیں درج کیں، ٹوٹل کیا اور کچھ رقم ایڈوانس وصول کر کے ایرانی کو اگلے ماہ کی ایک تاریخ دی، سر پر ہاتھ پھیرا اور وہ عقیدت سے سرنگوں بامراد مرید کی طرح جھومتا ہوا چلا گیا۔

"مائی جی یہ جو ویزا آپ کے بیٹے نے ایک ضرورت مند کو بخش دیا تو پھر اُس نے اپنے پاسپورٹ سے اس کے پاسپورٹ پر کیسے منتقل کر دیا؟" میں نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔

مائی جی میرے اس بے وقوفانہ سوال پر دل کھول کر ہنسیں۔ "پتر، اپنے عراق میں بڑا بڑا کاریگر ہے۔ پاسپورٹ بنانے کا۔ ایک پاسپورٹ کے صفحے دوسرے میں اتنی نفاست سے فٹ کرتے ہیں کہ مجال ہے.... اپنے سفارت خانے والے بھی مدد کرتے ہیں.... حق ملتا ہے۔ انہیں بھی.... خیر پتر تم کہاں جا رہے ہو؟"

"یہاں سے ترکی جاؤں گا اور...."

"وہاں ایرانی ڈنر سیٹ لے جاؤ۔ بہت پیسے چھوڑیں گے۔ مگر تین پھول والے نہیں پتوں والے"۔ مائی جی نے صلاح دی۔

"اور وہاں سے بیروت جاؤں گا . . ."

"ترکی سے مرسیڈس کے وہیل کپ خرید لینا، بیروت میں دُگنے پیسوں میں بک جائیں گے"۔

"راستے میں دمشق بھی ٹھہروں گا . . ."

"دمشق؟" مائی جی نے ایک طویل ہچکی لی جیسے فوت ہونے کو ہیں پھر ایک ٹھنڈی یخ سانس بھری اور زار و قطار رونے لگیں۔ "دمشق جاؤ گے؟"

"نہ جاؤں؟" میں نے گھبرا کر کہا۔

"جاؤ پتر جاؤ، جم جم جاؤ، وہاں میرے لئے بھی دعا کرنا . . ." وہ اپنی سفید چادر سے ناک پونچھتے ہوئے ایک اور ہچکی لے کر بولیں۔

"کروں گا مائی جی ضرور کروں گا، لیکن کہاں پر؟" میں آنسوؤں سے لبریز اس صورتِ حال سے خاصا پریشان ہوگیا۔

"موسیٰؑ کے مُصلّے پر . . ." انہوں نے چادر میں ایک اور "شُوں" کی۔

"وہ کہاں پر ہے؟"

"حضرت ابراہیمؑ کے مصلّے کے ساتھ . . ."

"دمشق میں ہیں؟"

"دمشق سے چند کوس کے فاصلے پر، اُس پہاڑ پر جہاں قابیل نے ہابیل کو قتل کیا تھا . . . میں نے وہاں نفل پڑھے ننھے مصلّوں پر . . . ہائے پُتر کیا بتاؤں اللہ کی قدرت، سبحان اللہ . . . سبحان اللہ . . ." مائی جی بدستور روتی رہیں۔ "جونہی قابیل نے ہابیل کو قتل کیا تو مارے دہشت کے چٹان کی زبان باہر نکل آئی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ کروڑوں سال بعد آج بھی وہ چٹان ہابیل کی موت پر آنسو بہاتی ہے۔ میں نے خود دیکھا ہے . . . . اور ان ہاتھوں سے . . . ." اُس نے دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر چلو بناتے ہوئے سسکی بھر کر کہا "میں نے خود وہ پانی پیا ہے۔ چٹان روتی ہے پتر . . . وہاں جانا تو میرے لئے دعا کرنا"۔

"اچھا مائی جی"۔

"اور بی بی زینب کے مزار پر بھی جانا"۔

"اچھا جی . . . ."

"اور دمشق میں صرف عبداللہ ہندی کے فندق میں ٹھہرنا، اپنا آدمی ہے"۔

مائی جی اس کے بعد کچھ دیر خاموش رہیں بمشکل اپنے رواں آنسوؤں کو روکا اور زیرِ لب آیاتِ قرآنی کا ورد کرتی رہیں اور پھر اُٹھ کر سبز قہوہ بنانے لگیں۔

قہوہ خوشبو اور ذائقے کی زبانوں سے عبارت تھا۔ اتنی دیر میں پھر دستک ہوئی اور ایک اور ایرانی ڈھیلے لٹکتے سوٹ میں چلتا ہوا اندر آگیا۔ اُس نے حسبِ دستور سر جھکایا اور ایک فہرست مائی جی کے آگے رکھ دی۔ میں نے مائی جی کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کیا اور پھر اُس کمرے میں چلا آیا جو اس نیک دل خاتون کی سفارش سے مجھے ملا تھا۔ یہاں چار بستر بچھے تھے۔ جن میں سے ایک کا انتخاب کر کے میں لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد دستک ہوئی اور ایک صاحب اندر تشریف لے آئے۔ "مال ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"مال؟ کونسا مال؟"

"پھیرے باز؟" انہوں نے قریب آکر کہا۔

"نہیں نہیں"۔ میں مسکرانے لگا "میں تو سیّاح ہوں"۔

وہ صاحب مایوس ہو کر سر ہلاتے ہوئے چلے گئے۔

ابھی میں اپنے آپ کو بستر پر دراز کرنے کو ہی تھا کہ ایک اور دستک ہوئی اور ایک اور ایرانی نمودار ہوگیا۔ "مال ہے؟" اُس نے پوچھا۔

"نہیں ہے۔" میں نے درشتگی سے کہا۔

"پاکستانی ہو؟" اُس نے صاف اُردو میں پوچھا۔

"ہاں...."

"کمال کے پاکستانی ہو۔ مال ہی نہیں ہے۔" وہ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔

ایک مختصر وقفے کے بعد پھر دستک ہوئی۔ جو صاحب اندر آئے انہیں میں نے بولنے کا موقع ہی نہ دیا۔ "مال نیست۔" میں نے انگلیاں نچا کر کہا۔

"نیست....؟" وہ سر کھجا کر بولے اور لپکتے ہوئے باہر چلے گئے۔

میں اب بستر پہ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا کہ آنے دو۔ اِس مرتبہ جو صاحب اندر آئے انہوں نے دستک دینے کی زحمت بھی گوارا نہ کی، اُن کے ہاتھ میں ایک بیگ تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں کو جتنا بھی خشمگیں بنایا جا سکتا تھا بنایا اور انگلیاں نچاتے ہوئے کہا "مال نیست۔" اُن صاحب نے بُرا سا منہ بنا کر میری جانب دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں کیا بکواس کرتے ہو اور پھر کھڑکی کے قریب والے بستر پر بیگ رکھ کر کپڑے بدلنے لگے۔ معلوم ہوا کہ میری طرح مسافر ہیں اور اسی کمرے میں قیام کرنے آئے ہیں۔ میں نے جھینپ کر تولیہ بغل میں دابا اور غسل خانے میں جا کر شیو بنانے لگا۔

شاید اس میں میری کسی ذہنی کیفیت کا دخل تھا کہ اس دوپہر تہران کا روشن دن مجھے بجھا بجھا سا لگا اور اِسی بجھتی ہوئی کیفیت کی لپیٹ میں آ کر اس کی گلیوں بازاروں میں رواں چہرے بھی کچھ آؤٹ آف فوکس اور راکھ ہوتے دکھائی دیئے۔ رنگ جیسے نچڑ گئے ہوں۔ میں پوری دوپہر بے مقصد گھومتا رہا۔ تہران میرا دوست نہ بنا، مجھ سے کھنچا کھنچا سا رہا۔ میں نے چوڑے فٹ پاتھ پر سجے درجن بھر تصویری کارڈ خریدے اور ایک پارک میں بیٹھ کر اُن پر اپنے دوستوں عزیزوں کے نام گھسیٹ دیئے۔ پھر ایک بس پر سوار ہوا جو معلوم نہیں کدھر کو جاتی تھی۔ آخری سٹاپ پہ پہنچ کر بھی

میں اپنی نشست پر براجمان رہا تا آنکہ وہ مجھے واپس اسی سٹاپ پر نہ لے آئی جہاں سے میں بوریت کے بوجھ تلے دب کر اُس میں سوار ہوا تھا۔ شام ہوئی تہران کے وہ چہرے جو دن کی روشنی میں بنجر لگ رہے تھے اب اُنہی کے خدوخال پر رنگ برنگی روشنیوں اور بے باکی کی فصلیں اگنے لگیں مگر میں بجائے اس کے کہ ایک تھکے ہوئے بیل کی طرح ان فصلوں پر منہ مارنے کی کوشش کرتا، شہر کی سرد مہری میں ٹھٹھرتا واپس اپنے نئے ٹھکانے پر چلا گیا۔

"مسافر خانہ نادر" میں مَیں نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا تو میرے بستر پر ایک شخص بھنگڑا ڈال رہا تھا.... اُس نے رنگین لنگی کے اوپر ایک امریکی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ جس پر بڑے بڑے حروف میں "MAKE LOVE NOT WAR" لکھا ہوا تھا اور وہ "ایلی ایلی" کے نعرے بلند کرتا بھنگڑا ڈال رہا تھا۔ دوسرے بستر پر ایک صاحب آنکھیں لال گلال کئے کھیرا نوش کر رہے تھے۔ بستروں کے درمیان میں تپائی پر ایک بوتل دھری تھی اور قابل فہم طور پر شراب کی تھی۔

"او آئے، او آئے" بھنگڑے کا شوقین مجھے دیکھ کر بستر سے اُترا اور زبردستی بغل گیر ہو گیا۔

"کون آئے، کون آئے" کھیرا کھانے والے نے چونک کر پوچھا۔

"اوئے اپنے باؤجی آئے.... اُٹھ اوئے ڈھینگر، باؤجی کے لئے پیگ بنا۔" اُس نے نحیف نوجوان کے پیٹ میں ایک معقول قوت کا گھونسا رسید کرتے ہوئے حکم دیا۔ وہ غریب لڑکھڑا کر بستر پر گرا اور پھر فوراً ہی ربڑ کے گڈے کی طرح سیدھا ہو گیا۔

"اوئے باؤے تیری میں کواری کو.... کتنی مرتبہ کہا ہے مارا نہ کر میرے گردے کمزور ہیں۔" ڈھینگر نے لال پیلے ہوتے ہوئے کہا۔

"اوئے ڈھینگر تیری میں ماں.... باؤجی کے سامنے گالی دیتا ہے۔" اُس نے ڈھینگر کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ رسید کیا۔ "بنا پیگ باؤجی کے لئے۔"

"نہیں بھائی جی آپ پئیں.... میں ذرا__"

"نئیں جی یہ نہیں ہو سکتا...." باوے نے ہاتھ جھٹک کر گرم ہوتے ہوئے کہا۔

"میں دراصل.... میں بہت فُل ہو کر آیا ہوں باہر سے...."

"اچھا...." باوا منہ کھول کر ہنسنے لگا۔ "تو پھر کھیرا کھاؤ۔"

میں چپکے سے بیٹھ کر کھیرا کھانے لگا۔

کمرہ تو میرا ہی تھا۔ مگر حسبِ دستور میری غیر موجودگی میں یہاں دیگر مسافران کو بھی فٹ کر دیا گیا تھا۔ کھڑکی کے قریب اس کمرے کا چوتھا باسی یعنی وہی ایرانی ہماری طرف پشت کئے اس ہنگامۂ مے نوشی سے بے خبر مزے سے خراٹے لے رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد کھیرے ختم ہو گئے۔

"اُٹھ اوئے ماں کے خصم...." باوے نے ڈھینگر کو ایک تھپڑ نما تھپکی دی۔ "جا کھیرے لا۔"

ڈھینگر جھومتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

"یہ جو ڈھینگر ہے ناں اپنا یار ہے۔" باوا پیار سے بولا۔

"ہاں وہ تو لگتا ہے۔" میں نے خوفزدہ آواز میں آہستہ سے کہا۔ باوا اس وقت خمار کی اُس حالت میں تھا جب بجلی کے کھمبے سڑک کے عین درمیان میں چہل قدمی کرتے نظر آنے لگتے ہیں۔

"ہم دونوں آج ہی کویت سے آئے ہیں.... وہاں سے مال لائے ہیں۔ ہمیشہ اسی مسافر خانے میں ٹھہرتے ہیں۔ یہاں گاہک خود بخود آتا ہے۔"

"آپ پھیرے باز ہیں؟"

"اللہ کا کرم ہے۔" اُس نے دونوں ہتھیلیوں کو اس طرح اُٹھایا جیسے اِن پہ رکھے وزن کو بیلنس کر رہا ہو۔

"کھیرے تو نہیں ملے، یہ لے آیا ہوں۔" ڈھینگر اندر آ گیا۔ اُس کے ہاتھوں میں ایک تربوز تھا۔

"اوئے گلہری کی اولاد شراب کے ساتھ تربوز کون کھاتا ہے...."

"نہیں ملتے کھیرے...." ڈھینگر نے روٹھتے ہوئے کہا۔

"اوئے گوالمنڈئیے کاں یاروں سے ناراض نہیں ہوتے۔" باوے نے اسے پیار سے ایک زوردار تھپڑ لگایا۔

"آپ گوالمنڈی کے ہیں؟" میں نے ڈھینگر سے پوچھا۔

"جی باؤجی۔"

"میرا کاروبار بھی اسی علاقے میں ہے۔"

"اچھا...." ڈھینگر گلوگیر ہو گیا۔ "باؤجی آپ دادو کو جانتے ہیں؟"

"کیا کرتا ہے؟"

"چکڑ چھولے بیچتا ہے۔ چوک میں.... میرا تایا ہے، اس کی ایک آنکھ میں نقص ہے۔"

"کانا ہے...." باوے نے تربوز کاٹتے ہوئے قہقہہ لگایا۔ "دادو کانا چھولیاں والا۔"

"اوئے باوے تیری میں.... تجھے شرم نہیں آتی میرے تائے کے لئے گستاخی کرتا ہے...." ڈھینگر لرزتے ہوئے بولا۔

"اوئے رنجیت سنگھ کی اولاد چپ کر کے بیٹھ...." باوے نے ڈھینگر کے سر پہ ایک ٹھاپ لگائی اور ڈھینگر غصے میں آ کر سامنے رکھا گلاس ڈیک لگا کر پی گیا۔

"اور آپ کہاں کے ہیں؟" میں نے باوے سے دریافت کیا۔

"میں سیالکوٹ کا ہوں، وہاں بھی کاروبار ہے۔"

"اوئے باوے خدا کو جان دینی ہے ..."، ڈھینگر سیدھا ہو گیا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا "باؤجی یہ وہاں ایک سنیارے کی دکان پر کام کرتا تھا۔ کہنا بناتا تھا"

"اوئے موج سنیارا لے گیا ..." باوے نے گلا پھاڑ کر گلاس اندر کیا اور پھر اٹھ کر میرے بستر پر بھنگڑا ڈالنے لگا۔ میں بھی چونکہ اُسی بستر پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس لئے اس کی اُچھل کود سے پسنجر گاڑی میں بیٹھے کسی مسافر کی طرح بے اختیار ہلنے لگا۔

"اوئے پھر مروائے گا ..." ڈھینگر میز پر گھونسا مار کر بولا۔

باوا بدستور بھنگڑا ڈالتا رہا۔ چنانچہ ڈھینگر اپنا بدبودار منہ میرے قریب لے آیا "جہاں جاتا ہے۔ گھُٹ لگا کر بھنگڑا ڈالنے لگتا ہے اور پھر ہم دونوں کو مسافر خانے والے نکال دیتے ہیں۔ آج بھی اس نے راہداری میں ایک سکھنی کو چھیڑا تھا۔ وہ تو سکھ کوئی شریف سکھ تھا ورنہ یہ قتل ہو جاتا ... باؤجی آپ ہی اسے منع کریں ..."

"میں کیسے منع کروں ... ؟"

"آپ کے بستر پر ناچ رہا ہے، منع کر دیں"

"کر دوں؟" میں نے جرأت جمع کرتے ہوئے پوچھا۔

"آہو ..."

"اے بھائی باوا صاحب ..." میں نے ایک خوفزدہ مسکراہٹ چہرے پر پھیلاتے ہوئے گذارش کی "یہ بستر ٹوٹ جائے گا، ہوٹل والے شاید پسند نہ کریں، آپ سے قیمت وصول کر لیں گے"

باوا ہانپتے ہوئے رُکا اور لُنگی کا ایک لڑ کھول کر اس میں بندھے ہوئے نوٹ ہوا میں اُڑا دیئے "اوئے ہمارے پاس رقمیں ہیں لٹا دیں گے"

ڈھینگر کی سرخ آنکھیں باقاعدہ لٹو کی طرح گھومنے لگیں۔ وہ زیرِ لب گالیاں بکتا فرش اور بستر پر سے نوٹ جمع کرنے لگا۔ اس دوران باوا چپ چاپ کھڑا اسے

دیکھتا رہا۔ جونہی اُس نے نوٹ اکٹھے کر کے اُسے واپس کئے اُس نے بڑی احتیاط سے اُنہیں لُنگی میں باندھا اور ایک زبردست قسم کی بڑک لگا کر پھر سے ناچنے لگا۔ ڈھینگر نے تربوز کی طرف کی رجوع کر لیا۔ اس ہنگامہ آرائی کے دوران ہمارا ایرانی شریک کبھی کبھار کروٹ بدل کر ہمیں گھورتا اور پھر منہ پھیر کر اونگھنے لگتا۔

"تہران اس مرتبہ بہت ہی نامہربان ہے"۔ میں نے سوچا۔ "پچھلی شب فرش پر گذری مرغیوں اور بچوں کے ساتھ، آج سارے دن میں ایک بھی ایسا لمحہ نہ آیا جو دیوانگی سیاحت کا جواز بنے اور اب میں ہوں اور یہ تربوز کھاتا ڈھینگر اور میرے بستر پر ناچتا باوا"۔ اِس وقت یہ بھی ممکن نہ تھا کہ میں اپنا سامان اٹھا کر کسی اور ٹھکانے کی تلاش میں نکلتا۔ چنانچہ میں نے ڈھینگر کے ساتھ مذاکرات شروع کر دیئے "کتنے بجے سونے کا پروگرام ہے؟"

"ہیں؟" ڈھینگر چوکنا ہو گیا۔ "ابھی تو ہم نے بیئر پینی ہے، ٹھنڈک کیلئے وہسکی کی گرمی دور۔ جگر کی گرمی دور ... دفع دور"

"اور اُس کے بعد؟"

"اُس کے بعد ہم ذرا معشوقوں کو پکڑنے جائیں گے، وہاں ..." ڈھینگر شرماتے ہوئے بولا۔

"آپ لوگ یہی شغل کرتے رہتے ہیں تو مال کب اور کس وقت بیچتے ہیں؟"

ڈھینگر کھسک کر میرے قریب آ گیا اور بڑی رازداری سے کہنے لگا "باؤجی میں تو چار ٹرنک لایا ہوں، اپنا مال ہے، اور باوے کا تو صرف ایک ہے ..."

"اوئے ..." باوا فوراً پلنگ سے نیچے اُتر آیا۔ "ڈیوس کی اولاد کیا کہا ہے؟ میرے پاس صرف ایک ٹرنک ہے؟"

ڈھینگر قدرے خوفزدہ ہوا مگر میری جانب دیکھتے ہی اپنا منحنی سینہ پھلا دیا "آہو کہا ہے میں نے ..."

باوے نے اُسے ایک زناٹے کا طمانچہ رسید کیا" اوئے جل ککڑ باؤجی کے آ
ہماری بے عزتی کرتا ہے ....." وہ میرے قریب منہ لاکر بولا " باؤجی ٹرنک ایک
لیکن مال اپنا ہے اور اس کے تین ٹرنک شیخ کے ہیں، یہ تو کمیشن پر کام کرتا ہے
کمیشن پر کام کرنا غالباً اُن کے نزدیک ڈوب مرنے کا مقام تھا کیونکہ ڈھینگر
دم کھڑا ہوگیا" اوئے تیری میں ماں کو..." وہ باقاعدہ باوے پر حملہ آور ہوگیا۔ باوا
کی ناتواں مُکیاں کھاتا رہا اور مسکراتا رہا۔ ڈھینگر نے تاؤ میں آکر اپنے حملے تیز کر دیئے
ڈھینگا مُشتی میں جانے کس طرح باوے کے چہرے پر ایک گہری خراش آگئی۔ اس
مسکرانا بند کیا، تکیئے کے نیچے سے ایک خنجر نکالا اور ایک زوردار بڑک لگا کر گالیاں
غریب ڈھینگر کی طرف بڑھا۔ ڈھینگر ایک دم چوکنا ہوگیا اور دروازے کی جانب
لپکا لیکن باوے نے پیچھے سے اُس کی شلوار کے درمیان میں ہاتھ اڑس کر اُسے
گرالیا اور اُس کے سینے پر سوار ہو کر خنجر لہراتا بڑکیں لگانے لگا۔ میں آہستہ سے کھ
کھسکتا ایک کونے میں دبک گیا۔ ڈھینگر نے نہ جانے کیسے اپنے آپ کو چھڑایا اور پھر
کی جانب بھاگا۔ اس دوران باوے نے خنجر جو لہرایا تو ڈھینگر ایک دم پلٹ
" اوئے مار دیا" اس کے بازو میں سے خون رِس رہا تھا، اُس نے ہاتھ لگا کر اس
گیلاہٹ محسوس کی اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگا" اوئے باوے مار دیا....
اوئے تیری میں کواری .... اوئے بہن .... میں مرگیا.... لوکو میں مرگیا"
ڈھینگر نے شراب کی بوتل اُٹھا کر فرش پر دے ماری اور پھر "مرگیا، مرگیا"
شور مچاتا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ اب باوا قدرے سوبر ہوا اور خنجر میر
کے نیچے چھپا کر میرے سامنے آکھڑا ہوا" باؤجی آپ آرام سے بیٹھیں، ہم تو شغل
کر رہے تھے"

میں نے دوسری جانب نگاہ ڈالی تو دوسرے کونے میں وہ ایرانی دیو
ساتھ گوند سے چپکا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد مسافر خانے کا مالک کمرے

داخل ہوا۔ اس کے ہمراہ دو سپاہی بھی تھے۔ انہوں نے ریوالور تان کر ہم تینوں کو ایک قطار میں کھڑے ہونے کا حکم دیا۔ ایرانی مسافر نے انہیں کچھ کہا تو اسے دوسری جانب کھڑے ہونے کی اجازت مل گئی۔ سپاہیوں کے ہمراہ ڈھینگر بھی کھڑا تھا اور اس کے بازو سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ بدستور رو رہا تھا اور چلا رہا تھا کہ لوکو میں مرگیا۔ ایرانی سپاہی باآواز بلند کچھ کہہ رہے تھے۔ اُدھر مسافر خانے کا مالک جانے کیا کہہ رہا تھا۔ اِدھر باوا کچی پکی فارسی میں جانے انہیں کیا سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ خاصے بحث مباحثے کے بعد سپاہی آگے بڑھے اور مجھے اور باوے کو بازوؤں سے جکڑ لیا۔ وہ ہمیں گرفتار کر رہے تھے۔ میں نے اپنی مختصر فارسی میں انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ میرا اِن دو حضرات سے کسی قسم کا تعلق واسطہ نہیں، سوائے اس کے کہ میں بھی پاکستانی ہوں، مگر وہ سر ہلا کر " بالے بالے" کہتے رہے اور مجھے کمرے سے باہر گھسیٹنے کی کوشش کرتے رہے۔ اتنی دیر میں ایرانی مسافر آگے آیا اور اُس نے انہیں غالباً یہی بتایا کہ میں یقینی طور پر اِن دو کا ساتھی نہیں ہوں اور میں صرف اُن کے ساتھ کمرہ شیئر کرنے کا قصور وار ہوں۔ اُس کی سفارش پر پولیس نے مجھے نیم دلی سے چھوڑ دیا اور باوے کے ساتھ ڈھینگر کو بھی گرفتار کر کے لے گئی۔ اُن کے رخصت ہونے پر مسافر خانے کے مالک نے کمرے کی صفائی کروائی۔ شیشے کے بکھرے ہوئے ٹکڑے چنے، باقی ماندہ تربوز بغل میں دابا اور رہم سے معذرت کر کے واپس چلا گیا۔ ایرانی نے اشاروں میں بتایا کہ اب اُسے نیند نہیں آرہی۔ چنانچہ اُس نے اپنے بیگ میں سے واڈکا کی ایک بوتل نکالی اور اُسی تپائی پر رکھ دی جس پر تھوڑی دیر پہلے ڈھینگر اور باوے کی بوتل دھری تھی۔ اس سے پیشتر کہ وہ مجھے پینے کی دعوت دیتا میں نے طمانیت کی ایک لمبی سانس بھری اور اپنے بستر میں گھس گیا۔

:• ———— •:

تہران کی سرد مہری اگلی صبح بھی جوں کی توں قائم تھی۔ چمکتی دھوپ کے باوجود وہ اپنی لاتعلقی کی ٹھنڈی سانسوں سے میرے بدن کو یخ کرتا رہا۔ تہران آج بھی وہی کتاب تھا جسے میں کل پڑھ چکا تھا اور اس میں کہیں بھی میرے لئے چاہت کا ایک لفظ نہ تھا، صرف بے مہری تھی، کھچاوٹ تھی۔ چہرے راکھ ہوتے ہوئے، گلیاں بازار بجھتے ہوئے، تہران آج میرا دوست نہ بنا، مجھ سے دور رہا۔ چنانچہ میں نے بھی اس شہرِ نامہرباں کو نظرانداز کیا اور اپنا رُخ اِس کے ایک ایسے باسی کی جانب کر لیا جو میرا دوست تھا.... میں نے سُکھ دیپ کو فون کیا.... کال آپریٹر سے منتقل ہو کر ایک نسوانی آواز تک پہنچی "مسٹر سُکھ دیپ میٹنگ میں ہیں نو کالز...." ساتھ ہی کلک ہوئی اور فون بند ہو گیا۔ میں نے پھر ڈائل کیا۔

"مسٹر سُکھ دیپ میٹنگ...."

"مجھے صرف ایک منٹ کے لئے ملا دیں بہت دور سے آیا ہوں...."

"کون صاحب بات کریں گے؟"

"تارڑ"

"جی تا... تارر...." ایرانی سیکرٹری میری "ڑ" پر اَڑ گئی۔

آپ پلیز ملا دیں، میں اُن کا ایک غیر ملکی دوست ہوں"

"ہیلو سُکھ دیپ ہئیر۔۔۔" اُدھر سے ایک بھرپور کھُردری آواز آئی۔

"سُکھ دیپ تم نے کہا تھا کہ کبھی تہران واپس آنا، ہم دن کے اُجالے میں [illegible]

چلیں گے۔۔۔ میں آگیا ہوں"

"جنٹلمین دی میٹنگ اِز اوور۔۔۔ تھینک یو" جواب آیا۔

"کیا مطلب؟" میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

اُدھر خاموشی طاری رہی۔

"ہیلو۔ ہیلو" مجھے شبہ ہوا کہ فون بند ہو گیا ہے۔

"اوئے سُسرے کیا ہیلو ہیلو لگا رکھی ہے" کچھ دیر بعد پھر اُس کی آواز

آئی "کچھ عقل کر، یہاں جن سوہروں کے ساتھ میٹنگ کر رہا تھا۔ انہیں نہیں [illegible]

کمرے سے باہر۔۔۔"

"وہ یقیناً مجھے پہچان نہیں پایا تھا۔ کسی اور کے دھوکے میں تھا" سُکھ دیپ

میں تارڑ بول رہا ہوں، پاکستان والا"

"اوئے آہو۔۔۔ تو بھی مُسلا ہی رہے گا۔ تیرا کیا خیال ہے کہ اس تہران [illegible]

کوئی اور سُسرا ہے۔ جس کے لئے میں اپنی بزنس میٹنگ ختم کر سکتا ہوں۔ [illegible]

"مل کر پوچھ لے۔۔۔" میری باچھیں کھِل گئیں۔

پندرہ منٹ بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ باہر نیلے رنگ کی وردی [illegible]

جرنیلوں ایسی سنہری پی کیپ سجائے ایک صاحب اٹینشن کھڑے تھے "مسٹر [illegible]

دیپ نیچے گاڑی میں بیٹھے آپ کا انتظار کر رہے ہیں، میں اُن کا شوفر ہوں"

فٹ پاتھ کے پہلو میں کھڑی سیاہ مرسیڈس کی پچھلی نشست پر سُکھ دیپ [illegible]

اپنی پٹیالہ طرز کی پگڑی کے بیٹھا انگلیاں چٹخا رہا تھا۔۔۔ سُکھ دیپ کا تیسرا روپ

پہلا رُوپ تو اب دھندلانے لگا ہے۔۔۔ جب میں اور وہ ساؤتھ اینڈ کی ہائی

سٹریٹ پر ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ہر سکرٹ پر مر مٹنے کی نظریں لئے گھوما کرتے تھے۔

ہماری انگریز دوست لڑکیاں اس حرکت پر بے حد بُرا مانتی تھیں۔ اُن کا خیال تھا کہ ہم

کچھ کچھ "ہومو" ہیں۔ جب وہ رات گئے حالتِ خمار میں میرے کمرے کے باہر کھڑا

ہو کر بے تحاشا قہقہے لگایا کرتا تھا۔ کافی ہاؤس میں داخل ہوتا تو اس کی پگڑی میں ٹانکا

ہوا عام شیشے کا ٹکڑا کوہِ نور کی طرح چمکتا اور لڑکیاں اس ہندوستانی "مہاراجے"

پر مر مٹتیں۔ ہم دونوں ایسے پرندے تھے جن کے پر نئے نئے اُگے تھے اور ہم انہیں

اندھی پروازوں کے لئے اندھا دھند استعمال کرتے۔ مگر وہ طالب علمی کا نوخیزی کا پیریڈ

تھا، آزاد اور بے دریغ محبتوں کا زمانہ،۔۔۔ پھر ہم اپنے اپنے گھونسلوں کی طرف لوٹ

گئے۔۔۔ سُکھ دیپ کا دوسرا روپ آج سے چھ برس پہلے کا تھا۔ جب میں اپنے

گھونسلے سے اُڈاری مار کر باہر نکل آیا اور تہران میں ہمارا میل ہو گیا۔ وہ اب بھی اسی

طور لاپروا اور ہنس مکھ اور مخلص تھا۔ صرف شادی ہو چکی تھی اور ایک وسیع کاروبار

کا مالک تھا۔ مجھے دیکھ کر اُس نے خوشی سے اپنے خوابیدہ پر پھڑ پھڑائے اور ہم دونوں

شمران کے قہوہ خانوں میں جھرنوں اور آب جو کی موسیقی پر جھومتے دریائے خراج کے

کناروں پر رواں کیسپئین سمندر کی طرف برق رفتاری سے پرواز کرنے لگے۔ اُس کی

سپورٹس کار مازندران کے جنگلوں میں اُڑتی، ریچھوں اور بھیڑیوں سے بچتی بچاتی رات

کے پچھلے پہر ہمیں رامسر لے گئی۔ وہاں اُس نے اپنی بیوی کو فون کیا اور "میں چلی پٹیالے"

کی دھمکی سُن کر فوراً سوبر ہو گیا۔ ہم دونوں کو اُسی رات واپس تہران لوٹنا پڑا۔ اُس نے

جُدا ہوتے ہوئے کہا تھا "واپس آنا، ہم پھر کیسپئین چلیں گے۔ لیکن دن کے اُجالے میں"

اور پھر ایک زوردار قہقہہ لگا کر تہران کی کہر آلود صبح میں گم ہو گیا تھا۔

اور اب، اِس وقت "مسافر خانہ نادر" کے فٹ پاتھ کے پہلو میں وہ ایک

پرانی سپورٹس کار کی بجائے سیاہ مرسیڈس کی پچھلی نشست پر بمع اپنی پٹیالہ طرز کی پگڑی

کے بیٹھا انگلیاں چٹخا رہا تھا… سُکھ دیپ کا تیسرا روپ۔ مجھے دیکھ کر وہ
سا بن گیا اور داڑھی میں سے پھوٹتی مسکراہٹ پر قابو پانے کی ناکام کوشش
دوسری طرف دیکھنے لگا۔ پھر وہ ہنستا ہوا باہر نکلا اور ایک اُداس ریچھ کی طرح
چھلاتے ہوئے بغلگیر ہو گیا۔ "اوئے تارڑا، اوئے تارڑا"؛ وہ بار بار کہہ رہا تھا
قہقہے لگا رہا تھا مگر اُس کے بھرپور قہقہے میں کہیں دُکھ
تھیں جیسے اندر سے اُداسی طنابیں کھینچ رہی ہو۔

"کیسے ہو سکھ دیپ؟" میں نے تہران کی سرد مہری میں گرمیٔ یار محسوس
کرتے ہوئے پوچھا۔

"دیکھ لو"؛ وہ پیچھے ہٹا اور بازو پھیلا کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ پہلے
سے قدرے صحت مند۔ داڑھی میں چند سفید بال۔ کِھلا ہوا وسیع سُکھ دیپ۔

"بال بچے کیسے ہیں؟"

"ٹھیک ہیں"؛ وہ سمٹ کر بولا "بیٹھو کار میں"۔

کار کا انجن قالین پر براجمان ایک مغرور ایرانی بلّی کی طرح ہلکے ہلکے غرّا رہا
میں نے سکھ دیپ کی جانب دیکھا۔ وہ انگریزوں کے بقول بالکل درست
طور پر ملبوس تھا۔ اُس کی مسکراہٹ ابھی تک اس کے قابو میں نہیں آ رہی تھی
نے گھڑی پر نگاہ ڈالی اور ایک دم شرمندہ سا ہو کر کہنے لگا "یار مائنڈ نہ کرنا
آج صرف ایک گھنٹے کے لئے تمہارے ساتھ رہ سکوں گا۔ میں نے بچوں سے وعدہ
رکھا ہے کہ چار بجے انہیں نہلانے کے لئے سومنگ پُول لے کر جاؤں گا"۔

"یہ تمہارا نہلانے کا خبط ابھی تک نہیں گیا" میں ہنس دیا۔ "مجھے کیسپین کے
میں ڈبکی لگوانا چاہتے تھے اور اب بچوں کو سومنگ پول پر لے جا رہے ہو"۔
نہیں اگر تم کہتے ہو تو…"

"نہیں سُکھ دیپ بچوں سے کئے ہوئے وعدے پورے کرنے چاہئیں

اور خاص طور پر سکھ بچوں سے کئے ہوئے وعدے…"

"اوئے تارڑا تو کبھی میرے بچے دیکھ لے ناں… واہ گورو کی قسم ایسے بچے
ہیں کہ…"

"مجھے یقین ہے کہ بہت ہی خوبصورت ہوں گے… سُن رکھا ہے کہ گدھے کے
بچے اور سکھ کے بچے جب چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں تو بہت خوبصورت ہوتے ہیں…"

"اور جب بڑے ہو جاتے ہیں تب؟" وہ دل کھول کر ہنستا ہوا کہنے لگا۔

"تب وہ علی الترتیب گدھے اور سکھ میں بدل جاتے ہیں"۔

"اوئے"؛ وہ باچھیں کھلاتا ہوا بولا "کم از کم بچپن میں تو خوبصورت ہوتے ہیں
اور مُسلوں کے بچے… اب تمہیں ہی دیکھو… خیر یار چھوڑ اس سُسرے مسافر
خانے کو اور بوریا بستر اٹھا کر میرے گھر چلے آؤ… میں شام کو اُسی ڈرائیور کو بھیج
دوں گا"۔

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا"؛ میں نے مصنوعی سنجیدگی سے کہا۔

"پر کیوں؟" وہ ماتھے پر بل ڈال کر بولا

"اگر بھابھی کو پتہ چل گیا کہ میں وہی تارڑ ہوں جو چھ برس پہلے اس کے ڈارلنگ
خاوند کو اغوا کر کے کیسپین کے کنارے لے گیا تھا تو… وہ تو مجھے مار دے گی"۔

سُکھ دیپ بجھ سا گیا۔ اُس نے گھر چلنے کی دعوت کو دہرایا نہیں، خاموشی سے باہر
دیکھنے لگا۔

"ہم جا کہاں رہے ہیں؟" میں نے اُس کی طویل خاموشی میں مخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

"ہوں…" اُس کا چہرہ راکھ ہو رہا تھا۔

"سُکھ دیپ ہم کل مل لیں گے۔ تم بے شک ابھی چلے جاؤ اپنے بچوں کے پاس"۔

"اوئے نئیں اوئے"؛ وہ یکدم نارمل ہو گیا۔ "ابھی کنٹیکی ان چلتے ہیں۔ بیئر پینے
کے لئے۔ چار بجے میں بچوں کے پاس چلا جاؤں گا اور کل دفتر سے چھٹی کر کے ہم دونوں

تہران کو ذرا سرخ کریں گے۔ انشاءاللہ!"

انشاءاللہ کے استعمال پر میں قدرے چونکا۔ مگر پھر خیال آیا کہ افغان سکھ تو بالعموم
لاحول ولاقوۃ بھی پڑھتے ہیں۔

سیاہ مرسیڈس کنٹیکی اِن ریسٹوران کے باہر کھڑی ہوئی اور ایرانی بلی کی غراہٹ
بند ہو گئی۔

"سکھ دیپ وہ تمہاری سپورٹس کار کہاں گئی؟" ریسٹوران کی نیم تاریک سیڑھیاں
اُترتے ہوئے میں نے پوچھا۔

"یار اُس کا حادثہ ہو گیا تھا... ایک ایرانی سُسرے نے دے ماری اپنی پر
پتہ ہے پولیس نے جرمانہ بھی مجھے ہی کیا۔"

"کیوں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"اس کی گاڑی کھڑی تھی اور میری چل رہی تھی۔" اُس نے ایک بے دھڑک قہقہہ
لگایا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

زیرِ زمین ریسٹوران کی تاریکی میں لوگ سر جھکائے شاید کچھ کھا رہے تھے اور ویٹر
کے درمیان جھکے جھکے چوروں کی طرح چل رہے تھے۔ ہم ایک کونے میں بیٹھے تو چوروں
کی نسل کا ایک فرد ہمارے پاس چلا آیا، میز پر دو ٹوکریاں سجائیں اور چلا گیا۔ ایک
صاحب اندھیرے میں سے نمودار ہوتے اور دو مگ ہمارے سامنے جما کر دھیرے سے
غروب ہو گئے۔ روشنی اتنی قلیل تھی کہ دوسری میزوں پر بیٹھے لوگوں کے بارے میں قطعی
پر نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ کھانا کھا رہے ہیں یا سر جھکائے شطرنج کھیل رہے ہیں۔ بہر حال
ہم دونوں شطرنج نہیں کھیل رہے تھے کیونکہ ہمارے سامنے بانس کی ٹوکریوں میں کینٹکی
طرز کا خصوصی روسٹ چکن تھا اور مگ ایرانی آب جو سے لبریز۔ مختصر وقفوں کے بعد
۔یہیں میں مقیم وہی صاحب دبے پاؤں نمودار ہوتے اور خالی مگ کی جگہ ایک اور مگ
جاتے جو خالی نہ ہوتا۔ آنکھیں نیم تاریکی کی عادی ہونے لگیں اور ریسٹوران طلوع ہونے

کے اُداس لمحوں میں ہرات کی تصویر کی طرح روشن ہوتا چلا گیا اور ہم اپنے جسموں میں پھیلتی
روشنی کی تمازت سے آسودہ ہوتے ہوئے باتیں کرنے لگے۔ میں نے اُسے پچھلے چھ
برسوں کی تفصیل سنانا چاہی مگر تمام قابلِ ذکر واقعات دس منٹ میں ختم ہو گئے۔
کیونکہ یہ زندگی ایک مشینی آدمی کی تھی جو ڈائل پر درج ہندسوں کے تحت شب و روز
میں ٹِک ٹِک کرتا گذرتا جاتا تھا، کولھو کے بیل کی طرح ایک ہی دائرے میں حرکت
کرتا ہوا۔

"اور تم؟ تم کیا کرتے رہے سکھ دیپ؟"

سکھ دیپ نے لبریز مگ کے اُوپر جھاگ کے گول دائرے میں پھونک ماری اور
اُس میں سمٹتے ہوئے سوراخ پر ہونٹ رکھ کر ایک طویل گھونٹ بھرا "میں"؟ اُس نے
مونچھوں پر سے جھاگ پونچھتے ہوئے سوچا۔

"اوئے" وہ بڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ "چار بجنے والے ہیں، میں ذرا بچوں کو فون کر
آؤں۔" اس سے پیشتر کہ میں کچھ کہتا وہ کاؤنٹر پر کھڑا ڈائل گھما رہا تھا۔

"انہیں کہا ہے کہ پانچ بجے آجاؤں گا...." وہ اپنی نشست پر بیٹھتے ہوئے
کہا۔ "تمہارا ایک مُسلا چاچا آیا ہوا ہے۔"

"لیکن سکھ دیپ بچے تو...."

"چھوڑ تارڑ.... چار کی بجائے پانچ بجے نہا لیں گے، نہانا ہی ہے ناں؟" اُس
نے ایک اور طویل گھونٹ بھرا۔ وہ آب جو کی گرمی کے باوجود کچھ بجھا بجھا سا تھا۔

"اوئے تارڑ...." وہ یکدم چوکنا ہو گیا۔ "یہ تم پاکستان جا کر کتابیں وغیرہ بھی
لکھتے ہو؟"

"ہاں" میں خوش ہو کر بولا۔ "لیکن تمہیں کیسے معلوم ہو گیا؟"

"مجھے اس طرح معلوم ہو گیا کہ ہر دوسرے تیسرے مہینے کوئی نہ کوئی پاکستانی
سیّاح تمہاری کتاب بغل میں دابے مجھے تلاش کرتا ہوا میرے دفتر میں آنکلتا ہے

اور بس کھڑا مجھے دیکھتا ہے اور دانت نکالتا ہے۔"

"تو مشہوریاں ہوگئیں ناں تمہاری ....؟"

"آہو۔" اس نے ایک بے پناہ قہقہہ لگایا مگر فوراً ہی سنجیدہ ہو کر مجھے گھو
ہوئے کہنے لگا "تم غلط باتیں بھی تو لکھ دیتے ہو۔"

"غلط باتیں؟"

"آہو۔ دارو کے بارے میں ڈنڈی مار گئے ناں ...."

سُکھ دیپ درست کہتا تھا۔ میں مجرم تھا۔ ہم جس نقلی معاشرے میں رہتے ہ
وہاں بازار میں سے شریفانہ طور پر گذرنے کے لئے، کسی محفل میں بیٹھنے کے لئے
رشتہ داروں سے میل جول رکھنے کے لئے ڈنڈی مارنی ہی پڑتی ہے۔ نہ ماریں تو
ماردیں۔ سو فی صد سچ کی شراب ہمیں کبھی ہضم نہیں ہوتی، ہم قے کر دیتے ہیں۔

پونے پانچ بجے سُکھ دیپ پھر اُٹھا اور کاؤنٹر پر جا کر بچوں کو فون کیا کہ وہ تیا
رہیں۔ انہیں ہر صورت میں چھ بجے سومنگ پول پر لے جایا جائے گا۔ اُس کی غیر
میں میں نے ریستوراں میں چہل قدمی کرتی ایک خاتون خوانچہ فروش سے ایک سگا
اور سُلگا لیا۔

سُکھ دیپ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک گہرے بھورے رنگ کے مشر
کی بوتل تھی "آب جو میں اب اثر نہیں، اسے چکھتے ہیں۔"

"بارہ مگوں کے بعد تو ظاہر ہے نہیں رہتا .... مگر یہ ہے کیا؟"

"تمہیں گنے پسند ہیں؟"

"گنے؟ یعنی کماد؟" میں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ آب جو کا اثر یقیناً ہوا ت
"آہو گنے .... یہ گنے کا رس ہے، صاحب لوگ اسے رَم کہتے ہیں۔" اس ن
ڈھکن اُتار کر مشروب کو سونگھا "خالص پوتے گنے کا رس ...."

رس واقعی خالص تھا کیونکہ اس کی چند چسکیوں نے اُسے خوش باش بنا دیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ ہوا میں شکاری کتے کی ناک سکیڑتے ہوئے کہنے لگا "اوئے
یہ کپڑا جلنے کی بو کہاں سے آرہی ہے؟"

میں نے بتایا کہ میں سگار پی رہا ہوں۔

"اوہ .... پیو ضرور پیو لیکن خالصہ تمباکو نہیں پیتا صرف گنے کا رس پیتا
ہے۔" وہ پہلی مرتبہ کھل کر ہنسا اور گلاس کو ڈیک لگا کر پی گیا۔ مگر یہ سرخوشی عارضی
تھی۔ اُس نے جبڑے بھینچ لئے اور سر جھکا کر کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر اُس نے
بجھی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور ایک ایسے شخص کی طرح گویا ہوا جو مکمل طور پر
نارمل ہے اور جس کے خون میں الکوحل کی مقدار زیرو فی صد ہے "تم شاید سمجھتے ہو کہ میں
ہمیشہ اسی طرح بلا نوشی کرتا ہوں۔ نہیں تارڑ صرف جب تم ملتے ہو تب! تمہیں ملتے
ہی وہ تمام سال پرانی کینچلی کی طرح میرے جسم سے اُترنے لگتے ہیں جنہوں نے مجھے اُن
دنوں سے جُدا کر دیا ہے جب ہر درخت سرسبز لگتا ہے اور ہر بدصورت لطیف زاج ہنس
دکھائی دیتی ہے .... رائڈر ہیگرڈ کی "شی" کی طرح تم گذشتہ زمانوں کی ایسی آگ ہو جو مجھے
پھر سے آزاد اور خوبصورت کر دیتی ہے .... تمہارے ساتھ میں نیچرل محسوس کرتا ہوں۔
جبکہ دوسروں کے سامنے مجھے ایک مدبر اور سنجیدہ سُکھ دیپ کی اداکاری کرنا پڑتی ہے ...."

چھ بجے اُس نے بچوں کو اطلاع کی کہ بس جانِ پدر میں سات بجے ہر صورت پہنچ جاؤں
گا۔ سات بجے سُکھ دیپ نے فیصلہ کیا کہ اب شام ہو چکی ہے۔ یہ کوئی وقت ہے نہانے
کا۔ بچوں کو کل نہلا دیں گے۔

ریستوراں پُر ہو چکا تھا۔ نشستوں کے خواہشمند لوگ سیڑھیوں میں کھڑے میزوں
پر رکھی خوراک کی مقدار سے اندازہ لگا رہے تھے کہ کونسا گاہک اب اُٹھنے کو ہے۔ ایک ایرانی
جوڑا بہت دیر سے ہمارے سروں پر کھڑا ہمیں ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔
سُکھ دیپ رَم کا آخری گھونٹ بھر کر اُٹھ کھڑا ہوا اور ویٹر کو بل کے لئے کہا "یہاں
تو میلہ لگ گیا ہے، کسی ویرانے کو ڈھونڈتے ہیں۔"

بل دو صفحوں پر مشتمل تھا۔ سکھ دیپ نے جیب سے عینک نکال کر ٹوٹل چیک کیا اور ویٹر سے کہنے لگا "جانِ برادر میں یہاں اپنی بارات لے کر تو نہیں آیا، اتنا بل ؟"

ویٹر جھکی ہوئی حالت میں مسکراتا رہا۔

"دو چار ایکڑ میں لگے گنے کے رس کا بل تو اتنا ہی آنا چاہیئے ۔" میں نے بل پر نگاہ ڈال کر اسے تسلی دی۔

"اوئے آہو" اُس نے ایک فلک شگاف قہقہہ ریستوراں میں بکھیرا اور بل ادا کر دیا۔

ریستوراں سے باہر آکر اُس نے ڈرائیور کو فارغ کر دیا اور خود سٹیئرنگ سنبھالا۔

"کیا اب ہم پرواز کرنے کو ہیں ؟" میں نے ڈیش بورڈ کو دونوں ہاتھوں سے تھامتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں نہیں تارڑ۔ اب میں نے تیز رفتاری چھوڑ دی ہے ۔۔۔۔ وہ اور زمانے تھے ۔۔۔۔ اب تو میں قدرے بزدل ہو گیا ہوں، سوئی چالیس کو عبور کرے تو سپیڈومیٹر پر مجھے اپنے بچوں کی تصویریں نظر آنے لگتی ہیں۔ تم فکر نہ کرو۔"

سیاہ مرسیڈس تہران کی گاڑھے سوپ ایسی ٹریفک میں رینگنے لگی۔

"تہران ویسے کا ویسا ہی ہے ۔" میں نے شاہ رضا کی آسودہ اور پُر آسائش شاہراہ پر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا "کچھ بھی نہیں بدلا یہاں تک کہ شاہ بھی نہیں بدلا ۔"

"وہ نہیں بدلے گا" سکھ دیپ سٹیئرنگ پر انگلی بجاتے ہوئے بولا "اُسے بدل دیا جائے گا۔ حالات ٹھیک نہیں ۔۔۔۔ ہم ہندوستانی جو یہاں کی شہریت رکھتے ہیں ہمیں بھی اپنے مستقبل کے بارے میں کچھ پتہ نہیں ۔۔۔۔ ہو سکتا ہے جب تم اگلی مرتبہ آؤ تو میں اُس وقت مشرقی پنجاب میں کھیتی باڑی کر رہا ہوں ۔"

"اچھا ہے قریب آجاؤ گے ۔"

"آہو" وہ مسکرایا "میں اُدھر بارڈر پر آکر ہر روز نعرے لگایا کروں گا کہ

اُس سُسرے تارڑ کو وہ اپنایا ہے۔ وہ تنگ آکر بھیج دیں گے ۔"

مرسیڈس ایک بلند آہنی دروازے کے پیٹ میں تھوتھنی لگا کر کھڑی ہو گئی ۔

ملحقہ کیبن میں سے ایک پہرے دار نکلا جسے سکھ دیپ نے ایک کارڈ دکھایا اور دروازہ کھول دیا گیا۔ یہ تہران کلب تھی۔ سومنگ پول کے سامنے سینٹل بار کا دروازہ تھا ہم اندر چلے گئے ۔ بے پناہ ہجوم تھا۔ زیادہ تر غیر ملکی صحافی تھے جو ایران کے چیدہ چیدہ کاروباری لوگوں اور فوجی افسروں سے گھل مل کر تازہ ترین صورتِ حال کے بارے میں مواد اکٹھا کر رہے تھے۔ صحافی جو شراب نوشی کے باوجود اپنے حواس بجا کیے ہوئے تھے اور دوسرے لوگ جن کے حواس ہی نہیں تھے، سکھ دیپ کو دیکھ کر بار کا انچارج باہر آگیا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک وزنی چابی تھی۔ مختلف کمروں میں سے ہوتے ہوئے ایک آبنوسی دروازہ سامنے آیا۔ انچارج نے قفل میں چابی کو گھمایا اور ہم اندر داخل ہو گئے۔ یہ ایک بلند چوبی چھت کا فرنیچر کی پالش کی مہک اور اُونی قالینوں کے گرم ماحول والا کمرہ تھا۔ کسی انگریز جنرل کی قدآدم تصویر مینٹل پیس کے اوپر سے ہمیں دیکھ رہی تھی۔

"اس سفید لنگور نے اپنے پنجاب میں بڑی تباہی مچائی تھی۔ پھر یہاں آگیا ۔۔۔۔" سکھ دیپ ایک صوفے میں آرام سے گرتا ہوا کہنے لگا "یہ اس کا پسندیدہ کمرہ تھا اور اب میں اُسی صوفے پر بیٹھ کر ایرانی آبِ جو پیتا ہوں جہاں یہ سُسرا اسکاٹ لینڈ کی وہسکی پیا کرتا تھا۔"

انچارج خوراک کے ہمراہ آبِ جو کا ایک سرد گلاس بھی لے آیا۔

"کتنے دن ایران میں ٹھہرو گے ؟"

میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ بارہ بج چکے تھے۔ "ایک دن بھی نہیں، آج تبریز چلا جاؤں گا۔ وہاں سے ارضِ روم، پھر شام، لبنان ۔۔۔"

"جب آتے ہوا افراتفری میں آنے ہو۔" وہ ناراض ہوگیا۔ "تین چار روز تک میں فارغ ہو جاؤں گا۔ پھر ایک ہفتے کے لئے ہم کیسپئن جا سکتے ہیں۔ اُسی طرح ... کے جنگلوں میں فراٹے بھرتے ہوتے ...."

"بھابھی اجازت دے دے گی؟ اُس نے تو ایک رات کا اعتبار نہیں کیا ... اور کہاں پورا ایک ہفتہ ...."

سُکھ دیپ نے سر جھکایا اور گوشت کے ٹکڑے میں کانٹا چبھو کر اُسے دیر تک دیکھتا رہا۔

مرسیڈس میرے مسافر خانے کی طرف رواں تھی اور سُکھ دیپ واقعی اُسے انتہائی سست رفتاری سے چلا رہا تھا۔ خاموشی کا بوجھ ناقابلِ برداشت ہونے لگا تو اُس نے کیسٹ ریکارڈر آن کر دیا .... ایک پاٹ دار آواز والا شخص ہیر پڑھ رہا تھا۔ اس کا لہجہ نرم اور دل گداز نہ تھا بہت درشت تھا مگر وہ ایک ایک لفظ کی ادائیگی اتنی شدت سے کر رہا تھا کہ آہستہ آہستہ اچھا لگنے لگا۔

"یہ سیتل کی آواز ہے۔" سُکھ دیپ گہری تھکاوٹ کی ایک سانس بھرتے ہوئے بولا۔ "یہاں ہندوستانی سکول میں ٹیچر ہے اور میرا جاننے والا ہے۔ جب بھی بوجھ بنتے ہیں تو میں اُس کے پاس چلا جاتا ہوں اور ہیر سنتا ہوں .... یہ وجود میں گھلتی ہے ... دیتی ہے۔"

"سُکھ تو تمہاری ذات کا حصہ ہے۔"

"صرف نام کا ...." وہ مدھم ہو کر بولا اور پھر سیتل کی آواز کے ساتھ آواز ملا کر ہیر کے بول گنگنانے لگا۔ وہ اپنے آپ میں مگن تھا، میری موجودگی سے یکسر بے خبر۔ کیسٹ ختم ہوئی تو کیسٹ ریکارڈر جو چند لمحے پہلے زندہ تھا، ہم سے باتیں کر رہا تھا، یک مردہ ہو گیا۔ لوہے کا ایک بیکار نیم گرم ٹکڑا۔

"نا رڈیار، چلو سیتل سے ہیر سنتے ہیں ...." سکھ دیپ نے بے بسی سے سٹیرنگ پر ہاتھ مارتے ہوئے میرے منت کی۔

"اس وقت؟"

"اس وقت کیا ہے؟ صرف ایک ہی تو بجا ہے۔" اُس نے پورا سٹیرنگ گھما کر مرسیڈس کو واپس کر لیا۔

سیتل کا فلیٹ تہران کے علاقے "بہارستان" کی ایک عمارت کی چوتھی منزل پر تھا۔ جیسے لنڈن کے ساؤتھ ہال میں خالصہ راج کرتا ہے اسی طور بہارستان میں ہر سو سکھ اپنی رنگ برنگی پگڑیوں میں کھِلتے نظر آتے ہیں۔ ہم ہانپتے ہوئے سیتل کے فلیٹ تک پہنچے۔ کال بیل بہت دیر تک بجتی رہی۔ پھر دروازہ کھلا اور ایک خاتون ناگواری کے موسموں میں جمائیاں لیتی ہوئی ہمارے سامنے آ گئی۔ سُکھ دیپ کو دیکھتے ہی جمائی مائل منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ "بھرا جی آپ .... آیئے آیئے .... ہمارے بھاگ کہ آپ نے یاد کیا ...."

"سیتل کہاں ہے بھابھو؟" سکھ دیپ نے بے چینی سے فلیٹ کے اندر جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"وہ تو گوردوارے گئے ہیں ...." بھابھو نے اطلاع کی۔

"گوردوارے؟" سکھ دیپ نے تھوک نگلتے ہوئے بے یقینی سے پوچھا۔ "کیا تکلیف ہے اُسے؟"

بھابھو میری موجودگی میں کچھ شرمندہ سی محسوس کر رہی تھی۔ اس نے سکھ دیپ کے قریب جا کر کان میں کچھ کہا۔ اُس نے سر ہلایا اور پھر میرا بازو پکڑ کر بالکل بچوں کی طرح درخواست کی "آؤ گوردوارے چلتے ہیں، نزدیک ہی ہے، سیتل کو پکڑ لاتے ہیں۔"

گوردوارے کے عالیشان ہال میں اکھنڈ پاٹھ جاری تھا۔ ہم نظریں نیچی کیے

جوتے اُتار کر اندر داخل ہو گئے۔ دائیں طرف سینکڑوں پگڑیاں جھکی ہوئی تھیں
بائیں جانب عورتیں اور بچے بصد احترام آنکھیں نیچی کئے بیٹھے تھے۔ سامنے تخت
پہ گرنتھ صاحب کے اوراق پر جھکا ایک نرم چہرے والا بوڑھا سکھ تھا۔ اس کی سفید
داڑھی پنکھے کی ہوا سے دھنی ہوئی روئی کی طرح مقدس کتاب پر پھیل رہی تھی۔
روشن تھے اور فرش پر قالینوں کی تہیں تھیں۔ سُکھ دیپ کو دیکھ کر بیشتر چہروں
حیرت کی مسکراہٹوں کا ردِ عمل ظاہر ہوا۔ ہمارے لئے جگہ بنائی گئی اور ہم دونوں
پالتی مار کر بیٹھ گئے۔ سُکھ دیپ کی نظریں سیتل کو تلاش کرنے لگیں۔

"وہ ہے سُسرا..." سُکھ دیپ نے مجھے کہنی مارتے ہوئے دوسرے کونے
طرف اشارہ کیا۔ وہاں سکھ ہی سکھ تھے اور اُن میں سے کسی ایک سکھ کا تعین کرنا میرے
لئے بے حد دشوار تھا۔

"سُسرا سر جھکائے بیٹھا ہے۔ اوپر ہی نہیں دیکھتا"۔ سکھ دیپ نے
ہو کر سرگوشی کی۔ ہمارے قریب کی دو داڑھیاں جو فرش کو چھو رہی تھیں ناگواری سے
اوپر اُٹھیں اور سکھ دیپ نے فوراً ایک عقیدت میں ڈوبی ہوئی آہ بھر کر سر جھکا لیا۔

"یہ تمہارے مولوی صاحب ہوتے ہیں؟" میں نے گرنتھ صاحب پر جھکے سکھ
کے بارے میں آہستہ سے پوچھا۔

"یہ بھائی سنت سنگھ ہیں"۔ وہ ہیجے سے بولا۔

"کس کے بھائی؟"

"اوئے کسی کے بھی نہیں۔ چپ کر کے پاٹھ سُن"۔

اتنی دیر میں بھائی سنت سنگھ نے بلند آواز میں کسی بانی کے بول پڑھے اور
حاضرین سر بسجود ہو گئے۔ میں شتر مرغ کی طرح گردن اُٹھائے اِدھر اُدھر دیکھ
دیپ نے کن اکھیوں سے مجھے دیکھا۔ "اوئے سُسرے مار کھانی ہے خالصو
نیچا کر"۔ میں وہیں دبک گیا۔ تھوڑی دیر بعد اسے احساس ہوا کہ پوری محفل میں ایک

ایسا ہے جو ڈھکا ہوا نہیں ہے اور وہ اُس کے دوست کا ہے، چنانچہ اُس نے فوراً جیب
سے رومال نکال کر میرے سر پہ رکھ دیا۔

آخر میں کڑاہ پرشاد تقسیم ہوا اور پاٹھ کے خاتمے کا اعلان کر دیا گیا۔ سُکھ دیپ فوراً
ہی سکھوں کے ایک ہجوم کے نرغے میں آ گیا جو اُس کی گوردوارے میں آمد پر خوشی کا اظہار کر
رہے تھے۔ وہ کچھ کچھ شرمندہ ہوتے ہوئے اقرار کر رہا تھا کہ ہاں واہگورو کی واہگورو جانے۔
وہ جب چاہے اپنے بندے کے دل میں اپنا پریم پھونک دے اور بندہ دھرم کی راہ پر
چلتا ہوا گوردوارے پہنچ جائے۔ اس دوران میں سیتل بھی ہمارے قریب آ چکا تھا۔ سُکھ دیپ
نے جلدی سے اس کا بازو تھاما اور ہم ہال میں سے نکل کر صحن میں آ گئے۔

"تیری ہیر سننے کے لئے آج مجھے گرنتھ صاحب بھی سننا پڑا ہے"۔ سُکھ دیپ
نے ہنستے ہوئے سیتل کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

گوردوارے کے صدر دروازے پر بھائی سنت جو خاص طور پر اس پاٹھ کیلئے
دہلی سے تشریف لائے تھے لوگوں کو الوداع کہہ رہے تھے۔ میری باری آئی تو میں نے
بھی اُن کی تعظیم کی اور جھک کر ہاتھ ملایا۔ اُس نرم چہرے والے سفید ریش بزرگ نے
مجھے بھی سکھ ہی جانا اور بڑی شفقت سے میرے سر پہ ہاتھ رکھ کر کہا۔ "پتر تم نے کیس
اور داڑھی صاف کرا کے واہگورو کی ناراضگی مول لے لی ہے۔ دھرم میں استرے کی مناہی
ہے۔ خالصہ داڑھی سے ہی سجتا ہے"۔

"بڑا نالائق سکھ ہے بھائی صاحب"، سکھ دیپ نے کہا۔ "ولایت کی ہوا کیا لگی ہے
دھرم کو ہی بھول گیا ہے"۔

اب میں بھائی صاحب کو کیسے بتاتا کہ سُکھ دیپ ہر ہفتے اپنی داڑھی اور کیس
تراشتا ہے مگر استرے کے ساتھ نہیں جس کی دھرم میں مناہی ہے۔ بلکہ الیکٹرک شیور

کے ساتھ کہ اُس کا تو گرنتھ صاحب میں کہیں ذکر ہی نہیں ہے۔

ہم واپس سیتل کے فلیٹ میں آئے تو بھابھو نے بڑے اہتمام سے کھانے
رکھی تھی اور اُس پر سکھ دیپ کی پیاس بجھانے کے لئے "پانی" کی وافر مقدار
پانی رنگدار تھا۔ سیتل چونکہ خود بھی شعر کہتا تھا اس لئے اُس نے دو سامعین کی موجودگی
فائدہ اُٹھایا اور جی بھر کر اپنے شعر سنائے اور ترنم سے سنائے۔ اس دوران سکھ دیپ
بدلتا رہا۔ بالآخر ہیر کی باری آئی اور رات کے تین بجے تک حافظ و سعدی کی سرزمین
ہم نے اپنے پنجاب کے وارث شاہ کا پُراثر کلام سیتل کی پاٹ دار اور جذباتی آواز
شروع کیا۔

انسان اپنے وطن سے کتنا ہی دور کیوں نہ ہو جائے۔ کتنے ہی چولے کیوں نہ
سے اُس کی دھرتی اُس کے سانسوں اور رگوں کے تحرک کے گرد ریشم کے کیڑے کی
باس اور وحشی چاہتوں کا ایک چولا بچھے بچھے بنتی رہتی ہے اور جب بھی دور دیس
زمین کی گرم آواز اُس کے کانوں میں اُترتی ہے تو پرائے چولے موم کی کینچلی کی طرح
ہیں اور اندر سے وہی اپنا چولا نکل آتا ہے۔ ہیر کی لے مجھے واپس لے گئی۔ اُس
پر جس کا گنبد کھلا ہے، جس کا پلنگ رنگ رنگیلا ہے اور جس کے رنگ وہی ہیں
میرے اندر کا چولا رنگا ہوا ہے .... سیتل آنکھیں بند کئے۔ ایک ہاتھ کان پر رکھے
آہوں کو اپنی زبان دے رہا تھا۔ سکھ دیپ سر جھکائے بیٹھا تھا اور بھابھو کرسی سے
لگائے اونگھ رہی تھی۔

ہم سیتل کے فلیٹ کی سیڑھیاں اُترے تو سکھ دیپ مجھے بہت خاموش
سا لگا۔ واپسی پر کار چلاتے ہوئے بھی وہ ایک سحر زدہ وحشی کی طرح سٹیرنگ پر
چپ چاپ بیٹھا رہا۔ مسافر خانے کے نیچے کار کھڑی کر کے وہ باہر نکل آیا اور مجھ سے
ہو گیا "خدا حافظ اور یار اتنی افراتفری میں نہ آیا کرو"

میں نے گھڑی پر وقت دیکھا تو چار بج رہے تھے۔ مجھے بے اختیار پھر وہ دن

آئی جب کیپٹن کے کنارے سکھ دیپ کو اُس کی بیوی نے فون پر ڈانٹا تھا کہ فوراً واپس
آؤ ورنہ میں چلی پٹیالے اور وہ انتہائی فرمانبرداری سے کوہ البرز کی خطرناک گھاٹیوں میں
کار چلاتا صبح کاذب کے وقت تہران پہنچ گیا تھا۔

"خدا حافظ سکھ دیپ" میں نے حدتِ یار کو محسوس کرتے ہوئے کہا "اور ہاں
بہت دیر سے گھر جا رہے ہو۔ اگر آج بھی جاتے ہی بھابھی نے "میں چلی پٹیالے" والی دھمکی
دے دی تو؟"

"وہ تو چلی گئی پٹیالے" اُس نے کار کی نشست پر گرتے ہوئے کہا۔ "دو سال
ہو گئے اُسے مرے ہوئے" سیاہ مرسیڈس سٹارٹ ہوئی اور پھر ایک تابوت کی طرح
تہران کی سیاہ رات میں جذب ہوتی چلی گئی۔

:________________:

وادیٔ ارارات

میرے سر پر نوح کا پہاڑ ہے اور پاؤں کیچڑ میں ہیں۔
پلکیں اُٹھاؤں تو برف پوش کوہِ ارارات کی سفیدی آنکھوں میں چمکتی ہے، جھکاؤں تو صرف ٹخنے دیکھ سکتا ہوں کہ پاؤں تو بوٹوں سمیت کیچڑ میں غرق ہیں۔

میں ارضِ روم کا مسافر ہوں۔ سامنے وادیٔ ارارات میں بچھی سڑک پر رواں ہونا چاہتا ہوں مگر ٹرانسپورٹ کی نایابی کے باعث پچھلے پانچ گھنٹوں سے بازرگان کی ایرانی سرحد کے اِدھر ترکی کی سرزمین پر کھڑا ہوں اور اچھے وقتوں کا انتظار کر رہا ہوں۔ کیچڑ کے اس جزیرے میں مَیں اکیلا نہیں ہوں، اور بھی سیاح ہیں۔ ترکی کی جانب بڑے بڑے ٹریلروں اور ٹرکوں کی ایک طویل قطار ہے جو حرکت میں نہیں ہے۔ کسٹم ہاؤس میں عملے کی کمی کی وجہ سے ترکی سے ایران میں داخل ہونا ایک مسئلہ بن چکا ہے۔ ایک ٹرک ڈرائیور پچھلے پانچ روز سے پھنسا بیٹھا ہے اور اب وادی میں خیمہ نصب کر کے دھوپ میں بیٹھا وہسکی پیتا ہے اور گانے گاتا ہے۔ شدید بارشوں کی وجہ سے پورا علاقہ کیچڑ کی ایک جھیل میں بدل چکا ہے اور دیوزاد ٹرکوں کے پہیے اس میں سے گھومتے ہوئے گزرتے رہتے ہیں اور یوں یہ کیچڑ انتہائی باریک مگر گاڑھے چینی سوپ کی صورت اختیار کر چکا ہے اور میرے پاؤں ٹخنوں تک اس میں ڈوبے ہوتے ہیں اور اوپر نوح کا پہاڑ سنگِ مرمر کے سفید مہاتما بدھ کی طرح سکون سے بیٹھا مجھے دیکھ رہا ہے۔

کسٹم ہاؤس سے فارغ ہونے والا ہر سیاح بڑی افراتفری میں ہمارے پاس

آتا ہے۔" ارضِ روم جانے والی بس کہاں ہے اور کتنے بجے چل رہی ہے؟" ہم اُسے بتاتے ہیں کہ کہیں بھی نہیں ہے اور اس لئے چل بھی نہیں رہی اور پوری صورتِ حال سے آگاہ ہونے کے بعد وہ بے چارہ بھی ہماری برادری میں شامل ہو جاتا ہے۔ کیچڑ میں پاؤں جمائے، مُنہ لٹکائے یتیموں کی طرح اُس سڑک کو دیکھنے لگتا ہے جس پر اگر چار پہیوں والی ایک سواری چلنا شروع کر دے تو سیدھی ارضِ روم پہنچ جائے۔ اس تمام کی غیر یقینی صورت حال میں سیّاح دُنیا کا سب سے بڑا یتیم ہوتا ہے۔ زبان سے وہ ناآشنا ہوتا ہے، راستے وہ پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہوتا ہے۔ اب مثلاً میرے اردگرد صنفِ نازک اور صنفِ مضبوط کے گیارہ بارہ سیّاح سالگرہ کے کیک میں نصب چھوٹی چھوٹی موم بتیوں کی طرح کیچڑ میں کھُبے کھڑے تھے۔ ان کے نقشے بتاتے تھے کہ اگلی منزل ارضِ روم ہے، ورنہ انہیں کچھ پتہ نہ تھا کہ یہ ارضِ روم کیا بلا ہے۔ آج شام تک وہاں پہنچنا نصیب بھی ہوگا یا خوراک اور چھت کے بغیر رات اسی وادی میں گزرے گی جہاں معلوماتِ عامہ کی ایک کتاب کے مطابق بھیڑیئے بھی ہوتے ہیں۔ ان کے چہروں پر قیامت اور بے چارگی باقاعدہ برس برس کر کیچڑ میں جذب ہو رہی تھی۔

میرے سر پر نوح کا پہاڑ ہے اور پاؤں کیچڑ میں ہیں۔

یہ نوح کا پہاڑ بھی عجیب نک چڑھا بڈھا ہے۔ اپنی سفید عبا اوڑھے ترکی، ایران اور روس کی سرحدوں پر مزے سے بیٹھا رہتا ہے، ہمیشہ سے بیٹھا ہوا ہے مجھے دیکھ رہا ہے مگر پہچاننے سے انکاری ہے، آنکھ ہی نہیں ملاتا حالانکہ یہ میری آوارگیوں کا گواہ ہے۔ اس نے مجھے کئی مرتبہ اسی کسٹم ہاؤس سے نکل کر لاپروائی سے سیٹیاں بجاتے ہوئے اجنبی دیسوں کی جانب جاتے دیکھا ہے۔ ہاں بھئی جس پہاڑ کو یہ شرف حاصل ہو کہ اس پر حضرتِ نوح نے بذاتِ خود اپنی کشتی لنگر انداز کی ہو اور پھر اسی کے پہلو میں خیمہ زن ہو کر سامنے والی وادی میں انگوروں کی کاشت شروع کی ہو وہ بھلا مجھے لفٹ دے سکتا ہے؟ کہاں بابا نوح اور کہاں ایک نکمّا آوارہ گرد۔

"یہ ایرانی کتنے غلیظ ہوتے ہیں، اپنے کسٹم ہاؤس بھی صاف نہیں رکھتے، اتنا کیچڑ۔" ایک جرمن سیاح کہہ رہا تھا۔

میں نے اُسے بتایا کہ ایران وہ اُدھر ہے شاہ کے مجسّمے والا۔ اب ہم ترکی میں ہیں۔

"ایک ہی بات ہے۔" وہ غرّایا۔ "سارے مشرقی ایک سے ہوتے ہیں، غلیظ۔"

ارضِ روم جانے کے شوقین تمام کے تمام سیّاح سفید چمڑی والے تھے اور میں اُن میں واحد مشرقی تھا، غلیظ! شاید اُن کے نزدیک میرا کیچڑ میں یوں کھڑا رہنا ایک معمول کی بات تھی۔

ایران کی جانب سے ایک جہاز نما ٹرک لڑکھڑاتا ہوا نکلا جس کے ساتھ ٹرین کے ڈبّے سے بھی بڑا ایک ٹریلر لہکتا ہوا چلا آ رہا تھا جیسے ایک دیوزاد کتورا دُم ہلاتا آ رہا ہو۔ لگتا تھا ایک چھوٹی موٹی عمارت کو پہیئے لگ گئے ہیں۔ ہمارے قریب سے گزرا تو ہم جلدی میں اپنی پوزیشنیں تو نہ بدل سکے البتہ دفاع کے طور پر آنکھیں ضرور بند کر لیں اس اقدام کا نتیجہ یہ نکلا کہ باقی جسم کے علاوہ پلکوں پر بھی کیچڑ کے نفیس چھینٹے پڑ گئے... یہ پہلا چھینٹا تھا... ٹرک بڑی باقاعدگی سے ہم پر چھڑکاؤ کرتے ہوئے گزرنے لگے۔ چند لمحوں بعد ہم سب ایسے مجسّموں کا رُوپ دھار چکے تھے جنہیں سنگ تراش گیلا چھوڑ کر سیر کے لئے چلا گیا تھا۔ اسی دوران جب ایک اور پہیّوں والی عمارت ہمارے قریب سے گزری تو ہم نے حسبِ سابق آنکھیں بند کر لیں مگر اس مرتبہ کیچڑ کی بوچھاڑ کی بجائے ٹرک کی پاور بریکوں کی سمندری چنگھاڑ ہمارے کانوں میں اُتری۔ آنکھیں کھولیں تو ٹرک کھڑا تھا اور ہمارے گروہ کا جرمن سیّاح آٹو، ڈرائیور سے درخواست کر رہا تھا کہ وہ اُسے ارضِ روم تک اپنے ساتھ لے چلے۔ چونکہ ڈرائیور بھی جرمن النسل تھا اس لئے اُس نے ہامی بھر لی اور اپنے ہم وطن کو برابر میں بٹھا لیا۔

"ہم بھی بیٹھ جائیں؟" میں نے مسکین ترین شکل بنا کر پوچھا۔ بقیہ پبلک میری حمایت میں دیہات میں لسّی مانگنے والی لڑکیوں کی طرح مسکرانے لگی۔

ڈرائیور نیچے اُتر آیا۔ "ٹرک کی پُشت پر بندھے ٹریلر میں سفر کرو گے؟"

"کرلیں گے۔" سب نے کھِلتے ہوئے نعرہ لگایا۔

"کیسے کرو گے؟" وہ تعجب سے بولا۔

"ہم اس وقت کسی بھی ایسی شے پر سوار ہونے کو تیار ہیں جس کے نیچے پہیے لگے ہوں" میں نے شتابی سے کہا۔

"جیسے تمہاری مرضی۔" ڈرائیور مسکرایا اور پیچھے جاکر ٹریلر کا دروازہ کھول دیا۔ ایک وسیع وعریض ہال تھا۔ اب مسئلہ صرف یہ تھا کہ اس میں ہم سوار کیسے ہوں، کیونکہ دروازہ سطح کیچڑ سے تقریباً سات فٹ کی بلندی پر واقع تھا۔ پہلے تو دراز قد خواتین و حضرات نے قسمت آزمائی کی مگر کیچڑ آلود بوٹوں کی وجہ سے پھسل پھسل کر گرتے رہے۔ پھر بہرحال ڈرائیور آگے آیا اور ایک بازی گر کی طرح پھرتی سے ٹریلر پر چڑھ گیا۔ اُس نے ہمارے رُک سیک پکڑ کر اندر پھینکے اور پھر ہمیں بھی باری باری اُوپر کھینچ لیا۔

"یہاں تو ہم آسانی سے فٹ بال کھیل سکتے ہیں۔" ڈچ لڑکی جولی فرش پر ڈھیر ہوتی ہوئی کہنے لگی۔

"فٹ بال کے علاوہ..." انگریز سیاح سائمن متانت سے کھانس کر بولا "یہ جگہ دیگر اِن ڈور کھیلوں کے لئے بھی موزوں ہے۔"

"مثلاً؟" جولی پوچھنے لگی۔

"ایسی اِن ڈور کھیلیں جن کے لئے تم ابھی بہت چھوٹی ہو۔" سائمن نے شرارت سے ہونٹ دبایا اور جیکٹ کی جیب میں سے ایک جاسوسی ناول نکال کر پڑھنے لگا۔

کارلز اور شارٹی نے جن کا تعلق ڈنمارک سے تھا، ایک چھوٹا سا شطرنج بورڈ سامنے پھیلایا اور اُس پر سر جھکا دیئے۔

امریکی میاں بیوی ارنسٹ اور میری آن پالی تھین کا ایک لفافہ کھول کر سینڈوچ پر منہ مارنے لگے۔ فرانسیسی جوڑے ہنری اور سی مان نے فرش پر سلیپنگ بیگ بچھا لئے۔

چونکہ اُن کے پاس منہ مارنے کو کچھ نہ تھا، اُنہوں نے مُنہ ملا لیے۔

لمبی لمبی ٹانگوں والی سویڈش لڑکیاں اِنگے، شیرن اور لِی آنا تالیوں کی تال پر مقبول سویڈش گروپ "آبا" کی دُھن "بے بی مجھے ایک رقص اور کر لینے دو" گانے لگیں۔

میں نے سگرٹ سُلگایا اور ایک پُرلطف سفر کی متوقع آمد پر اطمینان کا سانس لیا۔

ڈرائیور نے ٹریلر کا آہنی دروازہ بند کر کے باہر سے کنڈا کھینچ دیا۔ اندر ایک دم تاریک ہو گیا۔ لڑکیوں نے جان بوجھ کر شرارت سے یوں چیخیں بلند کیں جیسے اندھیرے کا فائدہ اُٹھایا جا رہا ہو اور شاید اُٹھایا بھی جا رہا تھا۔ ہر طرف سرخوشی اور اطمینان بخش زندگی کی ایک لہر دوڑ رہی تھی مگر اس کے بعد ٹرک سٹارٹ ہو گیا۔

دھڑام سے میرے اُوپر کوئی چیز آ گری۔ "کون ہے؟"

"شاید میں ہوں۔" انگریز سیاح سائمن کی خجالت آمیز آواز کہیں سے آئی۔

میرا وجود بھی میرے قابو میں نہیں آ رہا تھا، مست ملنگ ہو رہا تھا۔ میں نے سگرٹ لبوں تک لے جانے کی کوشش کی مگر وہ ناک سے جا لگا۔ پھر ایک رُک سیک اُچھلتا ہوا آیا اور میرے سینے پر سوار ہو گیا۔ حرکت کرتا ہوا ٹریلر کھونٹے سے زبردستی بندھے ایک گھوڑے کی طرح دولتیاں چلا رہا تھا، اُچھل رہا تھا اور ہم سب لوہے کے اس کمرے میں بند بے اختیار سے ہو رہے تھے۔ ہر طرف کہرام بپا تھا۔ لڑکیاں زور زور سے چیخیں مار رہی تھیں۔ مردانہ آوازیں مختلف زبانوں میں گالیاں اُگل رہی تھیں۔ مختلف اجسام تیزی سے حرکت کرتے ٹریلر کے فرش پر لڑھک رہے تھے۔ ڈچ لڑکی جولی کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ ایک شدید جھٹکے نے مجھے بھی آزاد کر دیا اور میں ایک بے وزن کیفیت میں فرش پر قلابازیاں کھانے لگا۔ سب لوگ نیم تاریکی میں جھٹکے کھاتے اِدھر اُدھر لُڑھکتے ہاتھ پھیلا رہے تھے تاکہ کوئی سہارا ملے اور اس خلائی کیفیت کا خاتمہ ہو۔

"سٹاپ۔ سٹاپ۔" ڈینش لڑکے کارلز اور شارٹی شور مچا رہے تھے

سائمن نے ٹریلر کے اگلے حصّے پر مکّے مار کر ڈرائیور کی توجہ مبذول کرانے
کی کوشش کی مگر وہ یہ بھول گیا تھا کہ اس کے آگے ایک اور ٹریلر جتا ہوا ہے
پھر کہیں ڈرائیور کی نشست ہے جو اس وقت اطمینان سے آٹو کے ساتھ کہیں
وادیٔ آرارات کے وسیع حسن سے لطف اندوز ہوتا ٹرک چلا رہا ہے۔ ٹریلر کسی موڑ
سے اُترتا تو ہم سب لپٹے قالینوں کی طرح گول ہوتے اگلے حصّے میں جا جمع ہوتے
اگر چڑھائی شروع ہوتی تو ساری مخلوق بے اختیار دروازے کی طرف لپکنے لگتی
سطح آتی تو چھت نیچی ہو جاتی اور ہم اُس میں بوبکروں کی طرح ٹکریں مارنے لگتے
معمولی خراشیں اب چوٹوں میں بدل رہی تھیں۔

ہم نے بازرگان سے صرف تیس چالیس کلومیٹر فاصلہ طے کیا تھا اور ارض روم
ابھی ڈھائی سو کلومیٹر دُور تھا۔ اگر وہاں تک ہم اسی بھونچال کی آغوش میں لڑھکتے رہتے
تو سفر کے خاتمے پر ہمیں روسٹ کر کے بلا خطر نوش کیا جا سکتا تھا، ایک بھی ہڈی نہ
سُرمے! اگر ہر فرد صرف ذاتی طور پر اُچھل کود کر رہا ہوتا تو بھی خیر تھی مگر یہاں تو ہر لمحے
کبھی کسی کی ٹانگ آپ کے پیٹ پر ہے، کبھی آپ کسی صاحب یا صاحبہ کی آغوش میں
براجمان ہیں۔ کبھی آپ نے کسی کی گردن دبوچ رکھی ہے، اس خیال سے کہ شاید یہ
کُنڈا ہے۔ اس مار دھاڑ میں مجھے سویڈش لڑکیوں کی ٹانگوں کی خوبصورت بناوٹ
کے علاوہ اُن کی تباہ کن لمبائی کا بھی شدید احساس ہوا... ایک موڑ آیا، ٹریلر گھوما
اور پھر کٹی کھاتی پتنگ کی طرح ٹیڑھا ہوتا گیا۔ ہم اس کی کجی کے زاویے پر اُسی طرح
لُڑھکتے چلے گئے۔ پھر لوہے کا یہ بند کمرہ شاید اُلٹ گیا اور ہم نیم بے ہوشی کے عالم میں
جانے کدھر کے کدھر نکل گئے۔ انجن کی آواز بند ہو گئی اور چند لمحوں بعد آہنی دروازہ
ایک زوردار جھٹکے سے کھُل گیا۔ تیز روشنی کے ساتھ ایک قہقہہ بھی اندر آیا جو یقیناً کسی
ذہنی مریض کے گلے میں سے برآمد ہو رہا تھا۔ میں نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی
اپنے آپ کو انسانی اعضا کے ایک انبار میں دفن پایا۔ بمشکل تمام اپنی گردن کو گوشت

کے اس ڈھیر میں سے نمودار کر کے میں نے دیکھا کہ ٹریلر پینتالیس درجے کے زاویے پر
معلق ہے اور ارض روم جانے کے شوقین خواتین و حضرات سامان سمیت ایک کونے
میں اس طرح ڈھیر ہوتے پڑے ہیں جس طرح سینکڑوں گنڈوتے ایک دوسرے میں گتھے
کاہلی سے سرک رہے ہوتے ہیں۔ ان میں ایک گنڈویا میں بھی تھا۔ ٹریلر کے باہر چمکتی
دھوپ میں ڈرائیور کولھوں پر ہاتھ رکھے ہماری اس دُرگت پر فلک شگاف قہقہے بلند
کر رہا تھا۔ ہم نے اپنے طور پر اس اُلجھی ہوئی انسانی اُون کی گرہیں کھولنے کی کوشش
کی مگر ٹریلر کے ترچھا ہونے کی بنا پر بار بار پھر اُسی کونے میں گرتے رہے۔ بالآخر ڈرائیور
آنکھوں سے پانی پونچھتا، بے تحاشا ہنستا ہوا، اپنی رانوں پر ہاتھ مارتا اندر داخل ہوا
اور ہر ایک کا ہاتھ پکڑ کر اُسے انسانی دلدل میں سے نکالنے لگا۔

"کون کہہ رہا تھا کہ ہم ہر اُس شے پر سوار ہونے کو تیار ہیں جس کے نیچے پہیے لگے
ہوں؟" اُس نے مجھے کھینچتے ہوئے دانت نکال کر پوچھا۔

"کہہ تو میں ہی رہا تھا۔" میں نے جھلّا کر کہا "مگر آپ جان بوجھ کر ٹرک کو اتنا تیز
چلا رہے تھے۔"

"میں بالکل مناسب رفتار پر جا رہا تھا لیکن چونکہ یہ ٹریلر کئی ٹن بوجھ کھینچنے کے
لئے بنایا گیا ہے اس لئے خالی حالت میں اسی طور اُچھلتا ہوا چلتا ہے۔ موڑ ذرا پیچیدہ
تھا، اس لئے یہ کم بخت سڑک سے اُتر گیا مگر ٹرک سڑک پر ہی ہے۔"

ہم آہستہ آہستہ کراہتے ہوئے، لنگڑاتے ہوئے ٹریلر سے باہر چھلانگیں لگانے
لگے۔ باہر دھوپ تھی۔ نوح کا پہاڑ بدستور لاتعلقی سے وہیں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے
دامن میں واقع وسیع چراگاہ میں بھیڑیں چر رہی تھیں اور پوری وادیٔ آرارات میں
خاموش امن کی ایک ایسی تازگی تھی جو شہر کے باسیوں سے کلام کرتی ہے۔ تم کتنے
بدقسمت ہو کہ عمارتوں اور سڑکوں نے تمہیں اپنے شور میں جکڑ رکھا ہے۔

ڈرائیور تھوڑی سی کوشش کے بعد ٹریلر کو دوبارہ سڑک پر لے آیا۔ اس دوران سیاحوں

کا کنبہ خراشوں اور چوٹوں پر اینٹی سیپٹک دوائیاں لگاتا رہا اور ہر فرد اپنے دانت ٹٹول کر
انہیں ہلاتا رہا کہ کتنے ہل رہے ہیں۔

"اب کیا ارادہ ہے؟" ڈرائیور ہمارے زخموں پر نمک چھڑکتے ہوئے بولا۔"کوئی
سواری ملنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور اس وادی میں رات بسر کرنا قدرے خطرناک
ہے۔ بھیڑیے ہوتے ہیں..." اور پھر لڑکیوں کی طرف دیکھ کر ہنسا۔"اور ترک بھی ہوتے ہیں۔"

"ہوتے ہیں؟" سویڈش اِنگے نے پُراشتیاق لہجے میں پوچھا۔

"بعد میں قتل بھی کر دیتے ہیں۔" ڈرائیور بے زاری سے بولا۔

"بعد میں کرتے ہیں ناں..." اِنگے ہنسی۔

"بہرحال میں جلدی میں ہوں، تم لوگ فیصلہ کر لو..." وہ ناگواری سے بڑبڑایا۔

فیصلہ یہی ہوا کہ وہ ہمیں کم از کم اگلے قصبے ڈوگ بایزید تک لے جائے جہاں
سے ارضِ روم کے لئے آسانی سے سواری ملنے کا امکان ہے۔ اُس نے ہمیں دوبارہ
اُسی آہنی دڑبے میں بند کیا اور ہماری درخواست پر عمل کرتے ہوئے انتہائی سُست رفتاری
سے ٹرک چلانے لگا۔ اس مرتبہ گروہ کے تمام لوگ سانس روکے گُم سُم بیٹھے رہے۔ معمولی
دھچکوں اور ایک آدھ قلابازی کے سوا سفر خیریت سے گزر گیا۔

ڈوگ بایزید نیچی چھتوں اور پتھریلے بدرنگ گھروں کا ایک ایسا قصبہ ہے جو وادیٔ
آرارات کی وسیع خوبصورتی کا ساتھ نہیں دیتا۔ متوقع برفیلے موسموں اور طوفانوں کو
جھیلنے کے لئے ہر وقت سمٹا سمٹا سا رہتا ہے، زمین سے بلند نہیں ہوتا۔ ہمارا گروہ ٹرک
سے اُترنے کے بعد اپنے دُکھتے جسموں کو گھسیٹتا ایک نزدیکی ریستوران میں گیا جہاں
حسبِ توفیق کافی یا ترکی میں کشید کردہ ڈنمارک کی کارلزبرگ بیئر نوش کی گئی اور اس
کے بعد ہم سب ارضِ روم جانے والی سڑک کے کنارے آ کھڑے ہوئے۔ گفتگو کے
دوران یہ طے پا چکا تھا کہ چونکہ میں ان خطوں میں نووارد نہیں ہوں اور ترکوں کا
ہم مذہب بھی ہوں اس لئے بقیہ سفر کے لئے پورے گروہ کی نمائندگی میرے ذمے

ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد ترک نوجوانوں کی ٹولیاں ہمارے گرد ٹہلنے لگیں۔ اس گہماگہمی
کا باعث اِنگے تھی جو ایک پتھر پر ٹانگیں پھیلاتے بیٹھی تھی اور سکرٹ اونچا کر کے
اپنی خوبصورت رانوں پر آئی خراشوں پر کوئی دوائی لگا رہی تھی۔ میں نے اجتماعی سلامتی
کے نام پر اس سے درخواست کی کہ وہ فی الحال یہ عمل ملتوی کر دے۔

"بعد میں قتل کر دیتے ہیں۔" سائمن نے اُسے چھیڑا۔

"بعد میں قتل بھی کر دیں تو کیا فرق پڑتا ہے..." اِنگے نے سکرٹ نیچے کرتے
ہوئے ایک بھو کی سانس بھری۔

سامنے پٹرول پمپ میں ایک بس رُکی۔ میں نے سڑک عبور کی اور ڈرائیور سے
پوچھا۔"ارضِ روم؟"

وہ نشست چھوڑ کر باہر نکل آیا۔"ارضِ روم۔ ارضِ روم۔" اُس نے ہاتھ ہلا
ہلا کر سب کو مژدہ سُنایا۔ پورا گروہ اس طلسمی نام کو سُن کر سحرزدہ حالت میں بس میں
جا بیٹھا۔ بس سٹارٹ ہوئی تو اس کا رُخ ارضِ روم جانے والی سڑک کی مخالف سمت
میں قصبے کی جانب تھا۔

"ارضِ روم تو اُس طرف ہے۔" میں نے ڈرائیور سے کہا۔

"ہاں ہاں جانتا ہوں... تم نے ٹکٹ نہیں خریدنے؟ وہ قصبے کے اندر
بس کمپنی کے دفتر سے ملیں گے اور پھر ہم فوراً ارضِ روم کے لئے روانہ ہو جائیں گے۔"

بس کمپنی کا دفتر ناہموار پتھروں سے بنی ہوئی سڑک کے کنارے ایک کوٹھڑی
میں تھا۔ منیجر سے ٹکٹوں کی درخواست کی گئی تو اُس نے گروہ میں شامل خواتین سے
راز و نیاز شروع کر دیئے۔

"یہ تمہارے ہونٹ سوجے ہوئے کیوں ہیں؟ یہ چہرے پر خراشیں محبت کی ہیں؟
... دوائی کا انتظام کروں..." ہر فقرے پر وہ دادطلب نگاہوں سے مجھے دیکھ کر
آنکھ مارتا اور جواب میں مجھے بھی زبردستی مسکرانا پڑتا۔

"اس جنس زدہ ٹرکش سلطان سے ٹکٹوں کی بات کرو۔" ہنری بیزاری سے
میں نے بات کی تو وہ زمین پر تھوک کر ٹکٹیں کاٹنے لگا۔ کرایہ وصول کر کے اس
ایک صندوقچی میں رکھا اور ڈھکن کو زور سے بند کر کے کہنے لگا۔

"بس شام سات بجے چلے گی۔"

"ڈرائیور نے کہا تھا ابھی روانہ ہو جائیں گے، صرف ٹکٹ خریدنے ہیں۔" وہ
غصے میں آگیا۔

"سات بجے ..." وہ اٹھ کر باہر چلا گیا۔

ابھی پانچ گھنٹے باقی تھے۔ مجبوراً ہم نے اپنا سامان کمپنی کے دفتر میں رکھا
وقت گزارنے کے لئے اس راستے پر ہو لئے جو وادیٔ آرارات کو جاتا تھا۔ قصبے سے
باہر نکلنے پر ہمارا گروہ مختلف ٹکڑیوں میں بٹ گیا۔ انگریز سیاح سائمن خود رو پودوں
کے نمونے جمع کرنے لگا۔ فرانسیسی ہنری اور سِی مان ایک ٹیلے پر چڑھ کر وہاں لیٹ
گئے۔ امریکی میاں بیوی ارنسٹ اور میری آن ایک پتھر پر بیٹھ کر دھوپ سینکنے لگے
کچھ لوگ قصبے کے آخری قہوہ خانے میں دوپہر کے کھانے کے لئے ٹھہر گئے۔ سویڈش لڑکیوں
کی تثلیث نے کچھ فاصلہ میرے ساتھ طے کیا اور پھر وہ تھک کر واپس چلی گئیں۔

میرے سامنے ایک ویران کچا راستہ دھوپ میں کاہلی سے لیٹا ہوا ایک خشک
انتہائی جاذبِ نظر پہاڑی سلسلے میں گم ہو رہا تھا۔ ان میں سے بلند ترین پہاڑی کے
میں جا کر پھر یہی راستہ نمودار ہو رہا تھا اور بالآخر چوٹی پر ایستادہ کسی قدیم عمارت کے
پہلو میں دفن ہو جاتا تھا۔ فاصلے کی وجہ سے نقوش واضح نہیں تھے لیکن بھورے پتھر
پر کھڑی یہ پتھریلی عمارت انسان کو اپنی جانب بلانے کی طاقت ضرور رکھتی تھی۔
پر ترک فوج کی درجنوں بارکیں تھیں۔ خاردار تار کے پیچھے ٹینک اور جیپیں دکھائی
دے رہی تھیں اور ان جنگی درندوں کے پس منظر میں اپنا سفید ریش نوح کا پہاڑ
کر رہا تھا۔ دائیں طرف اونچے نیچے ٹیلے تھے۔ پتھروں کے درمیان گھاس کے

تھے۔ ٹیلوں کی آڑ میں اِکّا دُکّا پتھریلے مکان بھی تھے۔
قصبے سے تقریباً پانچ کلومیٹر باہر آ کر جب میں آبادی کے مدار سے نکلا تو وادیٔ
آرارات کی کشش مجھ پر حاوی ہو گئی۔ نوحؑ کا پہاڑ میرے اور قریب آگیا۔ اب اس کے
اور میرے درمیان گھاس کے وسیع میدان تھے اور ان میں اُگے ہوئے گُلِ لالہ اس
کے سفید پس منظر میں پھٹتے ہوئے سرخ رنگ کے ہو رہے تھے۔ چھوٹی چھوٹی وادیاں
اس کے وسیع حجم میں ایک گھاؤ کی طرح کٹتی چلی جا رہی تھیں۔ ہموار چھتوں کے گاؤں
اس کی بلندی کے بوجھ تلے پچکے ہوئے لگ رہے تھے۔ اس کا برف چہرہ پوری وادی پر
چھایا ہوا تھا۔ اس کی برفیلی پلکیں صدیوں سے کھلی تھیں۔ اس کا گورا جمال ایک مقناطیس
کی مانند ہر آنکھ کو اپنی جانب پھیر لیتا تھا۔ میری آنکھیں تو کیا اس پُرطلسم سفید بزرگ
نے تو کشتیٔ نوح کو بھی اپنی جانب آنے پر مجبور کر دیا تھا۔

یہ سفید معبد مجھ پر حاوی ہو گیا اور میں دم بخود اس کی جانب سفر کرتا رہا۔ اس
کی ازلی برفوں میں سے جنم لینے والی یخ بستہ ہوائیں خدائی احکام کی طرح نازل ہو رہی تھیں،
... میرا بدن کوہِ طور کا ایک پتھر ہوتا تو اس پر یہ مقدس لفظ کندہ ہوتے چلے جاتے ...
تم چوری نہیں کرو گے ... تم ہفتے کے آخری روز کا احترام کرو گے ... تم ... تم ...
مگر میرا بدن پتھر نہ تھا، یہ زندہ تھا، خواہشوں سے رِستا ہوا، میرے بس سے باہر ...
سامری کا سنہری بچھڑا تو کوہِ طور کے پتھر کی ایک سِل نے جلا دیا تھا ... اور میرے بدن
کی سِل، اس کے اندر تو وہ خود چھپا بیٹھا تھا، سامری کا سنہری بچھڑا، میرے بس سے باہر۔

میں نے آرارات سے نظریں ہٹائیں اور اس راستے کو دیکھا جو اب بھی دھوپ
میں کاہلی سے لیٹا ہوا تھا۔ چوٹی پر واقع عمارت اب قدرے صاف دکھائی دے رہی
تھی۔ شاید کوئی قلعہ تھا۔ میں تھک رہا تھا اس لئے ستانے کی خاطر راستے سے ہٹ کر
ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور سگرٹ سلگا لیا۔ کوہِ آرارات سے منہ موڑ کر کہ میری آنکھیں اسے
دیکھ دیکھ کر تھک چکی تھیں مگر پھر بھی اس کی خنک موجودگی میری پشت پر سرسراتی رہی۔

یہاں سے مجھے دو ٹیلوں کے درمیان گھاس کا ایک پیالہ نما میدان نظر
تھا جس میں چند بھیڑیں سر جھکائے منہ چلا رہی تھیں۔ چرواہا ایک عمر رسیدہ
جو مجھے پہلے تو کن اکھیوں سے تکتا رہا اور پھر ایک نوخیز غزال کی مانند ٹیلوں
آیا اور کچھ فاصلے پر کھڑے ہو کر میرا جائزہ لینا شروع کر دیا۔

"السّلام علیکم"۔ میں نے بڑے میاں کی طرف سلام پھینکا۔

اُس نے ماتھے پر حیرت کے بل ڈالے اور ہتھیلی پھیلاتے میرے پاس
"وعلیکم السّلام"... اُس نے میرا ہاتھ اتنی شدت سے دبایا کہ میں بمشکل اپنے
ضبط کر سکا۔

اُس کے سر پر ترکمانوں کی لمبی قراقلی ٹوپی تھی۔ چست پتلون، چمڑے کی
جیکٹ اور گھٹنوں تک آتے ہوتے سیاہ بوٹ۔ خنجر کا کالا دستہ پتلون میں سے
رہا تھا۔ اُس کی لمبی داڑھی اور پلکوں میں ایک بال بھی سیاہ نہ تھا مگر اُس کا
شیشم کی چھمک کی طرح لچکیلا اور شفاف تھا۔

"مسلم؟" اُس نے لشکتے دانتوں کی نمائش کرتے ہوتے دریافت کیا۔ میں نے
اثبات میں سر ہلایا تو اُس نے مسکراتے ہوئے پھر ہاتھ آگے کر دیا۔ اس مرتبہ
کی شکنجہ گرفت کے لئے قدرے تیار تھا مگر پھر بھی دانت بھینچ کر اس مرحلے
گزرنا پڑا۔ ایک ہموار چھت کی پتھریلی چار دیواری کی جانب اشارہ کرتے ہوئے
اُس نے بتایا کہ وہ وہاں رہتا ہے اور میدان میں چرنے والی بھیڑیں اُس کی
ہیں۔ بابا جی کی زبان تو ترکی ہی تھی مگر اُس میں گاہے گاہے کچھ آشنا الفاظ
تھے جن کی مدد سے ہماری گفتگو آگے بڑھنے لگی۔

"آرارات؟" میں نے نوح کے پہاڑ کی جانب اشارہ کیا۔

"ہاں"۔ بابا جی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہنے لگے۔ "اُس پار روس ہے۔
روسی رہتے ہیں... تم روسیوں کو پسند کرتے ہو؟"

"میں کسی کو بھی ناپسند نہیں کرتا"۔ میں نے مسکرا کر کندھے سکیڑے۔
اس جواب سے بابا جی کا موڈ قدرے آف ہو گیا "خیر میں پسند نہیں کرتا"۔
میں نے اندازہ لگایا کہ نوح کے سفید پہاڑ اور گورے چٹے ترک بابے کی عمروں
میں بس انیس بیس کا ہی فرق تھا۔

بابا جی خاموشی سے آرارات کی جانب دیکھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ایک گہری
سانس بھری اور انگلی اُٹھا کر بولے "جوانی میں مَیں اس پہاڑ کو عبور کر کے روس جایا کرتا
تھا اور کسی نہ کسی روسی کو پکڑ لیا کرتا تھا۔ جانتے ہو اُس کے ساتھ میں کیا کرتا تھا؟"

"کیا؟"

بابا جی نے خنجر نکالا، آگے بڑھے اور میری گردن پر اُلٹا رکھ کر گلے اور زبان کے
زور سے "گرٹ" کی آواز نکالی اور مسکرانے لگے۔ میں نے لرزتے ہوئے خنجر کو اپنے سے
دُور کیا اور پھر حفاظتی اقدام کے طور پر دو قدم پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا۔

"ہر ہفتے ایک دو روسیوں کو تو "گرٹ" کر آیا کرتا تھا مگر یہ تو دس برس پہلے کی
باتیں ہیں جب میں جوان تھا"۔ بابا جی نے افسوس سے خنجر پتلون میں اُڑستے ہوتے کہا۔
جب بھی وہ "گرٹ" کا لفظ ادا کرتے، میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ جاتی۔ وہ اپنے چمکتے
ہوئے دانت یوں بھینچتے جیسے کسی درندے کے دانتوں تلے تڑپتا ہوا شکار آ گیا ہو۔

پتھریلی چار دیواری کی طرف سے کچھ شور سنائی دیا اور پھر چھینٹ کے لمبے لمبے
چوغوں میں ملبوس چند نوجوان لڑکیاں باہر آ گئیں۔ وہ زور زور سے ہنس رہی تھیں اور
بابا جی کو اشارے کر رہی تھیں۔ بابا جی نے منہ پر ہتھیلی رکھ کر غصے سے انہیں کچھ کہا اور
وہ بھیڑوں کی طرح فوراً مکان کے اندر چلی گئیں۔

"یہ آپ کی پوتیاں ہیں؟"

"بیٹیاں ہیں"۔ بابا جی کے دانت دھوپ میں لشکے... "البتہ ان میں سے ایک
میری بیوی تھی، پانچویں بیوی..."

میں نے اُن کا مکان اندر سے دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا تو باباجی ٹال گئے
"روسی آپ کو اس لئے بُرے لگتے ہیں کہ وہ کمیونسٹ ہیں؟" میں نے پوچھا۔
"روسی اگر مسلمان ہوں تب بھی مجھے بُرے لگیں۔ میں نے اپنا پہلا روسی
"گرٹ" کیا تھا..." وہ اطمینان سے بولے۔
"تم مسلمان ہی ہو ناں؟" گہری نیلی آنکھوں نے مجھے گھورا۔ انہیں شاید
میں روسیوں کے لئے ہمدردی کا شائبہ نظر آیا تھا میں نے مسکرا کر سر ہلایا تو
بولے "کلمہ سناؤ..."
میں نے کلمہ سنایا تو اُنہوں نے خوش ہو کر پھر ہاتھ آگے کر دیا۔ مجبوراً ملانا پڑا۔
"میں حاجی ہوں..." اُنہوں نے سینے پر دونوں ہاتھ باندھتے ہوئے فخر سے
"مکّے مدینے گیا تھا، تم گئے ہو؟"
"نہیں، ابھی نہیں گیا۔"
یکایک باباجی کی بھیڑیں یکدم مجتمع ہو کر ایک چٹان کی جانب چل دیں۔ اُنہوں
نے جلدی سے دست پنجہ لیا اور "ہو ہو" کرتے ایک نوخیز کھلاڑی کی طرح اُن کے پیچھے
سپرنٹ لگا دی۔
میں اپنا ہاتھ سہلاتا ہوا واپس اُسی رستے پر آیا اور اُس پہاڑی کی جانب چلنا شروع
کر دیا جس پر ایستادہ عمارت اب واضح طور پر ایک قلعے کی صورت میں نظر آرہی تھی۔
تھوڑی دیر بعد نوح کے پہاڑ کے پہلو میں سے بادلوں کی چند ٹکڑیاں نمودار ہوئیں اور
شفاف آسمان پر بکھر کر کہیں کہیں سے دھوپ کا رستہ روک لیا۔ میرے گرد کی تمام
دھوپ اور سایوں کے شطرنج بورڈ میں بٹ گئی۔ تیز ہوا کی وجہ سے یہ منظر جلد بدل
گیا اور لینڈ سکیپ نے ایک مختلف روپ اختیار کر لیا۔ پہاڑ، پتھر، راستے، گھاس بوٹے
اور سائے کے پیراہن اُتارنے اور پہننے لگے۔ سامنے کا سلسلہ کوہ ہر پل اپنی رنگت بدل رہا
تھا۔ کبھی ہلکا بھورا سائے میں اور کبھی مٹیالا سفید دھوپ میں۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ

وادی اور پہاڑ دراصل بالشوئی تھیئٹر کی سٹیج پر بنا ہوا کوئی سیٹ ہے اور اُس کے مختلف
حصوں پر روشنیاں ڈال کر روشنی اور سایوں کا ایک کھیل پیش کیا جا رہا ہے۔ صرف
کوہ آرارات اس سیٹ سے بلند ہمہ وقت چمک رہا ہے۔ چند کلومیٹر طے کرنے کے بعد
مجھے احساس ہوا کہ بایزید کا قلعہ بہت دُور ہے۔ وہ بھی اُن تمام اشیاء کی مانند نکلا جو
اپنی طرف بلانے کی قوت رکھتی ہیں۔ بہت نزدیک لگتی ہیں مگر جب آپ اُن کی جانب
سفر کرتے ہیں تو وہ آپ کو پاس نہیں آنے دیتیں، ہمیشہ دور ہی رہتی ہیں۔ میں
سفر جاری رکھتا تو بھی شام تک صرف پہاڑی کے قدموں میں پہنچ پاتا۔ وہ عمارت مجھ سے
دُور ہی رہتی۔ میں نے دائیں ہاتھ پر اپنے ساتھ ساتھ چلتے کوہِ آرارات کی جانب نگاہ کی
اور ڈوگ بایزید واپس جانے کے لئے مُڑا۔ واپسی پر یہ سفید معبد میرے بائیں ہاتھ پر تھا
اور پھر میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

بس کمپنی کے دفتر میں واپس پہنچا تو وہاں باقاعدہ فساد ہو رہا تھا۔ ہمارے گروہ
کے ارکان اپنی اپنی زبانوں میں چیخ رہے تھے اور منیجر شانت بیٹھا لڑکیوں کے ساتھ چہلیں
کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی سب لوگ میرے گرد جمع ہو گئے۔
"ہمیں پولیس کو اطلاع کرنی چاہیئے۔" سائمن ہانپتا ہوا بولا۔ "یہ ترک بے ایمانی
کر رہا ہے۔"
"ہوا کیا ہے؟"
"کہتا ہے یہ بس اب بھی نہیں جائے گی۔ صبح پانچ بجے چلے گی... اس نے ٹکٹ
دے رکھے ہیں۔ ہم سب پولیس سٹیشن جا رہے ہیں۔"
میں نے منیجر سے بات کی تو وہ بڑی حقارت سے کہنے لگا "ٹھیک ہے اپنا سامان
اُٹھاؤ اور چلے جاؤ پولیس کے پاس..."
"مگر تم نے ٹکٹ جاری کئے ہیں۔"
"اچھا!" وہ مصنوعی حیرت سے بولا "ذرا دکھاؤ۔"

میں نے اپنا ٹکٹ اُس کے آگے رکھ دیا۔ اُس نے اُنگلی تاریخ کے خانے پر
"اِس پر درج شدہ تاریخ پڑھی ہے؟ کل کا ٹکٹ ہے، بس آج کیسے جا سکتی ہے؟"
میں نے جلدی سے ٹکٹ دیکھا، وہ درست کہتا تھا۔ اُس پر اگلے روز کی تاریخ
تھی۔ پورے گروہ کے ٹکٹوں پر یہی تاریخ تھی۔ ٹکٹ خریدتے وقت کسی کو شبہ بھی نہ
تھا کہ ہمارے ساتھ فراڈ ہو رہا ہے اور اگلے روز کے ٹکٹ جاری کئے جا رہے ہیں۔
طور پر ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

باہر پہاڑوں میں تیزی سے چھا جانے والی رات آ چکی تھی اور ڈوگ بایزید
سنسان اور سرد ہو چکا تھا۔ اب شب بسری کا مسئلہ درپیش تھا۔ پورے گروہ نے سر جوڑ
سوچ بچار شروع کر دیا۔

"آپ لوگ یقیناً آج کی رات گزارنے کے بارے میں پریشان ہو رہے ہوں گے"
منیجر کے ہونٹوں پر اب ایک دردمند مسکراہٹ کھیل رہی تھی "خوش قسمتی سے میرے
عزیز ترین دوست کے بیٹے خلیلی کا "ہوٹل گرینڈ" دفتر کے ساتھ ہی ہے۔ آئیے میں آپ
چلتا ہوں۔"

آٹو نے زیرِ لب کوئی جرمن گالی دی اور زمین پر تھوک دیا۔

"اگر کھُلی فضا میں رات بسر کرنے کا ارادہ ہے تو اتنا بتا دوں کہ دو تین گھنٹے میں
درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے گر جائے گا اور اس سے تھوڑی دیر بعد گلیوں میں بھیڑیے
چہل قدمی کرنے لگیں گے۔"

خواتین دبک کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ جا لگیں اور جوُلی زور زور سے رونے

"دیکھ لینے میں کوئی حرج نہیں۔" میں نے گروہ کو صلاح دی۔

منیجر کے عزیز ترین دوست کے بیٹے خلیلی کا "گرینڈ ہوٹل" آگے پیچھے بنے دو
کمروں پر مشتمل تھا۔ پہلے کمرے میں جس کا دروازہ گلی کی جانب کھُلتا تھا، چند
ترک دہقان چارپائیوں پر لیٹے قہوہ پی رہے تھے، سگرٹوں کے کش لگا رہے تھے

اپنے جسموں کو کھُجلا رہے تھے۔ ہمارا گروہ چارپائیوں کے درمیان میں سے گزرا تو اُن کی
کھُجلی کی رفتار تیز ہو گئی۔ دوسرے کمرے میں پہلو بہ پہلو دس بارہ سیلن زدہ بستر بُودے
رہے تھے اور اس کمرے کے عقب میں ٹائلٹ کا بے پانی انتظام تھا۔ انگریزی محاورے
کے مطابق ہم اس گرینڈ ہوٹل کو رکھ سکتے تھے یا چھوڑ سکتے تھے۔ ہم نے اسے رکھ لیا اور
خلیلی کے ساتھ معاملاتِ کرایہ طے کرنے کے بعد دروازے کی کُنڈی اندر سے چڑھا لی۔
پہلے مرد حضرات نے کپڑے بدلے اور بستروں میں گھُس کر بدبُودار کمبل آنکھوں پر تان
لئے۔ اس مردانہ باپردگی کے دوران خواتین نے بھی یہی عمل دُہرایا اور ذاتی یا اجتماعی
طور پر دراز ہو گئیں۔ میں نے گیلی بُو والے کمبلوں کے درمیان اپنا سلیپنگ بیگ بچھایا
اور بستر پر لیٹ گیا۔ تینوں سویڈش لڑکیاں ایک ہی بستر میں گھُسی ہوئی تھیں مگر اُن کی
چھ عدد نفیس ٹانگیں ایک انسانی کیکڑے کی طرح کمبل سے باہر جھانک رہی تھیں۔
سب لوگ سونے کی تیاری کر رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے اُٹھ کر
کُنڈی اُتار دی۔ ایک ترک دہقان جبڑے کچکپاتا ہنس رہا تھا۔

"کیا ہے؟" میں نے بیزاری سے پوچھا۔

"ٹائلٹ"۔ اُس نے ہمارے کمرے سے ملحقہ غسل خانے کی طرف اشارہ کیا۔

میں راستے سے ہٹ گیا اور وہ بستروں کے درمیان میں سے انتہائی کاہلی
سے چلتا، آنکھیں لڑکیوں پر سینکتا، دانت نکالتا غسل خانے میں داخل ہو گیا۔ فوراً
ہی باہر نکل آیا اور پھر اُسی طور سرگشت کرتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

میں کُنڈی چڑھا کر لیٹا ہی تھا کہ پھر دستک ہوئی۔ اب ایک اور صاحب حماقت
آمیز مسکراہٹ لبوں پر سجائے "ٹائلٹ، ٹائلٹ" کر رہے تھے۔ وہ بھی آنکھیں دائیں
بائیں گھماتے، مغربی دوشیزاؤں کو بستروں میں دراز، دیکھتے مسکراتے ہوئے غسل خانے
میں گھُس گئے۔ فوراً ہی واپس آ گئے اور لڑکیوں کو جھُک جھُک کر گڈ مارننگ کہتے دوسرے
کمرے میں چلے گئے۔ پھر ایک اور دستک ہوئی... مشتاقانِ ٹائلٹ کا تانتا بندھ گیا...

بالآخر فرانسیسی ہنری کا پارہ چڑھ گیا۔ اُس نے تازہ ملاقاتی کو پہچان لیا تھا کہ وہ تیسری مرتبہ ٹائلٹ کی آرزو لے کر حاضر ہوا ہے۔ "یہ جنس زدہ ترک صرف ہماری نیند کو تاڑنے کے لئے آتے ہیں۔ مت کھولو دروازہ۔" وہ گرجا۔

دوبارہ دستک ہوئی تو میں چپکے سے لیٹا رہا۔ تھوڑی دیر بعد کسی نے دروازہ باقاعدہ کوٹنا شروع کر دیا۔ مجبوراً مجھے پھر اُٹھنا پڑا۔ وہاں خلیلی کھڑا تھا اور اس کے عقب میں تمام ترک دہقان قطار باندھے کھڑے تھے۔ "آپ لوگ دروازہ کیوں نہیں کھولتے؟ ان مسافروں کو بھی ٹائلٹ کے استعمال کا حق حاصل ہے۔" خلیلی نے بڑے رُعب سے کہا۔

"ان بلڈی مسافروں میں سے ہر ایک تین تین مرتبہ ٹائلٹ جا چکا ہے۔" سائمن نے ایک زہرآلود مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

"اور ہاں . . ." خلیلی بولا۔ "آپ حضرات یوں بغلگیر ہو کر نہ سوئیں، میرے مسافروں کو اعتراض ہے۔"

"یہ کون ہوتے ہیں اعتراض کرنے والے . . ." ہنری غصے سے لرزنے لگا۔

"بیشتر مسافر جوان جہان ہیں اور خواتین کی ٹانگیں . . ."

"مسافر جائیں جہنم میں، وہ آتے کیوں ہیں اِدھر، ہم اسی طرح سوئیں گے۔" ہنری پھٹ پڑا۔

"خیر میرا فرض تھا آپ کو متنبہ کرنا . . ." خلیلی تحمل سے بولا۔ "اب اگر کوئی مسافر اشتعال میں آجائے اور داڑھی مُنہ میں دبا کر آپ پر حملہ آور ہو جاتے تو میں ذمہ دار نہیں ہوں گا . . ."

"اوہ . . ." ہنری کچھ کہہ نہ سکا۔ صرف غصے سے مُنہ بناتا رہا۔

"ویسے یہ درست ہے کہ ہر مسافر کئی کئی بار ٹائلٹ استعمال کر چکا ہے۔" میں نے خلیلی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دوستانہ لہجے میں کہا۔ "آپ میرے ترک بھائی

ہیں، پلیز اِنہیں منع کردیں۔"

"پاکستانی بھائی!" وہ سنجیدگی سے بولا۔ "میں انہیں منع نہیں کر سکتا، ان کے پیٹ میں گڑبڑ ہے۔" خلیلی کے اس بیان پر اُس کے پیچھے کھڑے مسافروں نے اس طرح مُنہ بناتے جیسے پیٹ کی خرابی کے باعث وہ واقعی بے حد اذیت میں ہیں۔ یہ بہت عمدہ قسم کی اداکاری تھی اور مجھے ماننا پڑا کہ خلیلی ایک منجھا ہُوا ایکٹر ہے۔

"اگر آپ لوگوں کو یہ رہائش پسند نہیں تو بے شک کہیں اور چلے جائیے . . . یا پھر ان غریبوں کو اجازت دیجئے کہ وہ ٹائلٹ تک جا سکیں۔" خلیلی کے کندھوں پر سے جھانکتے ہوئے غریب دانت نکالنے لگے۔

"ٹھیک ہے۔" ہنری نے سی مان کو اچھی طرح کمبل میں لپیٹا اور اُٹھ کر دروازے کے پاس آگیا۔ "تمام مسافر ایک ایک کر کے آئیں اور اس کے بعد اگر کوئی . . . اِدھر آیا تو . . ."

یہ بہت مناسب ہے۔" خلیلی نے سر ہلایا۔

معاہدے کے مطابق ایک مسافر آگے آتا اور انیمیوں کی طرح بستروں کے درمیان سُستی سے چلتا ٹائلٹ میں گھُس جاتا۔ کئی حضرات ٹائلٹ کے دروازے کو ہاتھ لگا کر یوں اداکاری کرتے کہ ادھو ضرورت ہی نہیں تھی ایسے ہی آگئے اور واپس چلے جاتے۔ لیکن اس مرتبہ انہیں صرف لڑکے ہی دیکھنے کو ملے کیونکہ خواتین حفاظتی اقدام کے تحت کمبلوں میں رُوپوش تھیں۔ البتہ سویڈش لڑکیاں اپنی لمبی ٹانگوں کے ہاتھوں مجبور تھیں۔ ان کے پاؤں نظر آرہے تھے۔ جب آخری اُمیدوار واپس جا رہا تھا تو ہنری بستر پہ کھڑا ہو کر خلیلی سے کہنے لگا۔ "اب اگر کوئی . . . ترک اِدھر آیا تو۔" اُس نے مُکہ لہرا کر ایک فحش اشارہ کیا۔ "میں کر دوں گا۔"

"یہ کیا کہتا ہے؟" خلیلی مجھ پر چڑھ دوڑا۔ "بے شک ناپ تول لے ہم اس معاملے میں سب سے آگے ہیں۔"

”بابا حساب کتاب کی بات نہیں ہو رہی۔“ میں نے اُسے ٹھنڈا کرنا چاہا۔
”ایک قوم کی عزت کا سوال ہے۔“ وہ بے حد غصے میں تھا۔ ”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں... کیوں بھئی عدنان؟“

عدنان جو پاس ہی کھڑا تھا اُس نے سر ہلا کر تصدیق کی۔

”ہمارے آباؤ اجداد اتنی ساری بیویاں کھانا پکانے کے لئے نہیں رکھتے تھے۔“
خلیلی کا مُنہ سُرخ ہو رہا تھا اور وہ طرح طرح کے ناقابلِ بیان اشاروں سے ناقابلِ بیان، بیان دے رہا تھا۔ اس دھماچوکڑی میں لڑکیاں بے حد نروس ہو گئیں اور اُن میں سے بیشتر نے کمبلوں کے نیچے زار و قطار رونا شروع کر دیا۔ جُولی بے حد درد انگیز آواز میں رو رہی تھی اور اُس روزِ بد کو کوس رہی تھی جب اُس کے دل میں پُراسرار مشرق دیکھنے کی خواہش بیدار ہوتی تھی۔ لڑکیوں کے رونے کی آوازیں سُن کر خلیلی قدرے پریشان ہو گیا اور پھر ”او کے، او کے“ کرتا کمرے سے باہر نکل گیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ہاتھا پائی تک نوبت نہیں پہنچی اور کُنڈی چڑھا کر بالآخر اپنے سلیپنگ بیگ میں گھُس گیا۔

”ہنری“! فرانسیسی کی ساتھی لڑکی نے کمبل میں سے مُنہ نکالا۔ ”اب میں ٹائلٹ جانا چاہتی ہوں... واقعی!“

سُوئے شام

"پاکستانی، دیکھو کوہِ آرارات کی سفید برف کتنی قریب لگ رہی ہے مطلع صاف ہے، جلدی سے ایک تصویر بنالو۔" ڈوگ بایزید سے نکلتے ہی ہنری نے اپنی نشست سے مڑکر کہا۔ میں نے بمشکل آنکھیں کھولیں اور کھڑکی سے باہر ایک ناراض نگاہ ڈالی۔ آرارات کی چوٹی سورج کی پہلی شعاعوں کے مرکز میں کسی عظیم معبد کے نقرئی کلس کی طرح چمک رہی تھی... اولڈمین اینڈ دی سی...!" نوح کا یہ پہاڑ بھی ہیمنگوے کا بوڑھا آدمی تھا جو وادیٔ آرارات کی سمندر وسعتوں میں کشتیٔ نوح کے ایک حصے پر بے خوفی سے براجمان تھا۔ باہر کی دُنیا سے بے نیاز، میری موجودگی سے بے خبر، اپنے آپ میں مگن۔ ہم سیاح تو صرف چھوٹی چھوٹی مچھلیاں تھے جو اس کے نزدیک کوئی وقعت نہ رکھتی تھیں۔ وہ تو کسی بڑی وہیل کا منتظر تھا، کسی طوفانِ نوح کا۔

"مجھے نیند آرہی ہے۔" میں نے ہنری کو کہا اور کوہ آرارات سے مُنہ موڑکر اپنے آپ میں سمٹے ہوئے اونگھنے لگا۔

بس کچھ عرصہ تو شریفانہ طور پر صراطِ مستقیم پر ہی چلتی رہی اور پھر بے راہرو ہو کر پہاڑوں کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے لگی۔ چڑھائی کا آغاز ہُوا تو انجن جانکنی کی حالت میں پوری شدت سے ہچکیاں لینے لگا۔ اتنے شور میں اُونگھنا قدرے دشوار تھا۔ اس لئے میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ باہر بارش ہو رہی تھی اور دُھند کا آسیب کھڑکیوں کے راستے دبے پاؤں اندر آرہا تھا۔ کہیں موسمِ سرما کی آخری برفوں کے سفید پیوند گھاس کے سرسبز

پیراہن پر اُبھرے دکھائی دے رہے تھے ۔سڑک کے نیچے ایک کھائی میں اُلٹا ہوا ٹریلر بھی نظر آیا جو گہری دُھند میں قبل از تاریخ کے کسی جانور کا ڈھانچہ لگ رہا تھا۔ دو گھنٹے کی مسافت کے بعد انجن کی ہچکیاں ختم ہوئیں اور اس کا سانس درست ہوا ... ہم نیچے اُترنے لگے ... اگری کے قصبے میں ہم نے اپنے آپ کو ٹرکش قہوے سے گرمایا اور سفر پھر شروع ہو گیا۔ گیارہ بجے کے قریب آس پاس کی لینڈ سکیپ موہوم اجنبی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

"ارضِ روم ۔ ارضِ روم"۔ ڈرائیور نے مڑ کر مسافروں کو خبر کی۔

"ہونہہ، ارضِ روم"۔ میں نے رُوٹھے ہوئے بچے کی طرح مُنہ بسور کر سوچا... کس طرح سے میرا سامنا کرے گا یہ شہر؟ چھ برس پیشتر... جب اکتوبر کا آخر تھا سٹیشن سے شہر جانے والی سڑک کے دونوں طرف شاہ بلوط کے درختوں کے خزاں رسیدہ پتے سُرخ ہو کر گرنے شروع ہو گئے۔ کاکیشیا سے آنے والی ہوائیں خنک تر ہو چلی تھیں اور چند روز میں برف گرنے والی تھی۔ پہلے کوہِ دھند اور گرد و نواح کا پہاڑیوں پر اور پھر وہ شہر کا رُخ دیکھ لے گی ... شہر، جہاں میری جیب میں صرف ایک لیرا تھا اور میں نے صبح سے صرف ایک پیالی دہی اور چند انگور کھائے تھے ... ارضِ روم جہاں بالآخر گیلے فٹ پاتھ پر بیٹھ کر مجھے اپنا سامان بیچنا پڑا تھا۔ اپنی بھوک مٹانے کے لئے، وطن واپس پہنچنے کے لئے ... ارضِ روم میرے لئے سردی، بیچارگی اور بھوک کا دوسرا نام تھا۔ ارضِ روم مائی فٹ!

میرے گروہ کے سیّاح ارضِ روم پہنچ کر مجھ سے علیحدہ ہو گئے اور سٹیشن کی طرف چلنے لگے جہاں سے استنبول کے لئے ڈائرکٹ گاڑی چلتی تھی۔ لاہور سے ارضِ روم تک کی ـــــ زمین اور آسمان سے میری جان پہچان پرانی تھی مگر اب یہاں سے مجھے ملک شام کی جانب کوچ کرنا تھا اور یہ راستہ میرے لئے ایک گہرے جنگل میں اُترنے کا تھا۔ میں اس سے ناآشنا تھا۔ میں نے ترکی کا نقشہ کھولا اور میز پر پھیلا دیا... یہ لائن

... اور یہ جنوب کی طرف شام کا بارڈر ... نزدیک ترین ترک شہر غازی انتپ نام کا تھا۔

"غازی انتپ"۔ میں نے بکنگ کلرک کی کھڑکی میں نقشہ گھسیڑتے ہوئے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"انتپ ..." اُس نے نقشے پر کوئی توجہ نہ دی اور ٹکٹ کاٹ دیا۔

"میں شام جانا چاہتا ہوں، یہی راستہ ہو گا ناں؟"

"انتپ ... کلس ..." اُس نے میرے پیچھے کھڑے مسافر سے ہاتھ ملایا اور گپ لگانے لگا۔

بس کی روانگی میں ابھی پانچ گھنٹے باقی تھے۔ جی تو نہ چاہتا تھا کہ سرد یادوں والے اسی شہر سے دوبارہ میل کروں مگر پھر سوچا کہ بس دوسری صبح غازی انتپ پہنچے گی۔ دورانِ سفر کے لئے خشک خوراک کا بندوبست کر لینا چاہیئے۔ چنانچہ میں ایک چڑھی ہوئی تیوری اور حقارت کی نظر لئے بس سٹیشن سے باہر آ گیا۔

مجھے شہر کی طرف دیکھنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ میں اسے جانتا تھا۔ اس کی ایک ایک اینٹ میرے ذہن پر نقش تھی اور ان اینٹوں کے درمیان شدید سردی، بھوک اور غریب الوطنی کا سخت سیمنٹ تھا۔ ڈبل روٹی، خشک گوشت اور اُبلے ہوئے انڈے خرید کر میں اس کے بڑے بازار میں آ گیا۔ ایک ریستوران کے بڑے شیشے کے پیچھے شوارما گوشت کا ایک تکلا سُستی سے گھوم رہا تھا۔ چھ برس پہلے میری جیب میں ایک لیرا تھا جو میں نے مدرسے کے نیچے بیٹھے ہوئے فقیر کی جھولی میں ڈال دیا تھا مگر آج ... میں اندر چلا گیا۔ شوارما کے باریک قتلے، سلاد اور چپس اور اس کے ساتھ بدن کو یخ کر کے پھر حرارت دینے والا مشروب۔ میں نے نفیس خوراک سے بھرے پیٹ کی آسودگی میں محمود ہوتے ہوئے سگرٹ سلگایا اور شیشے کے اس پار بازار میں رواں لوگوں کو دیکھنے لگا... لوگ خوبصورت تھے۔ فٹ پاتھ پر گیس کے غبارے بیچنے والا کھڑا تھا۔ سینکڑوں رنگین غباروں میں سے ایک رنگ علیحدہ ہو کر چلنے لگا۔ دراصل وہ پیلے فراک میں ملبوس ایک ننھی منی پلی ہوئی بچی تھی۔ جس نے ابھی ابھی ایک غبارہ خریدا تھا۔ یونیورسٹی کی چند لڑکیاں کِھلتے جسموں کے لئے

ناکافی پیراہنوں میں پھنسی غباروں کے قریب سے گزریں۔ پل بھر کے لئے
رنگوں میں مدغم ہو کر شناخت کھو بیٹھیں اور پھر اسی لمحے ظاہر ہو کر آزاد
نکھری ہوئی چلی گئیں۔ دُھوپ کا قلعی گر ارض روم اور اس کے چہروں پر
کا نوشادر چھڑک کر انہیں چمکیلا بنا رہا تھا۔ میں نے بل ادا کیا اور ریستوران سے
آ گیا۔

ہوا میں خنکی تھی مگر دُھوپ میں پگھلتی ہوئی پرانے گھروں کی سُرخ چھتیں
حال ہی میں پینٹ کی گئی تھیں۔ اُن کی چمکتی رنگت مسرت دینے والی تھی
کا وہ مینار جس نے میرے بھُو کے بدن کو بارش سے پناہ دی تھی، نیلے آسمان میں
بشاش کھڑا تھا اور اس کا صحن دُھوپ کی سوہنی سفیدی میں سانس لے رہا تھا
سے پرے کوہ دُھند اور نواحی پہاڑ کاکیشیا کی حسیناؤں کی طرح خود بھی خوبصورت
یک لخت مجھ پر وارد ہوا کہ میں تو اس شہر کو پسند کرنے لگا ہوں۔ یہ وہ بستی نہیں
نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ شاید ارض روم کو احساس ہوا ہو کہ میں نے چھ برس
اس غریب الدیار کے ساتھ زیادتی کی تھی اور اب صرف مجھے منانے کی خاطر وہ
حسین ترین رُخ میرے سامنے لا رہا ہے۔ جی چاہا کہ غازی انتپ کا ٹکٹ واپس کر
چند روز کے لئے یہیں ٹھہر جاؤں۔ لیکن نہیں شاید یہ رُوپ صرف آج کے لئے
ہو سکتا ہے کل رنگ اُتر جائیں، دُھوپ سرد ہو جائے اور شہر کی عمارتیں اور
میرے لئے پھر ایک دیوانے کا خواب بن جائیں!

سفر کے آغاز پر میں نے اپنے رُک سیک میں سے ٹافیوں کا ایک پیکٹ
بس میں سوار بچوں میں تقسیم کر دیا۔ خواتین کے سامنے نظریں نیچی رکھیں اور مردوں
سگرٹ پیش کئے۔ یوں میں نے اپنے آپ کو ایک قابلِ اعتماد ساتھی کی حیثیت
اس خاندان میں شریک کر لیا جو اگلے چودہ گھنٹوں کے لئے میرا ہم سفر تھا۔

اسکندرون کے راستے قبرص جا رہے تھے!
ترک زوجیوں کی تھی جو
بس نے ارض روم کو چھوڑا تو میں ایک دوست شہر سے جُدا ہوا۔ میرے اور
اس شہر کے درمیان اب رنجش کا ایک تار بھی باقی نہ تھا اور اگر کہیں تھا تو اُس منظر
نے توڑ دیا جو ایک رنگین شعبدے کی صورت میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ دائیں ہاتھ
پر نیلے پہاڑوں کا ایک سلسلہ اونٹوں کے کوہانوں کی طرح ہموار میدان کے آخر میں
سے اُبھرا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ پہلے وہ سمندری نیلاہٹ کے تودے نظر آتے
اور پھر دھوپ کا زاویہ بدلنے سے ان پر برف کی سفید لکیریں چمکنے لگیں جو نیچے میدانوں
میں اُتر رہی تھیں۔ پہاڑوں کے دامن سے لے کر مجھ تک پھیلا ہوا میدان اُکتاہٹ
کی حد تک سبز تھا اور ہریاول کے اس وسیع کینوس میں لاتعداد ڈنٹھل گُلِ لالہ کے
سُرخ پیالے تھامے ساکت کھڑے تھے جیسے ابھی ابھی بارش ہوئی ہو اور زمین میں
سے اَن گنت بیر بہوٹیاں نکل کر گھاس میں سے جھانک رہی ہوں یا شاید کسی نے
ہزاروں غباروں میں سُرخ پانی بھر کر انہیں ایک سبز قالین پر رکھ کر سوئی کی نوک سے
پھاڑ دیا ہو اور سُرخی جذب ہوتی گئی ہو۔ بس کے چلنے سے یہ منظر مجھے دھیرے دھیرے
ہلتا دکھائی دے رہا تھا جیسے کوئی مصوّر تصویر بنا کر شام ڈھلے اسے کھلی فضاؤں میں
چھوڑ گیا اور رات بھر کی اوس نے رنگوں کو قدرے پھیلا دیا ہو۔ فرانسیسی مصوّر رینائر
کی تصویر "گُلِ لالہ کا کھیت" اگر زندہ ہو سکتی تو یہیں ہوتی۔ پچھلے پہر کی ہلکی دُھوپ نے
قدرت کے اس رُوپ کو اس طرح نیم روشن کیا ہوا تھا کہ اسے دیکھتے ہوئے آنکھیں
تھکتی نہیں تھیں۔ پھر ساکت زندگی کی تصویر کا ایک حصہ تحرک میں یوں بدلا کہ ایک
چھوٹا سا بچہ سُرخ سویٹر پہنے گھاس میں آزادی سے دوڑتا دکھائی دیا۔ چند قدم پیچھے
اس کا باپ اسے پکڑنے کی خاطر ہنستا ہوا بھاگا چلا آ رہا تھا۔ ان سے کچھ فاصلے پر ایک
پیلا خیمہ نصب تھا اور اس کے باہر ایک غیر ملکی عورت آنکھوں پر ہتھیلی جمائے ان دونوں
کو کھلے میدان میں بھاگتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اس کا حیات آور جسم ایک اور زندگی کی

کی نوید دے رہا تھا اور اسی لئے وہ اس مسرت آمیز دوڑ میں شریک نہیں
... کوئی سیاح خاندان جو میری طرح ارضِ روم سے نکلا اور اس منظر کا اسیر
میری طرح بے اختیار نہ تھا، اپنی کار روکی اور آج کی شب گزارنے کے لئے
پہاڑوں، ہرے میدان اور گُلِ لالہ کا مہمان بن گیا۔

یہ لینڈ سکیپ سرکتے سرکتے پیچھے رہنے لگی اور پھر پلک جھپکتے میں ہماری
سائے میں چلی گئی۔ ایک کٹا پھٹا پہاڑی سلسلہ شروع ہوا اور ہم ایک ایسی
ہمسائگی میں چلنے لگے جسے پہلی نظر میں میں نے چشمہ جانا مگر پھر اس کا پانی ہر چند
کے بعد باقاعدگی سے نمودار ہونے لگا۔ چڑھائی طے کرتے ہوئے ہم سائے میں
اور زرد مرتی ہوئی دُھوپ ہمیں اپنے تعاقب میں دیکھ کر بلندیوں پر سمٹ
ہم نے درجنوں مال بردار بڑے ٹریلروں کو اوورٹیک کیا جو ہینی بال کے ہاتھیوں
کی مانند اس سلسلۂ کوہ کو سست الوجودی سے عبور کر رہے تھے۔ اب باہر دیکھنے
آنکھیں تھکتی تھیں۔ روشنی اور نیم تاریکی کی درمیانی کیفیت میں اشیاء کا تعین مشکل
تھا۔ یکدم ہماری بس معمولی طور پر جھولی جیسے سرکس کا مسخرہ سادہ پانی پی کر نشے کی کیفیت
طاری کر کے ڈولنے لگتا ہے اور پھر کھڑی ہو گئی۔ تمام مسافر باہر نکل آئے۔ اردگرد
منظر پہلے سے بھی زیادہ آؤٹ آف فوکس ہو رہا تھا۔ میری آنکھیں پتھروں اور چٹانوں
کو آپس میں گڈمڈ ہوتے دیکھ رہی تھیں جیسے وہ حرکت میں ہوں اور وہ تھے کیونکہ
نے بس اس لئے روک دی تھی کہ ان پہاڑوں میں ایک خفیف سا زلزلہ آ رہا تھا
ترکی کا یہ سلسلۂ کوہ اکثر زلزلوں کی زد میں آیا رہتا ہے اس لئے مقامی مسافروں
معمولی نوعیت کے ان جھٹکوں کو زیادہ اہمیت نہ دی اور بار بار گھڑیاں دیکھتے
کہ زلزلہ خواہ مخواہ وقت ضائع کر رہا ہے۔ اپنا سگرٹ ختم کر کے ڈرائیور سڑک کے
بیٹھا اور اطمینان سے زمین کے ساتھ کان لگا کر آنکھیں بند کر لیں، تھوڑی دیر بعد
نے آنکھیں کھولیں اور سر کے اشارے سے مسافروں کو بس میں سوار ہونے کو کہا۔

ہم اندھیرے میں سفر کر رہے تھے اور باہر کا کچھ پتہ نہ تھا کہ کونسا خطۂ زمین گزر رہا
ہے۔ یہاں کے لوگ کیسے ہیں، دوست یا دشمن۔ اندھیرے میں سفر کرنے والوں کو بھی فائدہ
ہوتا ہے کہ وہ اپنی مختصر دُنیا میں محو رہتے ہیں اور باہر کا کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ ہم کہاں ہیں اور
کیوں ہیں۔ میں نے خوراک کا پیکٹ نکال کر ایک ہلکا سا ڈنر نوش کیا اور پھر کھڑکی کے ساتھ
سر ٹیک کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ پچھلی نشستوں پر چند فوجی حسبِ عادت بلند آواز میں
گفتگو کر رہے تھے۔ بس کے جھٹکوں کے ساتھ میں نیم غنودگی کی طرف مائل ہوا۔ مسافر باتیں
کرتے رہے، میں غنودگی اور نیم غنودگی کی جانب بڑھتا اور واپس آتا رہا۔ ان دونوں میں
سے پتہ نہیں کونسی کیفیت تھی جب میں نے محسوس کیا کہ پچھلی نشستوں پر بیٹھے ہوتے مسافر
خالص پنجابی زبان میں گفتگو کر رہے ہیں۔ اگرچہ میں نے اپنے اونگھتے وجود کو سمجھایا کہ میں
اس وقت ترکی میں ہوں، مسافر بھی ترک ہیں اور ترک زبان میں ہی بات چیت کر رہے
ہیں مگر جانے یہ کیا معاملہ تھا کہ مجھے ان کا ایک ایک لفظ سمجھ آ رہا تھا اور یہ لفظ پنجابی
کے تھے۔ نہ صرف یہ کہ آوازیں میرے دوستوں کی تھیں، میرے جاننے والوں کی۔ یہ ہو نہیں
سکتا تھا، مگر ایسا تھا، اُس کیفیت میں ایسا ہوا۔ میں نیند اور ہوش کی کسی منزل پر ان کی
باتیں سُن رہا تھا، سمجھ رہا تھا، وہ آپس میں کسی لطیفے کا تبادلہ کرتے تو میں چپکے سے مسکرانے
لگتا، اپنے دُکھوں کا ذکر کرتے تو میں رنجیدہ ہونے لگتا۔ لفظ سرگوشیوں میں بدل جاتے تو
مجھے معلوم ہو جاتا کہ وہ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں اور میرے کان تیز ہو جاتے۔۔ لیکن ترک
پنجابی کیسے بول سکتے ہیں؟ یہ مجھے معلوم نہیں مگر اُس وقت اس پہاڑی سلسلے کی رات
میں رینگتی ہوئی بس میں وہ بول رہے تھے۔

"انتپ، انتپ" کوئی میرے کندھے جھٹک کر چیخ رہا تھا۔ میں ہڑبڑا کر
اُٹھ بیٹھا۔ باہر صبح کی دُھوپ تھی اور بس ایک ہموار میدان میں انگوروں کے کھیتوں میں
سے گزر رہی تھی۔

"انتپ"۔ کنڈکٹر نے پھر مجھے جھنجھوڑا۔

"غازی انتپ؟" میں نے پوچھا۔

"انتپ، انتپ"۔ اُس نے ڈرائیور کو آواز دے کر بس رُکوائی اور مجھے [illegible] ہوئے نیچے اُتار دیا۔ ایک مسافر نے کھڑکی میں سے میرا رُک سیک سڑک پر پھینک [illegible] بس چلی گئی۔ میں نے آنکھیں ملتے ہوئے چاروں طرف دیکھا تو شہر نہ تھا۔ انگوروں [illegible] کھیت تھے۔ میں ابھی سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ ایک اور بس رُکی اور کنڈکٹر نے باہر نکل کر "انتپ، انتپ" کہتے ہوئے میرا رُک سیک اٹھایا اور مجھے بس کے اندر کھینچ لیا۔ نشست پر بیٹھتے ہوئے میں نے دیکھا کہ ارض روم والی بس دائیں ہاتھ پر [illegible] نکون جانے والی شاہراہ پر مڑ رہی ہے۔ چونکہ میں غازی انتپ کا واحد مسافر [illegible] اس لئے مجھے اس بس کے سپرد کر دیا گیا تھا۔

صبح کے سات بج رہے تھے جب ہم غازی انتپ میں داخل ہوئے۔ ایک [illegible] بچے سکول جا رہے تھے۔ مزدور فیکٹریوں میں پہنچنے کے لئے تیز تیز چل رہے تھے۔ [illegible] لوگ سائیکلوں پر دوہرے ہو رہے تھے، کاریں ٹریفک کے ہجوم میں ہارن دیتی [illegible] رینگ رہی تھی۔ اور لوگ تھے بے شمار، ایک شہر۔ میں منہ میں بیداری کے کسیلے [illegible] لئے بڑھی ہوئی شیو کے ساتھ ان سب کو دیکھتا رہا۔ یہ کتنی لرزا دینے والی بات [illegible] کہ غازی انتپ ایک لفظ تھا جسے صرف ایک روز پہلے آپ کی آنکھوں نے ایک نقشے پر دیکھا۔ آپ نے اس لفظ کی جانب سفر کیا جس سے آپ زندگی میں پہلی مرتبہ [illegible] ہوئے تھے اور وہاں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ وہ صرف ایک لفظ نہیں بلکہ بچے سکول [illegible] رہے ہیں، مزدور فیکٹریوں میں پہنچنے کے لئے تیز تیز چل رہے ہیں۔ دفتری لوگ [illegible] پر دوہرے ہو رہے ہیں۔ کاریں ٹریفک کے ہجوم میں . . . اور آپ کو آج تک [illegible] سب کے وجود کا شائبہ تک نہ تھا۔ اور یہی لرزا دینے والی بات ہے کہ دُنیا میں [illegible] ہزار ایسے ہی شہر ہوں گے اور پھر بھی ہم اپنے آپ کو مکمل سمجھتے ہیں۔

بس سٹیشن پر اُتر کر میں نے شامی سرحد کے بارے میں فوراً یوں استف[illegible]

جیسے شام تو یہ سامنے والے بڑے بازار کے اختتام پر شروع ہوتا ہوگا مگر بتایا گیا کہ ہنوز ملکِ شام دور است اور مجھے ابھی یہاں سے خاصے فاصلے پر واقع کِلس کے قصبے تک جانا ہوگا۔ کِلس کے لئے بس ساڑھے آٹھ بجے روانہ ہوتی تھی۔ چنانچہ فارغ وقت میں میں نے جسم کو ہلکا کرنے کے لئے بس سٹیشن کے غلیظ غسل خانے سے استفادہ کیا۔ پھر میٹھی ٹرکش روٹی کے چند نوالے قہوے کی مدد سے نگلے اور اس کے بعد غازی انتپ میں گھومتا رہا۔ ایک شہر، دروازے کھڑکیاں، بازار اور لوگ۔

غازی انتپ کی گہما گہمی کے بعد کِلس کی جانب سفر کرتے ہوئے مجھے شدید ویرانی کا احساس ہوا۔ انگوروں کے باغوں میں دُور دُور تک کوئی ذی روح موجود نہ تھا۔ ہماری بس ایک سیدھی اور بالکل خالی سڑک پر چل رہی تھی۔ کِلس ایک مختصر مگر جاذبِ نظر ترک قصبہ تھا جس کے بڑے چوک میں جہاں بس رُکی اتاترک کا ایک مجسمہ نصب تھا۔ میں نے سامان اُٹھایا اور اپنے تئیں ملکِ شام میں قدم رکھنے کو تھا کہ ایک مرتبہ پھر اطلاع ملی کہ ابھی سرحد دُور ہے۔ یہاں سے ٹیکسی میں سوار ہو کر جانا ہوگا۔ چنانچہ ایک اجتماعی ٹیکسی میں سوار ہوا جس نے بالآخر مجھے ترک شامی بارڈر پر جا اتارا۔

شامی کسٹم افسر نے پاسپورٹوں کے ڈھیر میں سے بطورِ خاص میرا پاسپورٹ نکال کر الگ رکھ دیا۔

"یہ صاحب کوئی قصہ کھڑا کریں گے۔" میں نے قریبی کرسی پر بیٹھتے ہوئے سوچا۔

تمام مسافروں کو فارغ کرنے کے بعد انہوں نے میرے پاسپورٹ کا مطالعہ شروع کر دیا۔ ان کی تیوری چڑھی ہوئی تھی۔

"مائی پھیرے باز نے بھی تو اسی کسٹم ہاؤس کی کھڑکیاں توڑ دی تھیں۔" میں نے ہراساں ہو کر سوچا۔ "یہ صاحب یقیناً پاکستانیوں کے خون کے پیاسے ہوں گے۔ سرحد عبور نہیں کرنے دیں گے۔"

اتنے میں انہوں نے گرجدار آواز میں کوئی نام پکارا۔ باہر کھڑا سپاہی اتنی بیتابی

سے اندر آیا کہ سیلوٹ مارتے ہوئے اُس نے مجھے لرزا دیا۔ عربی زبان میں کچھ کہا،
وہ اجازتی سیلوٹ کے بعد جیسے یکدم وہیں غائب ہو گیا ہو۔

"نہ صرف یہ کہ سرحد عبور نہیں کرنے دیں گے بلکہ یہ تو گرفتار کرنے کے موڈ میں
دیتے ہیں۔" جیسے گلا اسی لمحے پک گیا ہو۔ میں تھوک بھی نہیں نگل سکتا تھا۔ کوئی
عبور کرتے ہوئے سیاح خوف اور بے چینی میں ضرور مبتلا ہوتا ہے کہ جانے کیا ہو
کر دیں، اگر روک لیا تو پھر کیا ہو گا۔ اور پھر ایسی سرحد جس کے بارے میں آپ
ہو کہ چند ماہ پیشتر اپنے پاکستانی برادران نے اس کی عمارت اور عملے پر باقاعدہ
کی تھی۔

کسٹم افسر نے پاسپورٹ کے ورق الٹانے کے بعد اُسے پھر میز پر پھینک دیا
کنپٹیوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے انگریزی میں پوچھا۔ "پاکستانی ہو؟"

"جی۔" میں نے اقرار کر لیا اور کیا کرتا، پاسپورٹ پر بھی لکھا تھا۔

"ہوں۔" وہ جھوم کر بولے۔

"میں سرحد عبور نہیں کر سکتا؟" میں نے کھسیانے ہو کر پوچھا۔

"نہیں"۔ وہ کہنے لگے۔

اس "نہیں" سے ایک بخار کی سی کیفیت میرے جسم میں سرایت کرنے لگی۔

میں وہی سپاہی ایک ٹرے ہاتھوں میں لئے اندر داخل ہوا۔

"آپ تب تک سرحد عبور نہیں کر سکتے جب تک کہ میرے ساتھ قہوے کا
گلاس نہ پئیں۔ سگریٹ؟" انہوں نے ایک بڑھیا برانڈ کا پیکیٹ کھولتے ہوئے
آگے بڑھا دیا۔

میری حیرت قابلِ فہم طور پر عروج پر تھی۔

"تاخیر کے لئے معذرت خواہ ہوں، مگر دوسرے مسافروں کی موجودگی میں
کو قہوے کی دعوت دینا قدرے معیوب سی بات ہوتی۔" وہ کھُل کر مسکراتے ہوئے

"آپ نے خواہ مخواہ تکلف کیا . . . میں اب بھی صورتِ حال کے بارے میں
کچھ دُھندلاہٹ میں تھا۔

"یہ تو نہیں ہو سکتا کہ ایک پاکستانی بھائی ہمارے پاس آئے اور ہم اسے یوں
خشک خشک اپنے ملک میں داخل کر لیں۔"

"تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں۔" میں نے قدرے نارمل ہوتے ہوئے سر ہلایا۔

"باتیں کو چھوڑیئے۔" وہ مُنہ بنا کر بولے۔ "لیکن پاکستانی . . . آپ ہمارے بھائی ہیں۔"
دمشق پہنچ کر مجھے معلوم ہُوا کہ شامی پاکستانیوں کو اتنا عزیز کیوں جانتے ہیں۔

قہوہ ختم کرنے کے بعد اُنہوں نے میرے پاسپورٹ پر مُہر لگائی اور پھر اپنی
کرسی سے اُٹھ کر میرے ساتھ ایک پُرجوش مصافحہ کیا۔ "میں آپ کو شام میں خوش آمدید
کہتا ہوں۔ اہلاً و سہلاً۔"

میرا گلا میرا ساتھ چھوڑ گیا۔ میں بمشکل "شکریہ" کہہ سکا۔

ماضی کے تلخ تجربات کے مقابلے میں مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے میرے اور
شام کے دوران کوئی سرحد نہیں، اگر تھی تو وہ صرف میرے لئے کھول دی گئی ہے۔
شامی لوگوں کی وہ بے باک خوش اخلاقی جس نے مجھے شام میں گزارے ہوئے شب و روز
میں حیرت زدہ کئے رکھا۔ اس کی پہلی خوراک مجھے اس کی سرحد پر ہی مل گئی تھی۔

تارکول کی گھنی تاریک سڑک پر ٹیکسی ایک ہموار رفتار سے حلب جا رہی تھی دائیں
اور بائیں گندم کے سنسناتے لشکارے مارتے زرد کھیت نیل رنگے آسمان کے کناروں
تک چلے گئے تھے۔ مصوّر فان گوگ کی تصویروں ایسی شفاف زردی میں کہیں کہیں دیوقامت
کمبائن ہارویسٹر آہنی جبڑے کھولے ان کھیتوں کو چبا رہے تھے اور بھوسے اور گندم
کے دانوں سے بھری ہوئی بوریاں اپنی دُموں میں سے ایک خراب ہاضمے والی بکری کی
طرح اُگل رہے تھے۔ گندم کا پہلا خودرو پودا ملکِ شام کے انہی خطوں میں پیدا ہُوا تھا۔
ٹیکسی کے اندر ہو کے بھرتی ہوئی ایک گہری مترنم آواز، ڈھولکی کی تھاپ پر

عربی میں کوئی گیت الاپ رہی تھی اور اس کے زیرِ اثر میرے جسم میں ایک [illegible]
پھیل رہی تھی... واللہ مستنفر باللہ تم بالآخر اپنے پہلے عرب ملک میں ہو [illegible]
کی بجائے صحرا ہوتا، گندم نہ ہوتی، کھجوروں کے درخت ہوتے یا چلیے زیتون کے [illegible]
ہی سہی اور مکینیکل ہارویسٹر کی جگہ ایک آدھ مریل اونٹ تھوتھنی اٹھائے [illegible]
ہُوا دکھائی دے جاتا تو تصوّرِ عرب ذرا زیادہ راحت آمیز ہو جاتا لیکن خیر ٹیکسی [illegible]
وجود میں گونجتا نغمہ تو بہر طور عربی میں ہی ہے ناں... میں نے ایک مرتبہ جب [illegible]
کی تھاپ پر ذرا سر کو جنبش دی تو ڈرائیور نے اسے پسندیدگی کی علامت جان کر [illegible]
گھمایا اور آواز مزید بلند کر دی۔

"سبحان اللہ اُمِ کلثوم کی آواز میں بھی کیا سحر ہے۔" میں نے سر ہلا کر ٹیکسی [illegible]
کو کہا۔ "ناں..." اُس نے زبان پٹاخے کی طرح بجا کر سر ہلایا۔ "یہ فیروز ہے۔"

"اچھا۔" میں کھسیانا ہو گیا۔ "فیروز ہے...؟ آواز تو لڑکیوں ایسی ہے۔"

"لڑکی ہی ہے۔" وہ ہنس دیا۔

پچھلی نشست پر بیٹھے ہوئے مسافر آغازِ سفر سے ہی نیم سجدے کی کیفیت میں
چلے گئے تھے اور فیروز بی بی میں مگن تھے۔ اتنی دیر میں فیروز نے کوئی تان لگائی
ڈرائیور نے حلق میں سے ایک "سبحان اللہ" نکال کر ایکسلریٹر پوری قوت سے [illegible]
ٹیکسی ایک برق رفتار موٹر بوٹ کی مانند گندم کی زرد جھیل میں تیرنے لگی!

یہ لفظ جو میں لکھ رہا ہوں، یہ حرف جو آپ پڑھ رہے ہیں، ملکِ شام [illegible]
نے ہی مجھے اور آپ کو عطا کئے۔ حروفِ تہجّی کی ایجاد اسی خطّے میں ہوئی۔ قدیم [illegible]
اور پجاریوں نے اپنی ضرورت کے لئے حرفوں کی شکلیں بنائیں اور پھر یہ کنعانیوں [illegible]
یونانیوں اور رومنوں سے ہوتے ہوئے یورپ پہنچ گئے۔ دوسری جانب یہی حروف
ایران کے راستے ہندوستان میں آئے... شام کا اوّلین نام "آرام" تھا جو بعد [illegible]
صرف اس وجہ سے "الشام" کہلایا کہ یہ خطّہ خانہ کعبہ سے بائیں ہاتھ پر واقع تھا۔

مقابلے میں جو دائیں جانب آتا تھا۔ کعبے کو شام سے ایک نزدیک کی نسبت ہبل نام
کا ایک بُت بھی تھا جو سُرخ عقیق سے تراش کر انہی علاقوں سے معبدِ عرب میں بھیجا
گیا۔ انسانی اخلاقیات اور روحانی ترقی کے حوالے سے اس خطّے کو باقی دُنیا پر ہمیشہ
برتری حاصل رہی۔ یہودیت اور عیسائیت نے اس کے آس پاس جنم لیا اور اسلام
کا پھیلاؤ یہیں سے شروع ہُوا۔ ایک کہاوت ہے کہ ایک مسلمان، یہودی اور عیسائی
دُنیا میں کہیں بھی ہو اُس کی رُوح شام کو لَوٹتی ہے۔

دوپہر کے قریب ہم حلب پہنچ گئے۔ میں نے موسیقی میں مگن ڈرائیور سے ہاتھ
ملایا اور پھر دمشق جانے والی ایک پُرتکلّف و پُرہجوم بس میں سوار ہو گیا۔ یہ میرا پہلا شامی
گروہ تھا۔ دُودھ میں گھُلے شربتِ انار ایسی رنگتیں، ترشے ہوئے نین نقش اور نفاست سے
حرکت کرتے ہوئے۔ بس روانہ ہوئی تو چھت میں نصب سپیکروں میں سے ایک سُریلی
آواز کا جادو مسافروں کے سروں پر چڑھ کر بولنے لگا۔ جملہ حضرات نے نیم سجدے کی
کیفیت اختیار کی اور آواز پر کان دھرے سُراغِ موسیقی پانے کی دُھن میں غرق ہو گئے۔

"سُبحان اللہ فیروز کی آواز میں بھی کیا سحر ہے۔" میں نے اپنے ہمسائے سے
سلسلۂ کلام شروع کرنے کی غرض سے کہا۔

اُس نے گردن سے لٹکتی سونے کی صلیب کو انگلیوں پر رکھ کر چُوما اور پھر زبان
سے پٹاخہ سا بجاتے ہوئے کہا۔ "ناں... یہ اُمِ کلثوم ہے۔"

اُمِ کلثوم اور فیروز کی آوازوں نے آئندہ چند روز کے لئے شام اور لبنان میں
میرے ساتھ ساتھ سفر کرنا تھا۔ اس دوران نیند کے علاوہ مجھے کوئی ایسا لمحہ یاد نہیں
جب کہ ان کی گہری رچی ہوئی آوازیں میرے کانوں میں نہ اُتری ہوں۔ محلّے اور بازار تو
[illegible] اُن کے الاپ سے گونجتے ہی ہیں مگر ٹیکسیوں، بسوں، قہوہ خانوں،
یہاں تک کہ کھلے میدانوں اور ویرانوں میں بھی یہ دو خواتین ہمہ وقت آپ سے ہم کلام
رہتی ہیں۔ اُمِ کلثوم اور فیروز ان ملکوں کی آب و ہوا ہیں۔ شک ہونے لگتا ہے کہ

عمارتوں اور انسانوں کے وجود ان کی گونجتی صداؤں کی گرفت میں ہیں
قائم ہیں اور اگر کبھی یہ یک لخت خاموش ہو جائیں تو شاید اس سناٹے سے عمارتیں
جائیں اور انسان گونگے ہو جائیں۔

ہم حلب سے باہر آئے تو حبس کا احساس ہُوا۔ میرے ہمسائے نے ماتھے
پسینہ پونچھا اور کھڑے ہو کر چھت میں نصب ایئر کنڈیشنر کے سوراخوں کے آگے
دی۔ کچھ دیر پُر امید کھڑا رہا اور پھر جیب میں سے ٹکٹ نکال کر اس پر لکھی عبارت
پڑھنے لگا "یہ بس مکمل طور پر ایئر کنڈیشنڈ ہے۔" ہلکی مسکراہٹیں مسافروں کے چہروں پر
اور وہ مطمئن ہو کر اپنی نشست پر براجمان ہو گیا۔ قدرے توقف کے بعد ایک اور مسافر
اور بڑی خصوصیت سے کنڈیشنر کے آگے ایک اُنگلی کھڑی کر دی "یہ بس مکمل طور پر
ایئر کنڈیشنڈ ہے۔" اُس نے بھی اپنے ٹکٹ کو انتہائی سنجیدگی سے پڑھا... "دراصل یہ بس
صرف کنڈیشنڈ ہے۔" وہ اپنی نشست کی طرف بڑھتے ہوئے مسکرا رہا تھا، کیونکہ ایئر کا
تو نام و نشان نہیں۔" مسافروں نے ایک ہلکا سا قہقہہ بلند کر دیا۔ اتنی دیر میں ایک
اور صاحب ہتھیلی پھیلائے ایئر کنڈیشنر کی طرف بڑھے۔

"خواتین و حضرات!" بس کا خوبرو اور خوش لباس کنڈکٹر پشیمانگی میں
مسافروں سے مخاطب ہُوا "میں آپ کے علامتی احتجاج کا مطلب بخوبی سمجھتا ہوں
افسوس ہے کہ ایئر کنڈیشنر کام نہیں کر رہا۔ حما پہنچنے پر اسے درست کر دیا جائے گا
انشاء اللہ..." "انشاء اللہ" تمام مسافروں نے نہایت وسیع القلبی سے نعرہ لگایا
کنڈکٹر مسکراتے ہوئے ٹرے میں سجی ٹافیاں اور سویٹس ہمیں پیش کرنے لگا۔

حُما پہنچ کر کافی کے لئے توقف کیا گیا۔ مسافر سڑک کے کنارے ریستوران میں
گئے اور میں فٹ پاتھ پر کھڑا ہو کر سگرٹ پینے لگا۔ سامنے ایک وسیع سی جانب
تین منزلہ عمارت جتنی بلند لکڑی کی بڑی بڑی چرخیاں سُستی سے گھوم رہی تھیں
کی تاریخی پن چکیاں تھیں۔ لاتعداد بچے ان کے گیلے چوکھٹوں سے چمٹے ہوتے تھے۔

آہستہ آہستہ بلندی کی جانب اُٹھتے اور جونہی واپسی کا چکر شروع ہوتا، چیخیں مارتے
ہوتے تالاب میں کُود جاتے۔ پچھلے بائیس گھنٹے کی مسلسل مسافت کی تھکن میری پوروں تک
پہنچ رہی تھی اور میں جمائیاں لیتا بس کے اندر چلا گیا۔
حما کے آس پاس کا زمینی منظر اُس تصور کی طرف تیزی سے بڑھنے لگا جو کہ عرب
ملکوں سے وابستہ ہے یعنی سبزہ کم ہونے لگا اور صحرا اس کی جگہ لینے کو آگے آنے لگا۔ البتہ
شام کے ان صحراؤں میں مجھے وہ ہجومِ نخیل دکھائی نہ دیا جو مسجدِ قرطبہ کے لاتعداد ستونوں
کو دیکھ کر علامہ اقبال کے تخیل میں اُبھرا تھا۔ شام کے صحراؤں میں اِک ہجومِ نخیل کی علامت
اس حوالے سے بھی بہت بلیغ ہے کہ مسلمان اندلس کی تہذیب و ثقافت کا سرچشمہ سرزمینِ
شام ہی تھی۔

آس پاس عمارتیں نظر آنے لگیں، ایک اور شہر شروع ہو گیا، تجارتی قسم کا اور بہت
سپاٹ۔ یہاں بھی کافی کے لئے بس روک دی گئی۔ تھکن مجھ پر غالب آ چکی تھی اور میں
باہر نکلنے کی بجائے اپنی نشست میں دھنسا اُن نوٹس کی ورق گردانی کرنے لگا جو میں
نے شام کے بارے میں آغازِ سفر سے پیشتر تیار کئے تھے۔ ان میں مختلف شامی شہروں
کا تاریخی پس منظر تھا۔ جب میں نے دمشق کا تذکرہ ختم کیا تو بس ایک مرتبہ پھر شہر سے باہر
آ چکی تھی اور ہم ایک دو رویہ شاہراہ پر اُسی شہر کی جانب سفر کر رہے تھے۔ حُما کے باب
میں اس کی دیو ہیکل پن چکیوں کا ذکر تھا اور تیسرا شہر حمص تھا... حمص۔ کم از کم ایک
روز قیام کرنا ہے۔

حضرت حمزہ کے قاتل وحشی کا شہر، خالد بن ولید کا مدفن۔
"حمص یہاں سے کتنی دُور ہے؟" میں نے اپنے ہم نشست سے دریافت کیا۔
"حمص تو بہت پیچھے رہ گیا ہے... جہاں کافی کے لئے بس رُکی تھی۔"
میں نے پلٹ کر دیکھا تو بس کے عقبی شیشے میں سے ایک طویل شاہراہ بہتی ہوئی
دُور ہو رہی تھی اور اُس کے آخر میں کسی آبادی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ ایک آواز تھی

شاید حمص کی جانب سے۔

أنا فارس الضديد

أنا خالد بن الوليد

أنا سيف الله

دُور سے یہ رجز سنائی دیتی اور دشمنوں کو علم ہو جاتا کہ ایک ناقابلِ تسخیر فاتح میدانِ جنگ میں داخل ہونے کو ہے جو نپولین اور چنگیز خاں کی حکمتِ حرب رکھتا ہے جس کی تدبیرِ حرب تیمور لنگ ایسی ہے اور جو ذاتی شجاعت میں رستم کے ہم پلّہ ہے اور یوں وہ ان تمام فاتحین پر سبقت رکھتا ہے۔ ایک رومی جرنل نے آغازِ جنگ سے پہلے طعنہ دیا "اے خالد! میں نے سنا ہے کہ تمہارے پیغمبر نے تمہیں ایک ایسی تلوار عطا کی ہے جو تمہیں ناقابلِ تسخیر بنا دیتی ہے تو اس میں تمہارا (خالد بن ولید) کا کیا کمال ہے؟" خالد نے جواب دیا "ہر جنگ میں درجنوں تلواریں میرے ہاتھ میں ٹوٹتی ہیں، شجاعت تلواروں میں نہیں، خالد بن ولید میں ہے۔" وہ ہمیشہ میدان میں اُترنے سے پہلے آہنی خود کے نیچے ایک ٹوپی پہنتا جس میں حضور صلعم کے موئے مبارک سِلے ہوتے تھے۔ اتنا زور آور جوان تھا کہ ایک رومی جرنیل کو بازوؤں میں کس کر زور لگایا تو اس کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں۔ سکندر اور چنگیز کے علاوہ وہ واحد فاتح تھا جو شکست سے کبھی آشنا نہ ہوا۔ یہاں تک کہ ایامِ کفر میں مسلمانوں کے خلاف جنگِ اُحد میں بھی کامران ہوا۔

اسی حمص میں حضرت حمزہ کو بے دردی سے شہید کرنے والے شخص وحشی نے اپنی زندگی کے آخری ایام حالتِ خمار میں گزارے۔ شراب نوشی کے جرم میں حضرت عمرؓ نے اسے اسّی دُرّوں کی سزا دی مگر وہ پھر بھی اس سے جدا نہ ہوا اور بالآخر حضرت عمرؓ نے یہ کہہ کر چشم پوشی اختیار کر لی کہ شاید حضرت حمزہ کے خون کی وجہ سے اللہ وحشی کو ویسے بھی معاف نہیں کرے گا۔ حمص کے ضعیف الاعتقاد لوگ اس کی زیارت کو آتے تو وہ انہیں حضرت حمزہ اور مسالمہ کے قتل کی تفصیل سناتا اور برچھے کو بلند کر کے کہتا "اس برچھے سے میں نے

ایامِ کفر میں ایک بہترین آدمی کو قتل کیا یعنی حضرت حمزہ کو اور پھر اپنے ایامِ ایمان میں ایک بدترین آدمی کو یعنی دشمنِ اسلام مسالمہ کو۔"

خالد بن ولید کی کامرانی صرف میدانِ جنگ تک محدود رہی، وہ سیاست میں مات کھا گیا۔ جبری طور پر برطرف ہوا اور پھر حمص میں آکر ایک زخمی چیتے کی طرح تنہائی اور خاموشی میں پڑا رہا۔ بازو جو ہمیشہ فضا میں بلند رہتے تھے خالی ہو کر بستر میں قید ہو گئے۔ ایک روز اس نے اپنے واحد قرابت دار حمّام سے بڑے دکھ سے پوچھا "اے حمّام میرے جسم کو دیکھ اور دو انگلیاں جوڑ کر کسی ایسے حصے پر رکھ جہاں زخم کے نشان نہ ہوں۔" حمّام نے کہا "اے خالد ایسا کوئی حصہ نہیں"۔ خالد نے بے بسی سے سوال کیا "تو پھر میں شہید کیوں نہ ہوا؟" حمّام کا جواب تھا "اس لئے ابو سلیمان کہ اللہ کی تلوار کو کوئی شہید نہیں کر سکتا۔" شام ہوئی تو خالد نے اپنی اذیت کو اس تاریخی فقرے میں ڈھالا "میں ایسے مر رہا ہوں جیسے ایک اونٹ مرتا ہے، میں بستر میں ایک شرمناک موت مر رہا ہوں۔" مدینہ میں کہرام مچ گیا۔ حضرت عمرؓ اپنا دُرّہ لے کر حجرے سے باہر آ گئے کیونکہ اُن کا حکم تھا کہ جہاد میں کام آنے والوں کا ماتم نہ کیا جائے۔ باہر اُن کی بیٹی حفصہ بھی گریہ کر رہی تھیں۔ "لوگ مرنے والے جنگجو خالد بن ولید کا سوگ منا رہے ہیں" انہوں نے بتایا۔ حضرت عمرؓ نے وہ دُرّہ لٹکا دیا اور اپنے تمام اختلافات بھول کر کہا۔ "بنو مخزوم کی عورتوں کو ابو سلیمان کا ماتم کرنے دو، اس لئے کہ وہ جھوٹ نہیں کہہ رہیں کہ رونے والے ابو سلیمان جیسے شخص پر ہی روتے ہیں۔"

انا فارس الضدید

انا خالد بن الولید

انا سیف اللہ

بس کے شیشے میں سے ایک طویل شاہراہ بہتی ہوئی دُور ہو رہی تھی۔ حمص پیچھے رہ گیا تھا۔

دمِ دمشق اندر — ۱

شام ہو رہی تھی، چھ بجے کے قریب ہم ایک خاموش سے شہر میں داخل ہوتے جو دمشق تھا۔

اُوپر اُٹھتی ہوئی دیواریں خاصی بلندی پر جا کر آسمان کے ایک مختصر ٹکڑے کو کندھا دے رہی تھیں۔ میں مسافر خانے کے صحن کی گہرائی میں براجمان اُوپر دیکھ رہا تھا جیسے کسی کنوئیں میں اعتکاف میں بیٹھا ہوں مگر عبادت میں دل نہیں لگ رہا اور باہر نکل جانا چاہتا ہوں۔ عبدالرحمٰن بھی ایک کونے میں نیم دراز آسمان کو تک رہا تھا اور اُس کی اُنگلیوں میں چرس کا ایک سگرٹ کاہلی سے راکھ ہو رہا تھا۔ صابر سرکار بار بار دیگچی کا ڈھکن اُٹھا کر بھاپ میں ناک لہراتے ہوئے پکنے والے مٹر آلو میں نمک مرچ کی مناسبت کا اندازہ لگا رہا تھا۔

تہران میں مائی پھیرے باز نے مجھے نہایت شفقت سے مشورہ دیا تھا کہ پُتّر دمشق میں عبدالکریم الہندی کے ہوٹل فندق الکبیر میں قیام کرنے پر گھر کا سا آرام ملے گا۔ چنانچہ میں نے بس سے اُتر کر ایک راہ گیر سے سنجک دار کا راستہ پوچھا تو وہ صاحب اپنا راستہ بھول کر میرے ساتھ چلنے لگے۔ پہلے مرکزی چوک میں کھڑے ہو کر ریڑھی پر بکنے والا سیاہ رنگ کا ایک بدمزہ اور اُبکائیاں لانے والا شربت بصد اصرار پلایا اور پھر فندق الکبیر تک میرا ساتھ دیا۔ عبدالکریم ایک اُدھیڑ عمر کا شخص تھا اور الہندی ہی تھا مگر مائی پھیرے باز کے حوالے کو اُس نے چنداں اہمیت نہ دی، بس سر ہلاتا رہا اور ایک جہازی سائز کا حُقّہ گڑگڑاتا رہا۔ ... کاؤنٹر کے پیچھے ہندوستانی اور پاکستانی اداکاراؤں کی تصویریں مکھیوں کی آلائش سے سیاہ

ہو رہی تھیں اور اُن کے درمیان میں بی بی زینب کے روضے کی ایک تصویر آویزاں تھی جس کے عین اُوپر زیرو کا ایک سبز بلب جل بجھ رہا تھا۔ کاؤنٹر کے سامنے ایک بوسیدہ بدبُو چھوڑتے قالین پر چار پانچ رعشہ زدہ کرسیاں تھیں جہاں چند حضرات سر جوڑے کھُسر پھُسر کر رہے تھے... ہو سکتا ہے وہ بلند آواز میں گفتگو کر رہے ہوں مگر ہوٹل کی بوسیدگی میں گونجتی ریشماں اور نور جہاں کی آوازوں کے شور میں وہ کھُسر پھُسر ہی کر رہے تھے۔ کاؤنٹر کے پیچھے عبدالکریم جو کہ الہندی ہی تھا، ایک جہازی سائز کا حُقہ گُڑگُڑا رہا تھا۔

"اس میں تمہارا سامان ہے؟" اُس نے میرے رُک سیک پر ایک کسٹم افسر والا ہاتھ رکھ کر پُوچھا۔

"ہاں۔"

"کیا کیا ہے؟"

یہ سوال قدرے غیر متوقع تھا، بھلا عبدالکریم کو کیا غرض کہ میں اپنے رُک سیک میں کیا کیا اُٹھائے پھرتا ہوں۔ بہر حال میں نے بتایا، چند کتابیں، ایک جین جیکٹ، ہراتی پُوسٹ، بنیانیں، انڈر ویئر...

"انڈر ویئر ریشمی ہیں؟" اُس نے کاہلی سے سر اُٹھایا۔

"نہیں۔"

"خیر..." وہ مایوسی سے بولا۔ "ریشمی ہوتے تو عرب لڑکیاں زیادہ پسند کرتیں۔"

"کچھ کچھ بیہودہ سی بات نہیں کہ عرب خواتین یہ سُونگھتی پھریں کہ میں ریشمی انڈر ویئر پہنتا ہوں یا سُوتی..."

عبدالکریم الہندی نے ایک تمسخر آلود نگاہ سے مجھے نوازا۔ "تم پھیرے باز نہیں ہو؟"

"نہیں۔"

"تو پھر کیا ہو؟" وہ قدرے چوکنا ہو گیا۔

"سیاح ہوں، دمشق دیکھنے آیا ہوں۔"

"اچھا..." وہ بے یقینی سے بولا "صرف گھُومنے پھرنے، سیر کرنے؟"

"ہاں" میری بیزاری انتہا کو پہنچنے لگی۔ "الہندی صاحب میں آپ کے فائیو سٹار ہوٹل میں اس لئے آگیا ہوں کہ مائی پھیرے باز نے آپ کی سفارش کی تھی، مجھے ایک کمرہ چاہیئے، ہے یا نہیں؟"

"ہے۔" وہ جلدی سے بولا اور ایک زنگ آلود چابی میرے آگے رکھ دی۔

کمرے نے مجھے بالکل مایوس نہ کیا حسب توقع خوب خستہ حال اور ناقابلِ رہائش حد تک بدبُودار۔ میں نے آگے بڑھ کر گلی پر کھُلتی کھڑکی کھول دی مگر اندرونی آب و ہوا جُوں کی توں رہی۔ سیلن زدہ بُو کا سر چشمہ وہ بستر تھا جس پر بچھی چادر کی شکنوں پر مَیل کی لکیریں یوں اُبھری ہوئی تھیں جیسے شیر خوار بچے کی بند مُٹھی کھولی جائے تو ہتھیلی کی لکیروں میں مَیل پھنسی ہوتی ہے۔ غسل فرمانے کے لئے راہداری میں واقع مشترکہ غسل خانے کی جانب رجوع کیا تو وہاں فرش اس حد تک کائی زدہ تھا کہ اُس پر باقاعدہ سکی اِنگ ہو سکتی تھی۔ بہر حال بازی گروں کی طرح توازن قائم رکھتے ہوئے میں نے تین روز کی کھُردری فصل اپنے چہرے سے اُتاری۔ بالوں کو شیمپو کیا جو اتنے طویل سفر کے بعد بالکل پتھر ہو چکے تھے اور پھر کمرے میں واپس آگیا... صابر سرکار شاید میری تاک میں تھا، وہ بھی فوراً دستک دے کر اندر چلا آیا۔

"سرکار، شام کے کھانے کے لئے مٹر اور آلو کی بھُجیا تیار کر رہا ہوں۔ روٹی ہاتھ کی ہو گی تین عدد۔ دس روپے پاکستانی میں حاضر کر دوں گا اور ساتھ میں چائے بھی۔ خاکسار کو صابر کہتے ہیں سرکار..." وہ دیسی خانساموں کی طرح اپنے موٹے پیٹ پہ ہاتھ باندھ کر سر جھکائے مؤدب کھڑا ہو گیا۔

افغانستان، ایران اور ترکی کے بے مرچ کھانوں کے بعد میرے تالو میں سے مرچ کے مزے کی خواہش پھُوٹنے لگی۔ "مرچیں تیز ہوں گی؟"

"نہ ہوئیں تو اور چھڑک دوں گا سرکار۔"

"لے آؤ۔"

"سرکار زحمت نہ ہو تو صحن میں تشریف لاکر تناول کریجئے۔ کھلی فضا میں روٹی گرم گرم اُترے گی توے سے۔"

۔۔۔۔اور اب صابر جو ہر کس و ناکس کو سرکار سرکار کہتا خود بھی سرکار ہوگیا تو بار بار دیگچی میں سے اُٹھنے والی بھاپ میں ناک لہرا رہا تھا اور اُس کا دوسرا گاہک عبدالرحمٰن جو پہلے دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا، انتظار کرتے کرتے فرش پر دراز ہو چکا تھا۔ شام ہی میری پہلی شام۔

بھجیا تیار کرنے کے بعد صابر نے نہایت اہتمام سے اپنے پھولے ہوئے پیٹ پر ایک ایپرن لپیٹا اور مشکوک صفائی کی حامل دو رکابیوں میں سالن ڈال کر پیش کر دیا۔ گرم روٹی کے پہلے نوالے نے ہی میرے بیشتر طبق روشن کر دیئے۔ مرچیں تیز ہی نہیں ناقابلِ برداشت تھیں مگر اب ہاتھ کھینچنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ اُدھر صابر میرے سر پر کھڑا کسی الف لیلوی جن کی طرح ہاتھ باندھے میری رائے کا منتظر تھا۔

"واہ کیا خوب کرارا کھانا پکاتے ہو صابر بھائی۔" میں نے چھنگلی سے آنکھوں میں تیرتے پانی کو پونچھتے ہوئے رُندھے ہوئے گلے سے کہا۔

"ذرہ نوازی ہے سرکار کی۔" وہ بچوں کی طرح خوش ہوگیا اور کورنش بجا لایا پھر ایپرن اُتار کر رکھا، میری طرف شرمندہ نظروں سے دیکھا اور صحن میں اوندھے پڑے ایک گملے کو اُٹھایا۔ نیچے کسی نامعلوم برانڈ کی سستی شراب کی چوتھائی بوتل رکھی تھی۔

"اجازت ہے سرکار؟" اُس نے بے حد فرمانبرداری سے دریافت کیا اور پھر بوتل مُنہ لگا کر ایک گہرا گھونٹ بھرا۔

"صابر سرکار تمہیں کتنا عرصہ ہوگیا ملک سے نکلے ہوئے؟" میں نے دورانِ ڈنر گپ شپ کے طور پر پوچھا۔

"کچھ زیادہ ہی ہوگیا سرکار۔" وہ روہانسا ہوگیا۔ "زمانے گزر گئے صابر سرکار کو ملک

سے نکلے ہوئے۔"

"پاکستانی ہو ناں؟"

"ہوں تو سہی سرکار مگر ہمت نہیں پڑتی کہلانے کی... ہم تو بے آسرا لوگ ہیں، گناہگار ہیں... نیک نام دے سکتے تو کہلاتے پاکستانی..."

"دمشق میں کس طرح پہنچ گئے؟"

"آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا کوئٹے کے ہائی سکول میں۔ ماں باپ تھے، خاندان تھا، زندگی کے مزے تھے۔ پھر سرکار بُری عادتوں نے مجھے خرید لیا۔ تین سال کی سزا ہوئی، جیل سے بھاگا تو گرفتاری کے خوف سے سرحد پار کرکے ایران چلا گیا... بس وہ دن اور آج کا دن، کہیں ٹھکانہ ہی نہیں... کچھ عرصہ بھیک مانگی ایران میں۔ پندرہ برس عراق میں درزی کا کام کیا۔ پھر وہاں ایک پاکستانی تاجر کو جاسوسی کے الزام میں برسرِعام پھانسی دی گئی تو ہم سب کی شامت آگئی۔ یہاں چلا آیا۔ چار سال بی بی زینب کے روضے کے باہر شربت بیچتا رہا۔ پچھلے سال وہاں سے بھی اُٹھا دیا گیا... پھر یہ بھگت رام اپنا یار بن گیا..."

"کونسا بھگت رام؟"

"یہ جو چرس کے نشے میں ڈوبا ابھی تک اپنے پہلے نوالے کو گھور رہا ہے۔"

"مگر یہ تو عبدالرحمٰن ہے۔"

"ہے بھگت رام مگر جب اس کا ہندوستانی پاسپورٹ ضبط کر لیا گیا تو اِس نے یہاں سے پاکستانی پاسپورٹ خرید لیا۔ اُس پر بھگت رام کیسے لکھواتا... عبدالرحمٰن ہوگیا... باقاعدہ کلمہ پڑھ کر ہوا سرکار... بھگت رام!" اُس نے اپنے یار کو پکارا۔ "کلمہ پڑھ کر سُنا سرکار کو۔"

بھگت رام نے اپنے پہلے نوالے کو واپس رکابی میں رکھا اور نہایت خشوع وخضوع سے کلمہ پڑھنے لگا۔

"تو سرکار بھگت رام اپنا یار بن گیا... اِس نے کہا، صابر سرکار نکال پھر
ہے تیرے پاس، سو گُنا کر دوں گا۔ میں نے نکال دیا۔ ہم نے چرس خریدی اور
جانے کے لئے۔ قاہرہ ایئرپورٹ پر اُترے تو آگے سرکار پولیس ہی پولیس۔ ...
لگا دی۔ دو ساتھی پکڑے گئے اور اُنہیں پچھلے مہینے دس دس سال کی قید ہو...
بس سرکار میں نے تو توبہ کر لی حرام کی کمائی سے۔ اب یہاں عبدالکریم الہندی ...
بھرتا ہوں، شام کو کھانا پکا کر ہوٹل لگاتا ہوں، تھوڑا سا کڑوا پانی پیتا ہوں اور یہ
پڑا رہتا ہوں صحن میں۔ مگر یہ سب تو آج کا کھیل ہے سرکار، کل پھر کوئی ٹھکانہ ڈھو...
پڑے گا..."

"کیا کل سے عبدالکریم الہندی حُقّہ پینا چھوڑ رہا ہے؟" میں نے ہنستے ہوئے...
"نہیں سرکار یہ ہوٹل بِک گیا ہے۔ کل بارہ بجے نئے مالک قبضہ لینے کے لئے
رہے ہیں۔"

"مگر عبدالکریم الہندی نے تو مجھے یہ نہیں بتایا۔" میں پریشان ہو گیا۔
"آپ نے پُوچھا کہ کیوں عبدالکریم الہندی یہ ہوٹل بس ایک رات کا ہی مہمان...
... نہیں پُوچھا ناں؟" صابر کھلکھلا کر ہنس دیا۔ شراب کا ہلکا سرور اُس کے بدن
تن و توش میں گھُل رہا تھا۔

مرچوں کی عادت ہونے کے بعد اب سالن بہت مزیدار لگ رہا تھا۔ "ایک...
اور مل جائے گی صابر؟"

"کیوں نہیں سرکار۔" وہ پھُرتی سے اُٹھا، ایپرن زیبِ تن کیا اور جھک کر...
پلیٹ میں ایک اور روٹی رکھ دی۔ "دو روپے ہوں گے ہر فالتو روٹی کے۔" ...
بعد اُس نے ایپرن اُتارا اور اپنے شغل میں محو ہو گیا۔

"صابر تم وطن واپس کیوں نہیں چلے جاتے؟"
"میری جڑوں کو ہوا لگ گئی ہے سرکار، اور پھر وہاں جاؤں کس کے پاس...

نہیں کہاں کہاں چلے گئے ہیں۔" اُس نے آخری گھونٹ بھرا اور بوتل کو احتیاط سے گملے
کے نیچے چھپا دیا۔

"آپ سیر کرنے آئے ہو ناں سرکار؟"

"ہاں۔"

"مگر گھر تو جاؤ گے ناں واپس؟"

"ہاں۔"

"ہاں آپ تو گھر جاؤ گے، گھر والے جو ہوتے..."

"گھر" کے لفظ پر جیسے صابر کے چہرے پر جلاوطنی کی دُھول کے لاکھوں ذرّے
چمکتے اور مدھم پڑ جاتے۔

میں نے صابر سرکار کو کھانے کی قیمت ادا کی اور کمرے میں آ گیا۔

کھڑکی سے باہر گلی چُپ تھی۔ دمشق کی بستی دیر تک جاگنے کی عادی نہ تھی۔
رُک سیک میں سے سفری ڈائری کھینچ کر میں نے چند سطریں لکھیں اور پھر کپڑے
تبدیل کرتے ہوئے بستر کی طرف دیکھا۔ حسبِ سابق صفائی کے معاملے میں انتہائی پس ماندہ،
حوصلہ شکن حد تک غلیظ اور بُو باش۔ میں نے اپنا سلیپنگ بیگ دل کڑا کر کے بستر پر
بچھایا اور اُس کے نرم پروں میں دراز ہو گیا۔

دو دن اور ایک رات کا متواتر سفر ایک آہنی شہتیر کی طرح مجھ پر آن گرا۔ جسم کے
مختلف حصے تھکاوٹ کی برف میں منجمد ہونے لگے۔ آنکھیں بند رکھنے کے لئے مجھے باقاعدہ
دانت بھینچنے پڑے۔ اس بے آرامی میں کچھ وقت گزرا اور پھر ایک عجیب سی بے چینی جسم
پر چھانے لگی۔ کروٹ بدلتا تو وہ سانس لینے کے لئے رُک جاتی مگر پھر فوراً ہی رواں ہو
جاتی۔ میں ایک بیزار مگرمچھ کی طرح کروٹیں بدلتا رہا مگر یہ بے چینی کم نہ ہوئی۔ بدن پر
جیسے پھوڑے پھُوٹتے رہے بالآخر جب ضبط نہ ہو سکا تو بستر سے اُٹھ کر روشنی آن کر دی۔

. . . نہ صرف میرے جسم پر بلکہ پورے بستر پر مکھی کے حجم جتنے سینکڑوں کھٹمل موجود
جنہیں اگر میں دن کی روشنی میں دیکھتا تو بیر بہوٹیاں جان کر شدید رومینٹک
ان کے رُومانس کے نشان تو میرے بدن پر ثبت ہو رہے تھے ۔ یہ کسی بھی کھٹمل سے
پہلی ملاقات تھی . . . میں نے ایک پانی میں شرابور جسم کو خشک کرنے کے انداز میں
اور بازوؤں کو ہتھیلی میں بھینچ کر ان نازک اندامون کو اُتارا ، پھر سلیپنگ بیگ کو
لگا تو فرش پر نظر پڑی ، ایک سُرخ قالین دھیرے دھیرے ہل رہا تھا ، دیوار
چہل پہل کے رواں آثار تھے ، کراہت سے میرا وجود کھنچنے لگا ۔ سو پچاس کی بات
میں یقیناً نہایت منظّم طریقے سے اُن کی فصل کو اپنے ہراتی بوٹ کی مدد سے ملیا میٹ
مگر یہاں تو نقشہ کچھ یوں تھا جیسے کسی سنیما سکوپ فلم کے لئے افواجِ چنگیزی کی
بلندی سے فلمبند ہو رہی ہے ۔ میں نے اپنی چپّل سے تقریباً ایک مربع فٹ کے
میں سے اُن کا صفایا کیا اور پھر چپّل کو ہاتھ میں تھامے ایک بُت کی طرح آزاد
سرزمین پر کھڑا ہو گیا . . . اب کیا کیا جائے ؟ ساری رات تو اس حالت میں نہیں
جا سکتی اور پھر ہر پانچ منٹ کے بعد مجھے اپنا علاقہ صاف رکھنے کے لئے چپّل
تھی ۔ میں نے اس صورتِ حال کے بارے میں عبدالکریم الہندی سے مشورہ کرنا
جانا . . . اُس کے کمرے کا دروازہ بہت دیر بعد کھُلا ۔ مجھے دیکھ کر وہ قدرے
ہو گیا کیونکہ چپّل ابھی تک میرے ہاتھ میں تھی جسے میں نے ایک اور دستک دینے کے
فضا میں بلند کر رکھا تھا ۔

"اوہ معاف کیجئے گا ۔" میں نے ہاتھ نیچے کر لیا ۔

"کیا ہے ؟"

"میرے کمرے میں کھٹمل ہیں ۔"

"اچھا ، وہ تو میرے کمرے میں بھی ہیں ۔" اُس نے جسم کھجلاتے ہوئے دروازہ
میں نے کمرے میں آکر سامان پیک کیا اور ہوٹل سے باہر نکل کر ایک

پر آ گیا ۔ شہر سو رہا تھا اور میں بھی ایک خالی فٹ پاتھ پر سلیپنگ بیگ بچھا کر اس کے ہمراہ
سو گیا ۔

میرا مُنہ کھُلے کا کھُلا رہ گیا اور قدم رُک گئے ۔ سامنے سے پھر وہی لڑکی چلی آ رہی تھی ۔
وہ پہلے سے قدرے دُبلی تھی مگر تھی وہی ۔ اور اس سے پہلے جب دیکھا تھا تو قد اس
کی نسبت نکلتا ہُوا تھا ۔ ہر مرتبہ اُس کا لباس بھی مختلف ہوتا ۔ وہ ہر دس پندرہ منٹ
کے بعد مجھے کہیں نہ کہیں نظر آ جاتی ۔ سُوق الحمیدیہ کی کسی دکان میں ، شارع درویش
کے کسی قہوہ خانے میں ، فٹ پاتھ پر اپنے خاوند کے ہمراہ ، البو رُومانہ میں اپنے کسی
دوست کے ساتھ ، شارع صالح میں اپنے بچّے کے ساتھ ، شارع الباکستان میں
اکیلی گھُومتی ہوئی . . . اور ہر مرتبہ میرا ردِّ عمل طے شدہ ہوتا ۔ میرا مُنہ کھُل جاتا اور
قدم رُک جاتے ۔ میں بنیادی طور پر ایک نظر باز قسم کا بندہ نہیں ہوں ، اُڑتی چڑیا
کو دیکھ تو لیتا ہوں لیکن پَر گننے نہیں بیٹھ جاتا یعنی چہرہ پُرکشش ہُوا تو زیادہ سے
زیادہ آنکھیں جھپکنے میں معمولی سا تامّل کر لیا اور بس . . . لیکن دمشق میں نظر آنے والی
یہ لڑکی میری اخلاقیات کی جڑوں میں بیٹھ گئی تھی ۔ اُس نے مجھے انتہائی اَپ سیٹ
کر دیا تھا ۔ مختصر وقفوں کے بعد وہ میرے سامنے سے یا پیچھے سے چلتی ہوئی آتی اور
میں اپنے آپ کو ملامت کرتا ہُوا اُسی مقام پر پتھر بنا مُنہ کھولے اُسے ہونقوں کی طرح
دیکھنے لگتا ۔

اُس کا سراپا بیان کرنے کی کوشش مضحکہ خیز ہو گی کیونکہ تمام لفظ تو عکس کی مدح
کی نظر ہو چکے اب سراپا سامنے آیا تو کاغذ کورے نکلے . . . پتہ نہیں اُس کی جلد کچھ ایسی
تھی جیسے . . . اُس کا بدن . . . اور آنکھیں ایسی تھیں جیسے . . . بال اتنے لامبے تھے
جس طرح . . . یعنی یہ جیسے اور جس طرح کو مکمل کرنا میرے بس کی بات نہیں ۔ میں تو
یہ جانتا ہوں کہ اُس نے دمشق میں میرا چلنا پھرنا دُوبھر کر دیا تھا ۔ وہ نظر آتی اور میں

اُس کے حُسن کا خراج مُنہ کھولنے اور قدم روکنے کی صورت میں بلا تاخیر ادا کر دیا
کہا جاتا ہے کہ یہ لڑکی یہودی، فلسطینی، آرمینین اور کاکیشین خون کی آمیزش سے بنی
ہے اور واللہ کیا خوب بنی ہے۔ اگر نیندیں اُڑا دینے والے حُسن میں کچھ حقیقت ہے
تو انسان دمشق میں آکر ہمیشہ کے لئے بے خوابی کا شکار ہو جائے۔ اور یوں یہ بات
بھی کچھ ناقابلِ یقین سی لگتی ہے کہ یاروں نے قحط کے دوران دمشق میں عشق کو فراموش
کر دیا تھا، اگر ان دنوں یہ لڑکی دمشق میں موجود تھی تب! ... بہرحال جب یہ لڑکی
میرے قریب سے گزر گئی تو میں نے اپنے ساکت قدم اُکھیڑے اور پھر سے چلنا شروع کر دیا۔

میں آج صُبح تک فٹ پاتھ کی سیمنٹ سطح پر بڑے اطمینان کے ساتھ سویا اور
پھر خوش قسمتی سے مجھے ایک قریبی ہوٹل فندق الکبیر میں جگہ مل گئی۔ کمرے روشن
اور بستر اتنے سفید کہ اُن میں لیٹنے یا لوٹنے کو جی نہیں چاہتا تھا کہ خواہ مخواہ شکنیں پڑ
جائیں گی۔ نفیس چمچماتے غسل خانے میں تیار ہو کر جب میں باہر نکلا تو سب سے پہلے
مسجد اُمیّہ دیکھنے کا ارادہ تھا مگر پھر میں نے اپنے آپ کو دمشق کے ساتھ ہم آہنگ کرنے
کے لئے شہر کی آوارہ گردی شروع کر دی۔

اس شہر نے مجھے قبول کیا اور میں نے اس کی ہوا کو پسند کیا۔ اس کی عمارتیں اور
ماحول کچھ کچھ خزاں کے تانبے ایسے رنگ کی گھلاوٹ کے سے تھے۔ اس کے باسیوں
نے مجھے دوست جانا اور مجھے ایک بھی ایسا شامی نہ ملا جس سے میں نے راستہ پوچھا ہو اور
اُس نے اپنے رستے، اپنے کام کاج کو بھلا کر کھُلی مسکراہٹ کے ساتھ میری رہنمائی نہ کی ہو۔
ایک تقریباً سرپٹ بھاگتے ہوئے شامی کو روک کر جب میں نے کچھ دریافت کیا تو وہ
یکدم شانت ہو کر مجھ سے گفتگو میں محو ہو گیا اور پھر گھڑی دیکھ کر ہڑبڑا اُٹھا "اوہ مجھے تو
اس وقت صدر اسد کے دفتر میں ہونا چاہیئے تھا۔"

اپنی کار میں بیٹھتے ہوئے اُس نے مسکراہٹ برقرار رکھتے ہوئے کہا "میں دمشق کا
اٹارنی جنرل ہوں، وہ سامنے میرا آفس ہے، ضرور آنا۔" سو یہ شہر اور اس کے

اپنوں کی طرح ہی نہ ملے بلکہ میرے اپنے ہو گئے۔ دمشق میں میرا قیام انتہائی اطمینان
بخش اور پُرسکون رہتا... اگر وقفوں سے یہ لڑکی نمودار نہ ہوتی رہتی۔ موسم پاکستان
کے مقابلے میں گرم تو نہ تھا مگر پیدل چلنے سے اور بار بار آتشِ حُسن کی قربت سے پیاس
کا احساس ہوا۔ غلطی سے پھر وہی سیاہ شربت پینے کو ملا جو بخار کے مکسچر ایسا تھا مگر جسے
شامی برادران نہایت اہتمام سے نوش کر رہے تھے۔ پھر لنچ کے طور پر ایک سانڈوچ
فلافل کھایا جو چنوں کی دال کا ذائقہ لئے ہوئے تھا اور سُوق الحمیدیہ کا رُخ کیا جس کے
پہلو میں دُنیا کی قدیم ترین مسجدوں میں سے ایک جامع اُمیّہ واقع ہے۔

سُوق الحمیدیہ وہ جگہ ہے جسے اکڑے ہوئے بالائی ہونٹ والے انگریز صاحب بہادر
"دی گرینڈ بزار" کا نام دیتے ہیں۔ تہران اور استنبول کے بازاروں کی مانند ایک ایسا وسیع
شاپنگ سنٹر جس کی درجنوں بل کھاتی گلیوں کو مشرقی سُورج کی تمازت سے محفوظ رکھنے
کے لئے ڈھک دیا جاتا ہے۔ بازار کے خاتمے پر ایک رُومی معبد کے کھنڈر تھے اور ایک
آبی ذخیرے کی چند محرابیں اور ستون، درمیان میں ایک گلی تھی۔ سامنے مسجد اُمیّہ کا بلند
دروازہ نظر آ رہا تھا جس کی چوکھٹ پر بیٹھ کر زائرین اپنے جوتے اُتار رہے تھے۔

مسجد اُمیّہ میں حُزن تو ہے مگر حُسن نہیں ہے۔ آنکھوں کی زبان قدامت کے ذائقے
سے آشنا ہوتی ہے مگر خوبصورتی کی حلاوت کی خواہش ناتمام رہتی ہے۔ تین فصیل نما دیواروں
کے ساتھ بلند برآمدے کھڑے ہیں۔ درمیان میں صحن اور چوتھی جانب مسجد کی عمارت ہے۔
برآمدوں میں قدیم بازنطائن نقاشی کے نمونے ملتے ہیں جن میں درختوں اور بیل بوٹوں
کے درمیان جنگلی جانوروں کی شکلیں بھی ہیں۔ بنو اُمیّہ شکار کے دلدادہ تھے اور یہ جانور
اُسی شوق کی غمازی کرتے ہیں۔ اس عمارت میں اگر اذان بلند نہ ہو تو اس کی رُوح ایک
رُومی معبد یا کلیسا کے قریب آجاتی ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں جب دمشق فتح ہوا
تو یہاں سینٹ جان دی بیپٹسٹ کا کلیسا اعظم تھا جسے مسلمانوں اور عیسائیوں نے
ایک معاہدے کے تحت مشترکہ عبادت کے لئے مخصوص کر لیا۔ مسلمان دائیں جانب

سے داخل ہوتے اور عیسائی بائیں طرف سے اور پھر ایک ہی چھت تلے نماز پڑھتے اور
میس کہتے۔ ۷۰۵ء میں ولید اوّل نے پورا کلیسا خرید کر مسجد کی تعمیر شروع کر دی۔
ایرانی، ہندوستانی، یونانی اور شامی کاریگروں نے پتھروں کے ٹکڑے جوڑ کر نادر نمونے
تخلیق کئے۔ سونے کے میورال بناتے گئے اور سات برس کے عرصے میں مسجد اُمیہ تکمیل
کو پہنچی۔

مسجد کے صحن میں شاید دُنیا کا قدیم ترین کنواں واقع ہے۔ روایت کے مطابق
حضرت یحییٰ لوگوں کو حضرت عیسیٰ کی آمد کے لئے پوِتر کرنے کے لئے اسی کنوئیں
کے پانی سے بپتسما کیا کرتے تھے۔ ہمارے لئے حضرت یحییٰ اور عیسائیوں کے لئے سینٹ جان
دی بیپٹسٹ کا مزار بھی مسجد کے عین درمیان میں واقع ہے۔ میں اس سے پیشتر استنبول کے
ٹوپ کاپی میوزیم میں اس پیغمبرِ خُدا کا پنجہ دیکھ چکا تھا جو سونے کی تاروں سے جوڑا گیا ہے۔
مسجد کے اندر ایک نیم تاریک تھکی ہوئی خاموشی تھی۔ عبادت گزاروں کے جھکے ہوئے سر، ہلتے
ہوتے ہونٹ، حضرت یحییٰ کے مزار کی جالی سے آسودگی حاصل کرتے ہوئے ہاتھ، کونسا
ہاتھ مسلمان ہے اور کونسا عیسائی؟ مرکزی فانوس کے نیچے پُر وقار سراپے کے مالک ایک
باریش بزرگ آس پاس مؤدب بیٹھے ہوئے لوگوں سے محوِ گفتگو تھے۔ میں بھی اُن کے قریب
بیٹھ گیا۔ لوگ مذہب کے علاوہ اپنے ذاتی مسائل کا حل بھی دریافت کر رہے تھے۔ مجلس
کے خاتمے پر اُنہوں نے سب کے لئے دُعا کی۔ میں نے آگے بڑھ کر ہاتھ ملایا تو اُنہوں
نے پاکستانی ہونے کا سُن کر بے حد شفقت سے میرے سر پہ ہاتھ پھیرا اور میرے لئے
خصوصی دُعا مانگی۔

کچھ دیر سستانے کے بعد میں باہر صحن میں آگیا جہاں دُھوپ ڈھل رہی تھی۔
اسی صحن میں خلیفہ سلمان نے فاتحِ اُندلس موسیٰ بن نصیر کا شاہانہ استقبال کیا تھا اور
پھر چند ہی روز بعد معزول کر کے مسجد کے باہر ایک ستون سے باندھ دیا تھا۔ سامنے وہ
مینار ہے جس پر ایک روایت کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہوگا۔ صحن کے

درمیان میں وہ گنبد ہے جسے خزانہ کہا جاتا ہے۔
رُومی طرز کے بلند اور پُر ہیبت برآمدے میں چلتے ہوئے ایک شامی طالب علم
قیس میرا دوست بن گیا جو امتحانوں کی تیاری کے سلسلے میں وہاں سکون سے پڑھنے
کے لئے آیا ہُوا تھا۔ وہ مجھے مسجد کے اُس حصّے میں لے گیا جس سے متصل اُس ملامتِ
کائنات کا محل ایستادہ تھا جسے یزید کہتے ہیں۔ ایک پرانی وضع کی بیل گاڑی برآمدے
میں کھڑی تھی۔ پہیے لکڑی کے تھے اور اُن پر زائرین کے ہاتھ تھے، کچھ انہیں چُوم
رہے تھے۔
"اس گاڑی پر کربلا کے اسیروں کو دمشق لایا گیا تھا۔" قیس نے لاپرواہی سے بتایا۔
"لیکن یہ تیرہ سو برس پرانی تو نہیں لگ رہی۔" پہیوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے میں
نے حیرت سے پُوچھا۔ بالکل ہمارے ہاں کی گَڈ کی طرح تھی۔
"ہاں مجھے بھی شک ہے مگر ہمارے ہاں روایت ہے اور چھت سے لٹکتے اُس
پنجرے کو بھی اسیرانِ کربلا کو اذیت دینے کے لئے استعمال کیا گیا تھا۔"
برآمدے کے خاتمے پر دائیں ہاتھ ایک بند کمرہ تھا جس کی دیوار میں ایک چوکور
جالی نصب تھی۔ زائرین اس جالی کو چھُوتے، آنکھوں سے لگاتے اور ایک جانب ہو کر
آہ و زاری کرنے لگتے۔ کچھ اُس کے سامنے ہاتھ سینے پر باندھے تصویریں اُتروا رہے
تھے... پرچم سیاہ تھے، لبادے سیاہ تھے، ماتم کا ماحول۔ یہاں کچھ ہُوا تھا، یہاں کچھ ہے۔
چوکور جالی کے اُوپر کوئی عبارت رقم تھی۔
میں نے قیس کی طرف دیکھا۔ اُس نے سر جھکا لیا "یہاں... یہاں شہیدِ کربلا
حضرت امام حسینؑ کا سرِ مبارک رکھا گیا تھا۔"
میرے حواس سنّاٹے میں آکر سُن ہو گئے۔ ہاں، یہاں کچھ ہُوا تھا۔
اُن دنوں مسجد کے ساتھ شاہی محل کی دیواریں تھیں۔ یزید کے محل کی دیواریں۔
یہ جگہ جہاں ہم کھڑے ہیں، قید خانہ تھی جس میں اسیرانِ کربلا کو رکھا گیا اور اس مقام پہ

جہاں جالی ہے، امام کا سر ایک طشتری میں نمائش کے لئے رکھا گیا تھا۔"

"کیا یزید کا محل باقی ہے؟"

"نہیں... کیسے باقی رہتا... یزید بھی باقی نہیں رہا۔ اُس کی قبر پر اب پتھروں کی ایک تپتی ہوئی بھٹّی ہے جو دن رات جلتی رہتی ہے۔"

اور جس مقام پر حسینؓ کے سر نے لمحہ بھر کے لئے آرام کیا تھا وہ جگہ بوسوں سے تر رہتی ہے۔ ہاں یہاں کچھ ہوا تھا۔

ع سر داد نہ داد دست در دستِ یزید

کچی دیوار تنگ گلی کے آخر تک چلی جا رہی تھی جہاں محراب کے نیچے بلند کواڑوں والا ایک دروازہ تھا۔ میں نے آہستہ سے دستک دی اور انتظار کرنے لگا۔

مسجدِ اُمیّہ سے نکل کر میں دمشق کے پرانے شہر میں چلا آیا تھا اور پچھلے تین گھنٹوں سے ایک ایسے شخص کی طرح جسے کہیں پہنچنے کی جلدی نہیں ہوتی، سُستی سے قدم [illegible] مُنہ اُٹھائے پُرانے گھروں اور کچی دیواروں میں نصب منقّش کھڑکیوں کا مشاہدہ کرتا قدیم شہر کے باوقار باسیوں کو تکتا چل رہا تھا۔ دائیں بائیں جو بھی گلی نکلتی، کسی کوچے کا آغاز ہوتا اور میں بڑی فرمانبرداری سے بلا سوچے سمجھے اپنا رُخ موڑ لیتا۔ اس بے جہت آوارگی نے بے حد تھکا دیا تھا اور پیاس کی شدّت نے مجھے اس دروازے پر دستک دینے کو اُکسایا تھا۔

تھوڑی دیر بعد کسی آہنی کنڈے کی سخت آواز آئی اور کواڑ چِرچِراتے ہوئے کھُل گئے۔ ایک خیمہ نما چوغے میں کھڑے شامی نے بصد حیرت میرا معائنہ کیا۔ میں نے چُلّو مُنہ کو لگا کر "العطش" پکارا اور وہ مُسکراتا ہوا واپس چلا گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازے کے اندر جھانکا۔ مجھے افسوس ہوا کہ آخر اس شامی کو کیا ہو گیا ہے۔ اس نے مجھے اندر آنے کے لئے کیوں نہیں کہا... دُنیا جہان سے کٹا ہوا ایک صحن تھا۔ بلند

دیواروں کی تہہ میں، بے ترتیب جھاڑیاں اور اُن کے درمیان میں خاموشی سے چلتا ایک نالہ، دیواروں پر رنگین گملے ٹنگے ہوئے تھے جن میں سے لٹکتی بیلیں درختوں سے جھولتے بندروں کی طرح آہستہ آہستہ ہل رہی تھیں۔ نیلی محرابیں اور بند کھڑکیاں۔ یہ صحن مجھے آشنا سا لگا۔ یہ آشنائی چھ برس پیشتر قرطبہ کی ایک گلی میں ہوئی تھی جس کے ہر مکان کے اندر یہی صحن تھا۔ صرف اس کا نام وہاں "پاتیو" تھا۔ پرانے قرطبہ اور دمشق کے اس حصّے کو اگر پہلو بہ پہلو رکھ دیا جائے تو اس میں چلنے والے کو کسی سرحد کا احساس نہ ہو کیونکہ اصل میں دونوں ایک ہیں۔ جنگِ عظیم میں تباہ شدہ تاریخی شہروں کو جس طرح پرانے نقشوں کی مدد سے ہو بہو دوبارہ تعمیر کر لیا گیا تھا، کچھ اِسی طرح بنو اُمیّہ نے اپنے کھوتے ہوئے وطن دمشق کو اندلس کی نئی سرزمین پر قرطبہ کے رُوپ میں ڈھال دیا۔ مسجدِ قرطبہ بھی مسجدِ اُمیّہ کے نقشے پر تعمیر کی گئی۔ اگرچہ یہ نقل خوبصورتی میں اصل کو ماند کر گئی۔ دمشق کے باغِ رصّافہ کی کاپی قرطبہ کے باغِ رصّافہ کی صورت میں ہوئی۔ حویلیاں، فوّارے اور قصر اس طرح نئے شہر میں بلند ہوئے کہ اُس کے آسمانی منظر پر دمشق کا دھوکہ ہونے لگا۔ کھجور کے پودے کو دیکھ کر شام کی یاد میں آہیں بھرنے والے اُمیّہ انہی گلی کوچوں سے نکلے تھے۔ قرطبہ کے بعد اب میں دمشق میں تھا اور یوں ایک آوارہ گرد کو بنو اُمیّہ پر فوقیت حاصل ہوئی کہ وہ اُن کے دونوں گھروں کی خوبصورتی کا شاہد بنا۔

لمبے چوغے والا شامی برآمدے میں سے نکل رہا تھا اور اُس کے ہمراہ ایک مُلازم طشتری اُٹھائے چلا آ رہا تھا۔ یہاں بھی مجھے سادہ پانی کی بجائے وہی سیاہ شربت پینے کو ملا۔ انکار کیسے کرتا، صبر کا گھونٹ بھر کر پی گیا۔ میں نے شکریہ ادا کرنے کے بہانے ایک مرتبہ پھر صحن میں جھانکا مگر گھر کا مکین ایک سنجیدہ مسکراہٹ کے ساتھ کواڑ پر ہاتھ رکھے کھڑا رہا۔ میں پیچھے ہٹا تو اُس نے دروازہ بند کر کے قرطبہ کو میری نظروں سے اوجھل کر دیا۔

اسی بے مہار آوارہ گردی کے دوران ایک بازار میں بالکل غیر متوقع طور پر حضرتِ

رقیہ بن امام حسینؑ کا مزار نظر آگیا۔ میں نے اندر جا کر زیارت کی۔ مزار کے چاروں طرف منتیں ماننے والوں نے بچوں کے کھلونے اور پنگھوڑے سجائے ہوئے تھے۔ قریب ہی جامع التوبہ واقع ہے جو مسجد اُمیّہ کی ایک مختصر شکل ہے۔ دروازے کے ساتھ ایک تختی پر درج ہے کہ یہ مسجد سلطان الملک الاشرف مُوسیٰ الایوبی نے ۱۲۳۴ء میں تعمیر کروائی۔

شام ہو چکی تھی۔ جامع التوبہ سے نکل کر میں ایک قریبی قہوہ خانے میں سستانے کے لئے داخل ہُوا جو اتنا مختصر تھا کہ ہر آنے والے کا وجود اُسے بھر دیتا تھا اور اُس میں موجود لوگ قہوے کی پیالیوں پر پڑتے سائے سے جان جاتے تھے کہ کوئی نیا گاہک آیا ہے۔ قہوہ خانے کا مالک پیتل کے ایک منقّش فنجان میں سے بھاپ چھوڑتے قہوے کا ایک پیالہ بھر لایا۔ وہ ایک بے ڈول توند والا عمر رسیدہ شخص تھا جس کی سفید پلکیں اتنی گھنی اور لامبی تھیں کہ آنکھوں پر لٹک رہی تھیں، ایک پیارا سا بوڑھا شیگی ڈاگ۔ میری غیر ملکی شباہت کو اُس نے آنکھ میچ کر دیکھا اور چلا گیا۔

قہوہ خانے میں دس پندرہ گاہک براجمان تھے اور وہ سب کے سب مالک کے ہم عمر تھے یا شاید اُس سے بھی بوڑھے۔ قہوے میں کسی کو رتّی بھر دلچسپی نہ تھی۔ چند ایک تاش کا کوئی خصوصی عرب کھیل کھیل رہے تھے اور باقی کرسیوں میں پڑے آرام سے حُقّے گڑگڑا رہے تھے۔ دیواروں پر اُن زمانوں کی تصاویر آویزاں تھیں جب کیمرہ تازہ تازہ ایجاد ہُوا تھا، بھُورے رنگ اور مٹتی ہوئیں۔ درمیان میں ایک زنگ آلود تلوار اور سیاہ ڈھال ٹنگی ہوئی تھی۔

میں نے قہوہ ختم کیا تو ایک نیم دراز بوڑھے نے حُقّے کی نال آگے کر دی۔ کش لگایا تو لُطف آگیا۔ عجیب نشہ آور قسم کا تمباکو پی رہے تھے یہ دُھندلائے ہوئے بوڑھے۔ تھوڑی دیر بعد مالک اپنا کام نپٹا کر ہمارے پاس بیٹھ گیا اور حُقّہ گڑگڑانے لگا۔ چند طویل اور کھانسی آور کش کھینچ کر اُس نے دیوار سے ایک تصویر اُتاری اور جھاڑ پونچھ کر میرے سامنے رکھ دی۔ معدوم ہوتی ایک شکل، ایک بھاری بھرکم نوجوان کسی نیکر

میں ملبوس ایک ہاتھ میں تلوار دوسرے میں ڈھال تھامے شمشیر زنی کا کوئی پینترا دکھا رہا تھا۔ میں نے سر اُٹھا کر دیکھا تو اس کے چہرے پر ایک دُودھ پیتے بچے کی پوپلی مسکراہٹ تھی۔ تصویر اُسی کی تھی۔ پھر اُس نے تلوار اور ڈھال اُتاری اور تصویر کے انداز میں پینترا باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ باقی بوڑھے جو شاید روزانہ اس قسم کا تماشا دیکھتے تھے اُس پر نعرے کسنے لگے مگر وہ بُت بنا کھڑا رہا۔ پھر یکدم اُس نے پھُرتی سے پینترا بدلا اور ایڑیوں پر گھُومتے ہوئے تلوار کو اس زور سے کمرے میں گھمایا کہ وہ گاہکوں کے سروں پر سے شائیں شائیں کرتی گزرنے لگی جیسے کسی تیز رفتار پنکھے کا ایک ہی پَر ہو اور وہ آپ کے اُوپر سنسناتا ہُوا گزرنے لگے۔ میرے بالوں اور سرسراتے پھرتی تلوار کے درمیان واجبی سا فاصلہ تھا چنانچہ میں اپنا سر کندھوں کے بیچ میں دھنسانے کی کوشش کرنے لگا۔ کہن زدہ بوڑھے کا دوسرا ہاتھ ڈھال کو یوں حرکت دے رہا تھا جیسے مدّمقابل کے وار روک رہا ہو۔

اُس کے عمر رسیدہ دوست بے فکری سے مُسکراتے رہے اور میری پریشانی سے لُطف اندوز ہوتے رہے۔ درجن بھر گھُمن گھیریاں کھانے کے بعد وہ ہانپنے لگا اور پسینہ پونچھتے ہوئے اپنے ہتھیار پھر سے دیوار پر سجا دیئے۔ میں نے بھی پسینہ پُونچھا اور حُقّہ پینے لگا۔ اُٹھنے سے پیشتر جب میں نے قہوے اور تمباکو نوشی کا مکمل بل طلب کیا تو بوڑھے مالک نے میرا کندھا تھپک کر مسکراتے ہوئے انکار کر دیا۔ میرے اصرار پر اُس نے تیوڑی چڑھا لی اور تلوار کی جانب اشارہ کیا۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور چپکے سے باہر آگیا۔

دمشق کی مسجدوں سے نمازِ عشا کے لئے مؤذنوں کے بُلاوے بلند ہو رہے تھے۔ ان صداؤں میں بلا کی خوش الحانی تھی اور ایسا کیوں نہ ہوتا اِس شہر کی مٹّی میں بلال حبشیؓ جو دفن تھے۔ مسجد اُمیّہ کی فصیل نما دیوار کے پہلو میں چلتے ہوئے مؤذنوں کی صدائیں مجھ تک پہنچ رہی تھیں۔ میں اس دیوار کے ساتھ یوں چپک رہا تھا جیسے باقی ساری زمین سمندر ہے اور یہ ساحل۔ جھالر دار مینار کے نیچے پہنچ کر میں کھڑا ہو گیا۔ اُوپر اذان دینے والوں کا ایک گروہ کھڑا تھا۔ اُن میں سے ایک اَللّٰہُ اَکبَر کہتا تو باقی مؤذن یہی الفاظ قدرے مختلف

اندازمیں دُہراتے۔ اِسی طور جب اَشْہَدُاَنْ لَّآاِلٰہَ اِلَّا اللہ کی صدا بلند کرتا تو ...
ساتھی وقفے کے بعد انہی الفاظ کی قرأت کرتے ... میرے لئے اذان دینے کا ...
نیا اور پُرکشش تھا۔

مسجد اُمیّہ کے سایے میں مَیں نے ایک خاموش صحن دریافت کیا جس کا ...
ستونوں پر آرام کرتی ایک محراب میں سے تھا۔ محراب پر محراب بنی انگوروں کی بیل ...
سیاہ تھی۔ صحن کے درمیان میں ایک تالاب تھا۔ کنارے پر ایک درویش سر جھکائے ...
کچھ پڑھ رہا تھا۔ محراب کی سیدھ میں تالاب کے پار ایک دروازہ کھلا تھا اور اندر ...
قبر تھی۔ قبر پر سنگِ مرمر سے تراشی ہوئی ایک پگڑی تھی۔ دُور سے یوں لگ رہا تھا ...
مرنے والے نے اپنی پگڑی احتیاط سے اُتار کر لوح پر رکھی اور خود قبر میں اُتر گیا ...
درویش کے مراقبے میں مُخل ہُوا اور اشاروں سے دریافت کیا کہ یہ کس بزرگ کا مزار ...
اُس نے سر اُٹھایا، میری لاعلمی کی حیرت چہرے پر ظاہر کی اور مجھے غیر ملکی پہچان ...
"سلطان صلاح الدین ایوبی"۔ میں ایک دم یُوں ٹھٹکا جیسے اُس کمرے کے اندر ...
بنفسِ نفیس موجود ہیں۔ تاریخ کے ہزاروں اوراق میرے ذہن میں پھڑپھڑائے ...
نے اُنہیں بے توجگی کے طاق میں رکھا اور اندر چلا گیا۔ داستان ... تاریخ ...
... حقیقت ... شجاعت ... صلیب ... ہلال ... خاک اندر خاک۔ فاتحہ پڑھ کر ...
نکلا، درویش سر جھکائے بیٹھا تھا۔ تالاب کا پانی تاریکی میں سیاہ رات تھا۔ محراب ...
باہر جانے سے پیشتر میں نے مُڑ کر دیکھا، دروازہ کھُلا تھا۔ وہاں ناکافی روشنی تھی ...
میں نے انتہائی غور سے قبر کی طرف دیکھا، میرا واہمہ تھا، پگڑی کے نیچے ایک ...
ہوئے دکھائی دے رہا تھا۔ عجیب واہمہ تھا مگر اس کے نقوش واضح تھے ...
زندہ تھے۔ واہمہ تھا۔ داستان۔ تاریخ۔ افسانہ۔ حقیقت۔ صلیب۔ ہلال ...
اندر خاک۔

دَمِ دمشق اندر — ۲

شارع معادیہ پر واقع انور کیہال سٹور کے شوکیس میں جھانک رہا تھا کہ ایک شامی باہر آیا اور خوش دلی سے پوچھا "فرمائیے"۔
شامی کہنے کے بعد مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ وہ خوبصورت بھی تھا۔ میں نے کندھے اُچکا کر کہا "بس یونہی تانک جھانک کر رہا ہوں، بچّوں کے ملبوسات بہت سٹائلش ہیں"۔
پُوچھا "پاکستانی؟" میں نے سر ہلایا تو وہ بازو سے پکڑ کر اندر لے گیا اور وہیں دبالِ جان سیاہ شربت منگوا کر پیش کر دیا۔ قریبی کاؤنٹر پر گلابی رنگت کا ایک چھیٹکا سا نوجوان کھڑا تھا جو گاہکوں کو چھوڑ کر فوراً میرے پاس چلا آیا "آپ پاکستانی ہیں؟ اہلاً وسہلاً، آپ بھائی ہیں"۔ اس کے بعد اُس نے انگریزی کے چند الفاظ کی مدد سے گفتگو شروع کر دی جس کا محور پاکستان تھا ... میں ابھی تک خاصا پریشان تھا کہ آخر ان شامیوں کو پاکستانیوں سے خدا واسطے کا پیار کیوں ہے۔ بشار کیہال بڑے کیہال صاحب کا بھتیجا تھا اور فارغ اوقات میں اپنے چچا کے سٹور میں سیلز مین کی حیثیت میں کام کرتا تھا۔ شربت نگلنے کے بعد جب میں نے اجازت چاہی تو بشار بولا "اب کدھر جائیے گا؟" میں نے کہا "پاکستانی سفارت خانہ تلاش کرنے کا ارادہ ہے۔ شنید ہے کہ نعیم تنویر نامی ایک شناسا اُدھر فرسٹ سیکرٹری وغیرہ ہُوا کرتا ہے، واجبی سی ملاقات ہے۔ اگر اُس نے گھاس ڈالی تو سبحان اللہ ورنہ اہلاً وسہلاً کہہ کر واپس آجائیں گے"۔

"میں بھی پاکستانی سفارت خانے کی طرف ہی جا رہا تھا۔" بشار جلد
دُوسرے ہی لمحے اُس نے باہر نکل کر ایک ٹیکسی روک رکھی تھی اور مجھے اندر
اشارہ کر رہا تھا۔

"ابو رُمانہ"۔ اُس نے ٹیکسی ڈرائیور کو ہدایت کی۔ ونڈ شیلڈ پر انسان
سُرخ نشان ثبت تھا۔

"آج ہی خریدی ہے۔" ڈرائیور نے بتایا "نظرِ بد سے بچانے کے لئے
خون کا ہے۔"

"انسانی خون کا؟" میں نے پُرتشویش لہجے میں پُوچھا۔

"نہیں نہیں۔" وہ ہنسا۔ "آج صُبح بکرا ذبح کیا تھا، اُس کا ہے۔"

یہ نشان میں نے دمشق کے قیام کے دوران گھروں کی جبینوں پر ثبت دیکھا۔ کہا
کہ بیشتر یونانی اور مصری دیوی دیوتاؤں کا مسکن ملک شام تھا۔ یہ سُرخ
کی یادگار دکھائی دیتا تھا۔

ابو رُومانہ کی ہیئتِ ترکیبی سراسر فرانسیسی تھی۔ درختوں، پارکوں اور
پیرس کا بوئے ڈی بولون جھلک رہا تھا۔ غیر ملکی سفارت خانے زیادہ تر اسی
واقع تھے۔

"اب آپ اپنے دوست سے ملاقات کیجئے میں چلتا ہوں۔" بشار نے
سفارت خانے کے گیٹ پر پہنچ کر کہا۔ "اور براہ مہربانی شام چار بجے میرے
کافی ضرور پیجئے گا۔" اُس نے اپنا کارڈ دیا اور اُسی ٹیکسی پر واپس چلا گیا۔ مجھے
شک تھا کہ وہ شامی مزاج کے ہاتھوں مجبور ہو کر صرف میرے لئے یہاں تک

مظہر قیوم ایک وسیع ہال نما کمرے میں ایک ہاکی کے میدان جتنی میز کے
سر جھکائے بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر سر اُٹھایا۔ سفارت کاروں والی ایک ابرو
بغور مطالعہ کیا اور پھر بولا۔ "اب کس کی تلاش میں نکلے ہو؟"

میں نے سوچا فرسٹ سیکرٹری صاحب نے پہچانا نہیں چنانچہ گویا ہوا کہ جناب جن
دنوں آپ واپڈا میں تھے اور فرانسیسی پڑھتے تھے اور مال روڈ پر گھومتے تھے تو ہم بھی...
میری تقریر کے دوران وہ میز کے کناروں کے ساتھ ساتھ فاصلہ طے کرتا ہوا میرے
میرے قریب پہنچ گیا۔ "یار مستنصر اب اتنے تکلفات کی بھی ضرورت نہیں۔" اور ہاتھ آگے
کر دیا۔ "کب آئے ہو؟ ... ٹھیک! ... کہاں ٹھہرے ہو؟ ... فندق الولید، مناسب
ہے ... اگر پسند نہ ہو تو میرے فلیٹ میں اُٹھ آؤ ... اور ہاں میں لنچ کے لئے اُٹھنے
ہی والا تھا، میرے پاکستانی باورچی نے کریلے گوشت پکا رکھے ہیں، آؤ چلتے ہیں ..."

دوست دوستی کے دَر کھولے تو ایسا ہونا ہی چاہیئے لیکن ایک شناسا اپنائیت
کے بازو وا کر دے تو انسانی برادری میں شامل ہونا کچھ کم ناگوار ہو جاتا ہے۔ مظہر کے
رویّے نے مجھے بے حد متاثر کیا ... ہم مظہر کی سفارتی مراعات کے تحت درآمد شدہ
نویں نکور فرانسیسی کار میں سوادِ دمشق میں سے شُوکتے ہوئے گزرے اور اُس کے
فلیٹ پر پہنچ گئے۔

"اب تمہیں دمشق دیکھنا ہے؟" اُس نے کھانے سے فارغ ہو کر کافی میں ایک
شوگر کیوب ڈراپ کرتے ہوئے پُوچھا۔

"نہیں۔" میں نے تکلّف برتا۔

"ہاں دیکھنا ہے۔" وہ بولا۔ "لیکن ان دنوں سفیر صاحب پاکستان گئے ہوئے ہیں
اس لئے میں اپنے دانتوں تک مصروف ہوں ... آج اور کل میرے بغیر گزارا کرو،
پرسوں شیڈیول کو آگے پیچھے کر کے دو تین گھنٹے نکال لوں گا ... تم نے باب الصغیر
کا قبرستان تو نہیں دیکھا ... نہیں دیکھا تو میں منصور کو فون کرتا ہوں۔" اُس نے منصور
کو فون کیا اور پھر بیان جاری رکھا۔ "آج قبرستان دیکھو ... کل سفارت خانے آ جانا،
محمد علی سے ملنا وہ دمشق کا انسائیکلوپیڈیا ہے ... اور پرسوں ... اور اس دوران کھانا
ہمارے نہیں کھانا۔" اُس نے نیپکن طے کر کے سائڈ پلیٹ میں جمایا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

"آؤ چلیں۔"

جانے سے پیشتر اُس نے اپنے سر پر ہاتھ پھیر کر بالوں کی کُل کائنات
ایک مجسّمے پر جما کر اس طرح پیار سے کنگھی کی جیسے ایک ماں بچّے کو سکول بھیجنے
پہلے سنوارتی ہے اور پھر اُنہیں سر پر رکھ لیا۔ میں بھی حیران تھا کہ مظہر کے بال پہلے
گھنے کیسے ہو گئے۔ وِگ تھی... سفارت خانے کے راستے میں اُس نے مالکی کے
مجسّمے کے قریب کار روک دی۔ میں تمہیں دمشق کا بے مثل مشروب پلاتا ہوں" اور ایک
قریبی ریڑھی والے سے اُسی سیاہ شربت کے دو گلاس لے آیا۔

"ہماری نومولود دوستی اپنی جگہ..." میں نے بدک کر کہا "لیکن یہ دوائی نہیں پیوں گا"

"دوائی؟" مظہر نے چسکیاں لیتے ہوئے کہا "یہ تو سوس ہے۔"

"ہو گا۔"

"خرمانی اور انجیر کے پتّوں سے بنا ہوا ہے، پیاس کے لئے اکسیر، معدے کے لئے

"پھر بھی نہیں پیوں گا۔"

سفارت خانے پہنچے تو مظہر کے ہال کمرے میں گٹھے ہوئے بدن کے ایک عینک
صاحب ہمارا انتظار کر رہے تھے۔

"یہ منصور ہیں" مظہر نے تعارف کروایا "تمہیں قبرستان دکھائیں گے۔"

"آئیے قبرستان چلیں" منصور فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے۔

منصور پی آئی اے میں انجینئر تھے اور دمشق آنے والی پروازوں کی تکنیکی دیکھ بھال
اُن کے ذمّے تھی۔ بنو اُمیّہ کی تاریخ کو دیمک کی طرح چاٹتے تھے اور فارغ اوقات
کوئی دبیز کتاب کندھے پر رکھے دمشق کے گلی کوچوں میں اُس کے حوالے ڈھونڈتے
آتے تھے۔ مطالعہ اتنا وسیع تھا کہ اگر جنگ جمل کا ذکر چل نکلا ہے تو حضرت علی کے
کے گلے میں لٹکتی گھنٹیوں کی تعداد سے بات کا آغاز کریں گے۔

ہم دھوپ سے بچاؤ کی خاطر دمشق کی قدیم فصیل کے سائے میں چل رہے تھے۔

انا خالد بن ولید

انا فارس الضدید

انا سیف اللہ

۱۳ھ میں خالد کی یہ رجز عذرا اور قتیفہ نامی قصبوں کے قریب واقع ایک درّے
میں سُنائی دی اور اُس نے پرچم عقاب غوطۂ دمشق کی زرخیزی میں گاڑ دیا۔ یہ زرد پرچم
جنگ خیبر میں حضور صلعم نے خالد کو عطا کیا تھا... دمشق کا محاصرہ شروع ہو گیا۔ باب صغیر
کے سامنے یزید بن ابوسفیان، باب توما کے سامنے شرجیل، باب فرادیس کے سامنے عمرو
بن العاص اور باب جابیہ کے سامنے حضرت ابوعبیدہ بن الجراح خیمہ زن ہو گئے۔ شہر کی
دوسری جانب خالد بن ولید کا پڑاؤ تھا۔ ایک طویل محاصرے اور شدید یلغاروں کے بعد
جب دمشق کے رُومی حکمران ہتھیار ڈالنے کو تھے، حضرت عمر کی جانب سے خالد کی معزولی
کا حکم آگیا، ایک ایسے قاصد کے ہاتھ جس کے سامنے کسی کو دم مارنے کی جرأت نہ تھی،
حضرت بلال حبشی۔ حضرت بلال نے سب سے پہلے حضرت ابوعبیدہ کو آگاہ کیا کہ خالد
کو معزول کر کے آپ کو سپہ سالار مقرر کر دیا گیا ہے۔ حضرت ابوعبیدہ نے صلاح دی کہ دمشق
سرنگوں ہونے کو ہے۔ اس نازک لمحے میں خالد ایسے پسندیدہ سپہ سالار کی معزولی سے
سپاہ میں انتشار پھیلے گا اس لئے چند روز انتظار کر لیا جائے... دوسرے روز ایک
صلح نامے کے تحت حضرت ابوعبیدہ دمشق میں داخل ہو گئے مگر شہر کی دوسری جانب
خالد کو اس معاہدے کا علم نہ ہو سکا اور اُنہوں نے حملہ کر دیا۔ شہر کے درمیان میں کلیسائے
مریم کے قریب دونوں کمانڈروں نے ایک دوسرے کو کچھ اس طرح دیکھا کہ حضرت ابوعبیدہ
ایک فرشتۂ امن کی صورت چلے آرہے ہیں اور دوسری جانب سے خالد تلوار سونتے
دشمن کو چیرتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں۔ ابوعبیدہ نے کہا، اے خالد تلوار نیام میں
ڈال دے۔ میں نے اپنے اختیارات کے مطابق رُومیوں سے معاہدہ کر لیا ہے کہ شہر

ہمارا اور اس کا مال و دولت ان کا۔ خالد طیش میں آگئے اور کہا۔ سپہ سالار
اور میں نے یہ شہر بزورِ شمشیر حاصل کیا ہے اس لئے مال و دولت پر بھی ہمارا حق ہے
آپ کو یہ معاہدہ کرنے کا اختیار نہ تھا۔ اس پر حضرت ابو عبیدہ نے بھی تلوار نیام سے
نکال لی اور فرمایا۔ میں قول دے چکا ہوں، آگے بڑھو اور مجھے راستے سے ہٹا دو
حضرت ابو عبیدہ ایک جنگ میں حضور صلعم کے سامنے ڈھال بنے کھڑے رہے اور
کے جسم میں دھنسی زرہ بکتر کی کڑیوں کو نکالتے ہوئے اُن کے دو دانت شہید ہو
تھے۔ دانتوں میں یہ خلا ہر شخص کے لئے تعظیم کا باعث بنا اور خالد نے خاموشی سے
تلوار نیام میں ڈال لی۔ یہ حضرت ابو عبیدہ کی عظمت تھی کہ اُنہوں نے ایسے وقت میں تحمل
کا ثبوت دیا اور خالد کی معزولی اور اپنے سپہ سالار ہونے کا راز فاش نہ کیا۔

تسخیرِ دمشق کے بعد ایک کھلے میدان میں افواج کے سامنے حضرت بلال نے خالد کی
پگڑی اُتار کر اُن کے ہاتھ باندھے اور پھر اُن پر عائد کردہ الزامات کی فہرست سُنا کر
معزولی کا حکم سُنایا۔ اس کے بعد حضرت بلال نے فرمایا۔ یہ سب کچھ میں نے امیر المومنین
کے حکم کے مطابق کیا۔ میں نے اپنا فرض پورا کیا لیکن اب معاملہ میرے اور تمہارے
درمیان ہے... اُنہوں نے خالد کے ہاتھ کھولے اور اپنے دستِ مبارک سے
پگڑی اُن کے سر پر دوبارہ باندھ دی۔

حمص میں مجھے خالد کی خاک کا قرب حاصل نہ ہو سکا مگر اب یہاں باب الصغیر
کے وسیع قبرستان کے ایک کچے کمرے میں عشرہ مبشرہ میں سے ایک، تمام غزوات میں
شامل صحابی حضرت ابو عبیدہ بن الجراح کا مدفن میرے سامنے تھا۔ قبرستان کے دوسری
جانب اُن کی تعمیر کردہ دمشق کی اوّلین مسجد دکھائی دے رہی تھی۔

پھر میں منصور کی رفاقت میں سبز گنبد والے ایک مختصر مقبرے میں داخل ہوا جہاں
ایک ایسے شخص کا سفرِ زندگی تمام ہوا جس کی کنیت ابو عبداللہ تھی، والد کا نام رباح
تھا۔ والدہ حمامہ تھیں۔ وہ طویل قامت تھا اور گھنے بالوں والا تھا، دُبلا پتلا تھا

اُس کے رخساروں پر گوشت بہت ہی کم تھا، اُمیّہ بن خلف کا غلام تھا۔ حضرت ابوبکرؓ
نے خریدا اور جو ساری زندگی حضور صلعم کے ساتھ سانس لیتا رہا۔ فتح مکّہ پر بیت اللہ کی
چھت پر کھڑے ہو کر پہلی اذان دی۔ حضورؐ کی وفات پر مدینے سے دل اُچاٹ ہُوا اور
حضرت عمرؓ کی اجازت سے دمشق میں مستقل قیام کیا۔ ستّر برس کی عمر میں فوت ہُوا اور
اُس کا رنگ گہرا سانولا تھا مگر وہ روشن تھا اور اُس کا نام... بلال حبشی تھا۔

باب الصغیر دھوپ میں صحرا تھا جس میں اُبھرے ہوئے ٹیلے قبریں تھیں اِن لوگوں
کی جن کے نام صرف سر جھکا کر سُنے جا سکتے ہیں۔ حضرت امام حسینؑ کی صاحبزادیاں فاطمہ،
صغریٰ اور سکینہ۔ اُن کی ہمشیرہ اُمِ کلثوم، اُم المومنین حضرت حفصہ بن عمر فاروق، اُمِ حبیبہ،
اُمِ سلمہ، حضرت ابوبکر کی بیٹی سیدتنا حفیظہ، حضرت عثمانؓ کا بیٹا ابان، خالد بن ولید کا
لڑکا سعید، اصحابِ صفہ میں شامل اوس بن اوس... اور یہاں اُن لوگوں کی قبریں
بھی تھیں جن کے نام سُننے ہی نہیں جا سکتے... ایک قبر محمد بن ابوبکر کی تھی جو حضرت عثمانؓ
کے قاتلوں میں سے تھا۔ اُس نے جب دو ساتھیوں کے ہمراہ دیوار پھاند کر حضرت عثمانؓ
کی ریش مبارک پکڑ لی تو اُنہوں نے فرمایا۔ اَے محمّد، اگر تیرا باپ ابوبکر یہ دیکھتا تو
سخت ناپسند کرتا۔" امیر معاویہ نے اُسے بکرے کی کھال میں سلوا کر تنور میں ڈالا اور
پھر جلی ہوئی لاش باب الصغیر پر لٹکا دی... معاویہ بن ابو لیلیٰ بھی یہیں پر ہے جو
صرف چالیس روز کے لئے خلافت پر متمکّن ہُوا۔

منصور ہر ٹیلے کے قریب رُکتا اور تاریخ کے حوالوں سے اس کے بوجھ تلے دبے
شخص کو میرے سامنے زندہ کر دیتا۔

باب الصغیر اپنے میانی صاحب کا بھائی بند قبرستان تھا جس میں سایہ و شجر کا نشان
نہ تھا۔ دھوپ کی شدّت دماغ کی رگوں اور شریانوں کو پگھلا کر اُلجھی ہوئی گرم سوئیوں
میں بدل رہی تھی۔ ہم باہر نکلنے لگے تو منصور نے عینک اُتار کر ماتھے سے پسینہ پونچھا
اور کہا۔ کیا تم اُس شخص کی قبر دیکھنا چاہو گے جس نے کہا تھا کہ جہاں میرے دُرّے

سے کام چل جاتے وہاں میں تلوار نہیں اُٹھاتا اور میں وہاں دُرّہ استعمال نہیں کرتا
میری زبان کا وار کاری ہو۔۔۔"

"منصور صاحب آپ کچھ مزید روشنی نہیں ڈال سکتے۔۔۔" میں نے گریز کرتے
ہوتے جواب دیا۔

"اور اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر میرا ایک بال بھی لوگوں سے بندھا ہو تو میں اسے
نہیں دُوں گا۔ اگر وہ کھینچیں گے تو میں ڈھیلا چھوڑ دوں گا اور اگر وہ ڈھیلا چھوڑیں
تو میں کھینچوں گا۔"

"میں بے حد شرمندہ ہوں لیکن میری تاریخی بصیرت اتنی عمیق نہیں کہ بیان کردہ
حوالے سے شخصیت کا نام بوجھ لوں۔"

"یزید کے باپ کی قبر دیکھو گے؟"

"امیر معاویہ کی؟" میں فوراً رُک گیا۔ "مگر اُن کی قبر تو نا معلوم ہے۔"

"میرے لئے نہیں۔" منصور بولا۔ "امیر معاویہ کہاں دفن ہیں، اس کے بارے میں
بیشتر اہلِ دمشق لاعلم ہیں۔ سیاحتی کتابچوں میں بھی کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ کسی گائیڈ
تو وہ لاپروائی سے کہے گا۔ "اس کی قبر؟ صرف اللہ جانتا ہے۔" چنانچہ میں
تاریخ میں غرق ہوا اور کھوج لگاتا ہوا اس قبرستان تک آپہنچا۔ میری تحقیق کے
اُن کی قبر حضرت بلالؓ کے دائیں ہاتھ پر ایک کچی کوٹھڑی میں ہونی چاہیئے
۔۔۔ میں نے جب اس کوٹھڑی کا دروازہ کھٹکھٹایا تو ایک بوڑھے نے کواڑ کے پیچھے
جھانکتے ہوئے درشتگی سے پُوچھا "کیا ہے؟" میں نے کہا "زیارت" کہنے لگا
یہاں کوئی زیارت نہیں۔" اور دروازہ بند کر لیا۔ وہ قبرستان کا چوکیدار تھا
بیٹے کے ہمراہ اس کوٹھڑی میں رہائش پذیر تھا۔ جب بھی موقع ملتا میں قبرستان
بوڑھے کی منت کرتا کہ صرف ایک منٹ کے لئے اندرونی حصہ دیکھ لینے دو مگر
یہی جواب ملتا کہ کوئی زیارت نہیں۔ بالآخر ایک روز میں نے اپنا کارڈ

پھینکا اور کہا بابا جی کبھی دل پسیجا تو بلا لیجئے گا، بندہ کچھ رقم خرچنے کو بھی تیار ہے۔۔۔
تقریباً ایک برس بعد وہ بوڑھا میرے دفتر میں نمودار ہو گیا۔ "السیّدی منصور میں کبھی نہ
آتا اگر مجبور نہ ہوتا، مجھے کچھ پیسوں کی ضرورت پڑ گئی ہے، کل آ کر امیر معاویہ کی قبر
دیکھ لینا۔۔۔"

"اس کا مطلب ہے کہ بوڑھے کے ساتھ دوستی ہو گئی؟"

"نہیں،" منصور ہنسا "میں دوبارہ ایک دوست کے ہمراہ آیا تو اُس نے پہچاننے
سے انکار کر دیا۔"

"میں دیکھتا ہوں کہ میری جیب میں کتنی رقم ہے اور اس میں سے کتنی امیر معاویہ
پر خرچ کر سکتا ہوں۔"

"نہیں اب وہ نہیں مانے گا۔۔۔ تم میرے دائیں ہاتھ پر کھڑے ہونا، میں دروازہ
کھٹکھٹاؤں گا اور بوڑھا تھوڑا سا کواڑ کھول کر مجھے دیکھتے ہی لعن طعن شروع کر دے گا۔
تم اس دوران کوٹھڑی کے دائیں کونے کو دیکھنے کی کوشش کرنا۔"

ہم ماہر جاسوس بنے پھونک پھونک کر قدم رکھتے دھوپ میں سفید کچی کوٹھڑی
کی طرف بڑھے اور منصور نے آہستہ سے بند دروازے پر دستک دی۔۔۔۔۔ ایک
بے ترتیب داڑھی والا بوڑھا کواڑ کے پیچھے دکھائی دیا اور اُس نے منصور کو دیکھتے ہی
عربی میں کچھ ناشائستہ قسم کی گفتگو شروع کر دی۔۔۔ میں نے ایڑیاں اُٹھا کر منصور کے
کندھے کے اُوپر سے کوٹھڑی کے اندر جھانکا۔۔۔ دائیں ہاتھ پر کوٹھڑی کے حجم کو نصف
میں تقسیم کرتا ایک چوکور ٹیلا دکھائی دیا۔ ٹیلے پر چند غلیظ کپڑے تھے، چند پرانی کتابیں
تھیں اور ایک پنجرہ دھرا تھا۔ پنجرے میں قید طوطا بڑی حیرت سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔
ٹیلے پر سنگِ مرمر کا ایک کتبہ بھی نصب تھا جس کی عبارت نیم تاریکی اور دوری کی
بنا پر پڑھی نہیں جا سکتی تھی۔ طوطے نے یکدم پر پھڑپھڑا کر ایک لمبی "ٹیں" کی اور بوڑھے
نے دروازہ بند کر دیا۔۔۔ بے آف بسکے سے سندھ اور چین تک، آرال سمندر ایک طرف

اور دوسری سرحد دریائے نیل، امیر معاویہ کی سلطنت ... ایک کچی کوٹھڑی، گز بھر کپڑے، چند کتابیں اور ایک طوطا، امیر معاویہ کی سلطنت!

ہم پانچوں فرانسیسی طرز کی بالکونی میں بیٹھے سڑک پر سے گزرتی کاروں اور بسوں کی چھتوں اور لوگوں کے سروں کو دیکھ رہے تھے، کافی پی رہے تھے اور گفتگو کر رہے تھے بلکہ میں اور بشار گفتگو کر رہے تھے اور اُس کی تین بہنیں ہم دونوں کو ٹکر ٹکر دیکھ رہی تھیں۔

میری آمد پر بشار کیمال بے حد نہال ہُوا اور مرحبا مرحبا کہتا ہُوا اپنے خوش ذوقی سے سجے کمرے میں لے گیا۔ دیواروں پر مغربی گلوکاروں، اداکاروں اور جوڈو کراٹے کے ماہرین کے جہازی پوسٹر آویزاں تھے۔ اُس نے اپنا ڈیک پلیئر آن کر دیا اور کونوں میں رکھے ہوئے سپیکروں میں سے دھم دھم کی آوازیں برآمد ہونے لگیں، جیسے کوئی دھوبی کپڑے دھو رہا ہو یا بھینس کیچڑ میں لوٹ رہی ہو اور مینڈکوں نے ٹرانا شروع کر دیا۔ معلوم ہُوا کسی سانٹانا صاحب کی دُھن ہے جو آج کل دنوں بے حد مقبول موسیقار ہیں۔ اس دوران بشار کی تینوں بہنیں بھی کمرے میں آ کر سپیکروں کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئیں اور قلیل مدت میں ہی وجد میں آگئیں انہوں نے مختصر بلاؤزوں کے ساتھ لمبے لمبے سکرٹ پہن رکھے تھے اور اُن کے نام شعاع اور شبیہہ قسم کے تھے۔ موسیقی کا سیشن اختتام کو پہنچا تو ہم پانچوں بالکونی میں آ بیٹھے جہاں میں اور بشار اشاروں کنایوں اور انگریزی کے چند لفظوں کی مدد سے گفتگو کرنے لگے اور اُس کی تین بہنیں یعنی شعاع اور شبیہہ وغیرہ ہمیں ٹکر ٹکر تکنے لگیں کیونکہ وہ انگریزی کا ایک لفظ بھی نہ جانتی تھیں۔ کبھی وہ بشار پر برس پڑتیں کہ اکیلے باتیں کیے جا رہے ہو ہمیں نہیں بتاتے کہ یہ کالے رنگ کا پاکستانی کیا کہہ رہا ہے۔ وہ ایک آدھ فقرہ بول کر انہیں ٹرخا کر پھر میری طرف متوجہ ہو جاتا۔ تھوڑی دیر تو وہ خاموش بیٹھی رہتیں مگر پھر احتجاج کرنے لگتیں۔ ایک مرتبہ ان تینوں نے بشار پر سوالوں کی یلغار کر دی اور بشار نے

خاصی جدوجہد کے بعد ترجمہ کر کے مجھے بتایا کہ پوچھتی ہیں مذہب کے بارے میں کیا خیال ہے؟ مذہب چونکہ ہم پاکستانیوں کا چہیتا موضوع ہوتا ہے اس لیے میں نے ایک مدلل تقریر جھاڑ دی کہ صاحب عرب لوگ مذہب سے بیگانے ہو گئے ہیں۔ لڑکے چُست جینیں پہنتے ہیں اور آپ شعاع اور شبیہہ وغیرہ غیر اسلامی لباس سکرٹ زیب تن کرتی ہیں، دھم دھم والی موسیقی پر سر ہلاتی ہیں۔ اسلام خطرے میں ہے ... اتنے میں مغرب کی اذان بلند ہوئی اور وہ تینوں اجازت لے کر نماز پڑھنے چلی گئیں۔ اور میں نے اپنی تقریر جاری رکھی کہ صاحب عرب لوگ مذہب سے بیگانے ہو گئے ہیں، غیر شرعی لباس پہنتے ہیں ...

اگلے روز میری ملاقات محمد علی سے ہوئی جو پاکستانی سفارت خانے کا سب سے قدیم رُکن تھا ... دُنیا کے ہر سفارت خانے میں کم از کم ایک محمد علی ضرور پایا جاتا ہے۔ وہ عام طور پر ڈرائیور، چوکیدار یا کلرک ہوتا ہے یا اُسے ہونا چاہیئے مگر وہ ہوتا نہیں۔ اُسے ایک ہینڈی مین یا ہر فن مولا کہہ سکتے ہیں۔ سفارت خانے میں آنے والا ہر نیا سفارت کار اُس کا محتاج ہوتا ہے۔ وہ اسے بتاتا ہے کہ صاحب اس شہر میں انڈے کہاں سے سستے مل سکتے ہیں۔ مسجد اُمیّہ کے کس حصّے میں نفل پڑھنے سے مُراد پوری ہوتی ہے، کار کی بیٹری کہاں سے چارج کروانی ہے، کس سفیر کی دعوت میں بھوک رکھ کر جانا چاہیئے اور کونسے سفیر کی دعوت سے بھوکے آنا پڑتا ہے۔ دانتوں کا کونسا ڈاکٹر سچ مچ دانتوں کا ڈاکٹر ہے۔ رات کو دیوار پھاند کر کس بس سروس سے بیروت جا کر صبح تک واپس آیا جا سکتا ہے جبکہ بیگم صاحبہ ہنوز محوِ خواب ہوں ... یہ والا محمد علی شامی تھا اور اُردو فر فر بولتا تھا ...

گفتگو کے دوران جب مسجد اُمیّہ کا ذکر آیا تو میں نے پوچھا کہ اس کے برآمدے میں کھڑی بیل گاڑی پر کیا واقعی اسیرانِ کربلا کو دمشق لایا گیا تھا؟ محمد علی ہنسنے لگا۔

"صاحب اس صدی کے آغاز میں مسجد اُمیّہ کا ایک بہت بڑا حصّہ آگ لگنے سے تباہ
گیا تھا چنانچہ جب دوبارہ تعمیر شروع ہوئی تو معماروں کے علاوہ اہلِ دمشق نے بڑھ
رضا کارانہ طور پر اس میں حصّہ لیا۔ میرے والد محترم جناب ابوالسعود بھی ان مقدس
مزدوروں میں شامل تھے۔ ایک روز ایک بیل گاڑی کے پہیے تلے آ گئے اور اُن کی ٹانگ
ٹوٹ گئی... ان گاڑیوں پر تعمیر کا سامان ڈھویا جاتا تھا.. بس یہ وہی بیل گاڑی ہے"

"اور چھت سے لٹکتے ہوئے وہ خوفناک پنجرے..."

"وہ پنجرے نہیں پرانے فانوس ہیں جن میں شمعیں روشن ہوتی تھیں، اب بجلی کی وجہ
سے بیکار ہو چکے ہیں۔"

اس سے پیشتر کہ وہ مزید انکشافات کرتا، ایک نووارد سفارتی افسر اپنے کمرے سے
نکلا اور بڑے متوددانہ طریقے سے پوچھا "محمّد علی بیروت کی سبزی منڈی میں اُس دکاندار
کا کیا نام ہے جو شملہ مرچ اور پیاز سستے داموں فروخت کرتا ہے؟ یار اُسے فون
تو کر دو۔" اور محمّد علی اس حاجت مند کے ہمراہ بیروت فون کرنے چلا گیا۔

میں ریسیپشن روم میں بیٹھ کر مظہر کا انتظار کرنے لگا جس نے آج صبح فون پر
اطلاع کی تھی کہ ایک بجے چلے آنا، لنچ کے بعد کچھ فراغت ہے، تمہیں سیر کروادوں گا۔
کچھ دیر بعد ڈیفنس اتاشی کمانڈر یونس کا اُدھر سے گزر ہوا تو وہ مجھے اپنے کمرے میں
لے گئے جہاں ایک دُبلا پتلا، چھدرے بالوں والا شخص کمر اکڑائے ایک رسالے کے
صفحوں میں مگن تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ اُٹھا اور بڑے تپاک سے ملا۔ میری ایک آدھ کتاب
کا حوالہ دیا، کسی ڈرامے کا ذکر کیا اور پھر دوبارہ ملاقات کی خواہش کا اظہار کر کے بیٹھ گیا۔

"آپ کے دوست کی شکل کچھ کچھ شناسا لگتی ہے لیکن میں پہچان نہیں پایا۔" میں نے
کمانڈر یونس سے کہا۔

"یہ عالم صاحب ہیں... آپ سگرٹ پیئیں گے؟"

"کرتے کیا ہیں؟"

"ایئر فورس میں ہیں... دمشق پسند آیا؟"

"ان کا پورا نام کیا ہے؟"

"ایم۔ ایم عالم... سُنا ہے آپ پرسوں بیروت جا رہے ہیں۔"

"اپنے ایم۔ ایم عالم؟" میں نے چونکتے ہو کر پوچھا۔ "۶۵ء کی جنگ کے ہیرو، ہمارے
ایس پائلٹ؟"

"جی بالکل"۔ کمانڈر یونس نے جھینپ کر کہا۔

"یہ دمشق میں کیا کر رہے ہیں؟"

"سیر کرنے آتے ہیں... آپ چائے پیجیئے گا ناں؟" اُنہوں نے گھنٹی بجا دی۔
میں کچھ کچھ کنفیوز ہو رہا تھا۔ دمشق میں اکثر راہ چلتے یا کسی قہوہ خانے میں بڑے
نکھرے ہوئے، کسی دیسی حجام کی دکان میں تراشیدہ سروں والے پاکستانی نوجوان دکھائی
دیتے۔ پوچھتا کہ صاحب دمشق میں کیسے آئے؟ ارشاد ہوتا، سیر کرنے آتے ہیں...
حالانکہ ٹورسٹ غریب تو شکل سے دھکّے کھانے والا لگتا ہے اور یہ حضرات دھکّے دینے
والے لگتے تھے... بہت بعد میں کھُلا کہ پاکستان نے ۷۳ء کی جنگِ رمضان کے دوران
شام کا ساتھ زورِ بیان سے نہیں زورِ بازو سے دیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جنگ کے
دوران شامی پائلٹ تو اسرائیل پر برستے تھے اور دمشق کا آسمان پاکستانی پائلٹوں کی
حفاظت میں ہوتا تھا۔ شامی توپ خانے میں جس نے اسرائیلیوں کا مُنہ پھیر دیا، کچھ
پاکستانی توپچی بھی شامل تھے اور شام کی جانب آنے والے ہر اسرائیلی پائلٹ کو ایم ایم عالم
کے تربیت شدہ شامی شاہینوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا... شاید اسی لئے شام میں
لفظ "پاکستان" جادو تھا اور اس ملک میں داخل ہونے والے ہر پاکستانی کو شامیوں کی
طرف سے دوستی اور پیار کا بلینک چیک پیش کر دیا جاتا تھا۔ ایسا چیک جو انسان
کبھی کیش نہیں کرواتا، سینے سے لگائے رکھتا ہے۔

خاردار جھاڑیوں کے درمیان گم ہوتی ریت آلود سڑک پر مظہر کی کار اُڑتی ہوئی جا رہی تھی اور عقبی شیشے میں سے دُھول کا سراسیمہ وجود ہمارے تعاقب کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ مظہر نے کار کے تمام شیشے چڑھا رکھے تھے تاکہ گرد اندر نہ آئے اور اس لئے بھی کہ اُس کی وِگ تیز ہوا سے پریشان ہو کر کہیں سر کا ساتھ نہ چھوڑ دے۔ دائیں ہاتھ پر ایک نیم صحرائی وسعت تھی۔

"یہاں سے چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر ایک ایسی جگہ ہے جہاں حضورؐ تجارت کے لئے تشریف لایا کرتے تھے۔" مظہر نے بتایا۔

"ہم وہاں جا تو نہیں سکتے ناں؟"

مظہر نے گھڑی پر نگاہ ڈال کر انکار میں سر ہلایا۔ اُس کے پاس وقت نہ تھا اور میرے پاس اختیار نہ تھا۔

دو بجے کے قریب ہم اُمّ المصائب بی بی زینب کے مزار "زینبیہ" پر پہنچ گئے۔ خلافِ توقع زائرین کا زیادہ ہجوم نہ تھا۔ ہم نے بُوٹ اُتارے اور سروں کو ڈھانپ کر روضے کے اندر چلے گئے۔ ایرانی فنِ تعمیر کا ایک محل نما مقبرہ۔ ہم نے فاتحہ پڑھی۔ کچھ دیر سر جھکائے جالی کے قریب بیٹھے رہے اور پھر باہر آ گئے۔

"کل میں نے اپنے آپ کو سارے دن کے لئے فارغ کر لیا ہے۔" مظہر ایک ہاتھ سے اپنی وِگ کو دستارِ فضیلت . . . کی طرح سنبھالتا ہوا کار میں بیٹھ گیا۔ "کہاں جاؤ گے اور کیا دیکھو گے؟"

"تم کہاں جا سکتے ہو اور کیا دکھا سکتے ہو؟"

"دمشق سے کچھ فاصلے پر ایک پہاڑ ہے جو روایت کے مطابق ہابیل اور قابیل کی لڑائی کا گواہ ہے۔ قابیل کے قتل پر اُس کا سینہ شق ہو گیا، زبان باہر نکل گئی اور آنسو بہہ نکلے . . ."

مجھے تہران والی مائی پھیرے باز کا آنسوؤں سے بھیگا ہوا چہرہ یاد آ گیا۔

"اور وہاں حضرت موسےٰ کا مصلےٰ ہے اور حضرت ابراہیم کا مصلےٰ ہے اور . . . وہیں لے چلنا۔"

"چوٹی تک پہنچنے کے لئے پیدل بھی چلنا پڑتا ہے، گرمی بہت ہے۔"

"بس وہیں جانا ہے۔"

"ہم ایک اور سمت میں بھی سفر کر سکتے ہیں۔"

"مثلاً؟"

"مثلاً میں تمہیں اسرائیل کی سرحد پر لے جا سکتا ہوں۔ گولان کی پہاڑیوں کے درمیان . . ."

گولان!

گولان کا لفظ میرے جسم پر بارود کے گولے کی طرح پھٹا۔ یاسر عرفات، جارج حباش اور لیلےٰ خالد کے جلتی آنکھوں والے چہرے جلاوطنی کے جنگلوں میں انتقام پر اُترے ہوئے تھے۔ "کیا واقعی؟ . . . کیا ایسا ہو سکتا ہے؟"

"ہم دونوں جگہ نہیں جا سکتے۔ تمہیں موسےٰ کے مصلے اور گولان میں سے ایک کو منتخب کرنا ہو گا۔"

"تم نے تو مجھے امتحان میں ڈال ہی نہیں مظہر! اتنا آسان فیصلہ شاید میں نے آج تک نہ کیا ہو . . . میں ماضی کے دھندلے نشانوں کے تعاقب کی بجائے حال کی حقیقتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں . . . گولان!"

⁂

گولان

گولان۔
بارود کی سیاہی پتھروں کے چہروں پر ملی ہوئی تھی۔
کھمبے ابھی تک جھکے ہوئے تھے، جلے ہوئے تھے، کچھ یوں خمیدہ ہو چکے تھے جیسے
کسی نے اُن کی گردنیں مروڑ دی ہوں۔
دمشق کے پہلے شہری ایئرپورٹ کے رن وے پر تباہ شدہ جہازوں کے ڈھانچے
بجھے ہوئے آتش دانوں کی طرح سرد تھے۔

تیز ہوا میدانوں میں تھی اور بھیڑیں چر رہی تھیں مگر ہر لمحہ بدکتی ہوئیں، خطرے
کے سگنل وصول کرتی ہوئیں۔ دائیں جانب جبل الشیخ بارود کی سیاہیوں سے بلند برف
پوش تھا... اپنے سر کی برف سفیدی کی نسبت سے "بوڑھا پہاڑ"۔
مظہر کی کار سڑک کی سیاہ لکیر پر سیدھی چلی جا رہی تھی۔
تیز ہوا میدانوں میں تھی اور ہلکا غبار اُٹھ رہا تھا مگر کار کے اندر صرف انجن کی
نامعلوم سی آواز تھی اور ریڈیو سے بہتی ہوئی کسی عرب موسیقار کی صدا... "ناتواں آدمی
حُب کے سامنے ختم ہو جاتا ہے اور قوی شخص حُب کی قربت میں مکمل ہو جاتا ہے۔"
کہیں کہیں کسان کھیتوں میں جھکے ہوئے تھے۔ مشقتی ہاتھ زمین کے ماتھے سے
بارود کی سیاہی مٹا رہے تھے۔
ریڈیو دمشق سے عطشی کی پُرسوز آواز ہم تک پہنچی... "اور میرے وجود کے لئے

سب سے اہم چیز یہ ہے کہ میں کہاں ہوں ... اور ہم دونوں کہاں ہیں۔"
جبل الشیخ کی برف میدانوں میں اُٹھتے غبار میں مدھم ہو رہی تھی۔
"تم بیروت نہ جاؤ، وہاں حالات بہت خراب ہیں۔" مظہر نے سٹیئرنگ سے ہاتھ
اُٹھا کر ریڈیو بند کر دیا۔
"حالات تو گولان میں بھی خراب ہیں لیکن ہم وہاں جا رہے ہیں۔"
"آج صبح میں نے بیروت میں پاکستانی سفیر سے بات کی تھی، آٹھ دس قتل اور چند بم
دھماکے تو اب بھی معمول ہیں لیکن ان کا خیال ہے کہ اگلے چند روز میں بیروت پوری طرح
پھٹنے والا ہے۔ فلنجیوں نے تین پاکستانیوں کو بھی اغوا کر لیا ہے۔ حالات بہت ہی خراب ہیں۔"
"مجھے بہر طور بیروت پہنچنا ہے کیونکہ مصر کے لئے بحری جہاز صرف وہیں سے چلتے ہیں
اور پھر موت تو برحق ہے۔"
"بالکل ہے۔" مظہر نے اپنی وِگ درست کی۔ "لیکن پردیس میں موت کا پیچھا کرنا بھی
تو دانشمندی نہیں۔"
"سیاح دانشمند نہیں ہوتا مظہر بلکہ ایک نافرمان بچہ ہوتا ہے۔ فرماں بردار ہوں تو
والدین کی گھنی چھاؤں اور بچوں کے آسمانی پیار کو چھوڑ کر اپنی من مرضی سے گھر سے در بدر
کیوں ہو جاتے ... امیر معاویہ نے لوگوں کے بارے میں کہا تھا مگر میں موت سے کبھی اپنا
ناطہ نہیں توڑتا ... اگر میرا ایک بال بھی موت سے بندھا ہو تو میں اسے ٹوٹنے نہیں دوں گا
اگر وہ کھینچے گی تو میں ڈھیلا چھوڑ دوں گا اور اگر وہ ڈھیلا چھوڑے گی تو میں کھینچ لوں گا
... یوں ہم برابری کی سطح پر رہتے ہیں۔ جس روز یہ ناطہ ٹوٹا تو وہ مجھ پر غالب آ جائے گی ..."
مظہر نے اپنی سفارتی ابرو ناگواری سے چڑھائی اور ریڈیو آن کر دیا ...
میدانوں میں اور پتھروں پر بارود کی جلن تھی۔ کھمبے کبڑے ہو کر ہماری کار کو حیرت سے
تک رہے تھے۔
زینوبیہ سے واپسی پر میں پچھلی شام ایک بس پر سوار ہو کر دمشق کے بلند ترین

مہاجرین" پر چلا گیا۔ چٹان پر ایک سائن بورڈ تھا "محافظِ مدینہ دمشق، جبلِ قاسیون"۔
اور جبلِ قاسیون واقعی ایک باپ کی طرح اپنے پاؤں میں پھیلے دمشق پر شفیق بنا کھڑا
تھا۔ پہاڑ کی گود میں دبکے ایک قہوہ خانے میں بیٹھ کر میں نے ایک سانڈلیش فلافل اور
سنگتروں کے رس کا آرڈر دیا۔ سامنے پارک میں شامیوں کا ایک ہجوم تفریح کی کیفیتوں
میں تھا۔ آئس کریم اور اُبلے ہوئے بھٹے فروخت ہو رہے تھے ... اُس لمحے مجھے احساس ہوا
کہ میرے خیمے کے نیچے گھاس اُگ آئی ہے، مجھے یہاں سے کوچ کر جانا چاہیئے۔ مجھے جو
دمشق دکھائی دے رہا تھا، اب اوپرا نہیں لگتا تھا، اپنا لگتا تھا، گھر لگتا تھا۔ اور مجھے
معلوم تھا کہ جوں جوں وقت گزرے گا یہ شہر خوبصورت ہوتا چلا جائے گا کیونکہ کوئی شے
جس لمحے وجود میں آتی ہے اُسی گھڑی وقت اُس پر اثر انداز ہونے لگتا ہے، زمانے
گزرتے رہتے ہیں اور وقت اُس شے پر، اُس عمارت پر، اُس شہر پر حاوی ہوتا چلا جاتا
ہے۔ آہستہ آہستہ اُس میں سرایت کرتا رہتا ہے اور ہم جب اُس شے کے سامنے کھڑے
ہوتے ہیں تو دراصل وقت کو دیکھ رہے ہوتے ہیں، وہ شے بذاتِ خود معدوم ہو چکی ہوتی
ہے۔ اس کی تمام تر خوبصورتی وقت ہوتا ہے۔ دمشق کا شہر مجھے یقین ہے یومِ ظہور پر
خوبصورت نہ تھا۔ اب ہے کیونکہ آج وہ وقت ہے ... "مہاجرین" سے واپسی پر پرانے
دمشق کے کوچہ ذکاق النقاشات میں مَیں نے ایک کھڑکی کھلتی دیکھی اور اُس کھڑکی میں اسی
لڑکی کا چہرہ تھا جو اس شہر میں ہر چند قدم کے فاصلے پر میرے پاؤں روک دیتی تھی۔ اُس
کا چہرہ ایسے دمکتا تھا جیسے ناخن تلے ٹارچ جل رہی ہو۔ وہ کھڑکی نیم تاریک کوچے
میں بھی ظاہر ہو رہی تھی۔ چند قدم آگے جانے کے بعد میں اُسے دوبارہ دیکھنے کی خواہش
میں پھر واپس آیا ... ہاں میرے خیمے کے نیچے گھاس اُگ رہی ہے، مجھے یہاں سے
کوچ کر جانا چاہیئے۔
کار رُک گئی ... ایک چیک پوسٹ ... ہمارے راستے میں ایک رکاوٹی شہتیر
نصب تھا۔ شامی فوجی سب مشین گن پر ہتھیلی رکھے ہماری طرف آیا اور کھڑکی پر جھکا "پاسپورٹ"۔

پاسپورٹوں کی واجبی سی ورق گردانی کے بعد اس نے مسکراتے ہوئے
مظہر سے کچھ کہا اور مظہر نے اُسی شدت سے مسکراتے ہوئے بیک گیئر لگا کر کار
کی طرف موڑ لی۔

"کل رات اسرائیلیوں نے قنیطرہ پر شدید گولہ باری کی ہے اس لیے حفاظتی
سخت کر دیے گئے ہیں۔ وزارتِ دفاع کی خصوصی اجازت کے بغیر ہم گولان نہیں
عقبی شیشے میں سے چیک پوسٹ کا حفاظتی شہتیر دُور ہوتا دکھائی دے
گولان دوسری طرف تھا۔

"پھر؟"

"پھر دمشق چلتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں ورنہ مُوسے کا مصلّے.."

دمشق واپس پہنچ کر مظہر نے مجھے ایک قہوہ خانے میں بٹھایا اور سُوس کا
میرے سامنے رکھ کر چلا گیا۔ میں ایک مایوس مریض کی طرح دُنیا جہان سے بیزار
کرنے لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ پاکستان میں ملٹے کے ایک چار انچ بلند شریف النسل
کو برآمد کرنے کے لیے وزارتِ زراعت سے صحت کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنے میں
لگ جاتے ہیں، اور یہاں تو وزارتِ دفاع تھی اور معاملہ اسرائیل کی سرحد کا تھا
صد شکر کہ شامی ابھی پاکستانی نہیں ہوئے اور مظہر ایک گھنٹے کے بعد ہی اجازت
جیب میں ڈالے واپس پہنچ گیا۔ نام کے خانے کے آگے.. السیّدی مستنصر حسین تارڑ
"اب تم گواہ رہنا کہ میں تمہاری آنکھوں کے سامنے سیّد بنا ہوں" میں نے
سے ہنس کر کہا اور فرطِ مسرت سے سُوس کا وہ گلاس جو اب تک میرے سامنے
دھرا تھا، اُٹھا کر پی گیا۔

چیک پوسٹ پر شامی فوجی ہماری رُکتی ہوئی کار کے قریب آیا اور
جھک گیا۔ میرا اجازت نامہ چیک کرنے کے بعد اُس نے حفاظتی شہتیر اُٹھا دیا
عقبی شیشے میں سے چیک پوسٹ کا حفاظتی شہتیر دُور ہوتا دکھائی دے

دمشق دوسری طرف تھا۔

گولان!

چند کلومیٹر تک کوئی کوئی مکان نظر آتا رہا، بکریاں چراتی ہوئی جامنی چوغے اور
گلابی شلوار والی ایک لڑکی نے رُک کر کار کو دیکھا۔ پھر لینڈ سکیپ ویران ہو گئی۔

اُجاڑ اور انتظار میں....

کسی دھماکے کے انتظار میں....

جیسے زمین دم بخود ہے، سانس روکے سُن رہی ہے۔

سڑک ایک لکیر کی صورت سیدھی چلی جا رہی تھی۔ بائیں طرف درختوں کا ایک
گھنا جھنڈ آیا۔

"حربِ تشرین یعنی جنگِ رمضان میں شامی توپ خانہ اس جھنڈ میں رُوپوش تھا۔"
مظہر نے بتایا۔

ہمارے سامنے میدان میں سڑک کے دونوں طرف مٹی کے بلند تودے تاحدِ نظر
صورتِ دیوار کھڑے تھے۔ دفاعِ دمشق کے لیے شامیوں نے گولان سے شروع ہو کر شہر
کی آخری حدوں تک ہر چند کلومیٹر کے فاصلے پر اس قسم کے حفاظتی بند کھڑے کر رکھے
تھے۔ درجنوں بل ڈوزر ان بلند مورچوں کو مضبوط بنانے میں مصروف تھے۔

طیارہ شکن توپوں اور ٹینکوں کی نالیاں فضا میں مُنہ اُٹھائے ساکت تھیں...
منتظر تھیں، سانس روکے سُن رہی تھیں۔

فوجیوں کا ایک گروہ جانے کہاں سے نمودار ہو کر میدان میں بھاگنے لگا اور پھر
یکدم زمین سے لپٹ کر زمین رنگ ہو گیا... وہ بھی سانس روکے سُن رہے تھے۔

گولان!

ہم ایک چھوٹے سے پُل پر سے گزرے جس کے ارد گرد چند درخت کھڑے تھے۔
یہ ساسا کا پُل ہے۔ اسرائیلی جنگ کے ابتدائی ایام میں یہاں تک آ گئے تھے۔

پھر شامیوں نے انہیں پیچھے دھکیلنا شروع کیا اور گولان تک لے گئے... اگر جنگ بندی قبول نہ کی جاتی تو گولان پر شامیوں کے قدم ضرور پہنچتے۔"

جون ۶۷ء میں اسرائیل کے قطرہ وجود کے سامنے عربوں کا سمندر رسائی جس پر ز بند ہُوا اور پھر مُردنی چھا گئی وہ ذلت آمیز تھا۔ عربوں نے ہزیمت کی دُھول چاٹی اور رُسوائی کا لبادہ پہنا۔ پھر ۸ اکتوبر ۷۳ء کو گھڑی کی سوئیاں چلنے لگیں۔ بازکے پر اُگے اور پرواز کے قابل ہُوا۔ چٹانوں تلے پوشیدہ پانی سطح پر آیا۔ درختوں کی جڑیں پھوٹ نکلیں۔ ۸ اکتوبر ۷۳ء کو حربِ تشرین کا آغاز ہو گیا۔ ترقی پذیر ممالک کے نصیب سامراجی طاقتوں کی تحریر ہوتی ہے، مکمل فتح تو عربوں کو نصیب نہ ہوئی مگر وہ ہزیمتوں کی دُھول سے اُٹھے اور مکمل وقار حاصل کر لیا۔

ساسا کے بعد کچی سڑک نظر آئی جو دائیں ہاتھ پر دوزین کے قصبے تک جاری تھی۔ قریہ صنخیہ کے بعد قریہ مدمیہ آیا۔ سرو، زیتون اور سفیدے کے درختوں میں زندہ قصبے۔

ایک دفاعی ریلوے لائن گولان تک جا رہی تھی۔

ہریاول کم ہو رہی تھی، زمین جفاکش نظر آنے لگی۔

میں نے کار کا شیشہ نیچے سرکایا، ہوا کا گہرا شور اندر آ گیا۔

ویران لینڈ سکیپ بے چینی سے بھری تھی جیسے پہلے دھماکے کا منتظر سپاہی پہلو بدلتا ہے۔

دُھول کے پُرشور غبار میں سے ایک سلسلہ کوہ نظر آیا۔

گولان!

ہم قریب ہوئے تو ایک دہیل نما پہاڑی ہماری کار پر حاوی ہونے لگی۔

"گولان کی اہم ترین اور سب سے بلند پہاڑی، تل البوندا" مظہر نے کار آہستہ کی۔ دامن سے لے کر چوٹی تک ہزاروں ایریل اور مختلف آلات گھاس کی طرح کی سطح پر اُگے ہوئے تھے۔

"ایک بڑی آنکھ جو ہر لمحہ دمشق کو دیکھتی ہے۔" مظہر نے ریڈیو بند کر دیا۔ "اسرائیلیوں نے اسے راڈار کا ایک جنگل بنا دیا ہے۔ اس میں پوشیدہ سینکڑوں دُور مار توپوں کا رُخ دمشق کی طرف ہے... لیکن فی الحال..." وہ ایک لمحے کے لئے رُکا... اس کی نظریں سڑک کی بجائے البوندا پر تھیں۔ "فی الحال اُن کی دُوربینیں دمشق سے آنے والی سڑک پر دوڑتی ایک کار پر ہیں اور وہ اس میں سوار دو افراد کی تصویریں اُتار رہے ہیں... مجھے یقین ہے کہ ہم فوکس میں ہیں۔"

البوندا پر اُگی تنصیبات اور ایریل مجھے ایک آکٹوپس کی طرح دکھائی دیتے جو ہمیں گھُور رہا تھا۔

"جب تک ہم البوندا کے پہلو میں پہنچیں گے۔ اسرائیلیوں کو حیفہ سے اطلاع مل جائے گی کہ اس نمبر کی کار کس کی ہے اور اس میں سوار دوسرا شخص کون سے ملک کا ہے۔"

"میں آج واقعی اہم محسوس کر رہا ہوں، پہلے شامیوں نے مجھے اکھڑ جاٹ کو السیدی کے لقب سے نوازا اور اب اسرائیلی انٹیلی جنس میرے کوائف معلوم کرنے کے لئے نڈھال ہو رہی ہے۔" میں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ میں ایک ایسے جرثومے کی طرح محسوس کر رہا تھا جسے ایک بڑی خوردبین سے دیکھا جا رہا ہو۔

"تل البوندا کے ساتھ دوسری پہاڑی کا نام تل عرام ہے اور اس کے پہلو میں تل کتانیہ دکھائی دے رہی ہے۔"

گولان!

خان دربند سے شام کا علاقہ ختم ہُوا اور نو مین لینڈ شروع ہو گئی۔ نو کلومیٹر کا یہ علاقہ اقوامِ متحدہ کی فوج کے زیرِ انتظام ہے مگر اس میں شامل بیشتر فوجی شامی ہیں۔

نو مین لینڈ ختم ہوتی تو کار کا راستہ ایک نو تعمیر دیوار نے روک لیا۔ دیوار کے پیچھے ایک سُرخ وین بے حد آہستگی سے حرکت کر رہی تھی۔ وین کی سائڈ پر حضرت داؤد کا نیلا ستارہ نقش تھا... اُدھر اسرائیلی تھے۔

دیوار سے چند گز اِدھر سڑک نوّے درجے کے زاویے پر دائیں ہاتھ کو مڑ گئی۔
ایک بورڈ پر "ترحب بکم" لکھا تھا یعنی "خوش آمدید"۔ اور ہم قنیطرہ میں داخل ہو گئے
جب میں غازی انتپ میں صبح سات بجے داخل ہُوا تھا تو میں نے دیکھا تھا
ایک شہر، بچے سکول جا رہے تھے۔ مزدور فیکٹریوں میں پہنچنے کے لئے تیز تیز چل رہے
دفتری لوگ سائیکلوں پر دُہرے ہو رہے تھے، کاریں ٹریفک کے ہجوم میں ہارن دے
رہی تھیں اور لوگ تھے بے شمار، ایک شہر... مگر یہ کیسا شہر تھا جس میں ہم داخل ہوئے
تو وہاں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو آگے بڑھ کر ہمیں کہتا کہ میرے شہر میں آئیے، میں
کا رہنے والا ہوں، وہاں کوئی بھی نہ تھا، صرف تیز ہوا تھی جو اُداسی کی بنا پر نہیں، شہر
بربادی کے غم میں سائیں سائیں کر رہی تھی۔ بازار کی تمام عمارتیں بیچ سڑک پر ملبے کی
بکھری پڑی تھیں۔ ڈھلوانوں پر مکانوں کے ڈھانچے تھے۔ سینکڑوں فٹ بلند دیواریں زمین
پر لیٹی ہوئی تھیں۔ دکانوں کے دروازے برآمدوں میں پڑے تھے اور چھتیں بیٹھ چکی تھیں
مسجد کا مینار صحن میں آرام کر رہا تھا اور کلیسا کے گنبد میں دراڑیں آئی ہوئی تھیں۔

ہم قنیطرہ کے کھنڈروں میں اُن پیاسے، تھکے ہارے کاؤ بوائز کی طرح گھومتے
جو کسی ویران بھوت گاؤں میں آ نکلے ہوں۔

ایک ٹیلے پر شہر کے ہسپتال کے آثار تھے۔ سلاخوں میں کنکریٹ کے ٹکڑے کہیں
کہیں اس طرح پھنسے ہوتے تھے جیسے برف پگھلنے پر درخت کی شاخوں میں چند گالے
رہ جاتے ہیں۔ لوہے کے شہتیروں میں سوراخ جھانک رہے تھے۔ کل شام اسرائیلیوں
نے اسی ہسپتال پر چاند ماری کے طور پر گولے برسائے تھے۔ ہم اس کی ننگی سیڑھیوں پر
قدم رکھتے چھت پر پہنچ گئے۔

جنگلی گھاس اور سرکنڈے، اُن سے پرے کھیت اور آخر میں گولان کی پہاڑیاں
اسرائیل کا کچھ حصہ اور تباہ شدہ قنیطرہ کا وسیع منظر۔ میں تیز ہوا کی بوچھاڑ میں
کو ریت کے ذرّوں سے بچاتا اُس سرزمین کی جانب دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا جہاں

نادر اور قدیم درختوں کو اُکھاڑ پھینکا گیا اور اُن کی جگہ دُنیا جہان سے مختلف قسم کے
ایسے پودے لاکر وہاں بو دیئے گئے جو ان فضاؤں میں سانس لینا بھی نہیں جانتے
تھے... لیکن وہ درخت اپنی سرزمین کو لوٹیں گے کہ ان کی جڑیں وہاں پر ہیں، پھر سے
تناور ہوں گے۔

دُور کھیتوں میں ایک شامی ہمیں دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ چلتا ہسپتال
تک آیا اور ٹٹول ٹٹول کر قدم رکھتا چھت پر آ گیا۔ وہ ان پانچ خاندانوں میں سے ایک
کا سربراہ تھا جنہوں نے دمشق میں جانے کی بجائے اپنے مسمار شدہ گھروں میں رہنے کو
ترجیح دی۔ اُس کی کمر قدرے خمیدہ تھی اور چہرہ جیسے دھات کا بنا ہُوا، کھدی ہوئی
سلوٹیں اور تراشا ہُوا ماتھا۔ اُس نے ہمیں بتایا کہ ۶۷ء میں گولان کی پہاڑیوں کے
ساتھ قنیطرہ بھی کھو یا گیا۔ ۷۳ء میں شامیوں نے واپس لے لیا، پھر اسرائیلی آگے آ گئے۔
ایک مرتبہ پھر شامی اپنے شہر میں داخل ہو گئے... جب جنگ بندی ہوئی تو قنیطرہ
کا بیشتر حصہ اسرائیلیوں کے قبضے میں تھا۔ اس وقت شہر میں صرف دو مکین باقی تھے
ایک بلّی اور ایک بوڑھی عورت۔ ۷۴ء میں اقوامِ متحدہ کے تحت ایک معاہدہ ہُوا اور
قنیطرہ شام کے حوالے کر دیا گیا۔ صدر اسد نے اس شہر پر شامی جھنڈا لہرایا مگر اس پرچم
تلے صرف کھنڈر تھے۔ جنگ کی تباہ کاریوں کے بعد جتنی عمارتیں اور مکان محفوظ رہے
اسرائیلیوں نے جانے سے پیشتر انہیں بُل ڈوزروں کی مدد سے مسمار کر دیا۔ ستونوں سے
زنجیریں باندھ کر انہیں اس طرح کھینچا گیا کہ ان پر قائم عمارتیں زمین پر آ رہیں۔ جب
شام نے اس تباہی پر احتجاج کیا تو جواب ملا کہ معاہدے میں یہ کہیں شامل نہ تھا کہ شہر
سالم واپس ہوگا۔ یعنی انہوں نے اپنے بزرگوں کی روایت پر عمل کیا۔ شائیلاک نے بھی
اسی طرح معاہدے کی پابندی کی تھی۔

"ہم جان بوجھ کر اسے دوبارہ تعمیر نہیں کر رہے تاکہ دُنیا دیکھ لے کہ گیس چیمبروں
میں مرنے والے یہودیوں کی اولاد کس طرح نازیوں کے ہی نقشِ قدم پر چل رہی ہے۔"

جھکا ہُوا شامی کہہ رہا تھا۔

چھت پر ہوا شدت کی تیز تھی اور میری جیکٹ کے کالر میرے گالوں پر ... ہوئے اذیت دے رہے تھے "کیا آپ کبھی اس شہر کو آباد نہیں کریں گے؟"

"کیوں نہیں"۔ بوڑھے لب ہلے اور ٹوٹے ہوئے دانتوں کی مسکراہٹ سامنے ...

"اسرائیلیوں کا خیال ہے کہ اُنہوں نے ہمارے قنیطرہ کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا ہے ... ہم پھر سے اسے تعمیر کریں گے لیکن صرف اس وقت جب ہم گولان کی پہاڑیوں میں ... اسرائیل کی جنگی آنکھ ہمیشہ کے لئے پھوڑ دیں گے۔"

قنیطرہ بربریت کا ایک وسیع اوپن ایئر ماڈل تھا جس میں گھومتے ہوئے انسان خود اپنے آپ سے شرمندہ ہوتا ہے۔ اس کی بربادی کا ذمہ دار محسوس کرتا ہے۔

ہم ہسپتال کی چھت سے نیچے اُترے تو سیاہ کاروں کا ایک قافلہ قنیطرہ میں داخل ... اور کلیسا کے ڈھانچے کے قریب رُک گیا۔ قبرص کا صدر آرچ بشپ جو اُن دنوں شام کے سرکاری دورے پر آیا ہُوا تھا، ایک کار میں سے اپنا سیاہ چوغہ سنبھالتا ہُوا نکلا۔ اس کے ہمراہ اس کی پارٹی کے ارکان تھے۔ عجیب سیاہ خوابوں والی ایک ڈراؤنی سی تصویر ... تباہ حال شہر کے کھنڈرات میں گھومتے ہوئے درجنوں سیاہ پوش پادری اور تیز ہوا ...

قنیطرہ سے نکلتے ہوئے پھر وہی بورڈ دکھائی دیا۔ "ترحب بکم"... ویلکم ٹو قنیطرہ۔

گولان!

تل ابوندا کے گرد لپٹی سڑک پر ایک اسرائیلی ٹرک آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ اس کے انجن کی گھٹی گھٹی آواز تیز ہوا کے دوش پر کبھی کبھار کانوں میں اُتر آتی۔ دامن میں انگور ... کے باغوں کے سبز پیوند خود کار فواروں سے سیراب ہو رہے تھے۔

ہم سرحد کی جانب چلنے لگے۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک چیک پوسٹ تھی جس پر اقوامِ متحدہ کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ شامی سپاہی نے آگے بڑھ کر ہم دونوں کے کاغذات چیک کئے اور سیلوٹ مار کر پھاٹک کھول دیا۔ تقریباً بیس قدم پر ایک اور پھاٹک تھا۔ پہلو میں ...

اسرائیل کا جھنڈا نظر آ رہا تھا۔

"آپ آگے چلے جائیے"۔ شامی نے مسکراتے ہوئے اشارہ کیا۔

"آگے اسرائیل تو نہیں؟"

"نہیں اُدھر بھی شام ہے"۔ اس نے اپنی ناگواری کو مسکراہٹ میں دبائے رکھا اور مجھے فوراً ہی اپنی حماقت کا احساس ہُوا۔

دوسرے پھاٹک کے ساتھ لکڑی کی ایک کیبن تھی، ہم نے اندر جھانکا۔ ایک شامی سپاہی پشکن کی کہانیوں کے عربی ایڈیشن پر جھکا ہُوا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ باہر آ گیا۔ اس کے کندھے سے کلاش نیکوو نامی سب مشین گن لٹک رہی تھی اور گلے میں دُوربین تھی۔ اتنے میں اقوامِ متحدہ کی ایک سفید جیپ ہمارے قریب آ رُکی۔ شامی نے جیپ کے چاروں طرف گھوم کر معائنہ کیا، پھر اندر جھانکا اور کاغذات چیک کرنے کے بعد پھاٹک کھول دیا۔ دوسری طرف جیپ کو اسرائیلی سپاہیوں نے ہاتھ دیا اور اتنی دیر میں پھاٹک پھر سے بند ہو گیا۔

نیلی آنکھوں اور صاف ستھری رنگت والا شامی اب ہماری طرف متوجہ ہُوا۔ اجازت نامے پر نظر ڈالتے ہی اُس نے میرے کندھوں کو تھام لیا۔ "آپ بھائی ہیں" اور میرے رخساروں پر برادرانہ شفقت کے بوسے دیئے۔ پھر مظہر کی طرف بڑھا جس نے سفارتی آداب کے تحت ہاتھ آگے بڑھا رکھا تھا مگر شامی نے اُسے نظر انداز کرتے ہوئے اُس کے کندھے تھام کر بھی یہی عمل دُہرایا۔ "آپ بھائی ہیں، ہمارے پاس آئے ہیں، شکریہ..."

میں نے شام کی پسندیدگی اور شامیوں کے بے پناہ خلوص کا ذکر کیا۔ قنیطرہ کی بربادی پر اپنے رنج اور افسوس کا اظہار کیا۔

"آپ چائے پئیں"۔ اس سے پیشتر کہ ہم انکار وغیرہ کرتے وہ تیزی سے کیبن میں گیا مگر فوراً ہی باہر آ گیا۔ "افسوس چائے تو ختم ہے"۔ وہ بے بسی سے بولا... پھر کچھ سوچ کر اپنی وردی کی مختلف جیبوں کی تلاشی لی۔ تین چار بسکٹ ڈھونڈ نکالے اور اپنی دونوں

ہتھیلیوں پر رکھ کر قدرے شرمندگی سے دعوت دی۔ "پلیز آپ ضرور لیجئے..."

میں نے ایک بسکٹ اُٹھا کر مُنہ میں رکھ لیا مگر وہ حلق سے نیچے نہ اُترتا تھا۔ اِس لئے نہیں کہ وہ سخت تھا بلکہ اُسے پیش کرنے والے کی محبت سے میرا گلا رُندھ گیا تھا۔

"آپ گولان کی پہاڑیوں کو قریب سے دیکھنا چاہتے ہیں؟" اُس نے دُوربین گلے سے اُتار کر مجھے تھما دی۔ میں اُسے آنکھوں کے قریب لایا تو وہ کہنے لگا "نہیں اُس ٹیلے پر جا کر دیکھیئے۔" وہ ٹیلا چیک پوسٹ کے دائیں ہاتھ پر اسرائیلی پرچم سے بھی قدرے آگے تھا۔

"آپ کو یقین ہے کہ وہ ٹیلا..." مظہر نے گھبرا کر دریافت کیا۔

شامی نے اپنی کلاشنیکو کی لبلبی پہ ہاتھ رکھ دیا۔ "بس آپ بارڈر کی سیاہ لکیر کے قریب نہ جایئے گا، وہاں مائنز بچھی ہوئی ہیں۔"

میں دُوربین ہاتھوں میں تھامے ٹیلے پر چڑھ گیا... ایک مرتبہ سفر کے دوران ایک آئل ٹینکر پر سواری کا اتفاق ہُوا تھا اور میرے ہم سفر علی نے اُس کی چھت پر لیٹ کر سگرٹ سُلگانے کے لئے ماچس جلا لی تھی۔ اس شعلے کو دیکھ کر جس طور میرے اندر کا خوف بھڑکا تھا، کچھ اُسی قسم کی کیفیت سے میں یہاں دوچار ہُوا۔ گولان کا علاقہ بھی ایک وسیع آئل ٹینکر تھا — ۶۷ء میں شامی فوجیوں نے تل الوندا کو بچانے کی خاطر اپنے آپ کو زنجیروں میں باندھ لیا تھا تاکہ جنگ کے پاگل پن کے دوران کہیں جسم فرار کا رستہ نہ تلاش کر لے مگر لوہے سے بندھے ہوئے اُن کے ہزاروں مُردہ جسم بدقسمتی کا راستہ نہ روک سکے۔

دُوربین میں تل الوندا پر اُگی ہوئی تنصیبات کا گھنا جنگل قریب آ گیا۔

میں نے ایک اسرائیلی جیپ کو فوکس میں لیا، وہ دُوربین کے شیشوں میں کسی ناقص فلم کے منظر کی طرح ہلنے لگی۔ پہلے اُس کی باڈی پر حضرت داؤد کا نیلا ستارہ نظر آیا پھر ڈرائیور جو مُنہ میں سگرٹ دبائے کاہلی سے بارڈر کے ساتھ ساتھ جیپ کو چلا رہا تھا۔ پچھلے حصّے میں ایک مشین گن نصب تھی جس کا رُخ قابلِ فہم طور پر میری طرف تھا۔ مشین گن کے ساتھ کھڑا فوجی جب میری زد میں آیا تو اسی لمحے مسکرا دیا... اُس کی آنکھوں پر بھی ایک دُوربین جمی تھی اور وہ مجھے واچ کر رہا تھا... میں نے اپنی دُوربین نیچے کر لی۔

تل الوندا پر اُگے ایریَل اور راڈار ایک دم دُور چلے گئے۔ جیپ ایک کھلونے کی طرح دکھائی دینے لگی... ایک لاپروا گائے بارڈر کی سیاہ لکیر کے بہت قریب گھاس چر رہی تھی... اور ہر طرف تیز ہوا تھی۔ گولان کے محاذ پر مکمل خاموشی تھی۔

میں ٹیلے سے نیچے اُترا تو شامی فوجی سب مشین گن کی لبلبی پر اُنگلی لپیٹے انتظار کر رہا تھا۔ مظہر ایک ہاتھ سے اپنی وِگ سنبھالے دوسرے ہاتھ سے پُشکن کی کہانیوں کی ورق گردانی میں مشغول تھا۔ مجھے دیکھ کر اُس نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا اور اُٹھ کھڑا ہُوا۔ "شاہراہِ دمشق شام ڈھلے بند کر دی جاتی ہے، ہمیں واپس لَوٹنا چاہیئے۔"

ہم اپنے میزبان کا شکریہ تو خیر کیا ادا کرتے، خوب زور زور سے اُس کا ہاتھ جھٹکا۔ مسکراہٹ بھی ہمارے بس میں نہ تھی اور پھر جانے کے لئے واپس مُڑے۔ چند قدم چلنے کے بعد میں رُک گیا۔ ایک سوال رہ گیا تھا۔ میں واپس شامی فوجی کے پاس گیا جو ابھی تک اپنی کلاشنیکوو کی لبلبی پہ اُنگلی جمائے کھڑا تھا اور سوال پوچھا۔ "آپ گولان کب واپس لے رہے ہیں؟"

وہ شاید اسی سوال کے انتظار میں تھا۔ تل الوندا کو ایک نظر دیکھا اور دیوتاؤں ایسے گہرے تیقن سے بولا۔ "شاید آج ہی... نہیں تو کل ضرور انشاءاللہ"

اے آلِ اسرائیل ایسا اِترانا بھی کیا،
گھڑی کی سوئیاں اگر آج رُک گئی ہیں
تو کل یہ پھر سے چل پڑیں گی۔
زمین کے چھِن جانے کا غم نہیں ہے۔
پرندے کے پر بھی تو جھڑ جایا کرتے ہیں۔

اور اس طویل تشنگی کا بھی خوف نہیں۔
پانی ہمیشہ چٹانوں کی تہہ میں ہوتا ہے۔
تم نے درختوں کی چوٹیاں کاٹ لیں
مگر جڑیں باقی رہ گئیں۔

نزار قبانی۔ ترجمہ/ محمد کاظم

بیروت ۔ خانہ جنگی

آرمرڈ کار ایک کچھوے کی طرح ویران چوک کے عین درمیان میں آرام کر رہی تھی۔ دھاتی بدن میں قریبی کھمبے کی روشنی بجھ رہی تھی۔ تقریباً دس گز کے فاصلے پر ایک ٹیلیفون بُوتھ کا دروازہ کھُلا تھا۔ ایک مسلّح فوجی فون پر جھکا بیٹھی ہوئی آواز میں کسی سے بحث کر رہا تھا... میں فٹ پاتھ سے اُتر کر چوک عبور کرنے لگا... فوجی نے گفتگو ختم کی، بُوتھ سے باہر آنے سے پیشتر ارد گرد کی بلند اور تاریک عمارتوں پر ایک نظر ڈالی اور آرمرڈ کار کی طرف چلنے لگا... ڈز... ایک فائر کی آواز آئی، فوجی ٹھٹکا، میں بھی رُک گیا، ایک اور ڈز ہوا، میری آنکھیں پھیل گئیں اور پھر اُسی لمحے پورا چوک ایک ایسی بھٹی میں بدلا جس میں مکی کے ہزاروں دانے چیخ رہے تھے۔ فوجی فون بُوتھ کی طرف لپکا۔ میں ایک شاپنگ سنٹر کی جانب بھاگا... آرمرڈ کار کے کچھوے کی گردن اُٹھی جو ایک مشین گن کی نالی تھی اور نواحی عمارتوں پر گولیاں تھوکنے لگی۔

وقت: رات کے نو بجے

مقام: ایونیو جنرل فواد شہاب کے قریب ایک چوک

شہر: بیروت

ملک: لبنان

اور میں: مشین گن کے گرم لوہے سے بچنے کے لئے شاپنگ سنٹر کی طرف بھاگتا ہوا۔

آج صبح دس بجے ایک چرب زبان ڈرائیور کی پرانی مگر شرلاٹے بھرتی ہوئی شیورلٹ

ٹیکسی دمشق کے امن سے نکلی۔

راستے میں میلسون آیا، یہاں بے آب و گیاہ پہاڑیوں پر شامیوں نے
کے خلاف ایک فیصلہ کن جنگ لڑی تھی۔ سامنے دہر البدر تھا جس کی چوٹیوں پر
سرحد پر جو ایک بلند پہاڑی پر واقع تھی، لبنان سے نکلنے والوں کا ایک ہجوم تھا اور
اُدھر کو جانے والے کم کم دکھائی دے رہے تھے۔ ان کم کم میں ایک کم میں بھی تھا
ڈرائیور مسافروں کے پاسپورٹ جمع کر کے کسٹم ہاؤس کے اندر چلا گیا اور میں سڑک
سے ہٹ کر ایک خوشبودار پتوں والے درخت کے سائے تلے بیٹھ کر سگریٹ پینے لگا
نشیب میں المصنع نامی لبنانی گاؤں نظر آرہا تھا جس کے سُرخ چھتوں والے گھر
جنوبی اطالیہ کے کسی ساحلی قصبے کے بھی ہو سکتے تھے۔

لبنان، یعنی دُودھ کی طرح سفید، ۱۹۴۳ء سے پیشتر ملک نہ تھا بلکہ بلادِ شام
ایک برف پوش پہاڑ کا نام تھا۔ رقبہ صرف چار ہزار مربع میل کے قریب مگر وجود کا
ذرّہ کئی آفتابوں سے زیادہ چمکتا ہے۔ جہاں عرب صحرا ہے، مصر نیل ہے، عراق
ہے وہاں لبنان پہاڑ ہے اور اس لئے لبنانی اپنے آپ کو اہل الجبل کا نام دیتے ہیں
ایک عرصہ فرانس کے زیرِ نگیں رہا۔ دُوسری جنگِ عظیم کے بعد یہ سفید فام رخصت
اور ۱۹۴۳ء میں لبنان ایک خود مختار ملک کی حیثیت سے وجود میں آیا۔

میں نے لبنان کو دو شخصیتوں کے حوالے سے پہچانا۔۔ بچپن میں خلیل جبران کی
نیم معجزانہ تحریروں میں، صُوفی نوجوان، خوبصورت مگر غریب دہقان دوشیزائیں
جابر زمیندار ایک پُراسرار جنگلوں اور برفانی چوٹیوں والی سرزمین میں ظاہر ہوتے
اور پھر مسجد قرطبہ میں تصویریں اُتارتی نائلہ اسعد نے مجھے اس خطے کے جسمانی خطے
سے آگاہی دی۔ خلیل جبران کا ادب اور نائلہ اسعد کا "فن" میرے لئے لبنان تھے۔
اور اب پہاڑی سے نیچے دیکھتے ہوئے المصنع کا گاؤں اور چاروں طرف پھیلے کی لبنان
مجھے انتہائی مایوس کر رہی تھی۔ تیز دھوپ، جھلستی ہوئی خشک پہاڑیاں اور

مانگنے والا حبس۔
سرحد عبور کرتے ہی ڈرائیور نے شیورلٹ کا انجن بند کر دیا اور ہم خاموشی سے
نشیب میں اُترنے لگے۔ شتورہ کا قصبہ گزرا۔ مکسہ سے پھر چڑھائی شروع ہو گئی۔ صوفر
نام کا ایک پُرفضا گاؤں آیا۔ وادی میں انگوروں کے باغ تھے اور سرسبز ڈھلانوں پر
سیاہ چیڑ کے جنگل پھیلے ہوئے تھے۔ گھروں اور راستوں میں بادل اُتر رہے تھے۔ چیڑ کی
ٹھنڈی باس میں چند گہرے سانس اور شام کے صحراؤں کی گرمی بدن سے رخصت ہونے
لگی۔ یہاں سے ایک راستہ ڈوگ رِور یعنی نہر القلب کی جانب جاتا ہے۔ روایت کے
مطابق اس دریا کے کنارے عہدِ قدیم سے کُتّے کا ایک مجسمہ نصب تھا جو دشمن کی آمد
پر بھونک بھونک کر اہلِ لبنان کو خبردار کر دیا کرتا تھا۔ ۶۳۵ء میں جب امیر معاویہ کے
بھائی یزید کی سرکردگی میں عرب۔۔۔۔ یہاں تک پہنچے تو اُنہوں نے اس نامعقول کُتّے
کو اُکھاڑ کر دریا میں ڈبو دیا۔ ان دنوں بیروت کے عجائب گھر میں رکھا ہے اور بالکل
نہیں بھونکتا۔

صوفر کے آسودہ موسم زیادہ دیر ساتھ نہ دے سکے۔ ٹیکسی ایک خاص بلندی
پر پہنچ کر نیچے اُتری تو لبنان میں سکون کے لمحے ختم ہوئے، نیچے ایک پُرشور شہر کے
آثار رینگتے دکھائی دے رہے تھے۔ شاہراہیں جیسے کاروں اور میکانکی ٹریفک سے
بنی ہوئی تھیں۔ ایک بوڑھے سانپ کی طرح رُک رُک کر حرکت کرتی ہوئیں، جدید
عمارتوں کے ہزاروں مستطیل ڈبّے اور سمندر۔۔۔ ٹیکسی صوریح سکوئر میں جا کر رُک گئی۔
اور وہاں جب ہم خود ٹریفک کے پُرشور بوڑھے سانپ کے جسم کا ایک حصّہ بن کر
رینگنے لگے تو چند جلی ہوئی عمارتوں کے ڈھانچے نظر آئے۔ ایک چوک میں دو آرمرڈ
گاڑیاں کھڑی تھیں اور اُن میں سے جھانکتے ہوئے فوجی فٹ پاتھ پر چلتی لڑکیوں پر
فقرے کس رہے تھے، اُن کی طرف ہوائی بوسے اُچھال رہے تھے۔ ایک گلی کے آگے
ریت کی بوریوں کی دیوار تھی۔ بیری کیڈ پر چند فلسطینی کھڑے تھے جو شناختی کاغذات

چیک کر کے لوگوں کو اندر جانے کی اجازت دے رہے تھے ... ٹیکسی صرف سٹرز پر جا کر رُک گئی۔ ترکی ٹوپی اور سوٹ زیب تن کئے لبنان کے پہلے وزیر اعظم ریاض صلح کا مجسمہ چوک میں ایستادہ تھا۔

شارع الامیر پر واقع خندق معرض الکبیر کا وکٹورین سٹائل ہوٹل کم از کم میرے ایسے نُقرے سیاح کے لئے بے حد پاش اور مہنگا دکھائی دے رہا تھا۔ اندر گیا تو مزید مہنگا دکھائی دیا البتہ جو کرایہ بتایا گیا وہ بیروت کی مناسبت سے انتہائی مناسب تھا۔ کمرہ ڈبل بیڈ کا تھا اور صوبح سکوئر کی جانب کھُلنے والی فرانسیسی کھڑکی چھت سے شروع ہو کر بستر کی پائنتی تک چلی آئی تھی۔ بالکنی پر قدرے پُرخطر انداز میں لٹکنے سے دائیں ہاتھ پر تقریباً ایک کلومیٹر کے فاصلے پر بیروت کی بندرگاہ کا ایک حصّہ بھی دکھائی دے جاتا تھا۔ کمرے کے نیچے ایک بھرا پُرا پُرشور بازار بہتا تھا۔

سنگِ مرمر کے ایک وسیع غسل خانے میں شاور کے بعد میں نے کپڑے تبدیل کئے اور تازگی کی باس میں مہکتا کاؤنٹر پر چابی جمع کروانے چلا گیا۔ جنگلی گھاس ایسے گھنے بالوں اور مضبوط گردن والے منیجر نے چابی بورڈ پر لٹکاتی اور بڑے کاروباری انداز میں بولا "تمہارے پاس چلانے کے لئے کچھ ہے ناں؟"

ایک مسکین سی مسکراہٹ میرے ہونٹوں پر آئی یعنی میں سمجھا نہیں۔

"پستول یا سب مشین گن وغیرہ ..."

میری مسکراہٹ غائب ہو گئی مگر مُنہ کھُل گیا۔

"رات نو بجے سے پہلے واپس آجانا اور سونے سے پیشتر دروازہ مقفل کرنا نہ بھولنا ... اسی اپریل کی بات ہے، بدبخت فلانجیوں نے ہوٹل میں گھُس کر چند مہمانوں کو ہلاک کر ڈالا تھا ..."

"میرا مُنہ بند ہوا اور دہشت زدہ آنکھیں کھُل گئیں۔ "اسی ہوٹل میں؟"

"ہاں" وہ آرام سے بولا "ہم فلسطینی ہیں اور فلانجیوں کو شک رہتا ہے کہ یہاں تنظیم آزادی فلسطین کے لوگ آتے جاتے رہتے ہیں ..."

"اور آتے جاتے رہتے ہیں؟"

"تم واحد غیر فلسطینی ہو ..." وہ دبے ہونٹوں مسکرایا۔

میں نے فی الفور طے کر لیا کہ اگلی صبح اس مورچے کو چھوڑ کر کسی ہوٹل میں چلا جاؤں گا ... "آپ کا ہوٹل قدرے پُرخطر سہی مگر بے حد آرام دہ اور مناسب کرائے کا ہے۔"

"صرف آپ کے لئے ورنہ ہمارا کرایہ اس سے دوگنا ہے ... تم برادر ہو السیدی حسین۔ میں نے سوچا انجانے میں کسی فلانجی ہوٹل میں چلے گئے تو ..." فون کی گھنٹی بلند ہوئی تو اُس نے نقرہ ادھورا چھوڑ کر چونگا اُٹھا لیا۔

بیروت ایسے بین الاقوامی چمکتے ہوئے شہر میں آوارہ گردی کا شوق منیجر کی مار دھاڑ سے بھرپور گفتگو سُننے کے بعد پھوار میں بھیگی ہوئی پتنگ کی طرح ڈھیلا پڑ گیا۔ منظر ڈیئر نے گولان جاتے ہوئے درست کہا تھا، بیروت میں حالات خراب ہیں۔

فون سے فارغ ہو کر اُس نے میرے چہرے پر برستی بے چارگی سے متاثر ہو کر نہایت شفیق لہجہ اختیار کر لیا "فکر کی کوئی بات نہیں السیدی، اگر وہ آئے تو اتنے ہی واپس نہیں جائیں گے ... بہرحال اس وقت کہاں جا رہے ہو؟"

"یونہی گھومنے کا ارادہ تھا، آپ کہتے ہیں تو نہیں جاتا۔"

"نہیں، حالات اتنے بھی خراب نہیں ... ہوٹل کے سامنے ہی سروس گیراج ہے جہاں سے تمہیں الحمرا کے لئے ٹیکسی مل جائے گی، روشے یعنی ساحل بھی قریب ہی ہے ... لیکن نو بجے سے پہلے ہر صورت واپس پہنچ جانا ..."

میں ہوٹل سے نکلا تو شارع الامیر باشیر کی گہما گہمی اور پُر رونق چہروں نے فلسطینی منیجر کی تمام گفتگو میرے ذہن سے زائل کر دی۔

زیرِ زمین گیراج میں پانچ چھ ٹیکسیاں ایک قطار میں کھڑی تھیں۔ میں پہلی ٹیکسی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ "الحمرا۔"

ڈرائیور نے سر کے اشارے سے اگلی ٹیکسی میں بیٹھنے کو کہا۔

اگلی ٹیکسی کا دروازہ کھولنے کو تھا کہ اُس کے ڈرائیور نے عربی میں تندرو درشت الفاظ استعمال کیئے اور پھر مجھے غیر ملکی پہچان کر نرم لہجے میں کہنے لگا: "سب سے اگلی ٹیکسی پہلے چلے گی، اُس میں بیٹھو۔"

سب سے اگلی ٹیکسی میں چار مسافر بیٹھ چکے تھے۔ پانچویں کی آمد کے ساتھ ہر ایک سے تیس قرش وصول کیئے گئے اور مرسیڈس ٹیکسی گیراج کی نیم تاریکی سے نکلی اور بیروت کے پُرشور سمندر میں ایک شارک کی طرح تیرنے لگی۔ شارک اس لئے کہ ڈرائیور کی بیباک ڈرائیونگ کی وجہ سے باقی ٹریفک ہم سے دُور دُور رہنے میں عافیت جان رہی تھی۔ اُس نے ڈیش بورڈ پر سے ایک کیسٹ اٹھا کر پلیئر میں ڈالی اور آواز بلند کر دی۔ سارنگیوں کی ایک وجد آور اُٹھان سے آغاز ہُوا اور پھر ڈھولک پر تھاپ پڑی۔ تھاپ کی اس دھمک پر میرے برابر میں نیم خوابیدہ ایک عمر رسیدہ عرب کا سر ایک جھٹکے سے سیدھا ہُوا۔ آنکھیں مُردہ مچھلی کی طرح کھُل گئیں اور ڈرائیور کے کندھے پر شاباش کی تھپکی دے کر پوچھا۔ "اُمِ کلثوم، بالبک فیسٹیول..."

اور پھر یہ صاحب سر جھکا کر ڈھولکی کی تھاپوں کا ساتھ دینے لگے۔ تعارف کے بعد جب اُمِ کلثوم کی گہری آواز نمودار ہوئی تو وہ بالکل ہی ساکت ہو گئے۔ ایک جب تان اُٹھتی ہی چلی گئی تو میں نے ذرا سوشل ہونے کی کوشش کی۔ "اپنے عطاءاللہ بخاری نے فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اُمِ کلثوم کے بدن میں پھیپھڑوں کی بجائے ہوا سے بھرے ہوئے مشکیزے لگا دیئے ہیں۔" اُن صاحب نے سر اُٹھا کر مجھے غور سے دیکھا اور پھر منجمد ہو گئے۔

آخری سٹاپ الحمرا سٹریٹ تھا۔ ٹیکسی میں اب صرف دو مسافر تھے۔ ایک موسیقی میں فنا شدہ وہ لبنانی حضرت۔

"حمرا۔" ڈرائیور اس طرح دھاڑا کہ اب اُترو گے بھی یا نہیں۔

وہ حضرت بھی باقاعدہ خفا ہو گئے۔ "اُمِ کلثوم گا رہی ہو اور میں چھوڑ کر چلا جاؤں... کُفر، کُفر..."

ڈرائیور یکدم شرمندہ ہو کر سمٹ سا گیا اور عاجزی سے کہنے لگا۔ "معاف کیجئے گا خیال ہی نہیں رہا... لیکن مجھے دراصل اب شہر واپس جانا ہے..."

"تو مجھے بھی واپس لے چلو..." اُن صاحب نے ڈانٹ پلائی۔

"جی بہت بہتر۔" ڈرائیور نے سر جھکا لیا۔

میں عربوں کے خون میں شامل اُمِ کلثوم کے سحر کا قائل ہُوا اور مسکراتا ہُوا ٹیکسی سے اُتر گیا۔

"الحمرا" جسے پیار سے "حمرا" کہا جاتا ہے، بیروت کی شانزے لیزے ہے۔ ایک مکمل یورپی سٹریٹ جہاں قہوہ خانوں کے قالین فٹ پاتھ تک چلے آتے ہیں۔ پیرس میں ڈیزائن شدہ ملبوسات اُسی قیمت پر دستیاب ہوتے ہیں۔ مرسیڈس کو بطور گدھا گاڑی استعمال کیا جاتا ہے اور تازہ ترین ماڈلز کی سپورٹس کاروں کے ٹائروں کی چیخیں ہر لحہ دل دہلاتی ہیں کہ بس حادثہ ہُوا کہ ہُوا مگر ہوتا نہیں، بس کان بریکوں کی جھنگھاڑ سُنتے ہوئے منتظر رہتے ہیں۔ فٹ پاتھی قہوہ خانوں میں براجمان پبلک انگوروں کی قدیم شراب سِپ کرتے ہوئے اِکا دُکا فائر کی آواز یا کبھی کبھار کے دھماکے کو بظاہر نظر انداز کرتے دکھائی دیتی ہے۔ اُس وقت بیروتی خواتین کا تازہ ترین فیشن کریز "سی تھرو بلاؤز" یا بالائی حجم کو ڈھکنے کے لئے جو بھی لباس استعمال کیا جاتا ہے، اُن دنوں ڈھکنے کے لئے استعمال نہیں ہوتا تھا۔ یہ لباس اتنا باریک تھا کہ ڈھاکہ کی ململ بنانے والے کاریگر اگر دیکھ لیتے تو فی الفور خودکشی کر لیتے کہ وہ تو انگوٹھی میں سے تھان گزارتے تھے اور یہاں دو دو تھان چار چار گرہ میں یوں بندھے چلے آتے تھے کہ کپڑے کا رنگ کچھ بھی ہو گلابی ہی نظر آتا تھا۔ مجھ ایسا اناڑی فٹ پاتھ پر چلتے چلتے سامنے سے آتی نیک بی بی کو دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ "پلے بوائے" رسالے کو درمیانی کیلنڈر صرف سکرٹ پہنے چلا آ رہا ہے۔ جو مال اچھا ہے اُسے واجبی طور پر

الگ باندھ کے رکھا تو گیا ہے مگر اس طرح کہ مال کی کوالٹی صاف دکھائی دے رہی پہاڑوں میں ہلکی بارش کے دھوئیں کے پیچھے مناظرِ قدرت اگرچہ قدرے دھندلے تو نظر آتے تھے مگر کوہ پیما نظروں کو بلندیوں کا اندازہ بخوبی ہو جاتا...

میں غریب ملک کا باسی امارت کے ان مظاہر سے مرعوب ہوتا فٹ پاتھ پر چل رہا تھا کہ تقریباً دس گز کے فاصلے پر ایک اسی نوعیت کی بی بی آتی ہوئی دکھائی دی۔ اُس کا چہرہ بھی خوبصورت تھا۔ اُسی لمحے ایک سپر سٹور میں سے ایک لبنانی صاحب شاپنگ کے بنڈل اُٹھائے باہر نکلے۔ اُن کی پُشت میری طرف تھی۔ اُنہوں نے خاتون کو آتے دیکھا، فوراً اپنے بنڈل نظریں ہٹائے بغیر نیچے رکھے اور ایک ہاتھ بلند کر دیا۔ اس دوران میں اُن کے قریب پہنچ گیا۔ اُنہوں نے میری طرف دیکھا نہیں، دھیان اُدھر ہی رہا اور ہاتھ میرے کندھے پر رکھ کر بزبانِ عربی کوئی قصیدہ پڑھنے لگے۔ وہ باحیا خاتون ہمارے قریب سے گزریں تو صاحب اپنے پاؤں پر آہستہ آہستہ گھومتے اُس کا عقبی نظارہ کرنے لگے۔ مجھے بھی اُن کے ساتھ گھوم کر اپنا زاویۂ نظر درست کرنا پڑا۔

وہ ایک رُومانی سرشاری کے عالم میں بے تکان بولتے چلے گئے۔

"مجھے افسوس ہے کہ میں بالکل نہیں سمجھ رہا۔" میں نے مُسکرا کر انگریزی میں کہا۔

اُنہوں نے میری طرف دیکھا نہیں، ہجوم میں گم ہوتی خاتون کی طرف اشارہ کر کے بولے۔ "کیا تم یہ بھی نہیں سمجھتے؟" اور اپنے بنڈل اُٹھا کر اُسی کیفیت میں مست چلے گئے۔

الحمرا میں نصف سے زیادہ عمارتیں بین الاقوامی بینکوں کی ملکیت ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق ان کے مالی ذخائر دس کھرب ڈالر سے تجاوز کر چکے تھے مگر خانہ جنگی کی حدت سے ان میں تیزی سے کمی آنے لگی۔ لبنانی بینکر یوسف بیداس نے درست کہا تھا کہ زر دُنیا کی بزدل ترین چیز ہے۔ گڑبڑ کے پیشِ نظر سیاحوں کی آمد بھی تقریباً معطل ہو چکی تھی۔ جو لوگ دُنیا میں کہیں بھی آتے جاتے، بیروت میں قیام کر کے کیسینو ڈی لبنان میں جوا کھیلنا اور کھل کھیلنا اپنا فرض سمجھتے تھے، اب اپنی ٹکٹوں پر بیروت کا سٹاپ

دیکھ کر سراسیمہ ہو جاتے تھے۔ اخبار میں کارٹون چھپا کہ ویران سرحد پر ایک لبنانی ہاتھ اُٹھائے دُعا مانگ رہا ہے۔ "یا اللہ اور کچھ نہ دے ٹورسٹ دے۔" بہرحال خانہ جنگی کے آثار کے باوجود اگر بیروت کی رونقیں اتنی شدید اور سی تھرو تھیں تو جانے امن و امان کے دنوں میں کیا سلسلے ہوتے ہوں گے۔

میں ایک فرانسیسی ٹوبکور کے قہوہ خانے کے قریب ہوا تو باہر کھڑا ویٹر جماہی روک کر مسکرا دیا۔ میں نے ایک [illegible] پوچھی جو [illegible] موجودہ دس کھرب ڈالر سے قدرے کم تھی یعنی چار ڈالر۔ مینو پر سستا ترین مشروب ساڑھے تین ڈالر کا تھا جو میں نے آرڈر کیا اور فٹ پاتھ پر کھلی کرسی میں دراز ہو گیا۔ ویٹر مشروب لایا تو ساتھ میں ایک موٹا تازہ چکن سینڈوچ بھی تھا۔ "میری طرف سے"۔ اُس نے بڑی آزادی سے میرا کندھا تھپکا جیسے کہہ رہا ہو کہ لو بچہ عیش کرو اور ویسے بھی یہ کہاں فروخت ہونا تھا۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور "حمرا" کی تعریف کی۔

"حمرا نہیں حمرا کہو"۔ وہ بولا

"حمرا..."

"نہیں جس طرح تم کہہ رہے ہو اس حمرا کا مطلب ہوتا ہے سُرخ بالوں والی طوائف۔ حمرا نہیں حمرا..." وہ کچھ کچھ حلق سے برآمد کر رہا تھا۔

میں نے دو چار مرتبہ اُسی طور کہنے کی کوشش کی مگر وہ بدستور سر ہلاتا رہا۔

"چلئے سُرخ بالوں والی طوائف ہی سہی، مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔" میں نے تنگ آ کر کہا اور سینڈوچ کی طرف رجوع کیا۔

سوائے اُن لمحوں کے جب فٹ پاتھ پر سے گزرتی کوئی سی تھرو خاتون میری توجہ کے پُرسکون پانیوں میں دو مرغابیاں چھوڑ دیتی، میں آئندہ سفر کی منصوبہ بندی کرتا رہا... بیروت میں حالات فی الحال اتنے تو خراب نہیں مگر طویل قیام شاید زندگی کے لئے مُضر ثابت ہو، اس لئے پانچ روز۔ پھر کسی ایسے بحری جہاز کی تلاش جو مجھے عرشے کے

کسی کونے میں بیٹھنے دے اور سکندریہ پہنچا دے ۔ اہرامِ مصر اور ابوسنبل کی رفا میں چار ہفتے ... پھر وہاں سے یونان ... جزیرے اور دیو مالا ... یک تخت پرسکون روانی میں ایک مشینی انداز کی ٹک ٹک ٹک کی پرخطر آواز سنائی دی۔ لوگوں کے کان کھڑے ہو گئے ۔ ایک دکان کا شٹر زور سے بند ہوا ، کاروں کی رفتار تیز ہو گئی ... دراصل یہ ایک بھٹے فروخت کرنے والا تھا جس نے گاہکوں کو متوجہ کرنے کے لئے اپنا چمٹا مختلف انداز میں بجا دیا تھا ۔ لوگوں کی سراسیمگی دیکھ کر اس نے شرمندگی سے ایک مرتبہ پھر یہی عمل دہرایا جیسے بتانا چاہتا ہو کہ بھئی مشین گن نہیں چلی، میرا چمٹا ہے پھر بھی پبلک کی تسلی نہ ہوئی اور بھٹے والے سے گذارش کی گئی کہ آئندہ بے دھیانی میں اس انداز سے چمٹا نہ بجانا، تیرے بچے جئیں۔ فٹ پاتھ کی رونق ختم ہو گئی ۔ چند دکانیں بھی بند ہو گئیں ۔ کیا پتہ اگلی ٹک ٹک مشین گن کی ہی ہو ۔ میں بھی خواہ مخواہ خوفزدہ ہو گیا اور بل ادا کر کے سمندر کی جانب اترنے لگا ۔ چھ بج چکے تھے ۔

روشے ، سفید چٹانوں میں روشن ایک ایسا ساحل جو سمندر سے بلند ہے اور سینکڑوں طویل قامت ہوٹل دیو ہیکل مجسموں کی طرح اس پر جھکے ہوئے ہیں ۔

سیاحوں کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اہلِ بیروت بال بچوں سمیت سا سڑک ایونیو ڈیگال پر سیر کر رہے تھے ۔ بھٹے فروخت کرنے والے یہاں بھی موجود تھے مگر اپنے چمٹوں کو شریفانہ انداز میں بجاتے ہوئے اور ہر آنے جانے والے کو دیکھ کر "دُرع مشوی" کی صدا دیتے ہوئے سفید ٹوپیوں والے آبنوسی سوڈانی "فستق فستق" پکا رہے تھے جیسے میں نے بھی خریدا، مونگ پھلی تھی ۔ روشے کے درمیان میں پہنچ کر د مشہورِ زمانہ سفید چٹانیں نظر آئیں جو نیلے سمندر میں دیو زاد کبوتروں کی طرح بیٹھی ہو ہیں ۔ ایک موٹر بوٹ ان کے گرد چکر لگاتی ہوئی کسی نامعلوم راستے سے اندر گئی اور دوسری جانب سے جھاگ اڑاتی ہوئی نکل گئی ۔ بیروت میں خودکشی کرنے والوں ک یہ محبوب چٹان ہے ۔ ایک اردنی نوجوان نے جب ان پگن راکس سے کود کر فنا ہونے

کی کوشش کی تو سمندر میں گرنے کے بعد مزے سے تیرتا ہوا ساحل پر آ گیا ۔ پوچھا گیا کہ ڈوبے کیوں نہیں ؟ کہنے لگا "میں اتنا اچھا تیراک ہوں کہ لاشعوری طور پر ہی تیرتا رہا ورنہ کون بدبخت جینا چاہتا ہے ۔" سوال ہوا کہ آخر آپ نے خودکشی کے لئے پگن راکس کو ہی کیوں چنا ؟ اس نے جواب دیا کہ اتنی بلندی سے سمندر ایک ہرے جنگل کی طرح دکھائی دیتا ہے ۔ ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند ہونے سے پہلے اس سے زیادہ خوبصورت منظر دیکھنے کو اور کہیں نہیں ملتا ۔

روشے کے فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے جب میں ساحلی سڑک کے اختتام پر پہنچا تو بتدریج گہری ہوتی ہوئی شام میں دو آرمرڈ کاریں سڑک کے درمیان میں کھڑی نظر آئیں ۔ ان کے سوراخوں میں سے مشین گنوں کی تھوتھنیاں جھانک رہی تھیں ۔ . اور اسی لمحے مجھے احساس ہوا کہ روشے کی رونق ایک سراب ہے جو صرف میری آنکھیں دیکھتی ہیں ورنہ اس پر چہل قدمی کرتے اہلِ بیروت اپنے اندر آرمرڈ کاروں کی سیاہ شبیہیں لئے پھرتے ہیں ... انہیں معلوم ہے کہ کھیل شروع ہونے کو ہے ۔ وہ اپنے اپنے پتے سنبھالے انتظار کر رہے ہیں ، کس کے ہاتھ میں بادشاہ ہے ، کس کے ہاتھ میں جوکر ہے ، کوئی نہیں جانتا ۔ کھیل شروع ہو گا تو پتہ چلے گا ۔ بازی جان کی ہو گی ، سب انتظار میں ہیں ۔

میں واپس آ رہا تھا تو پگن راکس کے قریب پھولوں سے لدی کاروں کا ایک قافلہ ہارن بجاتا گزر گیا ۔ کھلی کاروں میں ایک بارات تھی ۔ اگلی کار میں دولہا اور دلہن شادی کے لباس میں ایک دوسرے کے گالوں پر بوسے دیتے ہوئے ، راہ گیروں کو ہاتھ ہلاتے ہوئے ۔ بقیہ کاروں میں دوست اور اہلِ خاندان خوشی سے جنگلی ہو رہے تھے اور نشستوں پر اچھل رہے تھے ۔ ان کی دیکھا دیکھی قریب سے گزرتی کاروں نے بھی ہارن بجانے شروع کر دیئے ۔ اور روشے پر عارضی مسرت کا ایک شور برپا ہو گیا ۔

اس قافلے نے ساحلی سڑک کا ایک چکر لگایا اور پھر چیختی بریکوں سے درمیان میں سبز گھاس کے قطعے میں کھڑا ہو گیا ۔ باراتی کودتے ہوئے کاروں سے باہر نکل آئے ۔

ایک نوجوان نے ڈھولکی گھٹنے پر جمائی اور تھاپ دینے لگا۔ ایک قبر رسیدہ قسم کے بزرگ نے بیلی ڈانس شروع کر دیا۔ اگرچہ اُن کا تھل تھل کرتا جسم اس پھرتیلے رقص کے لئے قدرے نامناسب تھا مگر موصوف کو موسیقی کی دھمک کا اتنا شعور تھا کہ اُن کے گرد جمع تماشائیوں نے بے اختیار نوٹ نچھاور کرنے شروع کر دیئے۔ تمام باراتی جو یقیناً کچھ مخمور بھی تھے، تالیاں بجا رہے تھے اور گا رہے تھے۔ ایک صاحب پاس سے گزرے، ہنگامہ دیکھ کر رہ نہ سکے، کار سے اُترے، تھوڑا سا مٹک کر پھر کار میں بیٹھے اور چلے گئے۔ دُولہا اور دُلہن بچّوں ایسی بے پروا مسرت سے تک رہے تھے۔

ڈھولکی بجانے والے نوجوان نے رقص کرتے بزرگ کو تنگ کرنے کے لئے تھاپ آہستہ آہستہ تیز کرنی شروع کر دی۔ بزرگ بھی صاحبِ کمال تھے ساتھ دیتے گئے مگر جب تھاپ اتنی تیز ہوئی کہ ڈھولکی پر پڑتا ہاتھ ایک واہمہ لگنے لگا تو انہوں نے عربی میں ایک زوردار نعرہ لگایا جس کے جواب میں تمام باراتی اور تماشائی رقص میں شامل ہو کر بھنگڑا ڈالنے لگے... ان رقص کرنے والوں میں کون فلانجی تھا اور کون فلسطینی، یہ جاننا ناممکن تھا کیونکہ دونوں ہی ماشاءاللہ اور سبحان اللہ کے نعرے لگا رہے تھے لیکن اندر ہی اندر وہ سب ناچتے ہوئے بھی، موسیقی کے آگے خود سپردگی کے باوجود، ڈھولکی کی تالِ پر سر ہلاتے ہوئے بھی انتظار میں تھے۔ وہ اپنے پتّے سنبھالے انتظار میں تھے۔ کس کے ہاتھ میں بادشاہ ہے اور کس کے ہاتھ میں جوکر... کوئی نہیں جانتا...

گھری شام رات میں بدل چکی تھی اور ڈھولک بجانے والا بُری طرح نڈھال ہو چکا تو وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ دُولہا دُلہن خاموشی سے کار سٹارٹ کر کے چلے گئے۔ باراتی بھی اپنی کاروں میں سوار ہوئے اور چلے گئے۔ اب ہر طرف تھمی ہوئی خاموشی تھی۔ [illegible] اِکّا دُکّا روشنیاں تھیں، لوگ نہیں تھے۔ اگر تھے تو عمارتوں کی کھڑکیوں میں سے جھانک رہے تھے۔ نو بج چکے تھے، میں اگر واپس حمرا جاتا تو مزید تاخیر کا امکان تھا اس لئے میں نے بیروت شہر کا نقشہ دیکھا... یہ ساحل ہے، یہاں سے مجھے رُو میڈم کیوری کی طرف

جانا ہوگا اور وہاں سے ایونیو جنرل فواد شہاب کی جانب.. صوبلح سکوئر اُس کے آخر میں تھا۔

آرمڈ کار ایک کچھوے کی طرح ویران چوک میں... دھاتی بدن پر قریبی کھمبے کی روشنی... ڈز... ایک فائر... ایک اور ڈز... چوک میں مکّی کے ہزاروں دانے چیخ رہے تھے... مشین گن نواحی عمارتوں پر گولیاں تھوک رہی تھی... اور میں اپنی پوری قوت سے شاپنگ سنٹر کی طرف بھاگتا ہوا... چوک کی پتھریلی سطح پر شرارے پھوٹ رہے تھے اور عمارتوں کے شیشے چُور ہو کر فٹ پاتھ پر برس رہے تھے۔ شاپنگ سنٹر کے برآمدے میں گھُستے ہی میں نے اپنے آپ کو ایک شوکیس کے پیچھے چھُپانے کی کوشش کی... ہوا میں شاید آکسیجن ختم ہو چکی تھی۔ پسینے سے بھیگا چہرہ اور منہ کھُلا ہُوا، بدن میں ایک بے اختیار کپکپاہٹ... ایسے لمحوں میں انسان سوچتا ہے کہ آخر میں یہاں کیا کر رہا ہوں... میری موجودگی جو فوتیدگی میں بھی بدل سکتی ہے، کا مقصد کیا ہے... گھر کے بستر کی سفید پُرامن چادر یاد آتی ہے... میں کنوئیں کا مینڈک تھا، کولہو کا بیل تھا، ایک ہی مقام پر روٹین کے دائروں میں گھومتا، کتنی محفوظ اور خوبصورت زندگی تھی... اور اب اگر اس پناہ گاہ پر، شوکیس پر اگر ایک گولی بھی آ لگے تو اس کا شیشہ کرچی کرچی ہو کر گرے گا اور مجھے ننگا کر دے گا.. لیکن ایسے لمحوں میں انسان سوچتا نہیں، صرف اپنے آپ کو کوستا ہے، لعن طعن کرتا ہے کہ تم یہاں کیا لینے آئے تھے، گھر کی عافیت سے کیوں نکلے؟

تقریباً دو منٹ بعد چوک کی سطح جہاں شرارے پھوٹتے تھے حسبِ سابق تاریک ہو گئی۔ باہر سے آنے والا فائر ختم ہو چکا تھا۔ صرف آرمڈ کار کی مشین گن وقفوں سے اِدھر اُدھر برسٹ چلا دیتی... میں شوکیس کے پیچھے دُبکا دیکھتا رہا... بالآخر مشین گن بھی خاموش ہو گئی اور اُٹھی ہوئی نالی نیچے ہونے لگی۔ تھوڑی دیر بعد فون بوتھ میں

چھپا فوجی باہر نکلا، اُنگلی لبلبی پر جمائے، سب مشین گن کو ران پر دبائے اُس نے عمار
کے اُس مجموعے کی طرف نگاہ کی جن میں پوشیدہ کسی سنائپر نے اُنہیں پریشان کیا تھا۔
نے چوک کے درمیان میں آکر شاپنگ سنٹر کے برآمدے کو دیکھا اور پھر ایک لمحے کے
کے بعد آہستہ آہستہ میرے شوکیس کی طرف بڑھنے لگا۔ سب مشین گن کی تھوتھی میرے
قریب آرہی تھی۔ میرے پیٹ کے قریب... اُس نے یقیناً مجھے چوک میں سے بھاگ کر
شوکیس کے پیچھے غائب ہوتے دیکھ لیا تھا اور اب وہ میری طرف آرہا تھا، یقیناً اُس
کے ذہن میں شکوک تھے۔

میرا رنگ اگرچہ گندمی تھا مگر تاریکی میں کیا پتہ چلتا ہے اور میں نے ایک سفید جیکٹ
پہن رکھی تھی جو عام طور پر فلسطینی گوریلے پہنتے ہیں... اگر میں وہیں چھپا رہتا تو شاید
برآمدے میں داخل ہونے سے پہلے ایک برسٹ چلاتا اور پھر سوال پوچھتا، اور اگر
اپنے آپ کو ظاہر کر دوں تو بھی ہو سکتا ہے، وہ سراسیمہ ہو کر گولی چلا دے... ٹو بی
ناٹ ٹو بی... میں نے جیکٹ میں سے پاسپورٹ نکالا اور دونوں ہاتھ جتنے بلند
سکتے تھے اُتنے کر کے آہستہ آہستہ باہر آگیا... تاریکی میں سے نمودار ہوتی میری
جیکٹ کو دیکھ کر وہ ٹھٹکا اور کھڑا ہو گیا۔

"پاکستانی۔ پاکستانی"۔ میرے سوکھے حلق نے بمشکل ادائیگی کی۔

اُس نے خالی ہاتھ سے مجھے مزید آگے آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے قریب پہنچتے ہی
ہاتھ نیچے کر کے پاسپورٹ آگے کر دیا۔ اُس نے پاسپورٹ پر اُچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی اور میرے
چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے ایک گہرا سانس لیا اور مُنہ موڑ کر آرمرڈ کار کی طرف چلا گیا۔

فندق المعرض الکبیر کے بڑے چوبی دروازے کی چوکھٹ پار کرتے ہی مجھے یوں لگا
جیسے میں اژدہوں، جادوگروں اور بلاؤں کے جنگل سے بھاگ کر پناہ کے اُس قلعے میں داخل
ہو گیا ہوں جہاں ایک زرد شہزادی اپنی لامبی باہوں میں سمیٹ کر مجھے اپنے
میں جذب کرتے ہوئے کہے گی "تم گھر آگئے ہو۔"

بیروت ۔ واپسی کا دن

بھٹی گرم ہے۔
درانتی کا نصف چاند گرم ریت کو سمیٹتا ہوا پلٹتا ہے۔
مکئی کے دانے سُرخ ہو چکے ہیں۔
پہلے ایک دانے کی سُرخ جلد پھُوٹ کر سفید پھُول میں بدلے گی تڑاخ!
پھر دو تین دانے بھٹی میں سے اُچھلیں گے تڑاخ تڑاخ!
بدن اگرچہ منتظر ہوتا ہے مگر اولین پٹاخوں سے چونک کر کپکپاتا ہے۔
پھر ٹین کی چھت پر پڑتے اولوں کی طرح بے شمار دانے بھٹی میں اُچھلتے ہیں،
پھٹتے ہیں۔ اب بدن کپکپاتا نہیں، اسے عادت ہو چکی ہے۔
دانے پھُوٹ رہے ہیں، تڑاخ تڑاخ... ڈز، ڈز... گولیاں چل رہی ہیں۔
آرمرڈ کار میرے شیشے کے شوکیس کی طرف رینگتی ہوئی آرہی ہے اور اس کی مشین گن
کی نال مجھے سُونگھ رہی ہے... میں نے آنکھیں کھول دیں۔

میرا ایک کان جو تکیے میں دھنسا ہے، سماعت سے محروم ہے اور دوسرا کمرے
کی فضا میں ایک حساتی آلے کی طرح سُن رہا ہے... میں سیدھا ہو گیا۔ میرے دونوں
کانوں نے فائرنگ کی آواز سُنی، کہیں قریب ہی، شاید شیشے کی کھڑکی کے عین نیچے بازار
میں... میں نے وقت دیکھا، چار بج رہے تھے۔

دوسرے بستر پر نصر اطمینان سے سو رہا تھا۔ وہ پچھلی شب گیارہ بجے کے قریب

بہت دیر تک میرے مقفّل دروازے پر دستک دیتا رہا مگر میں نے منیجر کی ہدایت پر
کرتے ہوئے دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا۔ پھر منیجر کی ہی آواز آئی "السیدی حسین
نصر ہمارے دوست ہیں، ابھی پہنچے ہیں۔ ایک رات قیام کریں گے۔ دروازہ کھولئے"

نصر ایک چپ چاپ اور حزن آمیز فلسطینی تھا جو اسرائیل میں رہتا تھا اور
حکومت سے خصوصی اجازت نامہ حاصل کر کے چند روز کے لئے اپنے رشتہ داروں سے
ملنے بیروت آیا تھا۔

"نصر..." میں نے اُسے پکارا۔

وہ فوراً اُٹھ کر بیٹھ گیا جیسے جھوٹ موٹ سو رہا تھا، صرف میری آواز کا منتظر
تھا۔ "کیا ہے؟"

"باہر فائرنگ ہو رہی ہے۔"

اُس نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر جھانکا اور مسکرا دیا۔ "اِدھر آؤ۔"

میں قدرے تامّل سے اُٹھا اور اُس کے جسم کی آڑ لے کر نیچے دیکھا... درمیانی عمر
کا ایک لبنانی ران پر سب مشین گن جمائے قہقہے لگا رہا تھا اور اس کے گرد بازار سنسان
پڑا تھا۔ پھر اُس نے نشانہ لئے بغیر ایک اور برسٹ چلا دیا جو کسی عمارت کی کھڑکی پر
لگا۔ شیشے ٹوٹنے کی آواز آئی اور وہ پھر ہنستے ہنستے نڈھال ہو گیا۔

"تم کھڑکی سے ہٹ جاؤ۔ ہو سکتا ہے اگلا برسٹ اِدھر کو آ جائے۔"

"میں اس کی نالی پر نگاہ رکھے ہوئے ہوں۔ مجھے معلوم ہو جائے گا۔" نصر مسکرا
رہا تھا جیسے کوئی بہت ہی مزاحیہ فلم دیکھ رہا ہو۔

"یہ فلانجی ہے یا فلسطینی؟" میں نے بستر میں گھستے ہوئے پوچھا۔

"پتہ نہیں۔ ویسے بے ضرر لگتا ہے۔ یونہی تفریح کے لئے فائرنگ کر رہا ہے۔"

ایک اور برسٹ چلا اور ہماری کھڑکی کا شیشہ کورے کاغذ کی طرح کھڑکھڑا
پھر ایک بھرپور قہقہہ سنائی دیا۔

"اور اگر اس... تفریح کے دوران کسی کو گولی لگ گئی تو؟"

نصر نے میری طرف دیکھے بغیر کندھے اُچکائے۔ "کیا فرق پڑتا ہے۔"

دنوں کے ساتھ مزید چار برسٹ اور چار زوردار قہقہے... نصر کھڑکی سے
ہٹ کر اپنے بستر پر بیٹھ گیا۔ "چلا گیا ہے۔" اُس نے سوٹ کیس میں سے سگرٹوں کا
پیکٹ نکالا۔ "پیو گے؟"

میں نے شکریے کے ساتھ ایک سگرٹ سلگا لیا۔ "تلخ ہے۔"

"اسرائیلی سگرٹ ہے۔"

"اسرائیل کیسا ہے نصر؟"

"میں تو اپنے گھر میں رہتا ہوں، اپنے گاؤں میں، جو فلسطین کا ایک گاؤں ہے۔"

...اُس کے چہرے پر اپنے وطن میں رہنے والوں کا سکون نہ تھا۔ جلاوطنوں کا ملال تھا۔
"اسرائیل ہمارے چاروں طرف موجود ہے، قید خانے کی سلاخوں کی طرح... کچھ فلسطینی
ہمیں شک کی نظروں سے دیکھتے ہیں کہ ہم اسرائیل میں رہتے ہیں، اسرائیلی کاغذات پر سفر
کرتے ہیں۔ ہم ذلت کے باوجود اپنے گھروں میں دبکے بیٹھے ہیں، وطن نہیں چھوڑا...
تم ہی بتاؤ حسین کہ اگر تمام فلسطینی اسرائیل چھوڑ دیں تو کیا یہودیوں کے لئے یہ خوشی کی
بات نہ ہوگی؟ ہم جب تک وہاں موجود ہیں اس زمین کے دعویدار ہیں۔ کمزور ہی سہی،
ہم اپنا دعوےٰ قائم رکھے ہوئے ہیں..."

میں نے اُسے پچھلی شب کی واردات سنائی تو اُس نے کم عمری کے باوجود مجھے
بہت بزرگانہ نگاہ سے نوازا۔ "اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو آرام سے اپنے راستے پر
چلتا رہتا۔ ایک دم بھاگ اُٹھنا زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ بہرحال تمہیں عادت ہو جائے گی۔"

"میں اپنی بُری عادتوں میں اضافہ نہیں کرنا چاہتا... میں جلد از جلد بیروت چھوڑ
جانا چاہتا ہوں... پردیس میں مرنا ایک حماقت ہے۔"

"ہم فلسطینی تو ہمیشہ پردیس میں ہی مرتے ہیں..."

"آپ مجھے غلط نہ سمجھئے۔" میں نے قدرے شرمندگی سے کہا "میں صرف اپنی بات کر رہا ہوں۔ آپ تو اپنے کھوتے ہوئے وطن کے لئے جان دیتے ہیں... دنیا کے تمام مسلمان ملک آپ کے ساتھ ہیں، خاص طور پر عرب ملک..."

اُس نے اسرائیلی سگرٹ کا ایک طویل کش کھینچ کر تلخی کا دھواں حلق سے اُتارا اور وہ مسکرا دیا "پھر اردن، شام، مصر اور لبنان میں فلسطینیوں کو کیوں قتل کیا جاتا ہے... ہم عرب ملکوں سے بھیک نہیں لیتے۔ فلسطینی پوری عرب دنیا میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ اور ذہین ہیں۔ عرب ممالک میں کام کرنے والے فلسطینی ڈاکٹر، انجینیئر، بینکار اور دیگر ماہرین اگر ہاتھ کھینچ لیں تو ان کی معیشت شب بھر میں تباہ ہو سکتی ہے... ہم بھیک نہیں لیتے۔"

نصر اپنے اور اپنی قوم کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتا تھا اور میں ایک ہمدرد اور جاننے کی خواہش رکھنے والا سامع تھا۔ وہ اسرائیلی سگرٹ پھونکتا رہا اور باتیں کرتا رہا۔

۱۹۶۲ء میں صدر جمال ناصر کی کوششوں سے بے گھر فلسطینیوں کو لبنان کے بے آباد علاقے میں پناہ لینے کی اجازت ملی۔ اردن کے حسین نے بلیک ستمبر کے قتلِ عام کے بعد بقیہ فلسطینیوں اور فلسطین محاذِ آزادی کو بھی لبنان میں دھکیل دیا۔ ۱۹۷۳ء میں لبنانی فوج نے فلسطینیوں کی طاقت سے ہراساں ہو کر انہیں ملیا میٹ کرنے کی خاطر قدم اُٹھائے مگر بُری طرح ناکام ہوئی۔ پھر اسی برس یعنی اپریل ۷۵ء میں فلانجی دہشت پسندوں نے فلسطینی باشندوں کی ایک بس کو روکا اور انہیں ایک قطار میں کھڑا کر کے مشین گنوں سے ہلاک کر ڈالا۔ فلانجیوں نے نہایت فخر سے اعلان کیا کہ ہم نے دشمن کو دوپہر میں ہی ہڑپ کر لیا ہے بجائے اس کے کہ وہ رات کو ہمیں لقمہ بنا لیتا... لیکن یہ نوالا اُن کے حلق میں اٹک گیا۔ تنظیم آزادیٔ فلسطین کسی بھی ایسی مسلح جنگ سے گریز کر رہی تھی جو اسرائیل کو تقویت نہ پہنچاتی ہو مگر لبنان میں نمودار ہوتے ہوئے حالات نے انہیں اس میں کھینچ لیا...

گو لبنان تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف مذاہب کے باغی فرقوں کی پناہ گاہ رہا ہے۔ ان میں عیسائی مارونائٹ، یونانی آرتھوڈاکس، یونانی کیتھولک، یہودی اور مسلمان شیعہ اور دروز شامل ہیں۔ ۱۹۴۲ء میں جب ملک ایک وحدت کی صورت میں سامنے آیا تو ایک قدیم مردم شماری کے حوالے سے طے کیا گیا کہ مستقبل میں پارلیمنٹ کا سپیکر شیعہ ہو گا، وزیر اعظم سُنّی مسلمان اور صدر عیسائیوں میں سے چُنا جائے گا۔ ۷۰ء میں جب فلسطینی لبنان میں داخل ہوئے تو اُن کی آمد سے مسلمانوں اور ترقی پسند عیسائیوں کو قوت حاصل ہو گئی۔ مسلمانوں نے مطالبہ کیا کہ مردم شماری دوبارہ کی جائے کیونکہ آبادی میں اُن کا تناسب ستّر فیصد تک پہنچ چکا ہے اور وہ اسی حساب سے حکومت میں نمائندگی چاہتے ہیں۔ فلسطینیوں کی مسلح موجودگی اُن کا ٹرمپ کارڈ ہے... اُدھر عیسائیوں کی کوشش ہے کہ دستور میں ایسی ترامیم کروائی جائیں جن کے تحت مردم شماری بالکل نہ ہو اور موجودہ صورتِ حال ہمیشہ کے لئے برقرار رہے۔ ان کی دہشت کا بنیادی نشانہ فلسطینی ہیں اور یوں تنظیم آزادی نہ چاہتے ہوئے بھی اس خانہ جنگی میں اُلجھ گئی ہے۔ چنانچہ اب لبنانی حکومت اور دائیں بازو کی جماعتیں ایک طرف ہیں اور لبنانی مسلمان، فلسطینی اور ترقی پسند عیسائی دوسری جانب... فوج بکھر چکی ہے۔ ہر گروہ نے اپنی الگ ملیشیا بنا رکھی ہے۔ دن کے وقت شہر ایک دکھائی دیتا ہے مگر رات کو چھوٹی چھوٹی مسلح ریاستوں میں تقسیم ہو جاتا ہے... عیسائیوں نے لبنان کی تقسیم کا شوشہ چھوڑا ہوا ہے اور چرچ بھی اس سازش میں ملوّث ہے۔ پادری سمان نے کہا ہے کہ میں نے پادریوں والا چوغہ اُتار دیا ہے کہ یہ مسلح کارروائی میں رکاوٹ بنتا ہے۔

ہم ناشتے کے لئے ہوٹل سے باہر نکلے تو سپورٹس کاروں کے ٹائر چیخ رہے تھے، ٹیکسیوں میں اُمِ کلثوم کی گونج تھی اور فلسطینی، دروز، شیعہ، مارونائٹ، یہودی، یونانی، سب اس ہجوم کا حصہ تھے جو اپنی اپنی روزی کمانے کے لئے گھر سے نکلا ہوا تھا اُن بچوں کے لئے جن میں سے اکثر اگلے تیرہ ماہ میں یتیم ہونے والے تھے کیونکہ بیروت

کی خانہ جنگی میں تینتیس ہزار افراد زندگی سے بالکل الگ کر دیئے گئے اور پینتا
ہزار جزوی طور پر معطل ہو گئے۔

ناشتے کے بعد نصر نے بتایا کہ وہ بیروت کے مشرقی حصے میں جا رہا ہے
ایک کیمپ میں اس کے رشتے دار پناہ گزین ہیں۔ یہ کیمپ "عذابوں کا سلسلہ"
ہیں اور مارونائٹ عیسائی دیہات اور بیروت کی عیسائی آبادی کے درمیان
واقع ہیں۔

"وہاں حالات کیسے ہیں؟"

"فلانجی ہر رات راکٹ پھینکتے ہیں، اور ظاہر ہے جواباً ہم بھی یہی حرکت کر
ہیں۔" اُس نے ہاتھ ملایا۔ "بیروت کو چھوڑ دو چند روز میں بہت کچھ ہونے والا

"ابھی کچھ اور بھی ہوگا؟"

"ابھی تو تفریح ہو رہی ہے۔" وہ مُسکرایا۔ "خدا حافظ" اور اسرائیلی سگر
کے کش لگاتا بیروت کے ہجوم میں شامل ہو گیا۔

فنال بلڈنگ میں واقع ترک شپنگ کمپنی کے بکنگ کلرک سے جب میں نے
والے جہازوں کے بارے میں استفسار کیا تو وہ بے حد سستی اور قدرے بدتمیز
سے بولا۔ "ہمارا اگلا جہاز پانچ روز بعد اطالیہ کی بندرگاہ نیپلز کے لئے روانہ ہو
بے شک سکندریہ اُتر جانا مگر کرایہ نیپلز تک ہی چارج کیا جائے گا۔"

نارمل حالات میں تو بیروت ایسے رنگین شہر میں پانچ روز مونگ پھلی کے
کے برابر ہوتے مگر ان دنوں وہ بندوق کی گولیاں تھے۔ "مگر میں تو آج ہی بیر
چھوڑنا چاہتا ہوں۔"

"بہت سارے لوگ آج ہی بیروت چھوڑنا چاہتے ہیں۔" وہ خباثت
مُسکرایا۔ "میرا وقت ضائع نہ کرو، جاؤ۔"

میں نے اس کی بدتمیزی کا بدلہ یوں لیا کہ خدا حافظ کہے بغیر واک آؤٹ کر گیا۔

مصری جہاز ران کمپنی کا دفتر بھی قریب ہی تھا۔۔ مصری بھائی کاروبار کے موڈ میں
نہیں تھے۔ قہوہ پی رہے تھے اور اخبار پڑھ رہے تھے۔ مجھے آدھ گھنٹہ ایک بنچ
پر بٹھائے رکھا اور پھر بتایا کہ سکندریہ کے لئے جہاز بیس روز بعد ملے گا۔ وہاں سے
مایوس ہو کر میں مینا یعنی بندرگاہ کے علاقے میں گیا جہاں روسی شپنگ کمپنی کا
خوبصورت دفتر واقع تھا۔ اُن کا کرایہ دیگر شپنگ کمپنیوں سے دوگنا تھا۔

"مزدوروں کی مملکت کے جہاز میں سفر اگر مُفت نہیں تو دیگر ملکوں کی نسبت
تو ارزاں ہونا چاہیئے۔"

سفید وردی میں ملبوس ستھری صورت کی رُوسن مسکرا دی۔ "صرف روس میں،
یہاں ہم سرمایہ داروں کے لئے جہاز چلاتے ہیں۔"

"مگر میں تو بے چارہ پرولتاری ہوں۔"

"پرولتاریوں کے لئے ترکش شپنگ سے سستا اور کوئی نہیں۔" اُس نے ایک
اچھی کمیونسٹ کی طرح صلاح دی۔

واپس فنال بلڈنگ میں جہاں ترک شپنگ کے بکنگ کلرک نے مجھے دوبارہ
دیکھ کر اس طرح ناک چڑھائی جیسے میں کوئی بدبودار لکڑبگڑ ہوں۔

"ایک ٹکٹ برائے نیپلز۔"

"فرسٹ کلاس کا؟" اُس نے پُوچھا۔

"اس سے نچلی کلاس کونسی ہے؟"

"کیبن کلاس۔"

"اور اس سے نچلی؟"

"ڈیک کلاس۔"

"اور اس سے نیچے؟"

"اور اس سے نیچے سمندر ہے برادر..."

ڈیک کلاس یعنی عرشے کا ٹکٹ ایک سو دو ڈالر میں ملا جیسے جیب میں
مجھے ایک سب مشین گن کی ملکیت اتنا تحفظ کا احساس ہوا۔ جہاز کا نام "الکرنک"
تھا اور روانگی پانچ روز بعد رات ساڑھے دس بجے بیروت کی بندرگاہ سے
اُمید تھی کہ اگلے پانچ روز تک اہلِ بیروت اپنے آپ کو تفریح تک ہی محدود رکھیں
...ٹکٹ کی خریداری سے بکنگ کلرک کی نظروں میں میرا وقار خاصا بلند ہو گیا اور
نے اس کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے بڑے اعتماد سے میز پر رکھے ٹیلی فون پر ہاتھ ڈال
پاکستانی سفارت خانے کا نمبر ڈائل کر دیا۔ دمشق میں مظہر نے بیروت میں تعینات
فرسٹ سیکرٹری طالب میر کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا تھا کہ اگر کوئی ایمرجنسی ہو گئی
میر سے رابطہ قائم کرنا۔ دانشور قسم کا آدمی ہے مگر ہے قابلِ اعتماد... اب ایمرجنسی
یہ تھی کہ اگلے پانچ دنوں میں اگر میں مر مرا جاؤں تو گھر والوں کو کم از کم دسواں گزرنے
سے پیشتر اطلاع تو ہو جائے... میر صاحب نے انتہائی تحمل سے میرے حیاتیاتی
کے مسائل سُنے اور مجھے بلا تاخیر الحمرا کے ایک قہوہ خانے میں پہنچنے کو کہا۔

فنال بلڈنگ سے نکل کر میں شارع سوریا پر واقع عربی زبان کے معروف
"الآداب" کے دفتر میں پہنچا۔ وہاں ایک پُر مسرت بھاری جسم کی خوش شکل خاتون میز پر
جھکی کسی فرانسیسی ناول کا عربی میں ترجمہ کر رہی تھی۔ میں نے محترم دوست محمد
کا تعارفی خط پیش کیا جو عربی میں تھا اور انہوں نے مجھ سے گفتگو شروع کر دی جو عربی
ہی تھی۔ میں لاعلمی میں مُسکرایا تو وہ فرانسیسی بولنے لگیں۔ میں نے انگریزی کا سہارا لیا
تو وہ لاعلمی میں مُسکرانے لگیں۔ بہر حال کچھ ملی جلی اُردو عربی میں بات ہوئی۔ انہوں
نے بتایا کہ ڈاکٹر سہیل ادریسی جو "الآداب" کے مدیر ہیں تشریف نہیں رکھتے اور وہ
اہلیہ ہیں۔ میں نے اپنے ایک پسندیدہ فلسطینی شاعر محمود درویش سے ملاقات کی خواہش
کا اظہار کیا تو پتہ چلا کہ وہ ان دنوں بیروت سے باہر ہیں۔ چنانچہ چند دوستانہ مُسکراہٹوں

اور کافی کی ایک پیالی کے بعد میں نے اجازت چاہی اور الحمرا جانے کے لئے سروس گیراج میں آگیا۔

اگلی ٹیکسی بالکل خالی تھی۔ میرے بیٹھتے ہی ڈرائیور نے چابی گھما دی۔

"مسافر بہت کم ہیں..." اُس نے ڈیش بورڈ پر ہاتھ مارتے ہوئے سر ہلایا۔ "راستے میں پک کرتے چلیں گے۔"

ونڈ سکرین پر ایک سٹکر چسپاں تھا۔ ایک طرف ہلال دوسری جانب صلیب، درمیان میں لبنان کی علامت تکونا چنار نما درخت سیڈار، نیچے لکھا تھا "لبنان الواحد" یہ نعرہ فلانجیوں کی طرف سے ملک کی تقسیم کے جواب میں تھا۔ ڈرائیور فلسطینی تھا اور بے حد خوش گفتار۔ کہنے لگا "بیروت کو نظر لگ گئی ہے۔ زندگی میں پہلی بار اکیلے مسافر کے ساتھ الحمرا جا رہا ہوں۔"

میں نے پوچھا "لبنان کی وحدت پر یقین رکھتے ہو؟"

کہنے لگا "اسی میں ہماری سلامتی ہے۔ لبنان تقسیم ہو جائے تو فلانجی حصہ فوراً اسرائیل کے ساتھ الحاق کر لے اور ہم پھر بھٹکنے جائیں، یہ نہیں ہونے دیں گے۔"

میں نے کہا "میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ آخر یہ بوسیدہ سا درخت سیڈار اہلِ لبنان کو اتنا پیارا کیوں ہے؟"

اُس نے مجھے گھُور کر دیکھا جیسے اُس کی محبوبہ کی توہین کر بیٹھا ہوں اور بولا "کبھی بشاری جا کر ہزاروں برس پرانے سیڈار کا جنگل دیکھو، تب تمہیں معلوم ہو کہ یہ بوسیدہ سا درخت کتنا پُر جلال اور شاہانہ ہے... سیڈار پیغمبروں کا پسندیدہ درخت جسے ارز الرب بھی کہتے ہیں یعنی خدا کا درخت۔ بائبل میں اس کا ذکر آیا ہے۔ قرآن میں زیتون کو برکت والا درخت کہا گیا ہے اور لبنان کیا ہے؟ زیتون اور سیڈار کی سرزمین بلکہ زیتون تو فضول سا..."

"بہت بہت شکریہ میری سمجھ میں آگیا ہے کہ..."

"مجھے بات تو مکمل کر لینے دو... ایک پادری ایک سیڈار کے تنے میں کئی برس
تک چھپا رہا اور اس کی لکڑی میں سے رستے پانی پر زندہ رہا۔ یوں ایک سیڈار نے
ایک پادری کی جان بچا لی..."

"یہ بات تو سیڈار کے خلاف جاتی ہے۔"

"اور تمہیں پتہ ہے کہ بائبل کا لفظ لبنان کے شہر بائبلس سے لیا گیا ہے؟"
مجھے احساس ہوا کہ ڈرائیور خوش گفتار نہیں، باتونی ہے۔

اور تم نے سیڈار کو ایک بوسیدہ سا درخت کہا ہے... سبحان اللہ کیا درخت
ہے۔ نینوا کے کھنڈروں میں سے ہزاروں برس پرانا ایک شہتیر دریافت ہوا جب اُ
جلایا گیا تو سبحان اللہ وہی خوشبو... سیڈار تھا..."

میں نے باہر گزرتی عمارتوں سے اندازہ لگایا کہ اُس نے الحمرا جانے کے لئے
بوجھ کر طویل راستہ اختیار کیا ہے تاکہ اس کا سامع قابو میں رہے۔

"اور جناب فونیکی قوم نے اس درخت سے جہاز بنا کر بحیرۂ قلزم کو ایک جھیل
میں بدل دیا... اہرامِ مصر میں استعمال ہوا، فرعون خاص طور پر منگواتے تھے...

"فرعون اپنے ہاں سے ڈھاکے کی ململ منگواتے تھے، اپنی ممیاں لپیٹنے کے لئے"

"اچھا؟... اور یہ لبنان کے ہی باشندے تھے جنہوں نے حضرت سلیمانؑ کے
قصر اور ہیکل تعمیر کیا، سیڈار کی لکڑی سے... اور جناب کیا آپ کو پتہ ہے کہ حضرت
سلیمان کی بگھی میں کس درخت کی لکڑی استعمال ہوئی تھی؟"

"کیکر کی لکڑی!" میں نے جواب دیا۔

"جی نہیں جناب مقدس سیڈار کی لکڑی..."

وہ چپ ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے پوچھا۔ "اور کچھ؟"
کہنے لگا "بس اتنا کچھ ہی یاد تھا... سچی بات ہے میں صرف ڈرائیور ہی نہیں
پیشہ ور ٹورسٹ گائیڈ بھی ہوں... اتنا عرصہ ہو گیا تھا کسی ٹورسٹ کے سامنے لب

کی تاریخ بیان کئے ہوتے، بھولتا جا رہا تھا۔ آپ بور تو ہوتے ہوں گے مگر میں رواں
ہو گیا ہوں۔ کتنے روز ٹھہرنے کا ارادہ ہے؟"

"پانچ روز۔"

"کہاں ٹھہرے ہو؟"

"معرض الکبیر۔"

"صوبح سکوئر میں؟ پُرسکون ہوٹل ہے؟"

"ہاں اتنا پُرسکون کہ آج صبح کوئی صاحب میری کھڑکی کے عین نیچے کھڑے ہو کر
دس منٹ تک فائرنگ کرتے رہے..."

"تو تم بھی اُوپر سے کچھ چلا دیتے..."

"میرے پاس کچھ ہوتا تو چلاتا۔"

"نہیں ہے؟" وہ حیرت سے بولا۔

"نہیں۔"

"پانچ روز ننگے پھرو گے؟ خرید لو۔"

"کہاں سے خرید لوں؟"

"میں لے چلوں؟"

"ہاں لے چلو۔" میں نے تنگ آ کر ہتھیار ڈال دیئے۔

اُس نے ٹیکسی کو بیک گیئر میں ڈالا اور ایک گلی میں گھس گیا۔ دائیں بائیں چار
پانچ موڑ کاٹے اور پھر ایک بازار میں جا نکلا جہاں ایک پُرامن ماحول تھا۔ بچے کھیل رہے
تھے، خواتین کھڑکیوں میں براجمان سویٹر بُن رہی تھیں، گپیں لگا رہی تھیں۔

"آجاؤ۔" وہ ٹیکسی سے باہر آیا اور ایک دکان میں چلا گیا۔ بچوں کے کھلونوں اور
سویٹس کی دکان، چاکلیٹ کے خوش رنگ پیکٹ اور ڈبے شیلفوں پر سجے تھے۔ اُس
نے دکاندار سے عربی میں کچھ کہا جس کے جواب میں اُس نے میری طرف اشارہ کر کے کچھ

دریافت کیا۔ ڈرائیور نے میرے کندھے پر پرانے یاروں کی طرح ہاتھ رکھا اور کچھ تفصیلات بیان کرنے لگا... دکاندار نے شٹر گرایا، روشنی جلائی اور پھر شیلف سے ایک بظاہر چاکلیٹ کا بڑا ڈبہ اُتار کر کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ اُس نے ڈھکن اُٹھایا تو ایک نویں نکور چیکوسلاویکیہ کی بنی ہوئی سٹین گن بلب کی روشنی میں چمکنے لگی... گولیوں کی ایک بیلٹ بھی ساتھ تھی۔

"اگر رات ہوتی تو تم اسے باہر بازار میں جا کر ٹرائی بھی کر سکتے تھے۔ بہرحال عمدہ چیز ہے..." وہ بڑے پیار سے آبنوسی سٹیل پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ "قیمت صرف نوّے ڈالر... گولیوں کی بیلٹ مُفت۔"

"نوّے ڈالر میں تو میں یورپ پہنچ سکتا ہوں۔"

"اگر بیروت سے نکلے تب پہنچو گے ناں؟" وہ شرارت سے مسکرایا۔ "بہرحال مجھے معلوم تھا کہ تم خریدو گے نہیں۔ شکل سے ہی ڈرپوک لگتے ہو... آؤ چلتے ہیں۔"

دکاندار نے چاکلیٹ کا ڈبہ بند کر کے شیلف پر رکھا اور بڑی خوش اخلاقی سے ہمیں رخصت کیا۔

ہم پھر الحمرا کی طرف روانہ ہوئے۔

"تم نے بعلبک دیکھا ہے؟"

"نہیں۔"

"تم نے بشاری کا سیڈار کا جنگل نہیں دیکھا اور بعلبک بھی نہیں دیکھا، دیکھو گے؟"

"تم مجھے پلیز الحمرا لے چلو فی الحال..."

"ابھی تو نہیں لے جا رہا۔ بہت دُور ہے۔ تم یوں کرو کہ فی الحال لیون ٹریولز کی ٹورسٹ بس کا ٹکٹ خرید لو کل صبح کے لئے۔ دوپہر کا کھانا بعلبک میں، موسیقی اور لبنانی وائن ... بعلبک کے ستون، سورج کا شہر ہیلی پولیس، بعلبک جہاں صلاح الدین ایوبی کا بچپن گزرا تھا... رومی کھنڈرات ... اور صرف دس ڈالر میں، لے چلوں لیون ٹریولز؟"

"لے چلو"۔ میں نے اُکتا کر کہا۔

اُس نے ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا کیونکہ بعلبک کا حوالہ اُس نے میں اس وقت دیا تھا جب وہ لیون ٹریولز کے دفتر کے سامنے کھڑا ہو چکا تھا۔ بہرحال سودا بُرا نہ تھا۔ میں نے اگلی صبح کے لئے بعلبک کا ٹور خرید لیا۔ دس ڈالر میں بیروت سے دُور رومی کھنڈروں میں ایک دن ... کم از کم وہاں سکون تو ہوگا۔

خدا خدا کر کے جب ہم الحمرا پہنچے تو اُس نے کرایہ لینے سے انکار کر دیا۔ "تم ایک دوست ملک سے آتے ہو۔"

میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور ٹیکسی سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ "اچھا تو پھر سیڈار بڑا زبردست درخت ہے؟"

"ہاں۔" وہ بے اختیار ہنسنے لگا۔ "پیغمبروں کا پسندیدہ درخت، خدا کا درخت اور خدا حافظ۔"

طالب میر صاحب قہوہ خانے میں میرا انتظار کرتے کرتے نڈھال ہو چکے تھے۔

"آپ قدرے دیر سے پہنچے۔" اُنہوں نے سفارتی آداب کے تحت نرم سا احتجاج کیا۔ میں نے اُنہیں بتایا کہ میں پچھلے ایک گھنٹے سے سیڈار درخت پر لیکچر سن رہا تھا، سٹین گنوں کی خریداری کر رہا تھا اور بعلبک کے لئے ٹکٹ خرید رہا تھا۔ کہنے لگے۔ کمال ہے اتنا عرصہ ہو گیا بیروت میں رہتے ہوئے مگر ہمیں کبھی ایسا ٹیکسی ڈرائیور نہیں ملا... میں نے کہا آپ کو اتنا عرصہ ہو گیا بیروت میں رہتے ہوئے، کبھی آپ کی کھڑکی تلے کسی نے سٹین گن کے برسٹ چلاتے ہوئے قہقہے لگاتے ہیں؟ کہنے لگے، نہیں۔ میں نے کہا تو پھر؟ بولے تو پھر یہ کہ دوپہر ہو چکی ہے، چلئے گھر جا کر کھانا کھاتے ہیں۔

کلاسیم سینما کے سامنے ایک دکان کا اندر باہر سیاہ ہو رہا تھا۔ کل شب کسی نے دستی بم پھینکا تھا۔ فائر بریگیڈ کی چند گاڑیاں طوفانی رفتار سے الحمرا میں داخل ہوئیں، ان کی چیختی گھنٹیوں کی آواز کے ساتھ ہی دکانوں کے شٹر گرنے لگے اور راہ گیروں کے

قدم تیز ہو گئے۔

میر صاحب کے فلیٹ میں کھانے کی میز پر پھر خانہ جنگی کا ذکر چھڑ گیا۔

"روزانہ سینکڑوں شہری اغوا کر لئے جاتے ہیں اور پھر بھاری رقوم کی ادائیگی پر انہیں آزادی نصیب ہوتی ہے۔ کئی مرتبہ رقم بھی غائب اور شہری بھی غائب پچھلے دنوں تین پاکستانی اغوا ہو گئے۔ ہمیں اطلاع ملی کہ فلانجیوں کے پاس ہیں۔ چنانچہ سفیر صاحب نے اُن کے ہیڈ کوارٹر میں فون کیا کہ ہمارے آدمی رہا کر دو ورنہ ... اُنہوں نے کہا یہ دھمکی ہے؟ سفیر صاحب نے بے دلی سے کہا بس جناب یہی سمجھ لیجئے۔ اُنہوں نے پاکستانیوں کو چھوڑ دیا۔ ایک اور پاکستانی نوجوان کو ایک بلند عمارت کی آٹھویں منزل پر قید کر دیا گیا۔ وہ غریب کھڑکی کھول کر باہر لٹک گیا اور نعرے لگانے لگا۔ "پاکستانی پاکستانی" خوش قسمتی سے کسی راہ گیر نے اس کی دُہائی سُن لی اور پولیس کو اطلاع کر دی ... آپ بھی ذرا احتیاط برتیئے گا ... فائرنگ تو اکثر ہُوا کرتی ہے، کل تین آدمی مارے گئے۔ آپ کا قیام کس ہوٹل میں ہے؟"

ہوٹل کا نام سُن کر وہ باقاعدہ سراسیمہ ہو گئے۔ "بھئی وہ تو پورٹ کے قریب ہے اور پورٹ تو بس ... امن کے زمانے میں ایک طرف سے سُنّی راکٹ پھینکتے ہیں شیعوں پر اور دوسری طرف سے شیعہ حضرات بھی راکٹ بہ راکٹ جواب دیتے ہیں اور درمیان میں رہائش پذیر عیسائی مزے سے اپنے سروں پر سے گزرنے والے راکٹ دیکھتے ہیں البتہ جب خانہ جنگی تیز ہوتی ہے تو شیعہ سُنّی متحد ہو کر عیسائیوں پر راکٹ برسانے لگتے ہیں ... بہت خطرناک ایریا ہے، آپ میرے فلیٹ میں آجائیے ..."

پچھلے پہر میر صاحب کے دو بھانجے تشریف لے آئے جو دُنیا دیکھنے کے چاؤ میں ایک بحری جہاز پر ملازمت کرتے تھے۔ باریش، گفتگو کرتی آنکھوں والے تیز ملاح ان کے ہمراہ سفیدے کی طرح نکلتے ہوئے قد کا ایک نوجوان تھا۔ آنکھیں مُردہ مگر چہرے کے نقوش میں زندگی ہی زندگی۔

"یہ ہمارے دروز دوست ہیں، غسان" ملاحوں نے تعارف کروایا۔ "ہم ذرا سمندر سے اُداس ہو گئے ہیں، نہانے جا رہے ہیں۔ آپ بھی چلیئے۔"

"میں بس اتنا سا تیراک ہوں کہ اگر گہرے پانی میں دھکا دے دیا جائے تو ہاتھ مار کر باہر نکل سکتا ہوں اور بیروت کا سمندر میری صلاحیتوں سے بالاتر دکھائی دیتا ہے۔"

"غسان زبردست تیراک ہے، آپ کو بچا لے گا۔" ملاح نمبر ایک ہنسا۔

"چلیئے گا؟" میں نے میر صاحب سے دریافت کیا۔

اُنہوں نے اپنے صحت مند پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔ "ساحل پر جس قسم کے جسم دیکھنے میں آتے ہیں وہاں اسے دکھانا بدذوقی ہو گی۔ آپ ضرور جائیں مگر نو بجے سے پیشتر ہوٹل پہنچ جائیے گا۔ میں فون کر کے آپ کی آمد کے بارے میں تسلی کر لوں گا۔"

سمندر کی طرف اُترتے ہوئے ہمارا گزر اس بستی میں سے ہُوا جہاں دروز رہتے تھے۔ ہماری کچی آبادیوں ایسے بے ترتیب مکان مگر اندر چلے جائیے تو یوں لگتا ہے کہ پنجاب کے کسی سگھڑ اور صاف ستھرے گاؤں میں آ نکلے ہیں۔ ٹرنکوں پر کروشیے کے غلاف چینی کے برتن شیلفوں پر سجے ہوئے اور مٹی کی ٹھنڈی مہک۔ غسان کے والدین نے ہمیں قہوہ پلایا اور گھر کی بنی ہوئی میٹھی روٹی کھلائی۔

دروز ایک ایسا فرقہ ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اُن میں نامناسب حالات سے مقابلے کی سپرٹ دُنیا کی تمام اقوام سے زیادہ ہے اور وہ آزادی، اتحاد اور مذہب سے مکمل وفاداری پر آخری دم تک قائم رہتے ہیں۔ دروز لیڈر کمال جنبلاط لبنانی سیاست کے اہم ترین ناموں میں سے ہے۔ دروز علوی فرقے کی ایک شاخ ہیں جو پہلے نصیریہ بھی کہلاتا تھا۔ ان کا کلمہ عام مسلمانوں سے مختلف ہے۔ مُردوں کو پورے لباس میں دفن کرتے ہیں۔ تناسخ کے قائل ہیں اور جنت دوزخ سے انکاری ہیں اور ابن تیمیہ کے بقول شراب کو حلال سمجھتے ہیں۔ ایک مرتبہ حجرِ اسود کو لوٹ کر لے گئے اور ایک حج کے موقع پر متعدد حاجی صاحبان کو آبِ زمزم میں ڈبو کر شہید کر دیا تھا ... بہرحال

غسان اتنا خطرناک نہیں لگتا تھا اور ہم حج پر بھی نہیں جا رہے تھے، سمندر کی طرف جا رہے تھے۔

آج ردشے کے ساحل پر کل کی نسبت زیادہ ہجوم تھا۔ ہم ساحلی سڑک سے اُتر کر نیچے سمندر کے نزدیک چلے گئے جو خاصا پُرجوش دکھائی دے رہا تھا۔ پانی میں اُترتی لڑکیوں کے مختصر لباس مغربی تھے مگر جب باہر آتیں تو بھیگے ہوئے جسموں کو مشرقی لڑکیوں کی طرح سمیٹتی ہوئی چلتیں۔ پورے خاندان ساحلی چٹانوں پر قالین بچھائے کھُلی فضا اور دھوپ میں آباد تھے۔ وقت جس کا تھا، جہاں تھا تھما ہوا تھا۔ یعنی دادی اماں سیاہ چوغے میں ہیں، بیٹی سکرٹ میں بیٹھی ہے اور پوتی سومنگ کاسٹیوم میں اٹھلا رہی ہے۔ دادا ابا اپنا جہازی سائز حُقّہ ارکیلا بھی ساتھ لائے ہیں اور نیم غنودگی میں کش لگا رہے ہیں۔

میں نے بھی مردِ سمندر ہونے کی نیّت سے ایک تالاب نما حصّہ منتخب کیا جس کے گرد نوکیلی چٹانوں کا حصار تھا۔ لہریں دیوار کی صورت آتیں اور تالاب کو بھر کر پیچھے ہٹ جاتیں مگر آہستہ آہستہ پانی واپس سمندر میں بہہ جاتا۔ میں اندر گیا تو نوکیلے سنگریزے پاؤں کو اذیت دینے لگے۔ بیٹھنے کی کوشش کی تو ڈبکیاں کھائیں۔ چنانچہ سومنگ کاسٹیوم کو جھاڑ کر ساحل پر واپس آگیا۔ دونوں ملّاح اور غسان بے خطر سمندر کی پُرجوش سطح پر ہچکولے لے رہے تھے اور بار بار مجھے اندر آنے کے لئے ہاتھ ہلا رہے تھے۔ مجھے اُن کی تیراکی پر تو یقین تھا مگر سمندر پر یقین نہ تھا۔ اور میرا خدشہ درست ثابت ہوا۔۔۔ ایک نوجوان لڑکا جو میری طرح تالاب کی عافیت میں اُچھل کود کر رہا تھا، جوش میں آکر گہرے پانی میں کود گیا۔۔۔ تیرنا اتنا دشوار نہ تھا، اصل مسئلہ یہ تھا کہ دُور سے آتی ہوئی گونجتی لہر کی رفتار کا اندازہ کرنا، پھر اس کی آمد پر سانس روک کر اپنے آپ کو تب تک قائم رکھنا جب تک کہ وہ سر سے گزر کر ساحل سے ٹکرا نہیں جاتی۔ یہ نوجوان چند لہروں میں سے تو کامران گزرا مگر پانی کی ایک دیوار اُسے بے اختیار کر کے سمندر کے اندر تک لے گئی اور

وہ بُری طرح غوطے کھانے لگا۔ غسان نے جب اسے دیکھا تو اُس کا ہاتھ آخری مرتبہ سمندر کی سطح پر نمودار ہوا تھا۔ اُس نے فوراً بھاگ کر چھلانگ لگائی اور خود بھی پانی میں غائب ہو گیا۔ پورا ساحل دم سادھے دیکھ رہا تھا۔ تقریباً بیس سیکنڈ کے بعد غسان سطح پر اُبھرا۔ اُس نے نیم بے ہوش نوجوان کو ایک بے بس بچّے کی طرح بغل میں داب رکھا تھا۔ ملّاحوں نے ایک ٹیوب اس کی جانب پھینکی اور وہ اُس کے سہارے تیرتا ہوا ساحل پر آگیا۔ "اچھا تیراک ہے مگر ڈر گیا تھا۔ اگر تم پانی سے خوفزدہ ہو جاؤ تو بس ختم۔۔"

نوجوان نے ہوش میں آتے ہی کپڑے پہنے اور تیراکی سے توبہ تائب ہو کر گھر کی راہ لی۔

ابھی شام ہونے میں کچھ دیر تھی مگر میں نے ہوٹل واپسی کا اعلان کر دیا۔

"ابھی ٹھہرئیے، سومنگ کے بعد ہم لوگ ایک قہوہ خانے میں خول کھانے جا رہے ہیں، زیتون کے تیل کے ساتھ گرم گرم مچھلیاں۔"

میں نے معذرت کی اور پچھلی شب دیر سے لوٹنے پر جو دُرگت بنی تھی، بیان کی۔

"چلئے آپ کو چھوڑ آتے ہیں۔" دونوں ملّاح اور غسان میرے ساتھ ہو لئے۔

صبح سکوئر میں پہنچے تو دونوں ملّاح سازشی انداز میں کھُسر پھُسر کرنے لگے۔ "آپ تو بڑی خطرناک جگہ رہتے ہیں۔"

"ہاں" میں نے سر ہلایا۔ "یہاں جان کا خطرہ رہتا ہے۔"

"جان کا نہیں جسم کا۔۔" ملّاح نمبر ایک شرارت سے بولا۔ آپ کے ہوٹل کے عقب میں پگال کا علاقہ ہے۔۔۔ ایسا علاقہ جہاں اگر ملّاح گھُس جائیں تو انہیں پولیس ہی آکر نکالتی ہے۔"

"پگال تو پیرس کا بدنام ترین ایریا ہے۔"

"یہ بھی کچھ کم نہیں۔۔" ملّاح نمبر دو تجربہ کار نظر آنے لگا۔ آپ کا ہوٹل تو یہ سامنے ہے۔ آئیے کچھ دیر کے لئے اُدھر ہو آئیں۔"

میں نے مجبوراً "ہاں" کر دی جو قدرے پُرشوق تھی۔

پگال میں وہ تمام لوازمات موجود تھے جن کی غیر موجودگی میں ملاح سمندر پر بیزار رہتا ہے۔ ناچ گھر، شراب خانے، نیلی فلمیں اور نیلی کیسٹ، کاروباری حسینائیں اور ہٹے کٹے غنڈے ...

دو تین گھنٹے کی آوارہ گردی کے بعد میں نے پوچھا۔ چلیں؟ کہنے لگے "آپ کو بتایا بھی تھا کہ اگر ملاح اس علاقے میں آجائے تو پھر اسے پولیس ہی باہر نکالتی ہے ... ابھی پولیس نہیں آئی۔"

میں نے پولیس کا انتظار کرنا مناسب نہ سمجھا اور واپس ہوٹل آگیا۔ کمرے میں داخل ہوا تو نصر کے خالی کردہ بستر پر ایک اور عرب نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر اُس نے سائڈ ٹیبل پر بکھرے چند کاغذات سمیٹے اور سوٹ کیس میں رکھ دیئے۔

"میرا نام مستنصر ہے اور میں آپ کا روم میٹ ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے ہاتھ آگے کر دیا۔ اُس نے خاموشی سے ہاتھ ملایا اور کونے میں جا کر کپڑے تبدیل کرنے لگا۔

"آپ انگریزی جانتے ہیں؟"

اُس نے صرف سر ہلایا اور بستر پر لیٹ کر اخبار پڑھنے لگا۔

"آپ بھی شاید فلسطینی ہیں؟"

اخبار سے پل بھر کے لئے نظر ہٹائی، گردن کو خم دے کر مجھے دیکھا اور جواب دیئے بغیر مطالعے میں محو ہو گیا۔

آپ بے شک جہنم میں جائیں۔ میں زیر لب بڑبڑایا اور اپنے آپ کو کُرتے شلوار میں آرام دہ کر کے بستر پر لیٹ گیا۔ سونا محال تھا کیونکہ اُس نے بیڈ لیمپ جلا رکھا تھا۔ اخبار کو آخری سطر تک کھنگال کر وہ اُٹھا اور اپنے بیگ میں سے ایک گول بوتل نکال کر سائڈ ٹیبل پر رکھ دی۔ سرد چہرہ، گھنگھریالے نیم سنہری بال، دراز قد اور کسرتی جسم ...

"آپ پاکستانی ہیں؟" وہ سرد مہری سے بولا۔

"اوہو آپ تو بول بھی لیتے ہیں۔" میں نے ناگواری سے کروٹ بدل لی۔ "ہاں پاکستانی ہوں۔"

"یہاں کیا کر رہے ہیں؟ میرا مطلب ہے بیروت میں۔"

"اپنے تئیں سیر کرنے آیا تھا۔"

"ہوٹل معرض الکبیر میں کس طرح آگئے؟"

"دمشق سے آنے والی ٹیکسی نے مجھے صور سکوئر میں اتارا تھا اور یہ اس کے عین سامنے تھا، اس طرح آگیا۔"

"آپ عرق پئیں گے؟"

"کیا؟" میں تنگ آکر اُٹھ بیٹھا۔

"عرق۔" اُس نے بوتل کو اپنی انگوٹھی کے پتھر سے بجایا۔ "عرق"۔

"جی نہیں شکریہ ... میرا ہاضمہ فی الحال بالکل درست ہے۔"

"پلیز آپ میرا ساتھ دیجئے ... آپ دوست ہیں۔"

"کس چیز کا عرق ہے؟"

"سونف کا ..." اُس نے گلاس کا چوتھائی حصہ بھرا اور بقیہ پانی سے برابر کر دیا۔ پانی کی ملاوٹ سے بے رنگ عرق دودھیا ہو گیا۔ میں نے چکھا، گریپ واٹر ایسا ذائقہ تھا اور گلاس خالی کر دیا۔

"اتنی تیزی سے نہیں پیتے ..." اُس نے ایک واجبی سی چسکی لے کر گلاس میز پر رکھ دیا۔ "میرا نام احمد ہے اور آپ کا اندازہ درست تھا، میں فلسطینی ہوں۔ آج ہی بیروت پہنچا ہوں۔ پلیز اور عرق لیجئے۔" اُس نے گریپ واٹر کا ایک اور گلاس بنا دیا۔ میں نے تسلی کی خاطر بوتل اُٹھا کر دیکھی، اُس پر عرق ہی لکھا تھا اور سونف کی ہلکی خوشبو آ رہی تھی۔

"بیروت میں آپ کے رشتے دار ہیں؟"

"ہاں، بہت سارے ..." اُس کے جبڑے بھینچے ہوئے تھے اور یقیناً اس وقت

وہ میرے ساتھ نہیں تھا، کہیں اور تھا۔

"کتنے روز ٹھہرنے کا ارادہ ہے؟"

"یہ حالات پر منحصر ہے..." وہ چونک اُٹھا۔ "اور آپ؟"

"میں نے اُسے پانچ روز بعد چلنے والے بحری جہاز کے بارے میں بتایا۔

"ہاں آپ کو بیروت چھوڑ دینا چاہیئے... آپ خوف زدہ تو ہوں گے موجودہ صورت حال سے؟"

"موت سے کون خوف زدہ نہیں ہوتا؟"

اُس کا سر جھکا ہوا تھا، میرا خیال ہے کہ وہ مسکرایا۔ اس کا نصف چہرہ کمرے کی نیم تاریکی میں تھا اور بقیہ خدوخال ٹیبل لیمپ سے روشن ہو رہے تھے۔

احمد ایسے لوگوں میں سے تھا جو قدیم کھنڈروں کی طرح ہوتے ہیں۔ کھدائی کے ساتھ مختلف تہیں برآمد ہوتی رہتی ہیں۔ اُن کی آخری تہہ کے بارے میں بھی ہمیشہ شبہ رہتا ہے شاید اس کے نیچے ایک اور عہد پنہاں ہو، ایک اور تاریخ گم ہو۔ اُن کے تجربات انہیں شانت اور خاموش کر دیتے ہیں۔ اُوپر سے اُپلوں کی سفید راکھ اور اندر سے ایک ایک مسام دہکتا ہوا۔ فلسطینی شاعر محمود درویش نے ایک انٹرویو میں کہا تھا۔ "مجھے اپنا وہ زمانہ یاد ہے جب میں چھ برس کا تھا اور ایک سرسبز پہاڑی پر واقع خوبصورت اور پُرسکون قصبے البروہ میں رہتا تھا... گرما کی ایک رات تھی گاؤں کے لوگ حسبِ عادت چھتوں پر سو رہے تھے۔ آدھی رات کو میری ماں نے مجھے اچانک نیند سے بیدار کیا اور دوسرے ہی لمحے میں نے اپنے آپ کو گاؤں کے سینکڑوں لوگوں کے ساتھ جنگل میں چھپتے اور بھاگتے ہوئے پایا۔ گولیاں ہمارے سروں کے اُوپر سے گزر رہی تھیں۔ مجھے کچھ پتہ نہ تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ ایک رات کے مسلسل سفر کے نتیجے میں میرے بہت سے عزیز و اقارب اِدھر اُدھر ہو گئے اور میں ان میں سے ایک عزیز کے ساتھ ایک اجنبی گاؤں میں آگیا۔ جہاں کے لوگ

یہاں دوسری طرح کے تھے۔ میں نے سادگی سے کسی سے پوچھا "میں کہاں آگیا ہوں؟" میرے کان میں پہلی مرتبہ "لبنان" کا لفظ پڑا"... احمد بھی محمود درویش کی طرح بچپن میں اپنے آبائی قصبے سے نکالا گیا اور لبنان میں پناہ گزین ہوا جہاں اُسے درحقیقت معلوم ہوا کہ "وطن" کیا چیز ہوتی ہے۔ وہ بھی اس تجربے کو نہیں بھولا تھا جب زندگی میں پہلی مرتبہ وہ ایک طویل قطار میں کھڑا ہوا تھا، امدادی کھانا حاصل کرنے کی خاطر۔ وہ "مہاجر" کے نام سے پکارا گیا۔ احمد پناہ گزینوں کے کیمپ میں پلا۔ امدادی کھانوں کے لئے قطاروں میں کھڑے ہو کر جوان ہوا اور اپنی آنکھوں سے باپ اور بہن بھائیوں کے جسم اسرائیلی بموں سے مسخ ہوتے دیکھے... یہ زندگی کی مختلف تہیں تھیں جو اس کی شخصیت پر جم گئیں... ان کے نیچے کہیں احمد تھا، مجھے نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ مصائب کے باوجود اس نے تعلیم حاصل کی اور اب لیبیا میں انگریزی کا اُستاد تھا۔ رُوئے زمین پر منتشر لاکھوں فلسطینیوں میں سے ایک جو واپسی کے دن کے انتظار میں ہیں۔

میں سینکڑوں فلسطینیوں سے مل چکا تھا مگر احمد ایک مختلف انسان تھا۔ وہ حقارت سے اسرائیل کا ذکر نہیں کرتا تھا بلکہ ایک سپاٹ اور کاروباری انداز میں۔ وطن اس کے لئے ایک اغوا شدہ بچہ تھا جو جذباتی ہونے سے نہیں مل سکتا تھا۔ اس کی تلاش میں اس نے دشمن نہیں بھولنے تھے اور ایک سرد منصوبہ بندی سے خرکار کیمپ تک پہنچنا تھا۔ وہ احمد ایسے لوگوں کا انتظار کر رہا ہے۔

بیروت ـ بادشاہ یا جوکر

حسب معمول بیروت کی دلفریب اور پُرسکون صبح کا آغاز ایک سٹین گن کے چھپانے سے ہُوا۔ برسٹ کی پہلی گولی کی آواز نے ہی مجھے جگا دیا اور ساتھ ہی تفریح کے شوقین لبنانی صاحب کا ہنہناتا ہُوا قہقہہ سنائی دیا۔

میں نے اُٹھ کر کھڑکی کا پردہ سرکایا۔ صبح کے دُھندلے آثار میں وہ دان پر سٹین گن کا دستہ جمائے مُنہ کھولے کھڑا تھا۔ پھر نالی سیدھی ہوئی اور اس میں چند بے اختیار شعلے بھڑکے ... اُس نے ایک بچّے کی طرح داد طلب نگاہوں سے ہر سُو دیکھا ...

آہا جی میں نے سٹین گن چلائی ہے اور پھر ہنس ہنس کر دوہرا ہو گیا۔

"کھڑکی سے ہٹ جاؤ مستنصر" احمد بھی بیدار ہو چکا تھا۔

"میں اُس کی نالی پر نگاہ رکھے ہوتے ہوں، مجھے معلوم ہو جائے گا ..."

تیسرے قہقہے کے بعد دُور سے کچھ ٹوٹنے کی آواز آئی جیسے سُوکھی ٹہنی ٹوٹتی ہے ... لبنانی صاحب کے کان کھڑے ہو گئے ... تڑاخ کی ایک اور مدھم ٹہنی ٹوٹی، یقیناً پستول کا فائر تھا، جوابِ آں فائر کے طور پر۔ اُنہوں نے سٹین گن کو فوراً سینے سے لگا لیا اور شکایت آمیز نظروں سے اُدھر دیکھا جہاں سے فائر ہُوا تھا [illegible] تو یونہی دل لگی کر رہے تھے۔ آپ خواہ مخواہ سنجیدہ ہوتے جاتے ہیں تیسری [illegible] نے اُن کے آس پاس سیٹی بجائی اور وہ ہراساں ہو کر لڑھکتے ہوئے قریبی سڑھیں [illegible] میں غائب ہو گئے۔ میں اپنی ہنسی دباتا پیچھے ہٹا اور بستر پر بیٹھ گیا۔ احمد اپنے

کاغذات پر سُرخ دائرے بنانے میں مصروف تھا۔ یہ بیروت کے مختلف حصوں کے تفصیلی نقشے تھے۔

"تم آج فارغ ہو؟"

"نہ۔"

"کہاں جا رہے ہو؟"

"بعلبک... عظیم رومی معبد... ہیلی پولس... سُورج کا شہر... آج میں پہلی مرتبہ خلیل جبران کا لبنان دیکھوں گا... اِس آہٹوں پر چونکنے والے شہر سے دُور وادیٔ لبنان کے سرو اور سیڈار کے جنگلوں میں... میں وہاں پہنچتے ہی رُومی معبد کے کسی ہمدرد ستون سے لپٹ کر سو جاؤں گا کہ میں آبادیوں سے تنگ آچکا ہوں۔"

احمد نے سر اُٹھایا۔ اُس کے منجمد چہرے سے ہونٹ مسکراہٹ کی حرکت میں علیحدہ ہوتے۔ "تم دو روز میں ہی تنگ آگئے ہو اور ہم اتنے برسوں سے..."

"تمہاری بات اور ہے، تم خبطی لوگ ہو، اتنے برس بعد بھی واپسی کے دن کے انتظار میں ہو، اس مقصد کے لئے جہاز اغوا کرتے ہو، دھماکے کرتے ہو، خود مرتے ہو دوسروں کو مارتے ہو، بال بچّوں کے پرخچے اُڑتے دیکھتے ہو اور پھر بھی بھُولتے ہی نہیں اپنی مٹّی کو... ہم صاحب لوگ ہیں، صابر لوگ ہیں۔ ہمارے ملک کی تاریخ بتاتی ہے کہ ہم صاحب لوگ ہیں..."

"تمہارے مُنہ میں کڑواہٹ کے ذائقے ہیں..."

"اور یہ سب تم دہشت پر اُترے ہوئے فلسطینیوں کا قصور ہے... ہم صاحب لوگوں کو احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیتے ہو۔"

احمد نے سُرخ مارکر میز پر رکھ دیا۔ "وہ کیسے؟"

"تم بے گھر ہو مگر تمہارا وطن ہے اور ہم گھروں میں رہتے ہوئے بھی جلاوطن... پاکستانی ہونے کے باوجود ہمیں قومی سٹیج پر نمودار ہونے والے مسخروں سے حب الوطنی

کا سرٹیفکیٹ لینا پڑتا ہے... کیا کبھی کسی فلسطینی سے کہا گیا ہے کہ وہ سرے سے فلسطینی ہی نہیں ہے؟ تمہاری جدوجہد کو دیکھ کر، تمہارے وجودوں کو واپسی کے دن کی چاہت میں فنا ہوتے دیکھ کر ہمیں احساسِ کمتری ہو جاتا ہے کہ آخر ہم ہیں کیا اور کب تک یونہی رہیں گے..."

"اُس دن کو قریب تر لانے کے لئے مختلف رنگوں اور نسلوں کے لوگ ہمارا ساتھ دے رہے ہیں، تم بھی ایسا کر سکتے ہو۔"

"ہم تو اشک آور بیان دے سکتے ہیں، ساتھ نہیں دے سکتے..." کڑواہٹ کے باوجود میں ہنسا۔ "ویسے میں کچھ جاننا چاہوں گا..."

"جاننے کے لئے تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔"

"کہاں؟"

"یہیں بیروت میں۔"

"کب؟"

"جب بھی تمہیں فراغت ہو۔"

"فی الحال تو میں بعلبک کے قدیم کھنڈروں میں پناہ لینے جا رہا ہوں، کل سہی۔"

الحمرا اسٹریٹ کے آغاز میں لیون ٹریولز کا دفتر تھا، باہر ایک خالی لگژری کوچ کھڑی تھی۔ میں اندر چلا گیا۔ ایک ایسے صاحب سے سامنا ہُوا جو ہر دوسرے سانس کے بعد جمائی لے رہے تھے اور بڑھی ہوئی شیو کو بڑے انہماک سے کرید رہے تھے۔ میں نے اپنا ٹکٹ ان کے سامنے رکھ دیا۔

"آج کا ٹور کینسل ہو گیا ہے۔ کل بعلبک سے واپسی پر شتاح میں سے گزرتے ہوئے کوچ پر فائرنگ ہوئی تھی، آپ ذاتی طور پر دیکھ سکتے ہیں۔" اُس نے ٹکٹ پر معذرت لکھی اور گیارہ ڈالر واپس کر دیئے۔

میں نے باہر آ کر ذاتی طور پر دیکھا۔ کوچ کی باڈی میں چھید بھی تھے، تقریباً [illegible] کے لگ بھگ... بعلبک تک کا نقشہ بنا ہوا تھا اور راستے میں پڑتے قصبوں کے [illegible] درج تھے۔ ان میں فآنا بھی تھا جس کے عین اُوپر گولی کا سوراخ تھا... لبنان کے دیودار کے درختوں اور پہاڑی چشموں ایسی ایک لڑکی جو ناژلا اسعد تھی... مسجدِ قرطبہ میں میکسیکن ہیٹ پہنے فلیش گن سے تصویریں اتارتی ناژلا جس کے ساتھ خلیل جبران نے میرا تعارف کروایا تھا... آج سے پانچ برس پہلے وہ اشبیلیہ سے میڈرڈ جانے والی گاڑی میں سوار ہوئی تھی اور پھر ہمارا رابطہ ٹوٹ گیا تھا۔ ناژلا فآنا لیبارٹریز میں کام کرتی تھی جو بعلبک کے راستے میں پڑتا تھا... میرا ارادہ تھا کہ میں واپسی پر فآنا میں اُتر جاؤں۔ مجھے معلوم تھا کہ مجھے سامنے پا کر اس کے پہلے الفاظ کیا ہوں گے... واللہ مستنصر، یہ تم؟ لیکن فآنا کے عین اُوپر گولی کا سُوراخ تھا... سوری ناژلا اسعد۔

"کیا تو اُن راتوں کو یاد کرے گی جن میں ہم ایک جگہ جمع ہوتے۔ تیرے نفس کی شعاعیں ہالہ کی طرح ہمیں گھیرے ہوئے تھیں۔ کیا تو ان چنبیلی کی بیلوں کو یاد کرے گی جن کی شاخوں کے سائے میں ہم بیٹھے تھے اور وہ ہم پر اس طرح سایہ فگن تھیں گویا ہمیں انسان کی نگاہوں سے چھپاتے ہوتے ہیں۔ کیا تو ان گلیوں کو یاد کرے گی جن میں ہم چلتے تھے۔ تیری اُنگلیاں میری اُنگلیوں میں اس طرح پیوست تھیں جیسے..."

ناژلا کی انہی اُنگلیوں میں آج یقیناً ایک سٹین گن پیوست ہو گی کیونکہ کل تک [illegible] میں ہم ناژلا اور مستنصر تھے اور آج لبنان میں... ایک رومن کیتھولک اور ایک مسلمان... دل گرفتہ۔

میں نے ایک سروس ٹیکسی کو ہاتھ دیا اور ہوٹل واپس آ گیا۔

احمد بدستور اپنے نقشوں میں مگن تھا۔ اُس نے آہٹ پر سر اُٹھایا۔ "تم [illegible] نہیں گئے؟"

"شیاح میں فائرنگ کی وجہ سے ٹور کینسل کر دیا گیا ہے۔"

"اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تمہاری کوچ شیاح کے علاقے میں سے گزر کر بعلبک جائے گی تو میں وہاں رابطہ قائم کر کے ایک بے خطر سفر کی ضمانت دے سکتا تھا، بہر حال!"

"اگر ہم شیاح سے زندہ سلامت نکل جاتے تو آگے فآنا میں ناژلا اسعد سٹین گن پکڑے منتظر ہوتی..." میں نے بد دلی سے کپڑے بدلے اور لیٹ گیا۔

"ناژلا اسعد؟" احمد چونکا۔ "وہ کون ہے؟"

"لبنان کے دیودار کے درختوں اور پہاڑی چشموں ایسی ایک لڑکی..." میں کروٹ بدل کر پھر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ احمد نے مزید کریدنا مناسب نہ جانا اور اپنے کام میں محو ہو گیا۔

دس بجے کے قریب جب میں سو کر اُٹھا تو احمد اُسی حالت میں اور اُسی توجہ سے اپنے نقشوں پر لکیریں کھینچ رہا تھا۔

"کیا تم نے ناژلا اسعد کو خواب میں دیکھا تھا؟..." وہ ابرو چڑھا کر مسکرایا۔ "خیر اگر تم بعلبک نہیں جا رہے تو اس کا مطلب ہے کہ تم آج فارغ ہو اور میرے ساتھ جا سکتے ہو۔"

ٹیکسی بیروت کے ایسے حصّوں میں سے گزر رہی تھی جو میرے لئے بالکل اجنبی تھے۔ میری دوڑ صوبح سکوئر سے الحمرا تک تھی اور یہ حصّے شہر کے کناروں پر واقع تھے۔ شاہراہوں اور چوراہوں سے ہٹ کر، دیہاتی سی فضا لئے ہوئے ٹیکسی ایک تنگ گلی میں داخل ہوئی۔ چند گز کے فاصلے پر ایک بیری کیڈ تھا۔ بوریوں کی دیوار پر سٹین گن کی تھوتھنی تھی۔ احمد نے مسلح فلسطینیوں سے کچھ دیر گفتگو کی جو یقیناً میرے حوالے سے تھی اور پھر ہم ٹیکسی چھوڑ کر پیدل چلنے لگے۔ ایک فلسطینی ہمارے ساتھ ہو لیا۔ گلی ہمارے ہاں کے کسی محلّے کی طرح تھی۔ مرد کرسیاں ڈالے دروازوں کے

باہر بیٹھے ہوئے تھے، بچے سائیکلیں چلا رہے تھے اور چند ریڑھی والے خورد و نوش کی اشیاء فروخت کر رہے تھے۔ ایک بظاہر بوسیدہ عمارت کا دروازہ کھٹکھٹانے پر ایک ڈھلتی عمر کی خاتون باہر نکلی اور پھر احمد کو دیکھ کر اندر آنے کا اشارہ کیا۔ سیڑھیاں طے کرنے کے بعد ہم ایک نہایت جدید طرز سے سجے ہوئے مختصر کمرے میں داخل ہوئے ہمارا راہبر فلسطینی اور خاتون باہر چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد تین فلسطینی کمرے کے اندر آئے۔ اُن میں دو احمد کے ہم عمر ہوں گے اور تیسرا ایک عمر رسیدہ بوڑھا، اور وہ سب مسلح تھے۔ احمد نے میرا تعارف کرایا اور پھر اُن سے باتیں کرنے لگا۔ اُس نے انہیں وہ نقشے دکھائے جن پر وہ پچھلے دو روز سے سُرخ لکیریں کھینچتا رہا تھا اور پھر فلسطینیوں کے کہنے پر اُن میں کچھ ردّ و بدل کرنے لگا۔ اتنے میں وہ خاتون پھر آگئی، قہوہ اور میٹھی روٹی ایک ٹرے میں سجائے۔ ہم سب قہوہ پینے لگے۔

نوجوان فلسطینی تھوڑی بہت انگریزی جانتے تھے۔ اُن میں سے ایک کا بھائی انجنیئرنگ یونیورسٹی لاہور میں زیرِ تعلیم تھا اور وہ پاکستانیوں کے اخلاق اور مہمانداری کا بے حد مدّاح تھا۔

"ہم پاکستانیوں سے محبت کرتے ہیں۔" اُس نے انگلیوں سے الفتح کا "وی" بناتے ہوئے کہا۔

"اور بھوتو کو نہ بھولو۔" بوڑھا فلسطینی بولا "بھوتو گڈ مین۔"

احمد نے میری طرف دیکھا اور پھر اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا "کیا کوئی ایسا کام ہے جو ہم اس دوست کے سپرد کر سکتے ہیں؟"

اُنھوں نے خوشگوار حیرت سے میری جانب دیکھا۔ عربی میں چند فقروں کا تبادلہ ہوا اور پھر بوڑھے نے پوچھا "کیا تم شادی شدہ ہو؟"

"ہاں۔"

"بچے بھی ہیں؟"

"سلجوق اور سمیر۔"

وہ اتنی بے ساختگی سے ہنسے جیسے میرے بیٹے ان کے سامنے کوئی اوٹ پٹانگ حرکتیں کرنے لگے ہوں۔

"کیا آپ کوئی ہتھیار چلا سکتے ہیں؟"

"لبلبی دبانا کونسا مشکل کام ہے؟" میں انہیں کیسے بتاتا کہ خطرناک ترین ہتھیار جس کے استعمال پر مجھے دسترس حاصل ہے غلیل کہلاتا ہے۔

"آپ بیروت میں کتنا عرصہ قیام کر سکتے ہیں؟"

"زیادہ سے زیادہ تین چار ماہ . . ." میں نے گھریلو مجبوریوں کا ذکر کیا۔ بہن بھائیوں کی شادیاں، بوڑھے والدین اور منتظر بیٹے۔

اُنہوں نے سر جوڑے اور کھُسر پھُسر کرنے لگے۔ میں اس دوران انٹرویو کے لئے حاضر کسی امیدوار کی طرح پاؤں کی انگلیاں سکیڑتا بیٹھا رہا۔

"السیدی مستنصر!" بالآخر بوڑھا گویا ہوا۔ "ہم آپ کے شکر گزار ہیں کہ آپ نے ہمارے ساتھ چلنے کی خواہش کا اظہار کیا اور آپ پہلے شخص نہیں ہیں جنہوں نے ایسا کیا ہو ہمارے لئے ہتھیار اُٹھانے والوں میں پاکستانی بھی ہیں . . . پچھلے ماہ اسرائیل کے اندر ہمارے چھاپہ مار گروپ کے جو نوجوان شہید ہوئے، اُن میں سے ایک آپ کا ہم وطن تھا . . ."

"اور ہمارے ساتھ چند یہودی بھی ہیں، ترقی پسند اور صیہونیت کے خلاف ہماری جدوجہد پر یقین رکھنے والے . . ." نوجوان فلسطینی کہنے لگا۔

دستک ہوئی، اُن تینوں کی آنکھیں مجھ سے اُٹھ کر دروازے پر گئیں۔ وہی خاتون تازہ قہوے کا ایک صراحی نما برتن لے کر اندر آگئی۔

"تو آپ مہربان دوست ہیں . . ." بوڑھا پھر متوجہ ہوا "ہمارے لئے یہی بہت ہے کہ آپ ہمارے ساتھ ہیں۔ یہ خیال ہمیں تقویت بخشتا ہے لیکن . . . آپ تین چار

روز تک ایک ترک بحری جہاز پہ اطالیہ جا رہے ہیں؟“
”ٹکٹ بآسانی واپس ہو جائے گا...“
”نہیں، آپ اُس جہاز پر ضرور سوار ہوں کیونکہ چند روز میں...“ بوڑھے نے احمد کی طرف دیکھا جس نے بات آگے بڑھائی۔ ”تمہاری گھریلو ذمّہ داریاں ایسی ہیں کہ... ہم چاہتے ہیں کہ اگر فی الحال ہم اپنے گھر واپس نہیں جا سکتے تو تم ضرور جاؤ... کیونکہ چند روز میں یہ شہر جلے گا اور... مجھے یقین ہے کہ تم اپنے بچّوں سے پیار کرتے ہو...“
”ہاں... بالکل بوڑھی دادی امّاؤں کی طرح حماقت کی حد تک...“
”تم انہیں ہمارا پیار دینا...“ بوڑھے نے میرا کندھا تھپکا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ ”اور ایک روز تمہارے بیٹے میرے پوتوں کو ملنے کے لئے فلسطین آئیں گے...“

— زمین کے چھن جانے کا غم نہیں
باز کے پَر بھی تو جھڑ جایا کرتے ہیں
تم نے درختوں کی چوٹیاں کاٹ لیں
مگر جڑیں باقی رہ گئیں

احمد نے مجھے الحمرا میں اُتار دیا۔ اُس نے مجھے راستے میں بتایا تھا کہ تنظیم کو صرف ہتھیاروں کے استعمال میں مہارت رکھنے والے افراد کی ضرورت تھی اور اس کے علاوہ میری خاندانی مشکلات کے پیشِ نظر وہ مجھے قبول کرنے میں تامّل کر رہے تھے۔
احمد کے ہمراہ ان حرّیت پسندوں سے ملاقات کا تذکرہ شاید میں اس سفرنامے میں نہ کرتا اگر وطن واپسی پر مجھے ایک ناخوشگوار صورتِ حال کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ پاکستانی پریس میں ایک بے نام مصنّف کے بارے میں خبر چھپی کہ اُس نے بیروت میں تنظیم آزادی کے ساتھ رابطہ قائم کیا اور صرف اس لئے اُن کا ساتھ نہ دیا کہ تنخواہ کی جو پیشکش کی گئی وہ نہایت قلیل تھی۔ چونکہ میں بھی حال ہی میں بیروت سے لوٹا تھا اس لئے یار لوگوں

نے بلا تحقیق یہ خبر مجھ سے منسوب کر دی بلکہ ایک صاحب نے کسی ادبی جلسے میں مقالہ پڑھتے ہوئے میرے نام کے ساتھ اس کی تشہیر بھی کر دی... اوّل تو تنظیم آزادیٔ فلسطین ایک باقاعدہ پروفیشنل فوج نہیں ہے جس میں آپ تنخواہ کی بنیاد پر ملازمت کرتے ہیں پھر آزادی کی خواہش رکھنے والے یہ فلسطینی کبھی سوچ بھی نہیں سکتے کہ وہ دوسروں کو روپے پیسے کا لالچ دے کر اپنا رفیق بنائیں بلکہ انہیں تو دشواری پیش آتی ہے کہ وہ کس طرح ان ہزاروں انصاف پسند نوجوانوں میں سے چند ایک کو چُنیں جو ان کی جدوجہد میں شریک ہونا چاہتے ہیں۔ بیروت آنے سے پیشتر کسی گوریلا تنظیم میں شمولیت میرے دائرۂ خیال سے بالکل باہر تھی لیکن احمد کے ساتھ طویل نشستیں اور شدید تجربے میں سے گزرنے کی خواہش نے مجھے اُکسایا کہ زندگی بے حساب گزر رہی ہے، گزرے گی۔ اس کے چند روز و شب حصولِ انصاف کی خاطر صرف ہو جائیں تو کیا ہرج ہے... یہ ایک مکمل طور پر ذاتی واردات تھی جس کا ذکر صرف ایک مضحکہ خیز الزام سے بچاؤ کی خاطر کیا گیا ہے، یعنی ریکارڈ اگر کہیں رکھا جاتا ہے تو ذرا وہ سیدھا ہو جائے۔

ہاں تو احمد نے مجھے الحمرا میں اُتار دیا جس کے سائن بورڈ، دکانوں کے نام سینما اور قہوہ خانے مجھے ازبر ہو چکے تھے۔ میں اُن سے مُنہ موڑ کر دائیں ہاتھ اُترتی ایک گلی میں آیا اور بیروت انٹرنیشنل یونیورسٹی کی جانب چلنے لگا... کسی نباتاتی باغ والی ہریاول اور درختوں کے درمیان ایک ڈھلوان پر جو سمندر تک جاتی تھی، یونیورسٹی کی عمارتیں نظر آ رہی تھیں۔ طالب علم قابلِ فہم طور پر کم ہی دکھائی دے رہے تھے البتہ سرسبز جھنڈوں میں کچھ ایسے چہرے تھے جو بیروت کے آسمان کی تباہ کن تاریکی کے باوجود روشن تھے۔ ایک دوسرے کی لمحاتی قُربت خوفِ جنگ پر حاوی ہو رہی تھی۔
ایک پاکستانی لگتے ہوئے صاحب بینچ کے دُوسرے سرے پر آ کر براجمان ہوئے اور ایک کتاب میں غرق ہو گئے۔ میں نے معذرت کے ساتھ قومیت پوچھی تو پاکستانی ہی نکلے، گفتگو شروع ہو گئی۔ مُنیر صاحب چک نمبر ۳۰۲ گ۔ب فیصل آباد کے ہائی سکول میں ٹیچر تھے۔

یونیسکو کے کسی سکالرشپ کے حقدار ٹھہرے اور پچھلے ایک برس سے بیروت یونیورسٹی میں ٹیچنگ ڈپلومہ کے لئے جد و جہد کر رہے تھے۔ یونیورسٹی کے آزاد ماحول، لڑکیوں کے بے حیا لباس، بیروت کی بیباکی اور اسی قسم کی دیگر خوبصورت چیزوں سے تنگ آئے ہوئے تھے اور بار بار چک نمبر ۳۰۲ گ۔ ب فیصل آباد کی اخلاقی قدروں اور شریفانہ ماحول کو یاد کرتے تھے۔ قدرے شرمیلے بھی تھے۔ چنانچہ یونیورسٹی کے سوئمنگ پول میں منہ اندھیرے جا کر نہا آتے تھے کیونکہ بقول اُن کے اس کے بعد وہاں ننگی ننگی لڑکیاں آکر نہانے لگتی تھیں۔ میں پاکستانی سفارت خانے جانے کے لئے اُٹھا تو وہ ازراہِ ہمدردی ساتھ ہوئے، الحمرا پہنچ کر وہ شروع ہو گئے "بس مستنصر صاحب آپ کو کیا پتہ کہ ہم اپنے آپ کو کتنی مشکلوں سے ———— یہاں محفوظ رکھتے ہیں... صرف اس الحمرا کے میل ڈیڑھ میل کے علاقے میں سو سے زیادہ شراب خانے ہیں۔ میں نے خود گنے ہیں یعنی ہر پندرہ بیس گز کے فاصلے پر ایک بار... وہ جو سیڑھیاں نیچے اُتر رہی ہیں، یقین کیجئے اُن کے نیچے بار ہے اور اُدھر وہ جو کتابوں کا سٹور لگ رہا ہے اُس میں بھی شراب خانہ ہے... اور لڑکیاں تو صاحب بالکل برہنہ گھومتی ہیں، ننگ پننگی... وہ دیکھئے وہ بی بی راکھ کے رنگ کے بالوں والی، سُرخ شوز، نارنجی سکرٹ اور گلابی نیل پالش میں جو ہماری طرف آرہی ہے تو اُس نے بلاؤز کے نیچے کچھ بھی نہیں پہنا ہُوا..."

"اچھا...؟" میں نے باچھیں کھِلا کر کہا۔

"جی؟" انھوں نے تیوری چڑھا دی۔

"میرا مطلب ہے لاحول ولا..."

"بالکل... بس بھر کپڑے کی بنیان سی پہنی ہوتی ہے۔ سب کچھ تو نظر آرہا ہے دیکھئے تو سہی... حد ہے بے شرمی کی..." اتنے میں وہ خاتون ہمارے قریب آکر گزر گئیں، منیر صاحب گردن گھما کر اُسے پیچھے سے دیکھنے لگے اور بدستور بدنی تفصیلات بیان کرتے رہے۔ "اور ذرا دیکھیں ہِل کس طرح رہی ہے چلتے ہوئے... حد ہے..." الحمرا سٹریٹ

کے اختتام تک مُنیر صاحب کہنیاں مار مار کر مجھے متوجہ کرتے رہے اور "حد ہے، حد ہے" کی گردان کرتے ہوئے ساتھ میں خواتین کے مکمل سراپے بھی بیان کرتے رہے۔ رودشے پہنچ کر انہوں نے باقاعدہ اپنا دفاع شروع کر دیا۔ سمندر میں نہاتی لڑکیوں کو دیکھتے ہی دوسری جانب منہ موڑ لیتے اور اس ایک جھلک کی مدد سے اُن کے نہانے کے لباس اور جسمانی بلندیوں اور پستیوں کی تفصیل نہایت دُکھ سے سناتے جاتے "گھروں میں غسل خانے موجود ہیں تو پھر یہاں آکر سمندر میں اس طرح گیلے گیلے جانگیے پہن کر نہانے کا مطلب؟... اب آپ جان گئے ہوں گے کہ ہم کن امتحانوں سے گزرتے ہیں اور پھر بھی اپنے آپ کو محفوظ رکھتے ہیں۔" میں نے اقرار کیا کہ میں جان گیا ہوں اور آپ کی ہمت کی داد دیتا ہوں اور پھر اُن سے اجازت لے کر سفارت خانے کی طرف چل دیا۔ وہ بدستور ساحل پر گھومتے رہے۔

پاکستانی سفارت خانے میں طالب میر ایک عجیب و غریب مشکل سے دوچار تھے۔ پندرہ پاکستانیوں کا ایک گروہ سفارت خانے میں داخل ہوا اور اعلان کیا کہ جناب ہم دو روز سے بھوکے ہیں، ہمارے پاس ایک دمڑی بھی نہیں۔ جس فندق میں ٹھہرے تھے، وہاں سے نکالے گئے ہیں اس لئے آپ کھانا کھلائیے، رہائش کا بندوبست کیجئے اور ہمیں جرمنی پہنچانے کا بندوبست کیا جائے، ہم وہاں سمگل ہونا چاہتے ہیں.. چونکہ سفارت خانے کے پاس اس قسم کا کوئی ایمرجنسی فنڈ موجود نہ تھا اس لئے طالب میر صاحب نے اپنے پلّے سے انہیں خوراک کے لئے رقم دی اور ایک شب کے لئے سفارت خانے کی چھت پر سونے کی اجازت دے دی۔ قسمت کے یہ شکاری اگرچہ بُرے حالوں میں تھے مگر اُن کا ایک نوجوان ساتھی باقاعدہ لِشک رہا تھا۔ بال تیل سے چُپڑے ہوئے، بوسکی کی شلوار قمیض، انگلیوں میں سونے کی انگوٹھی، کلائی پر گھڑی، چمکتے بُوٹ، گورا چِٹّا اور چمکتا ہُوا، کبھی اس ساتھی سے چھیڑ خوانی کرتا کبھی دوسرے کی کمر میں کہنی مار کر ہنستا ہنستا دوہرا ہو جاتا۔ اُس پر نظر پڑتے ہی میر صاحب نے قدرے درشتگی سے کہا "اگر آپ واقعی دو روز سے بھوکے

ہیں تو اپنے اس ساتھی کی گھڑی اور انگوٹھی فروخت کر کے خوراک حاصل کر لیتے۔"
اُنہوں نے آپس میں نگاہوں کا تبادلہ اس طرح کیا جیسے یہ بات اُن کی سمجھ میں نہ آئی ہو۔ میر صاحب نے پھر سوال دوہرایا۔ وہ سب قدرے خفا ہو گئے اور ان میں سے ایک جو خاصا اُدھیڑ عمر تھا، بولا "صاحب، بال بچوں سے دُور، وطن سے دُور، بیویوں سے دُور... کچھ تو خیال کریں، کبھی کسی نے گھر والی کے گہنے بھی بیچے ہیں؟"

میر صاحب نے صدمے سے دوچار ہوتی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں ہونٹ دانت تلے دبا کر مسکراہٹ روک رہا تھا۔ اُنہوں نے اپنے پائپ کو بھرا اور دانتوں میں دبا لیا۔

بیروت یونیورسٹی کے نواح میں ایک آٹھ منزلہ عمارت کی لفٹ تیزی سے اُوپر جا رہی تھی۔ آٹھویں منزل پر میں اور میر صاحب باہر آ گئے۔

"اس طرف؟" میں نے طویل برآمدے کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں اس طرف۔" میر صاحب ایک تاریک کونے میں رُوپوش آہنی سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔

"یہ تو غالباً چھت پر جانے کے لئے ہیں؟"

"ہاں۔" وہ پُر پیچ سیڑھیوں پر گھومنے لگے۔ میں بھی پیچھے ہو لیا۔

آج پچھلے پہر میر صاحب کے ایک دوست کے ہاں بیروت یونیورسٹی میں زیر تعلیم چند پاکستانی نوجوانوں نے نہ صرف میری تحریروں کے پُر شوق حوالے دیئے بلکہ جوش عقیدت میں مجھے اپنے فلیٹ پر رات کے کھانے کے لئے بھی مدعو کر ڈالا۔ اب میں سیڑھیوں پر گھومتا ہُوا اُوپر جا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ فلیٹ تو آٹھویں منزل پر ختم ہو گئے، جانے کونسے آسمان پر مقیم ہیں۔

یکدم سیڑھیاں ختم ہو گئیں اور ہم ایک نیچی چھت کے برآمدہ نما کمرے میں چلے گئے۔

... نے۔ دیواروں پر وال پیپر کی بجائے پوسٹر چپکے ہوئے تھے۔ ایسے پوسٹر جو اگر فیصل آباد کے چک نمبر ۲۰۲ گ۔ب کے منیر صاحب بھی دیکھ لیتے تو محفوظ نہ رہ سکتے، برباد ہو جاتے۔ خاموش اور مدھم روشنی، ہلکی ہلکی موسیقی۔ اس کمرے کے آگے عمارت کی چھت تھی جس پر ہونے والے انتظامات کسی بارات کے منتظر دکھائی دیتے تھے۔ چھت کی پیشانی بیروت کے آسمان کی قربت میں تھی۔ دیواروں پر مشعلیں جل رہی تھیں اور ان کے نیچے بیل دار پودوں کے ساتے اور ان کی مہک تھی۔ ایک کونے میں الاؤ روشن تھے جن پر سٹیل کی دیگیں نارنجی نظر آ رہی تھیں۔ درمیان میں ایک میز پر کسی چھوٹے موٹے ریستوران کے مینو پر درج تمام تر لوازمات ہاتھ بے اختیار بڑھانے کے انداز میں سجی تھیں۔ ہم وطن ہمارے منتظر تھے، ہم نے اُن سے ہاتھ ملائے تو وہ ہمارے ہاتھوں کو تھامے میز کی طرف لے گئے۔

بیروت کے بازاروں میں رینگتی تاریک دہشت بہت نیچے تھی۔ پوری آٹھ منزلیں نیچے۔ یہ وسیع صحن جس میں مشعلیں ہلکی ہلکی ہوا میں پھڑپھڑاتی جل رہی تھیں شہر سے کٹ کر اُوپر آ چکا تھا آسمان کی خاموش نزدیکی میں۔ آس پاس کی عمارتوں کی پہلی چند منزلوں پر واقع کھڑکیاں یا تو بند تھیں اور یا اُن کے اندر کی روشنی پردوں میں مٹی ہوئی تھی۔ اُن سے اُوپر کہیں کہیں ایک آدھ کھڑکی کھلی تھی کہ وہ نیچے بازار میں سے فائر ہونے والی گولی کی زد سے تقریباً باہر تھیں۔ اندر کمرے میں کسی نے "ہیر رانجھا" کا کیسٹ آن کر دیا۔ مکان کے ساتھ گھر بھی قریب آ گیا۔

بلند عمارتوں کے چہرے کہیں کہیں سے روشن تھے مگر اُن کے پاؤں شہر کی گلیوں میں تاریک تھے اور ان میں لوگ تھے، انتظار کرتے ہوئے، اپنے اپنے پتے چھپائے، کس کے پاس بادشاہ ہے اور کس کے پاس جوکر؟

جب بھی کوئی مہمان جانے کے لئے اُٹھتا تو میں بھی اپنی نشست پر پہلو بدلتا مگر "آپ ابھی نہیں جا سکتے۔" اور میں خود اس عارضی عافیت کی چھت سے اُتر کر دہکتی ہوئی

زمین پر قدم رکھنے سے گریزاں تھا۔

میر صاحب کھانے کے فوراً بعد چلے گئے کیونکہ وہ اپنے بچوں کے بارے میں فکرمند تھے۔

روشے کا ساحل سیاہ تھا۔ اس پر جھکے شاندار ہوٹلوں کے سلسلے نے آئندہ چند روز میں آگ سے روشن ہو کر اپنی بنیادوں پر گرنا تھا۔

کمرے میں سے آتی ہوئی ہیر کی آواز مجھے فریب دے رہی تھی۔ یہاں سے اُٹھو گے تو گھر چلے جاؤ گے۔

میں نے گھڑی پر وقت دیکھا، ایک بج رہا تھا۔ مشعلوں کی لو بھی تاریکی کے بوجھ سے تھکتی ہوئی سمٹ رہی تھی۔

ایک نوجوان مجھے نیچے چھوڑنے آیا تو پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ نو بجے سے پیشتر واپسی کے قانون کو توڑے ہوئے چار گھنٹے گزر چکے ہیں اور میں بیروت میں ہوں اور یہ ہوٹل صوریح سکوئر میں ہے۔ قابلِ فہم طور پر سڑک خالی تھی اور سیاہ تھی۔ ہم خاصی دیر تک میں کھڑے انتظار کرتے رہے، بالآخر ایک ٹیکسی دکھائی دی۔ ڈرائیور کے ہمراہ اس کا ایک ساتھی بھی تھا۔ میرے میزبان نے عربی میں اُن سے کچھ کہا اور میں ٹیکسی میں سوار ہو گیا۔ اگلی نشست پر دونوں لبنانی نہایت مدھم آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ ان کے سروں کا زاویہ بدلتا تو میں چونک جاتا، شاید وہ میرے بارے میں کچھ کہہ رہے ہیں۔ تاریک راہوں میں ٹیکسی کے اندر جلنے والی روشنی سڑک پر بچھ کر ہمارے پیچھے پیچھے سمٹتی آ رہی تھی۔

میرے چاروں طرف شہر کے گھر اور محلّے رات کے سمندر کی سطح کے نیچے ساحل ... رہے تھے۔ کس کا دم ساتھ دیتا ہے اور وہ قائم رہتا ہے اور کس کا دم اُلٹتا ہے ... جنگ کے پانیوں کو پھیپھڑوں میں بھر کر سطح پر پھولے ہوئے بدن سے تیرتا ہے ... ہاتھ میں بادشاہ ہے اور کس کے ہاتھ میں جوکر... انتظار!

بیروت — خدا حافظ

دھماکہ اتنا شدید تھا کہ میں بے اختیار لڑھکتا ہوا بستر سے فرش پر منتقل ہو گیا۔ اسی ...ے کھڑکی کا ایک بڑا شیشہ فریم سے جُدا ہو کر قالین پر آ گرا۔ میں سانس روکے سفید چادر میں ...تی کی طرح لیٹا پڑا رہا۔ باہر رات تھی۔ کمرے کے ٹھہرے ہوئے اندھیرے میں حرکت ...لی... احمد جو میری طرح فرش پر پھینک دیا گیا تھا، دھیرے سے اُٹھا اور نیند میں چلنے ...لے ایک بچے کی طرح ہاتھ پھیلائے پھر بستر پر دراز ہو گیا... ایک اور زوردار دھماکہ ...ا، کھڑکی کے بقیہ شیشے کانپے۔

"احمد!"

"کیا ہے؟" وہ تکیے میں سے بڑبڑایا۔

"یہ دھماکے کیسے ہیں؟"

"سو جاؤ، کچھ بھی نہیں۔"

"لیکن کیسے سو جاؤں؟" میں نے جھلّا کر کہا۔ "باہر پتہ نہیں کیا کیا چل رہا ہے۔"

"ہینڈ گرینیڈ پھٹے ہیں، شاید اسی عمارت کے کسی حصے میں... سو جاؤ، سو جاؤ۔"

احمد کی بے اعتنائی میرے لئے ناقابلِ فہم تھی۔ باہر جو کچھ بھی پھٹ رہا ہے اگر کھڑکی ...ستے اندر آ گرے اور کمرے میں پھٹ جائے تو! مگر وہ دودھ سے شیراب ہو کر سونے ...ے بچے کی طرح پاؤں پسارے چھوٹے چھوٹے خرّاٹے لے رہا تھا۔ میں بدن پر لپٹی ہوئی ...سمیت لڑکھڑاتا ہوا اُٹھا اور رینگتا ہوا بستر پر لیٹ گیا... تھوڑی دیر بعد سٹین گن

کا ایک برسٹ فائر ہُوا . . . میں ایک منہناتے ہوئے قہقہے کے انتظار میں رہا مگر وہ
نہ پہنچا۔ صرف دوڑتے ہوئے قدم اور آوازوں کا ملا جلا شور . . . اس فائر کا جواب
کہیں دُور سے آیا اور پھر باقاعدہ تبادلہ شروع ہو گیا۔ فائرنگ کی آواز بے حد معمولی
اور جعلی لگ رہی تھی جیسے کوئی کھوپڑی دانت کٹکٹا رہی ہے یا ٹین کی چھت پر کنکر
برس رہے ہیں۔ اس دوران ایک اور دھماکہ سنائی دیا، کانوں کے قریب، شاید
ہماری کھڑکی کے عین نیچے۔ فائرنگ اتنی گھنی اور شدید ہو رہی تھی کہ کسی ایک سٹین گن
کا آہنی بہاؤ علیحدہ نہیں ہو پاتا تھا . . . یکدم میرے ذہن میں یہ خدشہ اُبھرا کہ ہو
سکتا ہے حملہ آور فلانجی ہوں اور پچھلے اپریل کی طرح آج بھی اس ہوٹل میں گھس کر
مہمان حضرات کو شہید وغیرہ کر دیں۔

"احمد"۔ میری آواز میں خطرے کا گھگھیاتا ہُوا سائرن تھا۔

"سو جاؤ۔" ایک انتہائی بیزار آواز آئی۔

"احمد کیا تم جانتے ہو کہ فلانجیوں نے پچھلے اپریل اس ہوٹل میں مقیم چند مہمانوں کو
ہلاک کر ڈالا تھا؟"

"ہاں۔"

"تو پھر؟"

"تو پھر کیا . . . ہوتا ہی رہتا ہے، سو جاؤ۔"

میں بستر سے اُٹھا اور جُھکا ہُوا احمد کے قریب چلا گیا۔ "اگر کسی نے کھڑکی میں
سے ہینڈ گرنیڈ پھینک دیا تو؟"

احمد مجبوراً اُٹھ بیٹھا۔ "تم خوفزدہ ہو؟"

"بُری طرح۔"

"ہاں انسان ہتھیار کے بغیر بے سہارا محسوس کرتا ہے۔" وہ جماہیاں لیتا ہوا
بستر سے اُترا، اپنا سُوٹ کیس گھسیٹ کر باہر نکالا اور استری شدہ قمیضوں

بنیانوں کی تہہ میں ہاتھ ڈال کر ایک پستول نکالا اور مجھے تھما دیا۔ "بھرا ہُوا ہے،
دروازے والی دیوار کے کونے میں بیٹھ جاؤ اور اگر دروازہ یکدم کُھلے تو . . . شُوٹ۔"

"شُوٹ؟" میں نے بے یقینی سے پوچھا۔

وہ شاید اندھیرے میں مُسکرایا ہو گا۔

میں کونے میں جا کر ایڑیوں کے بل بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد احساس ہُوا کہ میں نے
پستول کو ویسے ہی تھام رکھا ہے، لبلبی پر انگلی نہیں جمائی اور نہ ہی نالی کا رُخ دروازے
کی جانب کیا ہے۔ چنانچہ بڑی مشکل سے لبلبی تلاش کر کے اُنگلی لپیٹی اور اُسے سیدھا کر دیا۔

"اب تو خوفزدہ نہیں ہو؟"

"اب بھی ہوں . . . دروازے کا تو بندوبست ہو گیا مگر کھڑکی میں سے آنے والے
ہینڈ گرنیڈ کا کیا ہو گا؟"

"اس کے بارے میں کچھ نہیں ہو سکتا . . ." اُس نے پاؤں بستر پر رکھے اور لیٹ گیا۔

"کھڑکی بند تو کی جا سکتی ہے ناں؟"

"شیشے کی ہے، فرق نہیں پڑے گا۔" وہ اُونگھنے لگا۔ موت کا ایک دن معین ہے
پر اُس کا ایمان غیر متزلزل دکھائی دیتا تھا۔

باہر متواتر فائرنگ ہو رہی تھی، چیزیں ٹوٹ رہی تھیں۔

میں نے یوں کونے میں چپکے ہاتھ میں پستول تھامے اپنے آپ کو کچھ کچھ احمق محسوس
کیا۔ "تمہیں اتنے شور میں نیند آ جاتی ہے؟"

"ہُوں"۔ وہ بڑبڑایا۔ "کون سے شور میں؟" اور آنکھیں مَلتا ہُوا اُٹھ کھڑا ہُوا۔
"ہاں یہ . . ." اُس نے سُستی سے پھر اپنا سُوٹ کیس کھولا، ایک اور پستول نکالا اور
کمرے کے دوسرے کونے میں جا بیٹھا۔ "اب خوش ہو؟"

میری آنکھیں دروازے پر اتنی شدت سے چپکی ہوئی تھیں کہ پپوٹے دُکھ رہے
تھے، کواڑ ہلتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ لبلبی پر لپٹی اُنگلی پسینے سے تر تھی، پھسلتی ہوئی۔

باہر سے آنے والی فائرنگ کی آواز جتنی شدت اختیار کرتی، اُسی حساب سے پستول پر میری گرفت سخت تر ہو جاتی جیسے میری نم انگلیوں میں گرم ہوتی یہ دھات میرے جسم کو بلٹ پروف بنا دے گی۔ یہ طلسمان ہے جو مجھے محفوظ رکھے گا۔ میں نے ایک لمحے کو دروازے سے نظریں ہٹائیں اور پستول کی نالی کو دیکھا جو میری ناک سے چھ انچ کے فاصلے پر خفیف سی لرز رہی تھی اور پھر دروازے پر آنکھیں چپکا دیں... میں نے پستول کی طرف دیکھا... میں یہاں کیا کر رہا ہوں؟ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ میں نے اس گھڑے سے پیاس کیوں بجھائی جس میں دیوانگی سیاحت کے پانی تھے۔ کولھو کے بیل کی زندگی کتنی خوبصورت تھی، ایک ڈگر پر، شب و روز ایک ہی روٹین کی تابع، برس ہا برس گزر جاتے ہیں اور وہی چہرے، وہی ایک ناشتہ دکان، چھ آنے یا ایسف ادتے یوسف... گھر واپسی پر ٹیلی ویژن کے سامنے بُت بنے بیٹھے رہنا لیکن اپنے گھر میں... پُرسکون، دھماکوں سے پاک، ٹھیک ہے اُس زندگی کا حساب نہیں تھا مگر انسان متواتر زندہ تو رہتا ہے۔ کبھی اُس کی کھڑکی تلے گرنیڈ نہیں پھٹتے، اسٹین گنوں کے برسٹ نہیں چلتے اور وہ ایک بھرے ہوئے پستول کو تھامے خون میں توجہ اور سکوت کی جتنی قوت ہوتی ہے اُسے آنکھوں کے راستے دروازے پر منتقل کرتا ہوا اگلے سانس کی بے یقینی میں تو سانس نہیں لیتا.. متواتر زندہ تو رہتا ہے۔

آج رات دس بجے ترک جہاز اکڈنیز بیروت کی بندرگاہ سے لنگر اٹھا رہا تھا اور میں اُس کا متوقع مسافر تھا... پچھلے چند روز زیادہ تر اسی چھت کی نیم عافیت میں گزرے۔ احمد ایک ہمدرد اور اپنے پتھر کے چہرے کے نیچے ایک سیاہ حسِ مزاح رکھنے والا دوست اور ساتھی ثابت ہُوا تھا۔ میں صرف خوراک خریدنے کے لئے باہر جاتا یا کبھی کبھار ہوٹل کی پُشت پر واقع ایک دیسی قسم کے قہوہ خانے میں چلا جاتا جس کا قہوہ شاید کسی سکنڈ بوٹی سے کشید کیا جاتا تھا کہ میرے اعصابی تناؤ کو یکدم نارمل کر دیتا اور حقے کے دو کش مجھے آس پاس سے لمحاتی طور پر بے خبر کر دیتے۔ ایک دو مرتبہ الحمرا کی طرف... زیادہ سے زیادہ دکانیں بند تھیں اور سِی تھرو خواتین یکسر غائب ہو چکی تھیں البتہ مسکراتے تھتے والا البنانی کبھی مایوس نہ کرتا۔ وقت کی پابندی کرتا اور ہر صبح شاید ہماری ہی تفریح کی خاطر دو چار برسٹ ضرور چلاتا اور ہنس ہنس کر دوہرا ہو جاتا... میں اُس کی آمد کا انتظار رہتا اور ایک صبح اُس کے پہلے فائر کو سن کر میں نے اپنی گھڑی درست کی، چار بج کر دس منٹ...

تقریباً ایک گھنٹے سے ہینڈ گرینیڈ کا کوئی دھماکہ نہیں ہُوا تھا البتہ فائرنگ وقفوں سے ہو رہی تھی... اور آج رات دس بجے بیروت کی بندرگاہ سے ترک جہاز اکڈنیز کو رواں ہونا تھا، اذیتوں سے محبتوں اور رعنائیوں کی طرف... صبح کے آثار کے ساتھ جیسے متحارب قوتوں کے ہاتھ تھکنے لگے اور چھ بجے کے قریب فائرنگ بالکل ختم ہو گئی۔

... تھوڑی دیر بعد قدموں کی سرسراہٹ سنائی دی، بازار میں حرکت پیدا ہوئی اور پھر وہ روزمرہ کی آوازوں سے بھر گیا... احمد مُنہ پر ہتھیلی رکھے تھکا وٹوں کو روکتا اُٹھا... میں نے خالی ہاتھ سے پستول کی نالی تھامی اور دستے پر سیمنٹ ہوتی انگلیوں سے بمشکل علیحدہ کیا۔

احمد نے پستول سوٹ کیس میں رکھے اور اپنے نقشے نکال کر بیٹھ گیا "یہ آوازیں الگ نہیں ہیں۔ خوانچہ فروشوں کی دُہائی، ٹریفک کا شور، بچوں کی آوازیں، فائرنگ اور دھماکے، یہ سب ایک ہی بہاؤ میں ہمارے کانوں تک پہنچتی ہیں۔ اگر ہم ہر دھماکے پر چوکنے ہو کر پستول نکالتے رہیں تو زندگی معطل ہو جائے۔"

"اور اگر فلانجی سچ مچ ہوٹل میں گھس آتے یا کھڑکی کے راستے ہینڈ گرینیڈ پھینک دیا جاتا تو؟"

وہ ہنسا "تو پھر ہم یقیناً مارے جاتے۔ ویسے بھی پستول تھام کر نیند خراب کرنے کا ہمیں کچھ فائدہ نہ ہوتا... اگر فلانجی آ ہی جاتے تو وہ دروازہ توڑ کر پہلے ہینڈ گرینیڈ اندر پھینکتے پھر داخل ہوتے اور ظاہر ہے تم اندر ہی رہتے مگر قدرے بکھرے ہوئے...

اور اگر کھڑکی کے راستے ہینڈ گرنیڈ ہمارے قالین پر آ گرتا تو کیا تم اُسے ہوا میں
شوٹ کر دیتے ؟ ... انسان کو ذہنی طور پر دفاع کے لئے تیار رہنا چاہیئے ورنہ جو
نے تمہارے لئے آنا ہے وہ اپنا تعارف کروا کے تمہارے بدن میں داخل نہیں ہوگا۔
میں نے فرش پر سے ٹوٹے ہوئے شیشے چُنے اور ٹوکری میں پھینک دیئے۔ بازار
پر آیا تو نیچے بازار میں زندگی ایک بے خوف روانی سے حرکت کر رہی تھی جیسے چند لمحے
کسی نے سڑک کے بیچ ایک سٹیریو ڈیک رکھ کر لوگوں کو دھماکوں اور گولیوں کی آواز
سنائیں اور پھر کیسٹ ختم ہونے پر چلا گیا۔ کچھ بھی نہیں ہُوا تھا۔

ناشتے کے بعد میں سروس ٹیکسی کے ذریعے سفارت خانے پہنچا تو میر صاحب
کمرے میں موجود نہ تھے۔ دو گھنٹوں کے بعد جب وہ آئے تو قدرے پریشان آئے۔ مجھے
دیکھ کر مزید پریشان ہو گئے۔ "آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

"بیروت چھوڑنے سے پیشتر خدا حافظ کہنے آیا تھا۔"

"خدا حافظ۔" اُنہوں نے شتابی سے ہاتھ آگے کر دیا۔ "آپ ہوٹل سے فون پر ہی
بات کر لیتے تو بہتر تھا... مگر آپ یہاں تک آ کیسے گئے؟"

"سروس ٹیکسی سے۔"

"آپ کو معلوم ہے کہ صولح سکوئر کے قریب آج صبح کیا ہُوا ہے؟"

"جو کچھ ہُوا ہے وہ میری کھڑکی کے عین نیچے ہُوا ہے مگر اب تو حالات نارمل تھے"

"فی الحال۔" میر صاحب کچھ زیادہ ہی فکر مند تھے۔ "آپ کا جہاز کتنے بجے چل رہا ہے؟"

"رات دس بجے۔"

"اور بندر گاہ سے چلے گا؟"

"ظاہر ہے۔"

"مگر بندر گاہ تو..." اُنہوں نے فقرہ ادھورا چھوڑ کر گھنٹی پر ہاتھ رکھ دیا۔
کلرک اندر داخل ہُوا۔ "عزیز کو بلاؤ۔"

عزیز آ گیا، ڈھلتی عمر کا ایک گورا چٹا جُھکا جُھکا سا شخص۔

"عزیز ویسے تو ہمارے ہاں ڈرائیور ہے مگر بیروت شہر کو اس سے بہتر کوئی نہیں
جانتا۔"

گویا یہ شخص بیروت کے سفارت خانے کا محمد علی تھا۔
میر صاحب نے میرا تعارف کروایا کہ یہ میرے دوست ہیں، آج رات دس بجے
ان کا جہاز چلے گا اور بندر گاہ سے چلے گا... تم کیا کہتے ہو؟

"یہ نہیں جا سکتے۔" عزیز نے سستی سے کہا۔

"آپ نہیں جا سکتے۔" میر صاحب نے فوراً تائید کی۔

"کیوں؟"

"جہاز میں سوار ہونے کے لئے آپ کو بندر گاہ پہنچنا ہو گا اور وہاں آپ پہنچ
نہیں سکتے کیونکہ آج صبح بیروت پولیس نے ریڈیو پر جن خطرناک علاقوں کا اعلان
کیا ہے بندر گاہ اُن میں سرِ فہرست ہے۔"

"عزیز صاحب اگر میں اپنی بالکونی سے جھانکوں تو بندر گاہ نظر آ جاتی ہے.. میرے
خیال میں تو..."

"بندر گاہ تک پہنچنے کے لئے آپ کو اس علاقے میں سے گزرنا ہو گا جہاں حرکت
کرتی ہوئی ہر شے پر فائرنگ ہو رہی ہے... مجھے افسوس ہے کہ آپ اس جہاز پہ
سوار نہیں ہو سکتے۔"

"اگر میں اس جہاز پر سوار نہیں ہوتا عزیز صاحب تو ٹکٹ کے ایک سو دو ڈالر ضائع
ہوتے ہیں..."

"اور اگر آپ سوار ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔" عزیز اُسی لاپرواہ سستی سے بولا
"تو آپ کی زندگی ضائع ہوتی ہے۔"

میں نے پچھلے پانچ روز اس آس میں گزارے تھے کہ بالآخر میں زندہ عذاب میں

مُبتلا اس شہر سے نکل جاؤں گا۔ اس سے پیشتر کہ وہ زمین بھی گرم ہو جائے جس پر میں
کھڑا تھا۔ اور اب میرے سامنے ایک آہنی دروازہ تھا۔ اس کو ہاتھ لگا کر کھولنا چاہتا
ہوں تو ہو سکتا ہے اس میں بجلی کی لہر دوڑ رہی ہو، اور اگر نہیں کھولتا تو شاید بجلی کی
وہی لہر دھیرے دھیرے اُس زمین میں بھی آجائے جس پر میں کھڑا تھا۔ نہ بھاگا جاتا
ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جاتا ہے مجھ سے۔

"میں کوشش کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے اپنے آپ کو یقین دلانے کے لئے کہا۔
"میں پہنچ جاؤں گا۔"

عزیز نے فون اُٹھا کر بیروت پولیس کے ہنگامی دفتر سے بات کی اور پھر شہر کے
ایک نقشے پر سُرخ نشان لگا کر میرے حوالے کر دیا۔ "میں نے اس پر بندرگاہ تک جانے
کے لئے ایک رُوٹ بنایا ہے جو پولیس کے مطابق نسبتاً کم خطرناک ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور
سے کہئے گا کہ صرف اسی راستے پر چلے اور اللہ آپ کی مدد کرے۔"

"خدا حافظ۔" میر صاحب نے جلدی سے ہاتھ آگے کر دیا۔ اُن کے چہرے پر
میری آخری رسومات تھیں۔

ٹیکسی کے لئے الحمرا پہنچا تو احساس ہوا کہ عزیز کی اطلاعات درست تھیں۔ لوگ
ہراساں خرگوشوں کی طرح چوکنے ہو رہے تھے، جھانک جھانک کر چل رہے تھے۔ کوئی
گلی آتی تو رُکتے، جھانک کر اطمینان کیا اور پھر جلدی سے عبور کر گئے۔ ان کے قدم
تیزی سے اُٹھ رہے تھے۔ دُکانوں کے شٹر گرے ہوئے تھے... صولح سکوئر میں بُرے
کیفیت تھی۔ ہوٹل پہنچ کر میں نے احمد کو پوری تفصیل بتائی۔ وہ سوچ میں پڑ گیا
اور بالکونی میں جا کر دائیں ہاتھ پر بندرگاہ کی طرف دیکھا، واپس آیا اور بستر پر بیٹھ گیا۔
"حالات چاہے کتنے ہی خطرناک کیوں نہ ہوں سڑک پر سے گزرنے والی ہر ٹیکسی پر
پر فائر نہیں ہوتا۔ تمہارا جہاز کتنے بجے چلنا ہے؟"

"رات دس بجے۔"

"ہوں"۔ اُس نے چند لمحے قالین کو گھورنے میں گزارے اور پھر سر اُٹھا کر بولا۔
"ضروری تو نہیں کہ تم رات کو ہی یہاں سے نکلو، جہاز تو اس وقت بھی بندرگاہ میں
کھڑا ہو گا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد فوراً چلے جاؤ۔"

"اور اگر جہاز وہاں موجود نہ ہوا تو؟"

"تو تم بندرگاہ کے اندر انتظار کر سکتے ہو۔ وہاں نسبتاً محفوظ رہو گے۔"

تین بجے ہم ہوٹل کی سیڑھیوں سے نیچے اُترے۔ میں رُک سیک کاندھے پر رکھے
اور احمد جیکٹ کی جیب میں پستول رکھے۔

ٹیکسی رُکتی، احمد "مینا" کا لفظ ادا کرتا اور ڈرائیور ہماری سادہ لوحی پر مسکراتا
چلا جاتا۔ تقریباً ایک گھنٹے کے انتظار کے بعد ایک فلسطینی ٹیکسی ڈرائیور رُکا۔ احمد خاصی
دیر تک اُس کے ساتھ گفتگو کرتا رہا۔

"میں ساتھ نہ جاؤں تو تمہارے لئے بہتر ہے۔" احمد نے ایک پُرجوش معانقہ کیا۔
"میں... فلسطینی لگتا ہوں اور ہوں بھی۔ تم اکیلے بیٹھو گے تو زیادہ محفوظ رہو گے۔"

"کل صبح اُس منہناتے ہوئے گھوڑے کو میرا سلام کہنا جو ہر صبح کھڑکی کے نیچے
سٹین گن چلانے آجاتا ہے۔"

"میں صرف تمہاری خاطر ٹھہرا ہوا تھا، آج میں بھی چلا جاؤں گا۔"

"کہاں؟"

"کہیں۔ واپسی کے دن کو قریب لانے کے لئے۔" پتھر چہرے سے ہونٹ علیحدہ
ہو کر صرف میرے لئے مسکرائے۔

ٹیکسی چلنے لگی تو وہ کھڑکی پر جُھکا۔ "اسے پانچ ڈالر ادا کر دینا۔"

"پانچ ڈالر؟" میں نے حیران ہو کر ڈرائیور سے پوچھا۔ "ایک کلومیٹر کے لئے پانچ ڈالر؟"
اُس نے جواب دینے کی بجائے ایک ناراض نظر سے دیکھا کہ بھئی بڑے ناشکرے ہو۔
رُو ڈی کا لوچین تک ٹیکسی ہموار رفتار سے چلتی رہی۔ ٹریفک بھی تھی، لوگ بھی

نظر آ رہے تھے۔

ایک چوک آیا، آگے کا سماں بالکل مختلف تھا۔ ڈرائیور نے بریک پر پاؤں رکھی اور گردن گھما کر کہنے لگا "ہم سڑک کے دائیں ہاتھ پر چلیں گے اس لئے بائیں کونے میں بیٹھ جاؤ۔ اپنا سامان ڈھال کے طور پر سینے کے آگے جما لو تاکہ اگر اُدھر سے... اور اگر ٹیکسی ایک دم رُک جائے تو باہر کُود جاؤ..." میں نے اُس کی ہدایات پر عمل کیا اور رُک سیک کو گھٹنوں پر رکھ کر کونے میں دبک گیا۔

ٹیکسی پھر چلی۔ چوک کے آگے جیسے کوئی نیا شہر شروع ہو گیا ہو، سرحد پار کر کے نئی آب و ہوا تھی... ٹریفک نہ ہونے کے برابر۔ کھڑکیوں اور دروازوں کے پیچھے ایک آدھ سر جھانکتا ہُوا اور خاموشی۔ ٹیکسی دھیرے دھیرے چل رہی تھی، شاید دس کلومیٹر کی رفتار سے... کیونکہ تیز رفتار ٹیکسی پر ہمیشہ فائر ہوتا ہے۔ اُنہیں شک ہوتا ہے کہ اس میں سوار افراد گرنیڈ پھینک کر فرار ہونا چاہتے ہیں۔

میں کبھی کبھی کچھوے کی طرح گردن اُونچی کر کے دائیں بائیں دیکھ لیتا... ڈرائیور اپنے سامنے نظریں ساکت کئے ہوئے ایک ہموار اور سُست رفتار سے آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ پھر وہی ہُوا جس کا انتظار تھا... ایک برسٹ فائر ہونے کی آواز گونجی ڈرائیور نے ایکسلریٹر اس شدّت سے دبایا جیسے وہ پاؤں تلے آتے کسی مُوذی سانپ کو کچل دینا چاہتا ہے۔ میں دبکنے کی بجائے اتنا ہراساں ہُوا کہ پہلے تو گردن اُٹھا کر مڑ کے باہر دیکھنے لگا اور پھر فوراً ہی اپنے آپ کو نشست سے گرا کر رُک سیک اپنے اُوپر گھسیٹ لیا۔ ٹیکسی کا انجن دھاڑتا ہُوا شاید سوا سو کلومیٹر کی رفتار پر جا رہا تھا۔ ڈرائیور بھی شاید سیٹ کے نیچے بیٹھا ہاتھ سٹیرنگ پر رکھے ڈرائیو کرتا چلا جا رہا تھا۔ شاید دوسرے ہی لمحے ٹیکسی ایک شدید دھچکے سے رُکی۔ میں باہر کُودنے کو تھا کہ ڈرائیور نے دروازہ کھول دیا۔

"آ جاؤ۔" وہ ہنسنے لگا۔ "ہم بندرگاہ میں پہنچ چکے ہیں۔"

میں باہر آیا تو وہ ٹیکسی کے گرد گھوم کر معائنہ کرنے لگا۔ رُکا، جُھکا اور دو اُنگلیاں درمیان ستھرے سوراخوں میں ڈال دیں۔ "میرا خیال ہے امریکی ساخت کی سٹین گن تھی، سوراخوں کا سائز تو وہی ہے۔"

میں نے ایک گہرا سانس لیا۔ گولیوں کے چھید میری طرف کے دروازے میں تھے۔ کرایہ ادا کیا تو وہ پھر سوراخوں کا جائزہ لینے لگا۔ "تم کہتے تھے کہ پانچ ڈالر بہت ہیں۔ ان سوراخوں کی مرمت پر پورے پانچ ڈالر خرچ ہوں گے۔" وہ قہقہہ مار کر ہنسا اور اپنے فقرے پر محظوظ ہوتا ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔

ٹیکسی پھاٹک سے باہر نکل کر بیروت شہر کی طرف گئی تو میں نے پہلی مرتبہ بندرگاہ کو دیکھا۔ جہاز "ایکڈنیز" ڈاک میں کھڑا تھا۔ ترکی اور لبنان کے جھنڈے مستولوں کے ساتھ لپٹے لہرا رہے تھے... آزادی۔

دائیں ہاتھ پر کسٹم ہال تھا، میں اندر گیا۔ خالم خالی، بے آباد اور بھاں بھاں کرتا ہُوا۔ ایک کمرے میں سے ٹائپ مشین کی آواز آ رہی تھی۔ دروازہ کھولا، اندر ایک کسٹم افسر ٹائپ مشین پر جھکا ہُوا تھا۔ آہٹ سُن کر وہ چوکنا ہو گیا۔ مجھے دیکھا اور غصّے سے بولا۔ "کیا چاہتے ہو؟"

"میرا سامان چیک کر لیجئے، میں لبنان چھوڑ رہا ہوں۔"

اُس نے ٹھٹک کر مشین سے اُنگلیاں اُٹھا لیں کہ یہ سیّاح کیا کہہ رہا ہے اور پھر انتہائی بے چارگی سے کہنے لگا۔ "بابا جاؤ جاؤ، کوئی چیکنگ نہیں۔"

ایکڈنیز کی خالی سیڑھی میرا انتظار کر رہی تھی۔ میں رُک سیک اُٹھائے بندرگاہ کے خالی میدان میں سیٹیاں بجاتا اُس کی طرف چلنے لگا۔

ایک لبنانی پولیس افسر کرسی میز سجائے اخبار پڑھ رہا تھا۔ میں قریب سے گزرا تو اُس نے پوچھا۔ "پاسپورٹ؟" میں نے پاسپورٹ نکال کر میز پر رکھ دیا۔ اُس نے تمام ورق پلٹے اور پھر اپنے آپ میں مگن ہوتے ہوئے کہا۔ "تم لبنان نہیں چھوڑ سکتے۔"

گرم چیونٹیوں کا ایک لشکر میرے مساموں میں رینگنے لگا۔”کیوں؟“

”تمہارے پاس لبنان پولیس کا اجازت نامہ نہیں ہے۔“ وہ اپنے اخبار میں مح...

”لیکن میرے پاس لبنان کا ویزا ہے اور میں لبنان چھوڑ رہا ہوں، اس میں دخل نہیں ہو رہا۔“

”تم اس وقت تک لبنان نہیں چھوڑ سکتے جب تک تمہارے پاس پولیس کا ”خروج“ اجازت نامہ نہ ہو۔“

میرا جی چاہا کہ میں اپنا سامان وہیں پھینک کر سرپٹ بھاگتا ہوا جہاز میں جا گھسوں اور ترک بھائیوں سے سیاسی پناہ طلب کروں... لیکن یہ لبنانی بھائی پستول سے مسلح تھا اور خوفزدہ خرگوش کو شکار کرنا کتنا آسان ہوتا ہے... چاہے وہ سرپٹ ہی کیوں نہ بھاگ رہا ہو۔

لبنانی پولیس کا دفتر ظاہر ہے شہر بیروت کے کسی حصّے میں ہوگا اور اگر میں وہاں تک پہنچ بھی جاؤں تو اجازت نامہ حاصل کرنے میں ایک دو روز تو لگیں گے چنانچہ خدا حافظ اکڈنیز اور ہیلو مائی ڈیئر سٹی آف بیروت میں تمہارے پاس واپس آتا ہوں۔

”یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو، جاؤ جا کر اجازت نامہ لے کر آؤ۔“ وہ میری موجودگی سے بیزار ہو گیا۔”تم اس کے بغیر جہاز پر سوار نہیں ہو سکتے۔“

”کیا آپ ازراہِ مہربانی بتا سکتے ہیں کہ یہ اجازت نامہ کہاں سے دستیاب ہوتا ہے؟“ میں دُنیا جہان سے بیزار ہو چکا تھا۔

”بندرگاہ کے پھاٹک سے باہر، دائیں ہاتھ پر رُودی پورٹ ہے۔ تقریباً دو سو میٹر کے فاصلے پر پولیس کا دفتر ہے، وہاں سے۔“

بندرگاہ سے باہر، اُس علاقے میں جہاں مہربان ڈرائیور کی ٹیکسی چھید دل سے نوازی گئی تھی۔ میں نے سوچا آہستہ آہستہ چلنا خطرناک ثابت ہو چکا ہے، اس لئے کیوں نہ سامان یہاں رکھ کر ایک اولمپک طرز کی دوڑ لگا کر پولیس کے دفتر پہنچ جایا جائے۔

”یہ کیا کر رہے ہو؟“ اُس نے مجھے رُک سیک کندھے سے اتار کر زمین پر رکھتے دیکھ لیا۔

”سامان رکھ رہا ہوں، ذرا اجازت نامہ لے آؤں۔“

”لے جاؤ، لے جاؤ۔“ وہ رُک سیک کو اپنی چھڑی سے دھکیلتا ہُوا بولا۔”اگر تم اُدھر راستے میں مارے گئے تو میں اس سامان کے بارے میں خواہ مخواہ وضاحتیں کرتا رہوں گا۔“

بندرگاہ کے پھاٹک کے باہر وہی ویرانی تھی جو اندر تھی مگر اُس میں گھنی بکھرتی ہوئی سبز گھاس کا خوف تھا جس میں سانپ رینگتے ہیں۔

میں نے دائیں ہاتھ پر جھانکا، دو سو میٹر کے فاصلے پر ایک عمارت کے ماتھے میں سے نکلتے ہوئے بانس پر لبنان کا پرچم لٹک رہا تھا۔ لبنانی پولیس کا دفتر... دو سو میٹر... جو مجھے پیدل طے کرنا تھا۔

میں نے دانت بھینچے۔ رُک سیک کے سٹریپ میں انگوٹھے ڈالے اور سر جُھکا کر سڑک کے عین درمیان میں آہستہ آہستہ چلنے لگا... مجھ پر رُک سیک کے علاوہ اُن تمام کھڑکیوں اور دروازوں کا بوجھ جُھک رہا تھا جو میرے دائیں اور بائیں مکانوں میں سے مجھے دیکھ رہے تھے اور اُن چہروں اور دھاتوں کا بوجھ بھی تھا جو ویران سڑک کے وسط میں چلتے ہوئے ایک پیکر کو دیکھ رہے تھے۔ اُس کی قومیّت اور رنگ کے بارے میں تذبذب میں تھے، اس کی حماقت کے بارے میں تذبذب میں نہ تھے... خوف کا ہاتھ جسم کے اسپنج کو دبا رہا تھا۔ اس میں سے پسینہ پھوٹ رہا تھا... وہ مجھے دیکھ رہے تھے آنکھیں اور شاید چمکتی نالیں... میں چل رہا تھا مگر اس میں نیّت اور عمل کو دخل نہ تھا، بس میرے پاؤں میکانکی سپاہی کی طرح آہستہ آہستہ اُٹھ رہے تھے۔ دَھپ، دَھپ۔ دائیں اور بائیں، دوسری اور تیسری منزل پر کھڑکیاں تھیں، ان کے پیچھے پردے تھے، پردوں کے درمیان میں خلا کی

ایک سیاہ لکیر تھی، اُس کے پیچھے کچھ بھی ہو سکتا تھا . . . دستک ہو رہی تھی، دل کو دہلانے
کی دستک۔ جیسے ہاون دستہ مُونجھ کوُٹ رہا ہو، دَھم۔ دَھم۔ دَھم۔ ایک سٹیریو ڈیک
میرے اندر پوری والیوم پر کھُلا تھا۔ شریانیں اِس کی دھمک سے لرز رہی تھیں، دَھم
دَھم۔ دَھم۔ اور باہر کھڑکیوں اور دروازوں میں سے اُترتی دہشت سے حاملہ خاموشی . . .
جس گولی نے تمہارے لئے آنا ہے وہ اپنا تعارف کروا کے تمہارے بدن میں داخل نہیں ہوگی
. . . لیکن کونسی کھڑکی میں سے، کس دروازے کی اوٹ میں سے . . . جب گلے کا گھنگھرو بجنے
لگے تو احساس ہوتا ہے کہ انسان نے ابھی اپنی زندگی کا ایک لمحہ بھی نہیں گزارا اور ختم . . .
دُنیا کی وحشی خوبصورتی کے نئے رنگ دماغ میں نیون سائنوں کی طرح بھڑکتے ہیں . . .
میں کیسے ان سے جُدا ہوں گا . . . دَھم۔ دَھم۔ دَھم . . . کل آسمان پر ایک پرندہ تیرے گا
اور میرے پاس اُسے دیکھنے کے لئے آنکھیں نہ ہوں گی . . .

پولیس افسر نے اجازت نامے کی مُہر پاسپورٹ پر ثبت کی اور میری طرف دیکھا۔
"کیا بات ہے السیدی تمہارا چہرہ سفید ہو رہا ہے، آپ ٹھیک تو ہیں؟"
"ہُوں"۔ میں نے پاسپورٹ جیب میں رکھا اور نزدیکی صوفے پر گر گیا۔
"آپ اس وقت کہاں سے آ رہے ہیں؟"
"بندرگاہ سے۔"
"میں نے باہر ٹیکسی رُکنے کی آواز نہیں سُنی۔"
"میں پیدل آیا ہوں۔"
جیسے سرپٹ دوڑتا ہُوا گھوڑا اپنے آگے کھائی دیکھ کر بدکتا ہے وہ ٹھٹکا "بیٹھ . . .
. . . صبح سے تین لاشیں آ چکی ہیں . . . آپ کو یہ رِسک نہیں لینا چاہیئے تھا . . . اب
یہاں آرام کیجئے، کوئی نہ کوئی مسافر اجازت نامہ حاصل کرنے آئے گا اور ہم آپ کو
کے ہمراہ بھیج دیں گے . . ." وہ تیزی سے پچھلے کمرے میں گیا اور ایک خنک مشروب

. . . مشروب میرے گلے میں اُگی کانٹوں کی فصل کو نرم کرتا بخار زدہ جسم میں پھیلنے لگا۔
ایک السیشن کُتا ایک جرمن سیاح کو کھینچتا دفتر کے اندر آیا۔ سیاح نے اجازت
نامے کے لئے درخواست کی۔ پولیس افسر نے اُس کے پاسپورٹ پر فوراً مُہر لگا دی" اور
مُڑ کر "اگر آپ ہمارے دوست کو اپنی ٹیکسی میں بندرگاہ تک لے جا رہے ہیں۔"
"ضرور"۔ جرمن نے سر ہلایا۔
ٹیکسی بندرگاہ میں رُکی۔ میں نے اجازت نامے پر پولیس افسر سے مُہر لگوائی اور . . .
اکڈینز کی سفید سیڑھی پر تھکے قدموں سے چڑھنے لگا۔ رُک سیک کا بوجھ ناقابلِ برداشت
ہو رہا تھا۔ آخری سیڑھی پر ایک لمبا امریکی کھڑا تھا، ڈھیلے بازوؤں اور ٹانگوں والا۔
. . . اُس نے ہاتھ آگے بڑھا کر میرا رُک سیک اُچک لیا۔ "ویلکم ابورڈ"۔ عرشے پر قدم رکھتے
ہی اُس نے پُرانے دوستوں کی طرح گرمجوشی سے میرا استقبال کیا۔ "میں تمام کارروائی
یہاں سے دیکھ رہا تھا . . . بواتے جب تم بندرگاہ کے پھاٹک سے باہر نکلے ہو تو میں اپنی
زندگی کی شرط لگانے کو تیار تھا کہ تم واپس نہیں آؤ گے . . . ویلکم ابورڈ اکڈینز۔"
جہاز کے ترک عملے نے میرا ٹکٹ اور پاسپورٹ جمع کر کے رسید لکھ دی۔ ڈیک کلاس
اپنے نام کے مطابق عرشے پر نہ تھی بلکہ جہاز کے پیٹ میں تھی، انجن روم سے ملحقہ۔ ایک
ہال نما کمرہ جس میں یوتھ ہوسٹلوں کی طرز پر دو منزلہ بستروں کی قطاریں تھیں۔ میں نے ایک
بالائی بستر پر سامان رکھا اور سیلون میں آ گیا جہاں گرتھ میرا انتظار کر رہا تھا۔
"کچھ پیو گے؟"
"میرا خیال ہے مجھے اعتراض نہ ہو گا۔"
"سب سے پہلے تم مجھے اپنی زندگی کی کہانی سناؤ، پھر میں سُناؤں گا۔"
میں نے مختصراً اپنی زندگی کی کہانی بیان کر دی۔
گرتھ دمشق کے امریکی سکول میں ٹیچر تھا اور آج صبح امریکہ جانے والی پرواز کے
لئے ایئرلائن کی بس میں بیروت سے ایئرپورٹ کی طرف روانہ ہُوا تھا۔ ایئرپورٹ سے

چند میل ادھر شاہراہ پر فلانجی دہشت پسندوں نے بیری کیڈ کھڑا کر رکھا تھا۔ بس پر گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی اور ڈرائیور نے پھرتی سے بس کو واپس شہر کی جانب موڑ لیا۔ شہر کے قریب پہنچے تو انہیں ایک اور بیری کیڈ کا سامنا کرنا پڑا جو فلسطینیوں کا تھا۔ یہ بیری کیڈ پہلے موجود نہیں تھا بلکہ اُس وقفے کے دوران کھڑا کیا گیا جب وہ اس مقام سے گزر کر ایئر پورٹ کی طرف جا چکے تھے۔ یہاں بھی مشین گنوں نے انہیں پیچھے مڑنے پر مجبور کر دیا۔ اب وہ کہیں بھی نہیں جا سکتے تھے۔ ایک جانب فلانجی ایئر پورٹ کا راستہ روکے ہوئے تھے اور دوسری طرف فلسطینی شہر میں داخل نہیں ہونے دیتے تھے۔ بس میں سوار تین امریکی نوجوانوں نے فیصلہ کیا کہ سڑک چھوڑ کر یہاں سے سمندر تک پیدل جایا جائے اور وہاں سے کسی طور شہر پہنچا جائے۔ باقی مسافر تو کسی غیبی امداد کے انتظار میں بس میں دبکے رہے اور گرتھ اور دو امریکی چھپتے چھپاتے سمندر کی طرف چل دیئے۔ ساحل پر پہنچ کر اُنہوں نے ایک مچھیرے سے اُس کی کشتی کا سودا طے کیا اور اُسے کھیتے ہوئے بندرگاہ میں آگئے اور پھر یہاں پر بقول گرتھ "ہوائے اوہ ہوائے ہم کیا دیکھتے ہیں کہ بندرگاہ میں ایک جہاز یورپ جا رہا ہے اور آج ہی جا رہا ہے۔ چنانچہ ہم نے ماضی کی تمام محبوباؤں کو یاد کیا۔ اُن کے ہونٹ چومے اور جہاز میں داخل ہو گئے... خوش قسمتی تم ایک کتیا ہو اور ہم تم سے محبت کرتے ہیں۔"

"مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے جہاز حرکت کر رہا ہے۔" وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور پھر منہ کھول کر ہنسنے لگا۔ "جہاز حرکت نہیں کر رہا، میں شاید تھوڑا سا نشے میں ہوں کیونکہ ابھی صرف پانچ بجے ہیں اور وقت روانگی دس بجے رات دیا گیا ہے۔"

"اگرچہ میں بالکل نشے میں نہیں ہوں مگر مجھے بھی کچھ دیر سے محسوس ہو رہا ہے جہاز ہل رہا ہے... مگر یہ ہو نہیں سکتا۔"

ہم دونوں اُٹھ کر باہر عرشے پر آگئے... ہم بندرگاہ سے تقریباً دو کلومیٹر دور آ چکے تھے... گرتھ ہر ایک سے پوچھتا پھرتا تھا کہ کیا اس وقت دس بجے ہیں، اور

اگر صرف پانچ بجے ہیں تو جہاز کیوں چل رہا ہے؟ بالآخر عملے کے ایک رُکن نے بتایا کہ بیروت کے حکام نے جہاز کو وارننگ دی تھی کہ وہ تاریکی ہونے کے بعد مسافروں اور عملے کی سلامتی کے ذمہ دار نہ ہوں گے اس لئے فی الفور بندرگاہ خالی کر دی جائے۔

"اور اُن مسافروں کا کیا ہو گا جو پروگرام کے مطابق رات نو بجے کے قریب جہاز پر سوار ہونے کے لئے آئیں گے؟"

شام کے بعد بندرگاہ تک آنے کے لئے تو ہیلی کاپٹر درکار ہوں گے۔ جتنے مسافر آنے تھے آ چکے۔"

عرشے پر صرف چند مسافر تھے جو ڈری ڈری آنکھوں سے بیروت کی پیچھے ہٹتی عمارتوں کو دیکھ رہے تھے۔ بندرگاہ کا ویران علاقہ فٹ بال کے خالی میدان کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ اُس کے پیچھے عمارتیں خاموش تھیں۔ ان عمارتوں میں لوگ انتظار کر رہے تھے، کس کے ہاتھ میں غلام ہے اور کس کے ہاتھ میں بادشاہ، کوئی نہیں جانتا.....

بندرگاہ سے دُور ہو کر ہم ساحل کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ پجن راکس نظر آنے لگیں اور اُن کے پیچھے روشنے کی ویران سڑک... اکلوتی کار کا ایک نقطہ سڑک پر رینگ رہا تھا۔ شہر کا آسمانی منظر خوف سے عبارت تھا۔ کسی گھنی آبادی میں سے دُھوئیں کا ایک ڈولتا مینار آسمان کو اُٹھتا ہوا بکھر رہا تھا۔ یہاں سے بیروت مجھے بہت اکیلا دکھائی دیا۔ ساحل پر بیٹھا ہوا ایک دیوزاد گم شدہ بچہ جو آنے والے کل کی دہشت سے سہما ہوا تھا لیکن میں اس کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ میرے ہاتھ میں نہ بادشاہ تھا اور نہ غلام۔ میں صرف ایک تماشائی تھا اور موت کھیلنے والوں سے پہلے تماشائیوں کی طرف بڑھتی ہے۔ کیا میں واقعی رت کو بیروت میں چھوڑ آیا تھا؟ ڈیلفی کا اوریکل خاموش تھا... مگر اس جہاز نے یونانی دیومالا کے سمندروں میں سفر کرنا تھا۔ اوڈیسس کے سمندروں میں سے، اور میں راستے میں ڈیلفی کے اوریکل کی وہ کا علا بگاڑ ہو سکتا تھا... تم عمارتیں بناتے ہو، گھر سجاتے ہو مگر تمہاری ہڈیاں بکھری ہوتی ہیں۔ وہ صرف ہر لمحوں کے لئے یکجا ہوتی ہیں۔ جتنی دیر تک ہو سکے، ان ہڈیوں کو سمیٹ کر چلتے رہو۔

میں بیچاری فقیرنی سفر میں ہوں اور میری ہڈیوں کی گٹھڑی کو ہر کوئی کچوکے دیتا ہے۔ اسے
کھول دینے کی کوشش کرتا ہے۔ "بول فقیرنی تیری گٹھڑی میں کیا ہے؟" اور میں اسے سینے
سے لگائے رہی، سمیٹے رہی افغانستان میں، بیروت میں۔ میری ہڈیاں ہیں مائی باپ
... جب تک میرا ایک بال بھی موت سے بندھا ہوا ہے......

"مستنصر ہمارا سفر نیک شگون سے شروع ہوا ہے۔" گرتھ نے سمندر میں ابھرتے اس
راستے کی طرف اشارہ کیا جو ہمارے جہاز کے گزرنے سے وجود میں آ رہا تھا۔

"دیکھو۔"

اور میں نے دیکھا، درجنوں ڈولفن مچھلیاں اچھلتی کودتی، سیٹیاں بجاتی ہمارے
جہاز کے پیچھے چلی آ رہی تھیں۔

جہازرانوں کی قدیم کتابوں میں آیا ہے کہ جس جہاز کے سفر کے آغاز میں ڈولفن
مچھلیاں اس کا پیچھا کریں، اس کے مسافر سلامتی سے اپنی منزل کو پہنچتے ہیں... کیا
قدیم کتابوں میں لکھا ہر حرف سچ ثابت ہوتا ہے؟

قبرص

لبنان کی زمینی لکیر پر سمندر حاوی ہو رہا تھا اور پھر وہ بتدریج پانیوں کے پیچھے
غروب ہو گئی۔ اب صرف سمندر تھا۔

صرف سمندر۔

نمکین ہوا بدن کے بے چین خلا میں ایک بے قابو ہجوم کی طرح داخل ہوئی اور
بے چینی کو رخصت کر دیا۔ بے دانت بوڑھوں ایسے جبڑے کھولے کودتی کلیلیں کرتی
ڈولفن جہاز کے پیچھے چلی آ رہی تھیں۔

"ڈنر پر ملاقات ہو گی۔" گرتھ نیچے چلا گیا۔

سمندر پر تاریکی کا سانس گہرا ہو رہا تھا۔ ڈولفن کی ہمت جواب دے رہی تھی اور
اب جہاز اور ان کے کودتے بدنوں کے درمیان فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا۔ پھر خاصی دیر تک وہ
سطح پر دکھائی نہ دیں۔ میں دیکھتا رہا۔ یکدم ایک ڈولفن پوری قوت سے اچھلی اور بقول ایلیٹ
"ایک اداس روشنی میں ڈولفن یوں تیری جیسے پتھر سے تراشی ہوئی ہو۔" اور سمندر میں گم ہو گئی
... تاریکی کا سانس پھیل رہا تھا۔ سمندر کے آبی کھیت میں چلتا جہاز کا ہل جو راستہ پیچھے چھوڑ
رہا تھا وہ خالی تھا۔ سفر کے نیک شگون نے ساتھ چھوڑ دیا۔

راہداریاں خالی تھیں، مسافر اپنے کمروں کی عافیت میں روپوش تھے۔ جہاز چپکے
چپکے چل رہا تھا، ایک مفرور کی طرح جیسے بیروت کی خانہ جنگی اب بھی اس کے تعاقب میں ہو۔

نیچے میرے ہال نما کمرے میں تمام بستر خالی پڑے تھے۔ میں نے رُک سیک کھول کر سلیپنگ بیگ اپنے پسند کردہ بالائی بستر پہ بچھایا جو سمندر پر کھلنے والی گول پاٹ ہول کھڑکی کی سطح پر تھا اور پھر غسل خانے میں جا کر شاور کے نیچے ایک طویل عرصے تک مُنہ کھولے کھڑا رہا۔ کھڑکی کے باہر گھنا سمندر اور سیاہ شام ایک تھے۔

کمر کے گرد تولیہ باندھ کر جب میں کمرے میں واپس آیا تو اب یہاں کا منظر قدرے مختلف تھا۔ میرے بستر پر ایک بھاری تن و توش کا شخص نیم دراز تھا اور اُس کا پیٹ بُری طرح ہل رہا تھا۔ وہ شاید اپنی ہنسی کا گلا گھونٹ رہا تھا۔ اُدھر خالی بستروں کے درمیان ایک چھریرے بدن کا ناٹا سا نوجوان "ہا" "ہی" کی چیخیں بلند کرتا ہُوا کراٹے کے کرتب دکھا رہا تھا۔ وہ خوفناک چہرہ بنائے کبھی کسی گدے پہ ٹوٹ پڑتا اور اپنی ہتھیلی اُس میں دفن کر دیتا اور کبھی کسی خیالی مدِ مخالف کی گردن پر وار کرنے لگتا۔

مجھے دیکھتے ہی وہ فوراً ساکت ہو گئے اور موٹا شخص کان میں انگلی پھیرتا ہُوا میرے بستر سے اُتر آیا۔ دونوں نے مجھے اور خاص طور پر میری کمر کے گرد بندھے تولیے کو بڑی مشکوک نگاہوں سے دیکھا اور پھر ہال کے دوسرے کونے میں جا کر سرگوشیاں کرنے لگے۔ میں اپنے بستر پر لیٹ کر ڈائری لکھنے میں محو ہو گیا۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد وہ دونوں بڑے بن سنور کر برآمد ہوئے۔ چھریرے نوجوان نے مجھ سے عربی میں مخاطب ہو کر کچھ کہا اور مجھے خاموش پا کر فوراً ہی انگریزی میں کہنے لگا "میں سام ہوں اور یہ میرا دوست جارج ہے۔ ہم اس کمرے میں آپ کے شریک ہیں۔"

میں نے بستر سے اُتر کر دونوں سے ہاتھ ملایا۔

"میں جارج نہیں ہوں..." موٹا شخص بڑے ٹھسے سے بولا۔ "کنگ کانگ ہوں آرمینیا کا..."

"اوہ جارج..." سام نے پیار سے اس کی توند پر کراٹے کی ایک ہتھیلی چلائی۔ "ابھی تک تمہارا نشہ نہیں اُترا... دراصل بیروت سے بچ نکلنے کی خوشی میں ہم جہاز پر

پہنچتے ہی قدرے ڈرنک ہو گئے تھے... بلکہ خاصے... اب بھی ہیں... اس لئے... آپ جانے کیا سوچتے ہوں گے؟"

"میں یہ سوچ رہا ہوں کہ کہیں آپ بیروت کی خانہ جنگی کو اس جہاز پر تو نہیں لے آئیں گے، کیونکہ آپ عیسائی ہیں اور میں مسلمان..."

"ہم فلنجی نہیں ہیں اور آپ بھی یقیناً فلسطینی نہیں... اور پھر بھگوڑے ہمیشہ امن سے رہتے ہیں، اور وہ ہم ہیں۔"

"سیاح ہمیشہ ڈرپوک ہوتا ہے..." میں نے ناگواری سے کہا۔ "بیروت میرا گھر ہوتا تو کبھی نہ چھوڑتا۔"

"میرا خیال ہے میں ایک لاش کی بجائے بھگوڑا ہونا زیادہ پسند کرتا ہوں۔" جارج ہنسنے لگا۔ "اور اس ہال میں بھاگنے دوڑنے کے لئے خاصی جگہ ہے، خالی پڑا ہے۔"

"عرشے پر مسافر تو خاصے تھے مگر یہاں ہم صرف تین ہیں..." میں نے پوچھا۔

"ہم تین غریب ترین ہیں اس لئے..." جارج آزردہ ہو کر بولا۔ "باقی مسافر یا تو فرسٹ کلاس میں ہیں اور یا کیبن کلاس میں۔"

جارج ان لوگوں میں سے تھا جنہیں پہلی ملاقات پر ہی آر پار دیکھا جا سکتا ہے وہ اندھے شیشے نہیں ہوتے۔ اُس کا وسیع تن و توش ایک نہایت معصوم بچّے کو پناہ دیئے ہوئے تھا... اور سام ایسے لوگ جتنے زمین کے باہر دکھائی دیتے ہیں اُس سے زیادہ اس کے اندر ہوتے ہیں۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کونسے موقع پر اُن کا قد کتنا ہو جائے گا۔

"آپ ڈنر کے لئے نہیں چل رہے، پورے آٹھ بجے سَرو کر دیا جائے گا۔" سام نے گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہوئے دریافت کیا۔

"ہاں کیوں نہیں۔"

جارج نے اپنی ہنسی دبانے کے لئے مُنہ پہ ہاتھ رکھ لیا۔ "اگر آپ ڈائننگ ہال میں اسی طرح صرف تولیے میں ملبوس چلیں تو... سیبل تو بے حد خوش ہو گی۔"

"اوہ جارج" سام نے پھر اس کی توند تھپکی اور مسکراتے ہوئے کہنے لگا "سیبل ایک فرانسیسی رقاصہ ہے جو بیروت کے سستے ہوٹلوں میں بے حد پسند کی جاتی تھی پچھلے ہفتے میں اُسے تین مرتبہ اغوا کرلیا گیا، چنانچہ اب واپس فرانس جارہی ہے۔"

"حالانکہ..." جارج اپنی سُرخ آنکھوں کو مسخروں کی طرح گھماتے ہوئے ہنسنے لگا۔ "اُسے اغوا کرنے پر جو خرچہ اُٹھتا ہے اُسی رقم سے بآسانی..."

"اوہ جارج" سام نے قدرے سختی سے اُسے ٹوکا...

"آپ تیار ہوکر آئیں، میں اسے عرشے پر لے جاکر تازہ ہوا سے ہوش میں لانے کی کوشش کرتا ہوں..." سام اُسے سہارا دے کر باہر لے گیا۔

ڈائننگ ہال انجن روم کے عین اوپر ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس کی خستہ دیواروں میں سے زنگ پھوٹ رہا تھا اور سفید پینٹ کی ناہموار تہیں بھی اسے معزز بنانے میں ناکام رہی تھیں۔ تلاطم کے پیش نظر میزیں اور کرسیاں فرش سے جڑی ہوئی تھیں اور ان پر بیٹھ کر پہلو بدلنے کی عادت کو دبانا پڑتا تھا۔ البتہ اس بکتر بند قسم کے ڈائننگ ہال کو مختلف رنگ و روپ کے چہروں نے ایک چھوٹی سی بین الاقوامی بستی کا روپ دے رکھا تھا... ہماری میز پر سیبل بھی تھی جو جارج کی خصوصی دعوت پر وہاں اُٹھ آئی تھی۔ درمیانی عمر کی ایک پستہ قد عورت جس کا موٹاپا واضح ہونے کے مراحل میں تھا مونیک اور اُس کا خاوند پال جو ایک فرانسیسی جریدے کے لئے بیروت کے فلسطینی کیمپوں کی تصاویر اتارنے گئے تھے۔ مونیک دُبلی اور لم ڈھینگ ہونے سے بال بال بچی ایک ایسی لڑکی تھی جس کی کمر واقعی ایک بھڑ کی طرح تھی۔ اُسے کھاتے دیکھ کر مجھے حیرت ہوتی تھی آخر اس کا معدہ کس جگہ ہوسکتا ہے۔ پال مونیک سے قد میں چھوٹا، عینک لگائے ہوئے ایسا شخص تھا جو عمر کے باوجود ہمیشہ ایک سکول بوائے لگتا ہے اور جو سنجیدہ گفتگو سے اس تاثر کو زائل کرنے کی کوشش میں بہت وقت ضائع کرتا ہے۔ اور وہاں گر...

...مر کی بڑھیوں کی ایک میز پر قابو آیا ہوا تھا اور مجھے دیکھتے ہی اُن سے معذرت کرکے میرے پاس چلا آیا تھا... جارج ہمہ وقت اپنی خوراک سیبل کی پلیٹ میں منتقل کرتا رہا اور وہ شریف بی بی ایک شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ قبول کرتی رہی۔ مونیک اور پال خاموش بیٹھے رہے۔ سام ہال میں موجود لڑکیوں کا تیزی سے جائزہ لے رہا تھا، کیونکہ بقول اُس کے سفر صرف چار پانچ روز کا ہے اس لئے ابھی سے دو تین خواتین کو اپنی توجہ کا خصوصی مرکز بنایا جائے تب کہیں آخری دن تک متوقع نتائج برآمد ہونے کی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ اُس نے اس کارِ خیر کے لئے ایک اُونٹ نما آسٹریلین لڑکی کو چُنا جس کے ...از کم پانچ دانت ہمہ وقت نظر آتے تھے۔ میں نے اس کی پسند سے اختلاف کیا تو کہنے لگا "...ب ان سب میں سے تو یہی بہتر ہے اور ویسے بھی لمبی لڑکیاں چھوٹے قد کے لڑکوں کے لئے دل میں ایک نرم گوشہ رکھتی ہیں۔ اُس گوشے کو مزید نرم کرنا ہمارا کام..." ایک لبنانی اور ایک انگریز خاتون کو جو بس کہنے کو ہی خاتونیں تھیں، اُس نے سپیئرز کے طور پر منتخب کیا۔

کھانا کوالٹی میں جتنا گیا گزرا تھا اتنا ہی حجم میں زیادہ تھا۔ چنانچہ خوب پیٹ بھر کر کھایا۔ بل آیا تو وہ زیادہ تو نہ تھا مگر میری جیب سے بالکل باہر والا تھا۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ یہ میرا لاسٹ سپر ہوگا اور آئندہ ڈبل روٹی اور بسکٹوں وغیرہ پر گزارہ کیا جائے گا۔ کافی کے آخری گھونٹ کے بعد میں نے سگرٹ سُلگایا اور عرشے پر آگیا۔

ایک تاریک خلا تھا جس میں سے انجن کی بجھی بجھی آواز آرہی تھی، جیسے کوئی چوری چھپے کچر کچر کچے خربوزے کھا رہا ہو۔ کچر، کچر، کچر اور... خاموشی۔ ہوا بند تھی۔ سفر... سفر... ایک سیاح اس سے فرار بھی ہوتا ہے اور اس کے تعاقب میں بھی رہتا ہے... ...گی بھی رہتی ہے سدھارتھا کی طرح اور دُنیا سے مُنہ بھی موڑا جاتا ہے... پانی... پانی... اور پانیوں کی ایک اپنی زبان ہوتی ہے، وہ باتیں کرتے ہیں۔ اُن کی سرسراہٹ کا شور اُن کی گفتگو کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ دریاؤں اور سمندروں کے کنارے بسنے

والے قبائل اس پر ایمان رکھتے تھے۔ وہ پانی سے پوچھتے تھے، جواب پاتے تھے۔ پر
میرے سامنے تاریکی میں مستور پانی بالکل خاموش تھے۔ نہ شور نہ سرسراہٹ، وہ مجھ سے
گفتگو ہی نہیں کرتے تھے، ہم کلام ہی نہیں ہوتے تھے... یا پھر جو کچھ انہیں کہنا تھا، وہ
نہیں چاہتے تھے، میرا دل نہیں دکھانا چاہتے تھے... ہوا بند تھی۔ جہاز جیسے ایک ہی
جگہ پر خاموش کھڑا آہستہ آہستہ کندھے ہلا رہا تھا۔

میرے کان انتظار میں رہے... نہ کوئی دھماکہ، نہ سٹین گن کے کٹکٹاتے چلنے
کی آواز، نہ کوئی ہنہناتا ہوا گڈ مگڈ قہقہہ... صرف شڑاپ شڑاپ پانی کی مسلسل آواز
جیسے کوئی تھکا ہوا دھوبی کپڑے دھو رہا ہو... کبھی کبھار ایک لشکارا سا پڑتا اور
میرے بند پپوٹوں کے ماس میں روشنی بھر جاتی اور پھر وہی شڑاپ، شڑاپ، شڑاپ۔
میں نے آنکھیں کھولیں، گول کھڑکی میں سمندر تھا۔ گول فش باؤل کے پانی میں نیل گھلا ہوا
تھا۔ کبھی جہاز کی حرکت سے سمندر پوری کھڑکی پر بچھ جاتا اور کبھی سورج سمندر پر جھکتا
اور گول کھڑکی کے راستے میرے چہرے پر لشکارے مارتا پھیل جاتا... اور وہاں روشنی
تھی۔ ان گنت صدیوں کے بعد ایک پرامن صبح...

میں اپنے بستر سے اتر آیا۔ میرے پاؤں تلے لوہے کا فرش تھا اور اس کے نیچے
میلوں گہرا سمندر۔ میدانوں میں رہنے والا جسم جو زمین کے سانس سے چلتا ہے۔ ایک
بے یقینی کیفیت سے دوچار ہوا۔ زندہ مگر سانس کے بغیر... شیو کرتے ہوئے آئینے
میں میرا چہرہ گول کھڑکی میں سمندر تھا، ڈولتا ہوا۔ جہاز بھی ڈول رہا تھا اور میں توازن
قائم رکھنے کی خاطر ایک بوڑھے رقاص کی طرح کبھی اپنا وزن دائیں پاؤں پر ڈالتا اور
کبھی بائیں پر... میرا چہرہ آئینے میں سمندر تھا۔ اوپر عرشے پر نمکین سمندری ہوا نے میرے
تازہ شیو کیے ہوئے چہرے کو کریدا، خاردار تار بن کر چبھنے لگی اور پھر آسودگی کی چادر
پھیلا دیا۔ مسافر معصوم بچوں کی سی چلبلی مسرت کے ساتھ ادھر ادھر گھوم رہے تھے جیسے
نئے مکان کے مکین ہر دروازے اور ہر دیوار کو چھو کر اہم اور محفوظ محسوس کرتے ہیں۔

وہ بھی جھانک رہے تھے۔ لائف بوٹس پر لکھی ہدایات نوٹ کر رہے تھے اور بھاری
لنگروں پر ہاتھ پھیلا کر اطمینان کا اظہار کر رہے تھے۔ ڈیوٹی فری شاپ پر خریداری میں
بے چینی کا عنصر تھا جیسے سستی شراب اور سگرٹوں کا ذخیرہ محدود ہو جو نہ تھا۔
جہاز "اکڈ نیز" ایک ایسا بوڑھا انگریز تھا جو کبھی سلطنتِ ہند میں ایک بلند مرتبہ
فوجی افسر تھا اور اب ولایت کے کسی زوال پذیر چھوٹے سے قصبے میں اپنے کچن گارڈن میں
آلو اگاتا تھا۔ پرانی وردیوں کو بصد حسرت ہر صبح دیکھتا تھا۔ ان پر لگے زنگ خوردہ تمغوں
کو سانس کی بھاپ سے دھندلا کر چمکاتا تھا اور اپنے عظیم ماضی کی یاد میں آہیں بھرتا تھا،
البتہ اس نے اب بھی وہ تمام آداب اور قواعد اپنے اوپر لاگو کر رکھے تھے جو اس کے عظیم
ماضی کا ورثہ تھے۔ "اکڈ نیز" میں بھی تین سیلون تھے، ڈائننگ روم تھا، عرشے پر سوئمنگ
پول تھا، سینما تھا مگر... ان سب کا زمانہ گزر چکا تھا۔ وہ ریٹائرمنٹ کی منزل سے
آگے نکل چکے تھے مگر آداب اور قواعد جوں کے توں تھے۔ ڈنر کے لئے ویٹر اپنی سال خوردہ
وردیوں میں بڑے اہتمام سے کھڑے ہوتے۔ فرسٹ کلاس کے لئے سیلون الگ تھی جس میں
ڈیک اور کیبن میں سفر کرنے والوں کا داخلہ ممنوع تھا۔ سینما کا ناکارہ پروجیکٹر ہر فلم کو
چارلی چیپلن کی فلم بنا دیتا۔ لائف بوٹس بالکل مردہ تھیں۔ سوئمنگ پول کے کنارے ایک
لائف گارڈ کھڑا رہتا حالانکہ وہ ایک باتھ ٹب سے شاید دوگنا ہی بڑا ہو اور گہرائی اتنی
کہ اس میں پاؤں کے بل بیٹھ جانے سے بھی باہر کا منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔ خواتین ہاتھ
پاؤں چلا کر بمشکل اپنے سوئمنگ کاسٹیوم گیلے کرتیں اور پھر باہر آ کر دھوپ میں لیٹ جاتیں۔
ان کے کاسٹیوم دھوپ سے کم اور جارج اور سام ایسے نوجوانوں کی بھاپ چھوڑتی نگاہوں
سے زیادہ سوکھتے۔

السیشن کتے والا جرمن منہ میں پائپ دابے اپنے جانور کو صبح کی سیر کے لئے
راہداریوں میں لئے گھوم رہا تھا۔ مونیک اور اس کا خاوند عرشے پر رکھی کرسیوں میں
دھنسے آرام کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر مونیک نے ہاتھ ہلایا۔ پال نے صرف دیکھا اور

پھر آنکھیں بند کر لیں۔ انجن روم کے قریب سامنے سے چند خواتین آتی دکھائی دیں میں نے ایک طرف ہو کر اُنہیں راستہ دیا۔ پہلی سانولے رنگ کی چمکتے دانتوں والی ایک نوجوان لڑکی تھی۔ دوسری سانولے رنگ کی چمکتے دانتوں والی ایک نوجوان لڑکی تھی مگر عمر میں پہلی سے ذرا بڑی... اور تیسری بھی انہی خصوصیات کی حامل تھی مگر لڑکی سے عورت ہو چکی ہوئی۔ ان سب کو کسی ایک ہی بھٹی میں سے نکالا گیا تھا۔

جہاز کی تفصیلی آوارہ گردی کے دوران متعدد بار میرے گھٹنے آہنی چوکھٹوں سے ٹکراتے۔ ایک مرتبہ سیڑھیوں سے پھسلا اور ہمہ وقت تنے ہوئے رسّے پر چلنے والوں کی طرح دونوں ہاتھ اُٹھائے اپنے آپ کو بیلنس کرتا رہا حالانکہ روانی بے حد پُرسکون تھی۔ دراصل بحری جہاز کا پہلا باقاعدہ سفر ایک میدانی شخص کے لئے ایسا ہی ہے جیسے ایک ڈولفن مچھلی کو سمندر میں سے نکال کر نہانے کے ٹب میں ڈال دیا جائے۔ لمبے لمبے ڈگ بھرنے والے کو ناپ تول کر قدم رکھنے پڑتے ہیں اور یوں وہ اپنے آپ کو غیر محفوظ اور قدرے بے ہنگم سا محسوس کرتا رہتا ہے۔

سیلون میں ایک صوفے پر نیم دراز گرتھ کے آگے رکھی ٹیکس فری وہسکی کی بوتل آدھی ہو چکی تھی۔

"آؤ، آؤ" مجھے اندر داخل ہوتے دیکھ کر اُس نے اُٹھنے کی کوشش کی مگر ڈھیر ہو گیا۔

"تم قدرے جلد باز نہیں ہو؟ وہسکی تو غروب آفتاب کے بعد شروع کرنی چاہیے"

"زمین پر، ہاں! لیکن اس وقت ہم سمندر پر ہیں اور سمندر کے قوانین کے مطابق وہسکی پینے پر پابندی صرف نیند کے اوقات میں ہوتی ہے" اس نے ہاغا، ہاغا کرتے ہوئے ایک عزار ے کرتا ہُوا قہقہہ لگایا۔

"سمندر کے دیگر قوانین کیا ہیں؟" میں نے لُطف لیتے ہوئے پوچھا۔

"تاش، کتاب، شراب اور گرلز... تاش مجھے ناپسند ہے۔ اُستاد ہونے کی حیثیت سے کتاب میرا پروفیشن ہے اس لئے فارغ اوقات میں اس کے قریب

نہیں پھٹکتا۔ گرلز جس قسم کی اس شپ پر پائی جاتی ہیں وہ تم نے بھی دیکھی ہیں... باقی شراب رہ جاتی ہے..."

میں نے اُسے تین نیچے اوپر کی ہو بہو سانولی لڑکیوں کے بارے میں بتایا۔ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ "ہاں میں نے بھی دیکھی ہیں، مصری ہیں"

باہر جہاز نے ایک زوردار بھونپو بجایا۔ سیلون کی بڑی کھڑکی سے جہاز کا ایک حصہ نظر آ رہا تھا، اُس سے پرے سمندر تھا اور سمندر پر بیروت کی سکائی لائن سے مشابہ ایک شہر کی نیم واضح علامتیں دکھائی دے رہی تھیں۔

"شاید ہم واپس بیروت پہنچ گئے ہیں"

"جہنم، نہیں" وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ ہم دونوں عرشے پر آ گئے۔

جہاز ایک نیلگوں وسعت میں لنگر ڈالے خاموش کھڑا تھا۔ لنگر کی چرخی پر متعین ایک ملّاح نے بتایا کہ چند میل کے فاصلے پر دکھائی دینے والا جزیرہ قبرص ہے۔ مسافروں کی نگاہیں پُراشتیاق تھیں، جیسے پہلی مرتبہ زمین کو دیکھ رہے ہوں۔ جہاز کی چمنی سے ایک اور "ہُوں آں" کرتا ہُوا بھونپو زور سے بجا، مسافر یکدم چونکے اور پھر کھسیانے ہو کر مسکرانے لگے۔ سمندر کی ہموار سطح پر ایک بڑی کشتی پھٹ پھٹ کرتی چلی آ رہی تھی۔ جہاز سے ایک رسّہ نیچے پھینکا گیا جسے کشتی میں سوار ملّاحوں نے دبوچا اور لوہے کے ایک کُنڈے سے باندھ دیا۔ لنگر اُٹھا دیئے گئے، رسّہ تننے لگا اور پھر جہاز آہستہ آہستہ انجن بند کئے ہوئے کشتی کے پیچھے پیچھے چلنے لگا جیسے ایک ناراض عمر رسیدہ ماں نے ایک کڑیل جوان مگر فرمانبردار بیٹے کا ہاتھ پکڑا ہو اور اُسے گھسیٹتی چلی جا رہی ہو۔ پندرہ منٹ کے بعد ہم فاماگُستا کی ویران بندرگاہ میں پہنچ گئے جس پر ترکی کا سُرخ جھنڈا لہرا رہا تھا۔

لینڈنگ پاس جہاز میں ہی جاری کر دیئے گئے اور ہم گودی میں کھڑی ایک بس پر سوار ہو گئے۔ ڈرائیور نے ڈیش بورڈ میں سے مائک نکالا اور پبلک سسٹم پر مسافروں

سے مخاطب ہوا۔ "قبرص کے ترک حصّے میں آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ پچھلے برس انہی دنوں میں ترکیہ کی افواج اسی بندرگاہ کے راستے قبرص میں داخل ہوئیں اور آناً فاناً جزیرے کے چالیس فی صد ترک حصّے پر قبضہ کر کے ترک برادران کو یونانی قبرصیوں کے مظالم سے نجات دلادی۔ وقت کی کمی کی بنا پر ہم آپ کو فاماگستا شہر کے مرکز میں نہیں لے جا سکیں گے بلکہ جزیرے کی مختصر سیر کے بعد ایک ترک گاؤں میں تھوڑی دیر قیام کریں گے... شکریہ۔"

بندرگاہ سے نکل کر بس ایک وسیع قلعے کی حفاظتی کھائی میں چلنے لگی جسے پرانے زمانے میں بیرونی حملے کی صورت میں پانی سے بھر دیا جاتا تھا مگر اب اس میں تارکول کی سڑک بچھی ہوئی تھی۔ شکستہ فصیل ایک میل تک ہمارے ساتھ چلتی رہی اور پھر ہم ایک ہموار مگر نیم ویران میدانی علاقے میں داخل ہو گئے۔ کھیتوں کے درمیان ایستادہ ہاسٹی جھونپڑے اور فارم ہاؤس پچھلے برس کی جنگ کی گواہی دے رہے تھے۔ گھاس ابھی تک بارود کی سیاہی میں تھی۔ دیواروں پر گولیوں کے نشانات موجود تھے۔ کوئی عمارت سالم نہ تھی۔ یہاں پر قبرصی یونانیوں نے ترکوں کو روکنے کی ایک نیم دلانہ کوشش کی تھی مگر پھر پسپا ہو گئے۔

۶۴۹ء میں امیر معاویہ کی بحریہ نے رہوڈز اور کریٹ کے جزیروں کے علاوہ قبرص پر بھی قبضہ کر لیا۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں یہ جزیرہ بے شمار قوموں کی آمد و رفت کا ناظر رہا لیکن اس کا بنیادی تشخص ترکوں سے ہی وابستہ رہا۔ مجھے یاد ہے کہ ۱۹۵۷ء کے لگ بھگ جب میں انگلستان میں تھا تو وہاں قبرص میں برطانوی تسلط کے خلاف جدوجہد کرنے والے یونانی جنرل گریواس کا بڑا شہرہ تھا۔ انگریزوں کی خواہش تھی کہ جزیرے کو آزادی دے کر اسے صرف یونانیوں کے حوالے کر دیا جائے مگر ترک آبادی اس تجویز کی سر توڑ مخالفت کرتی تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ انگریزوں کے رخصت ہوتے ہی یونانی اپنی سینکڑوں برسوں کی نفرت کو ترک خاندانوں پر برسا دیں گے چنانچہ آئے دن ترک اور یونانی نکوسیا شہر میں محاذ آرائی

[...]رتے رہتے۔ اُن دنوں میرے ہوسٹل میں ایک ترک قبرصی لڑکا یوسل بھی قیام پذیر [...]تھا۔ ایک روز کمروں کی صفائی پر مامور خادمہ نے ہکلاتے ہوئے وارڈن کو اطلاع کی کہ [یو]سل کے تکیے کے نیچے ایک پستول دھرا ہے اور بھرا ہوا ہے۔ یوسل کی طلبی ہوئی تو اس [...]نے انگریزی میں کہا کہ یونانیوں ایسے کمینے دشمن سے بچاؤ کی خاطر ایک ترک کے لئے [ض]روری ہے کہ وہ ہمہ وقت مسلح رہے۔ وارڈن نے اُسے سمجھانے کی کوشش کہ اوّل تو [...]انگلستان ہے، یہاں اُسے کوئی خطرہ نہیں اور پھر پورے ہوسٹل میں ایک بھی یونانی [...]طالب علم نہیں ہے۔ یوسل پر اس منطق کا کوئی اثر نہ ہوا اور وہ پستول پاس [ر]کھنے پر مُصر رہا۔ معاملہ پرنسپل تک گیا مگر یوسل نے وہاں بھی صاف انکار کر دیا کہ جناب آپ بے شک مجھے کالج سے نکال دیں لیکن میں پستول کے بغیر اپنے آپ کو نامکمل سمجھتا ہوں۔ بالآخر پرنسپل کی درخواست پر مسلمان طالب علموں کے ایک وفد نے یوسل [...]سے پستول لے لیا اس شرط پر کہ جب بھی کوئی جنگی صورت حال پیدا ہو گی اُس کا اسلحہ فوراً اُس کے حوالے کر دیا جائے گا۔ یہ چھوٹا سا واقعہ ترک یونانی مخاصمت کا آئینہ دار ہے۔

بہرحال انگریزوں کی رخصتی پر ایک معاہدے کے تحت ایک ترک یونانی مخلوط حکومت آرچ بشپ مکاریوس کی صدارت میں وجود میں آئی۔ جولائی ۷۴ء میں یونان سے الحاق کے حامی چند فوجیوں نے مکاریوس کا تختہ اُلٹ دیا۔ اس سے پیشتر کہ نئے حکمران جزیرے کو یونان کا ایک حصّہ قرار دیتے، ترک وزیرِ اعظم بلند ایجوت نے قبرص پر فوج کشی کا حکم دے دیا۔ چالیس فی صد علاقے پر قبضہ کرنے کے بعد ترکوں نے خاردار تار کی ایک [...]ئی سرحد قائم کی جسے "گرین لائن" کے نام سے پکارا گیا۔

دو قومیں جو کبھی اچھے ہمسایوں کی طرح رہتی تھیں اب ایک سو اکیس میل لمبی [...] لائن کے آر پار، خاردار تار سے کاٹے ہوئے گھروں، محلّوں اور کھیتوں سے ایک [دو]سرے کو صرف نفرت اور بے اعتمادی کی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ یونانی دیو مالا میں محبت [...]خوبصورتی کی دیوی افروڈائٹس کی جائے پیدائش قبرص کا جزیرہ ہے۔ ان دنوں

افرودائٹس کہیں بھی دکھائی نہیں دیتی۔

قبرص کے جس حصّے میں سے ہم گزر رہے تھے وہ تقریباً ہموار سطح کا تھا جنہ
کا سارا عکس آسمان تھا۔ گہرا نیلا اور لینڈ سکیپ، نیم خشک اور چمکیلی جیسے سڑش
سے جلی ہوئی ہو۔ کاٹج نما چھوٹے چھوٹے گھر جو وسیع اور ویران پس منظر میں حیران
بچے تھے، گرین لائن کی قربت میں جاکر ڈرائیور نے بس موڑ لی اور ہمیں فاماگستا کے
ایک نواحی قصبے کے چوک میں لے آیا۔ سامنے ایک یونانی گرجے کی عمارت تھی لیکن
اب اس کے کنگورے مسمار کرکے وہاں ایک پنسل نما ترک طرز کا مینار تعمیر کردیا گیا
تھا۔ عمارت کو کلیسا سے مسجد میں بدل دیا جائے تو بھی وہ تشدد پر نہیں اُترتی اس
لئے وہ خاموش تھی۔

مقامی لوگ ایک فاصلے پر کھڑے ہو کر جہاز کے مسافروں کو دیکھتے رہے اور
کوشش کے باوجود میں اُن میں سے کسی کے ساتھ گفتگو نہ کر سکا۔ ہم ایک قہوہ خانے
کے باہر کرسیوں پر بیٹھے دُھوپ سینکتے رہے۔ روانگی سے پیشتر میں نے ایک دکان
سے خشک گوشت اور لسی کے چند کارٹن خریدے۔ کاؤنٹر کے پیچھے بلند ایجوت کی
تصویر تھی۔ ایک ہاتھ پر فاختہ، دوسرے میں بندوق۔ ڈبل روٹی کے بارے میں معلوم
ہُوا کہ وہ صرف فلاں گلی میں واقع بیکری سے ملے گی۔ میں اور گرتھ بیکری کی تلاش
میں نکل کھڑے ہوئے۔ چند بچّے ہمارے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ بیکری کے اندر دو
ترک بھوت بنے کھڑے تھے۔ نصف دھڑ تندور میں ڈالے ایک صاحب گول اور
گرم گرم روٹیاں نکال رہے تھے۔ ایک طرف آٹے کے ڈھیر لگے تھے جو ایگزاسٹ
پنکھے چلنے کی بنا پر گھنی دُھند کی صورت کمرے میں اُڑ رہا تھا۔ چند بچّے گندھے ہوئے آٹے
کی پوٹلیاں گود میں رکھے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ روٹیوں کی گرم خوشبو بڑی
دیوانگی تھی جو بھوک کے پیٹ کو بے اختیار کر دیتی ہے۔ ایسی ہی خوشبو کے آگے ...
"لامزراب" کے ہیرو نے ایک ڈبل روٹی چرائی اور پھر پوری زندگی اس کی سزا بھگتی۔

...بنا رہا... میں نے دو ڈبل روٹیاں خریدیں جو مالک نے اخباری کاغذ میں
لپیٹ کر میرے حوالے کر دیں۔
باہر آئے تو ہم دونوں بھی سفید بھوت بنے ہوئے تھے۔ چہرے اور بالوں سے
...صاف کرنے کی بجائے ہم اُسی بھوت حالت میں واپس چوک میں آ گئے۔ جارج
قہوہ خانے کے باہر کھڑا لسی پی رہا تھا۔ میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا "ہیلو
جارج"۔ اُس نے مُڑ کر مجھے دیکھا اور منہ کھول دیا مگر بولا نہیں صرف ہکلاتا رہا۔ "سُنا ہے
تم آرمینیا کے کنگ کانگ ہو؟" میں نے آٹے سے پوتے ہوئے چہرے میں سے دانت
نکالتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں"۔ اُس نے گھگھیاتے ہوئے کہا۔ "مگر تم کون ہو؟"
گرتھ جو ابھی تک خاصا مخمور تھا، غرارے کرتا ہُوا ہنسنے لگا۔ "ہاغا، ہاغا...
ہاغا... میں ہیملٹ ہوں اور یہ میرے باپ کی رُوح ہے۔"
اس سے پیشتر کہ جارج خوفزدہ ہو کر ہم پر حملہ آور ہو جاتا، میں نے اپنا چہرہ
اور بال پونچھ ڈالے۔

"اوہ..." وہ کھسیانا ہو گیا۔ "یہ جزیرہ اتنا ویران اور خاموش ہے کہ یہاں کچھ
بھی ہو سکتا ہے۔"

بندرگاہ واپس جاتے ہوئے ایک اور جنگ زدہ علاقے سے گزر ہُوا تو گرتھ کہنے
لگا "جہاں جاتا ہوں وہاں یا تو جنگ ہو رہی ہوتی ہے اور یا ہو چکی ہوتی ہے... میں
تنگ آ چکا ہوں۔ وہ دن کب آئے گا جب میں ایک ایسی دیوار دیکھوں گا جس پر
گولیوں کے نشان نہیں ہوں گے...؟"

میں بھی تباہی کے ان شواہد سے خاصا اُکتا چکا تھا۔ پہلے قنیطرہ اور گولان،
پھر بیروت اور اب قبرص۔ مجھے شک ہونے لگا تھا کہ میں ایک سیّاح کی بجائے کوئی
جنگی نامہ نگار ہوں جو ہر اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جو گولیوں اور دھماکوں سے

گرم ہو رہا ہو۔

جہاز ایک دل گرفتہ چاہنے والے کی طرح فاماگستا کی بندرگاہ سے پیچھے ہٹا اور بڑی آزردگی سے جزیرے کے ساتھ ساتھ چلنے لگا جیسے جُدا نہ ہونا چاہتا ہو پھر دل کڑا کر کے اُس نے قبرص سے مُنہ موڑا اور کُھلے سمندر کا رُخ کر لیا۔ تھکاوٹوں سے بھیگے مسافر اپنی اپنی کیبنوں میں چلے گئے . . . اپنے اپنے جزیروں میں۔ جہاز ایک متحرک جزیرہ جس میں مختلف شخصیتوں کے جزیرے، ایک دوسرے سے کٹے ہوئے اُن تک رسائی صرف کھانے کی میز پر، سوئمنگ پُول میں یا بیئر کے گلاس پر۔ اس دوران گفتگو کے عارضی پُل جو میز سے اُٹھتے ہی، گلاس کے خاتمے پر جھاگ ہو جاتے ہیں اور ہر شخص اپنی اپنی کیبن میں چلا جاتا ہے، اپنے جزیرے میں۔

میں عرشے کی ایک آرام کُرسی پر دراز سمندر کے چٹیل میدان پر نگاہ رکھے تھا جس پر شام اُترنے کو تھی۔ اس سپاٹ میدان میں ایک کشتی نمودار ہوئی اور جہاز سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر ہمارا ساتھ دینے لگی۔ غروب کرنوں میں اُس کے بادبان زرد ہو رہے تھے۔ ایک زرد تتلی جو اُڑتے اُڑتے تھک کر سمندر پر اُتری اور اپنے پَر کھول کر تیرنے لگی۔ رفتار یکساں ہونے کی وجہ سے یوں لگ رہا تھا جیسے جہاز اور یہ چھوٹی سی کشتی بالکل ساکت کھڑے ہیں لیکن کھُلے سمندروں میں ایک بادبانی کشتی آ کہاں سے گئی؟

ایک آہٹ ہوئی، سیبل لائف بوٹس کے اوپر سے جھانک رہی تھی۔

"اوہ تم یہاں ہو۔" وہ لائف بوٹس کے گرد چلتی ہوئی میرے پاس آ گئی۔ "مونیک [illegible] کیبن میں تمہارا انتظار کر رہی ہے۔"

"کیوں کیا بات ہے؟"

"یہ تو تمہیں وہاں جا کر معلوم ہو گا۔" اُس نے اپنی بیٹھی ہوئی جنسی آواز میں سرگوشی کی۔

مونیک اپنی کیبن میں بے چینی سے ناخنوں کو دانتوں سے کتر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اُس نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا۔ "آخر تم آ گئے۔" اُس نے میری طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"ہاں، میں آ گیا۔" میں نے فوراً ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "کیا بات ہے؟"

"خوراک۔" وہ بھوکی نظروں سے میرے اُوپر جھک گئی۔

"کون خوراک؟ کس قسم کی خوراک؟" میں قدرے نروس ہو گیا۔

اُس نے بیگ میں سے ایک بڑا سارا پیکٹ نکال کر میز پر رکھ دیا۔ "تم کل کے بعد ڈائننگ روم میں نہیں آتے۔ مجھے معلوم ہے کہ تم وہاں کھانا افورڈ نہیں کر سکتے۔ اسی لئے میں آج تمہارے لئے کچھ خوراک چُرا کر لے آئی ہوں . . ."

"اچھا یہ والی خوراک۔" میری جان میں جان آئی۔ "لیکن اس وقت تو میرے پاس ایک خستہ قبرصی ڈبل روٹی ہے اور . . ."

"اوہ فضول باتیں مت کرو . . ." وہ مصنوعی غصّے سے بولی۔ "تم جیسے صحت مند بچوں کے لئے گرم خوراک نہایت ضروری ہے . . . اور پھر مجھے اس میں کوئی دشواری بھی پیش نہیں آئی جونہی ویٹر نے کورس سَرو کیا میں نے اپنی پلیٹ بیگ میں اُنڈیلی اور یہاں لے آئی۔"

"اور تم کیا کھاؤ گی؟"

"میں ابھی جا کر ویٹر سے مزید خوراک منگوا لوں گی . . . تمہیں ان ترکوں کا پتہ ہے ناں . . . میں ذرا ہونٹ بھینچ کر، آنکھیں نشیلی بنا کر اُس سے بات کروں گی تو وہ سارا کچن میرے لئے اُٹھا لائے گا . . . بہرحال تم کھانا شروع کرو میں سویٹ ڈش لے کر آتی ہوں۔"

میرے کچھ کہنے سے قبل وہ کیبن سے باہر تھی۔

"آئندہ جہاز میں جب بھی کھانے کے لئے گھنٹی بجے تم دس منٹ کے وقفے کے بعد میری کیبن میں پہنچ جایا کرو . . ." سویٹ ڈش کے خاتمے پر مونیک نے حکم دیا۔

"بہت بہت شکریہ۔" میں واقعی بے حد ممنون تھا۔ "لیکن تمہارے خاوند کو تو اعتراض نہ ہو گا؟"

"ہاں کو؟ جب تک میں تمہیں صرف کھانا مہیا کروں، اُسے کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟"

وہ ہنسی - اس کے دانت چھوٹے چھوٹے تھے جیسے دُودھ کے ہوں ۔" اب میں ڈائننگ
روم میں واپس جا کر اس سویٹ ترک ویٹر سے کہوں گی کہ سویٹ ڈش بہت مزیدار
تھی اور کیا وہ کچن سے میرے لئے ایک اور ڈش سمگل کر سکتا ہے، اور وہ کرے گا
کیونکہ میں بہت بُری طرح سے اُس کے ساتھ فلرٹ کر دوں گی ۔"

مجھے معلوم تھا کہ یہ نظرِ عنایت مونیک کا مجھ پر فریفتہ ہو جانا وغیرہ نہ تھا بلکہ وہ
بنیادی طور پر ایک ہمدرد لڑکی ہے جو یہ برداشت ہی نہیں کر سکتی کہ کوئی بھی شخص محض
پیسوں کی کمی کے باعث پورے سفر میں صرف سُوکھی ڈبل روٹی اور پنیر نگلتا رہے ۔

سیلون میں گرتھ حسبِ معمول اپنے مخصوص کونے میں براجمان وہسکی پی رہا تھا۔

"آج کھانے میں سٹیک تھا تو برانڈ بالکل میری پسند کے مطابق تھی اور ایپل پائی
تو کسی انگریز لینڈ لیڈی کے ہاتھوں کی بنائی ہوئی لگتی تھی ..." صوفے پر بیٹھ کر میں
نے اپنی آسودہ آنکھیں بند کر لیں ۔

"ہیں ..." وہ چونکا ۔"لیکن تم تو ڈائننگ رُوم میں تھے ہی نہیں ۔"

میں نے مونیک کی کارروائی رپورٹ کر دی ۔

"تمہیں احتیاط برتنی چاہیئے لڑکے ۔" وہ ایک آئس کیوب کو مُنہ میں ڈال کر
کڑکڑانے لگا ۔"انسانی ہمدردی کو جسمانی ہمدردی میں بدلتے دیر نہیں لگتی ۔"

سیلون میں رکھے ٹیلی ویژن پر عمارتیں گر رہی تھیں، دھماکے ہو رہے تھے،
مورچوں میں سے سٹین گنیں لوہا اُگل رہی تھیں اور لوگ سراسیمہ ہو کر گلیوں میں بھاگ
رہے تھے ۔ بیروت میں کھُلی جنگ چھڑ چکی تھی ۔ لبنان ٹیلی ویژن کی نشریات ابھی تک
ہمارا پیچھا کر رہی تھیں ۔

"اوہ فار کرائسٹ سیک ..." گرتھ نے غصے سے دانت کچکچائے ۔"جنگ، جنگ،
جنگ ... کیا ایک شریف آدمی کھُلے سمندروں پر بھی آرام سے اپنی وہسکی نہیں پی سکتا ۔"
اُس نے اُٹھ کر چینل بدل دیا ۔ قاہرہ ٹیلی ویژن پر سکرین کو بھرتی ہوئی ایک فربہ بدن

نک مٹک کر جیبی ... جیبی پکار رہی تھی ۔" بات ہوئی ناں ۔" گرتھ نے تسلی سے ہاتھ
"اور کل صبح ہم مصر میں ہوں گے ۔" "اے ابوالہول میں آ رہا ہوں ۔"

"اور اگر ابوالہول نے تمہاری رفاقت کو پسند نہ کیا تو؟ سُنا ہے ٹی ٹوٹلر ہے،
شراب وغیرہ نہیں پیتا ..."

گرتھ نے ہا ہا، غا غا کرتا ہوا ایک اور قہقہہ لگایا ۔" تو پھر اُسے میرے لئے جگہ
خالی کرنی ہوگی ... اگلے دو تین ہزار برس کے لئے اب میں وہاں بیٹھوں گا ..."

سیلون کا دروازہ کھُلا، اُوپر تلے تین مصری لڑکیوں کے سر نمودار ہوئے ۔ گرتھ
نے ایک لمبا "ہائے" اُن کی طرف پھینکا اور وہ وہیں سے واپس چلی گئیں ۔

"تینوں متناسب اور نمکین ہیں مگر ایک دوسرے کے ساتھ جُڑی ہوئی ۔ تم اگر
ایک اور رضا کار کا انتظام کر لو تو ہم تینوں انہیں علیحدہ علیحدہ کر کے قسمت آزمائی
کر سکتے ہیں ... آج سمندر میں تلاطم بہت ہے، میں ذرا ٹائلٹ تک ہو آؤں ..."

وہ اُٹھا اور دائیں بائیں قدم رکھتا ٹائلٹ میں چلا گیا ۔ سمندر بالکل پُر سکون تھا، تلاطم
صرف اُس کے جسم میں تھا ... میں باہر آ گیا ۔

عرشے پر شب کی تاریکی اُس مرحلے میں معلق تھی جب کسی ایک لمحے میں وہ گرتی
ہے اور ہر شے کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے ۔ وہ لمحہ وارد ہوا اور ساتھ ہی گھر کی کسک
میرے وجود میں گھر کر گیا ۔ لاہور سے ہزاروں میل دُور بحیرہ روم کے پانیوں میں خاموشی
سے تیرتے ایک جہاز پر یہ خواہش کہ میں گھر ہوتا ۔ جہاز کا ایک ملازم شیشے کی کھڑکی سے
ناک چپکائے بڑی حیرت سے مجھے دیکھ رہا تھا کہ یہ شخص اتنی تاریکی میں اتنی خنکی میں اکیلا
کیوں بیٹھا ہے ۔ اُسے کیا پتہ کہ میں گھر میں ہوں اپنے پیاروں کے پاس ... انجن کی
گھرگھراہٹ ہے اور تاریکی میں حرکت کرتا ہوا جہاز کا آہنی وجود ... سمندر کا ہلکا شور
جیسے کسی گہرے کنوئیں میں بارش ہونے سے ہوتا ہے ۔

عجیب بات ہے پورے آسمان پر صرف ایک ستارہ ہے، بے حد چمکیلا، لونگ کے

لشکارے ایسا جہاز اتنی آہستگی سے چل رہا ہے جیسے یونانی دیومالا کا ہیرو جیسن جہاز
میں سنہری کھال کی تلاش میں جا رہا ہے۔

سکندر۔ سکندریہ

"شیری۔ شیری"! میرے قریب کھڑا گنجا شخص ہاتھ ہلاتا ہوا پکار رہا تھا۔ اُس کی
بیتاب آنکھیں سکندریہ کی ڈاک پر جمع اُس ہجوم میں متلاشی گھوم رہی تھیں جو ہمارے جہاز
کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اتنے فاصلے سے ہجوم صرف ایک بدن تھا جس
کے مسام علیحدہ علیحدہ نظر نہیں آ رہے تھے۔ وہ گنجا شخص جانے کس جانِ جاناں کے لئے
یوں بے حال ہو رہا تھا۔

"شیری۔ شیری"!

بندرگاہ ایک وسیع آبی شہر تھی جس پر مال بردار کشتیاں، جنگی جہاز، آبدوزیں اور
بادبانی کشتیاں بچے کے کمرے میں کھلونے تھے، بے ترتیب، بکھرے بکھرے۔ ساحل پر شاہی
محلات اور مسجد ابوالعباس کے لمبوترے گنبد دکھائی دے رہے تھے۔ ہمارا جہاز آبی مسافتوں
سے تھکا ہوا مسافر تھا۔ آہستہ آہستہ اپنے عارضی پڑاؤ سکندریہ کی طرف رینگ رہا تھا۔ ایک
لائٹ ہاؤس کے قریب سے گزرے جو تھا تو سکندریہ کا مگر وہ نہ تھا جس کا شمار عجائباتِ
عالم میں ہوتا تھا۔

"شیری۔ شیری"! گنجے شخص کا گلا بیٹھنے کو تھا۔

اٹھارہ برس پیشتر جب آتش ابھی پوری طرح جوان بھی نہیں ہوا تھا، ولایت جاتے
ہوئے ایک پنکھوں والا جہاز رات کے پچھلے پہر قاہرہ کے ایئرپورٹ پر اُترا تھا۔ مسافروں
کو بھیڑوں کی طرح ہانک کر ایک بس میں سوار کیا گیا اور قاہرہ کے جانے کونسے کوچے میں

میں واقع ایک قہوہ خانے میں لے جاکر کافی پلوائی گئی۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ ویٹر نے نیوی سوٹ پر ترکی ٹوپی پہن رکھی تھی اور دیوار پر کمال ناصر کی تصویر آویزاں تھی۔ اب تک مصر میرے لئے ایک ترکی ٹوپی اور ناصر کی تصویر تھا۔ آج پھر سرزمینِ مصر میرے قریب ہو رہی تھی۔

"اے امیرالمومنین! مصر کی سرزمین خاکستری رنگ کی ہے، اس کے درخت ہرے بھرے ہیں۔ طول میں اس کی مسافت ایک ماہ کی ہے اور عرض میں دس دن کی۔ اے ایک خاکی رنگ کا پہاڑ اور خاک آلودہ ریت اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔ اس کے وسط میں دریائے نیل نے اپنی جگہ بنا رکھی ہے اور اس میں کمی بیشی اس طرح جاری ہے جیسے سورج اور چاند میں جاری ہے۔"

"شیری۔ شیری!"

جہاز خلا میں تیرتے ایک مصنوعی سیارے کی طرح دھیرے دھیرے اپنے ڈاکنگ پوائنٹ کی طرف بڑھ رہا تھا جس پر منتظر ہجوم میں کہیں وہ شیری۔ شیری تھی۔ جسے پکارتے پکارتے میرے پہلو میں کھڑے شخص نے اپنا گلا بٹھا لیا تھا اور میرے کان بہرے کر دئیے تھے۔ سرزمینِ مصر قریب آ رہی تھی مگر صرف سات گھنٹوں کی مختصر ملاقات کے لئے کہ میرے جہاز "اکڈینیز" کو پھر اسی طرح اسی ڈاک سے دھیرے دھیرے پیچھے ہٹ جانا تھا.... انتونی کا بجرا اسکندریہ کی طرف آ رہا تھا جہاں قلوپطرہ منتظر تھی۔

سکندریہ۔ سکندر اعظم کے بسائے ہوئے درجنوں شہروں میں سے واحد شہر جو زمانے کے سمندر پر اب بھی تیرتا ہے، شاید اس لئے کہ اس کے پتھروں تلے کہیں سکندر اعظم کا چوبی تابوت ہے اور لکڑی تیرتی رہتی ہے... شاہِ مصر بطلیموس دوئم نے سکندر اعظم کو بابل سے سکندریہ منتقل کیا اور جب عرب یہاں آئے تو اُنہوں نے ایک شاہی مقبرے میں سکندر کی لاش دیکھی جو ایک طلائی چادر سے ڈھکی ہوئی تھی۔ روایت ہے کہ مسجد نبی دانیال کے صحن میں جہاں حکیم لقمان اور حضرت دانیال کے مزار ہیں اُن کے نیچے سکندر

بھی دفن ہے... اب حکیم لقمان اور شیروں والے حضرت دانیال کو اُٹھا کر کون دیکھے کہ نیچے سکندر اعظم ہے یا نہیں۔

"شیری شیری!" گنجے شخص نے بالآخر بندرگاہ پر منتظر ہجوم میں اپنی شیری کو سپاٹ کر لیا تھا اور اب وہ دونوں ہاتھ فضا میں بلند کئے اُسے آغوش میں لینے کے لئے بے چین ہو رہا تھا۔ وہ جب بھی آنکھیں جھپکتا اُس کے گال بھیگ جاتے... شیری ایک پونی ٹیلز والی گڑیا سی بچی تھی جو جہاز کے پہاڑ حجم کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اُس نے اپنی ماں کی اُنگلی سختی سے بھینچ رکھی تھی اور قدرے بوریت سے آنکھیں میچے عرشے پر کھڑے مسافروں کو تک رہی تھی۔ ایک شدید دھچکے کے ساتھ جہاز بندرگاہ کے پہلو میں کسمسایا اور پھر پُرسکون ہو گیا۔ سیڑھی پر سے اُترنے والا پہلا شخص شیری کی طرف بڑھا جو ابھی تک عرشے کی طرف دیکھ رہی تھی اور گھٹنے ٹیک کر اُس سے لپٹ گیا "شیری شیری" وہ اسی طرح پکار رہا تھا جیسے اب بھی جہاز پر کھڑا ہو اور اُس کے گال بھیگ رہے تھے۔ شیری کی ماں اُن پر نظریں جمائے مسکرا رہی تھی مگر چہرے پر حسد کی ایک لکیر کھنچ رہی تھی۔

لینڈنگ کارڈز اور بینک سے مصری پاؤنڈز کے حصول کے بعد میں اور گرتھ بھاگم بھاگ ٹورسٹ بیورو کے دفتر میں پہنچے اور سوالیہ نظروں سے کاؤنٹر کے پیچھے دیکھا۔ وہاں گوری مصری خاتون کو دیکھ کر ہم دونوں اپنے سوال بھول گئے... سانولی صورت، شگفتہ دانت اور ملکہ نفرتیتی کی سی آنکھیں جنہیں اگر ایک مردانہ ممی پر مرکوز کر دیا جائے تو وہ کی اکڑی ہوئی حالت میں سیدھی کھڑی ہو جائے اور پھر آداب پہ آداب بجا لاتی چلی جائے... وہ سمندر کی نمکین ہوا تھی جو چہرے کے مساموں میں رچتی ہے اور جس کا ذائقہ لبوں کو بھینچنے سے حلق میں اُترتا ہے۔ گرتھ نے میری طرف دیکھا اور میں نے اُس کی طرف اور پھر ایک لمبی "ہُوں" کا تبادلہ کیا۔

"کیا میں آپ حضرات کی مدد کر سکتی ہوں؟" نمکین ہوا نے شگفتہ مسکراہٹ سے پوچھا۔

گرتھ بے حد مرعوب ہو چکا تھا۔ اُس نے نحیف سی آواز میں "اوہ لوائے" کہہ کر میری طرف دیکھا کہ تم ہی ہمت کرو۔

"ہم سکندریہ میں صرف سات گھنٹوں کے لئے رُکے ہیں، کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اس دوران قاہرہ جاکر جہاز کی روانگی سے پیشتر ہی لَوٹ آئیں۔۔۔؟"

نمکین ہوا نے چند سیاحتی کتابچے اُلٹ پلٹ کر کچھ حساب کتاب کیا۔ "اگر آپ فوراً روانہ ہو جائیں اور ٹرین پورے وقت پر قاہرہ پہنچ جائے اور پھر آدھے گھنٹے کے بعد اگر آپ پھر ٹرین پر سوار ہو جائیں اور وہ بھی پورے وقت پر واپس سکندریہ پہنچ جائے تو یہ ممکن ہو سکتا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے ہم قاہرہ نہیں جا سکتے۔"

"ہاں۔" وہ بے وجہ ہنستی ہوئی بولی۔

ہم نے نمکین ہوا کے چند گہرے سانس لئے اور مُنہ لٹکاتے بندرگاہ سے باہر آگئے۔

"تم نے کہا تھا ناں کہ ابوالہول ٹی ٹوٹلر ہے، شراب نہیں پیتا۔"

"ہاں۔"

"تو پھر میں بھی اُس سے ملنا نہیں چاہتا اُسے مزید انتظار کرنے دو۔۔۔"

بڑے پُل کے قریب ہم نے اپنے جہازی ساتھیوں کو جا لیا جو شہر کی جانب رواں تھے۔ پُل کے پار چند سیاہ بگھیاں کھڑی تھیں اور اُن کے گھوڑے بے چینی سے کان ہلا رہے تھے۔ ایک بگھی اُن میں سے علیحدہ ہوئی اور ہمارے گردہ کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

"شہر جانے کے صرف دس ڈالر۔" مصری کوچوان نے اپنے بلند سنگھاسن سے جُھک کر ہم سے کہا۔

"دو ڈالر۔" سام نے جواب دیا جو اس سے پہلے بھی سکندریہ آچکا تھا اور مقامی طور طریقوں سے واقف تھا۔

"یہ بگھی شاہ فاروق کے ایک خانسامے کی تھی۔" کوچوان اِترا کر بولا۔ "شاہانہ سواری کے لئے صرف آٹھ ڈالر۔"

"دو ڈالر۔" سام نے لاپرواہی سے کہا۔

"تمہاری شکلیں ہی نہیں ہیں شاہانہ بگھی میں بیٹھنے والی۔" اُس نے نفرت سے مُنہ پھیر لیا مگر بگھی بدستور ہمارے پہلو بہ پہلو چلتی رہی۔

راستے میں مصری دستکاریوں کی چند دکانیں آئیں۔ اندر جانے سے پیشتر سام نے تنبیہ کی کہ مصریوں کو اشیاء فروخت کرنے کا ایک غیر انسانی قسم کا ڈھنگ آتا ہے اور نہ چاہتے ہوئے بھی انسان کوئی نہ کوئی بیہودہ سی شے خرید لیتا ہے اس پر گرتھ نے سینہ پُھلا کر اعلان کیا کہ اُس نے ساری زندگی کوئی ایسی شے نہیں خریدی جس کی اُسے واقعی ضرورت نہ ہو اللہ مصریوں کی ایسی تیسی۔

ہم نے اندر جا کر مصر کی یادگار کے طور پر چند بٹوے اور ہینڈ بیگ خریدے جن پر فرعونوں اور لومڑیوں کی شبیہیں کندہ تھیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ لومڑیاں نہیں اُن کی بیگمات تھیں۔ دکان کی مالکہ کو واقعی اشیاء فروخت کرنے کا ایسا ڈھنگ آتا تھا کہ سکندریہ کے بجٹ کا نصف حصّہ اُس کی نذر ہو گیا۔ گرتھ چونکہ بیان دے چکا تھا کہ وہ ہرگز ہرگز کسی قسم کی خریداری نہیں کرے گا اس لئے وہ ایک کونے میں کھڑا ہم سادہ لوح سیّاحوں کو لٹتے دیکھتا رہا اور بڑے فخر سے مسکراتا رہا۔ اُسے خالی ہاتھ دیکھ کر مالکہ ایک انتہائی دیدہ زیب بیگ نکال لائی۔ "جناب خالص چمڑے کا اور ہاتھ کا بنا ہوا۔ اس پر فرعون ریمیس کی تصویر ہے یہودیوں کو مصر سے نکل جانے کے احکام دیتے ہوئے۔"

"مجھے فرعونوں سے سخت چڑ ہے، میں یہودی ہوں۔۔۔" گرتھ نے مجھے آنکھ مارتے ہوئے بناوٹی غصّے سے کہا۔

دکان کی مالکہ نے اس جواب پر آنکھ تک نہ جھپکی اور شیلف پر سے ایک اور بیگ اُتار لائی۔ "یہ لیجئے اس پر مقدّس کوہ طور کی شبیہہ ہے جہاں حضرت موسےٰ پر خدائی احکام نازل ہوئے تھے۔۔۔ آپ یہودی ہیں ناں؟"

گرتھ کو وہ بیگ خریدنا پڑا۔

"اس لیڈیز بیگ کا میں کیا کروں گا؟" گرتھ نے دکان سے باہر نکلتے ہوئے جھلا کر کہا۔

"تم اسے کسی ایسی لڑکی کو تحفے کے طور پر دے سکتے ہو جس سے تمہیں بے حد محبت ہو۔" سیبل بولی۔

گرتھ نے آگے بڑھ کر بیگ اُس کے کندھے پر لٹکا دیا "میں نے ابھی ابھی فیصلہ کیا ہے کہ میں تم سے بے پناہ محبت کرتا ہوں... میری طرف سے ایک حقیر تحفہ۔"

بگھی والا جو دکانوں کے باہر ہمارا انتظار کر رہا تھا اب پھر ہمارے ساتھ ہو لیا۔

"چھ ڈالر دو گے؟"

"دو ڈالر" سام اُس کی طرف دیکھے بغیر بڑبڑایا۔

بیروت کی نسبت سکندریہ ایک غریب شہر تھا۔ عمارتیں شاندار مگر صفائی سے گریز کرتی ہوئیں، ٹریفک انتہائی غیر جانبدار قسم کی، پتہ نہیں چلتا تھا کہ یہاں دائیں جانب چلنے کا رواج ہے یا بائیں جانب۔ پولیس مین بھی ڈھیلے ڈھالے لیکن نسوانی آبادی کی رنگت اور دیکھنے کے انداز میں ایسا نمک کہ انسان چٹخارے لیتا لیتا زبان سُکھالے۔ آنکھوں کے گرد قلوپطرہ سٹائل کاجل کے حلقے اور ہونٹوں پر خوش آمدید کہنے والی تیز لپ سٹک۔ کہا جاتا ہے کہ ہونٹوں کو رنگنے کا رواج فرعونوں کے زمانے سے شروع ہوا۔ خواتین اپنے ہونٹوں پر لپ سٹک صرف اس لئے لگاتی تھیں کہ شیطانی قوتیں مُنہ کے راستے جسم میں نہ داخل ہو جائیں، باہر ہی رُک جائیں۔ اُن دنوں رُک جاتی ہوں گی... یا پھر لپ سٹک بدبودار ہوتی ہو گی۔

کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد کوچوان نے ہتھیار ڈال دیئے۔ "چلو دو ڈالر ہی دے دو۔"

"کہاں کے لئے؟" سام نے پوچھا۔

"شہر کے لئے۔"

"شہر تو ہم پہنچ چکے ہیں" سام نے ہنس کر کہا۔ کوچوان نے گھوڑے کو چابک سے

بُری طرح پیٹا اور ہمیں عربی میں کوستا ہوا واپس بندرگاہ کی طرف چلا گیا۔

ایک ڈاک خانے کے باہر تصویری پوسٹ کارڈوں کا سٹینڈ تھا۔ ہم سب نے وہاں سے ابوالہول اور اہرامِ مصر کے تصویری کارڈ خریدے اور اُن پر "میں اس وقت ابوالہول کے سائے میں بیٹھا تمہیں یہ کارڈ لکھ رہا ہوں، کاش تم بھی یہاں ہوتے...؟" قسم کی عبارتیں لکھ کر پوسٹ کر دیئے۔ قریب ہی ایک سٹیشنری کی دکان تھی۔ میں ایک بال پوائنٹ اور چند کھلے کاغذ خریدنے کے لئے اندر چلا گیا۔ باقی گروہ بھی میرے پیچھے پیچھے چلا آیا۔ اندر پھر وہی حادثہ ہوا۔ گرتھ نے میری طرف دیکھا اور میں نے اُس کی طرف اور پھر ایک لمبی "ہوں" کا تبادلہ کیا... سیلز گرل مصری تھی مگر مصری کی ڈلی نہ تھی بھورے رنگ کی دیسی شکر تھی جسے چکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ دراصل یہ تو نمکین ہے۔ میں نے بال پوائنٹ کا پوچھا تو اُس کے نمکین شکر ہونٹ مسکراہٹ میں کھل گئے۔ "پلیز"۔ سیلز گرل کی مسکراہٹ بڑی بے بس کر دینے والی تھی کہ جی چاہتا تھا اس کے ہونٹ کبھی بند نہ ہوں اور اس کا ایک ہی طریقہ تھا کہ اُس سے مزید بال پوائنٹ خریدے جائیں۔ چنانچہ جب میں نے تقریباً پانچ بال پوائنٹ خرید لئے تو گرتھ آگے آ گیا۔ "بال پوائنٹ؟"

"پلیز" مصری شکر ایک بال پوائنٹ اُس کے حوالے کر کے مسکرا دیتی۔ اس سے پیشتر کہ اُس کے ہونٹ بند ہوں گرتھ جلدی سے کہتا۔ "بال پوائنٹ؟" اور یوں جب ہم باہر نکلے تو گرتھ، جارج اور سام کے ہاتھوں میں درجنوں بال پوائنٹ تھے۔

"اب میں ان بال پوائنٹس کا کیا کروں؟" گرتھ پاؤں پٹخ کر بولا اور پھر کچھ سوچ کر سیبل کے پاس چلا گیا "چونکہ میں تم سے بے حد محبت کرتا ہوں اس لئے یہ حقیر تحفہ..."

دوپہر کے کھانے کے لئے سام ہمیں ساحلی سڑک ۲۶ جولائی پر واقع "ریستوران" میں لے گیا جس میں داخل ہوتے ہی سب کے چہرے اُتر گئے۔ زیبائش سے اندازہ ہوتا تھا کہ ایک سادہ گلاس پانی کی قیمت بھی ہماری کل پونجی سے زیادہ ہو گی مگر سام کا کہنا تھا "حضرات آپ فکرمند نہ ہوں۔ یہ مصر ہے لبنان نہیں۔ بل آئے گا تو بالکل مونگ پھلیوں

کے برابر ہو گا۔

"تم "حمامہ" پسند کرو گے"؟ سام نے عربی اور فرانسیسی میں چھپے مینو کارڈ پر نظر ڈال کر پوچھا۔

"اگر "حمامہ" چکن کو کہتے ہیں تو ضرور پسند کروں گا۔" میں نے جواب دیا۔

"حمامہ... حمامہ نہیں جانتے؟..." سام نے دونوں ہاتھوں سے ایک حمامہ بنانے کی کوشش کی۔ "پرندہ ہوتا ہے۔"

"کبوتر؟"

"ہاں... اُس نے سر ہلایا "مگر نہیں..." وہ سوچ میں پڑ گیا "...کبوتر نہیں... کبوتر کی بہن۔"

"فاختہ؟"

"بالکل"۔ وہ مینو کو میز پر پٹختے ہوئے بولا "یہ ریستوران روسٹ فاختہ کے لئے بے حد شہرت رکھتا ہے۔"

جس طرح خرگوش جیسے بیبے جانور کو باقاعدہ کھا جانا میرے نزدیک ایک نیم وحشیانہ قسم کی حرکت ہے اسی طرح فاختہ ایسی پُرامن پروں کی پوٹلی کو ہڑپ کر لینا میرے بس کی بات نہ تھی اور پھر اس پرندے نے مجھے اپنی ایک کتاب کا عنوان بھی تو دیا تھا۔ چنانچہ میں نے سام کی پُرزور سفارش کو نظر انداز کرتے ہوئے روسٹ فاختہ کی بجائے روسٹ مُرغ کا انتخاب کیا۔

"خواتین و حضرات آپ باہر ٹیرس پر بیٹھ کر سمندر کا نظارہ کریں۔ میں مشروبات وہیں بھجوا دیتا ہوں۔ کھانا نصف گھنٹے میں تیار ہو جائے گا۔" سیاہ سوٹ اور ٹائی میں ملبوس منیجر نے پھٹی ہوئی جینوں والے ہم سیاحوں سے مؤدب ہو کر درخواست کی۔

ٹیرس پر نرم گرماہٹ کی دھوپ تھی اور سامنے سمندر تھا۔ سیبل نے دھوپ سینکنے کے لئے اپنا سکرٹ کچھ اس طرح سے اوپر تک سمیٹ لیا کہ فٹ پاتھ پر چلنے والے ایک ایک

...نے لگے۔ ایک مداری آ گیا جس کا بندر اُسی تربیت گاہ سے فارغ التحصیل ہُوا تھا جس ...پاکستانی بندر تربیت حاصل کرتے ہیں یعنی اُس نے بھی دُولہا بن کر رقص کیا، سخی بابا وں ...بنا ...سلام کیا اور چھڑی پکڑ کر کمر خمیدہ بوڑھا بنا۔ اس کے بعد ایک پھیری والا مسکراتا ہُوا ...گیا۔ ہاتھ میں ریڈیو، بازوؤں پر گھڑیاں، گھڑیوں پر جرابیں لٹکتی ہوئیں، کندھوں پر ریشمی ...ے کے تھان، کانوں پر پین ٹکائے ہوئے... سام نے ہمیں ایک مرتبہ پھر خبردار کیا کہ ...رگ نہایت باتونی ہوتے ہیں اور اگر ان سے گفتگو شروع کر دی جائے تو انسان خواہ مخواہ ...نہ کچھ خرید لیتا ہے اس لئے عافیت اسی میں ہے کہ انہیں نزدیک ہی نہ آنے دیا جائے۔

"بالکل نزدیک نہ آنے دیا جائے۔" گرتھ نے تائید کی۔

چنانچہ سام نے ہم سب کی ترجمانی کرتے ہوئے پھیری والے کو عربی میں دفع دور ہو جانے کا حکم دیا اور وہ اُسی طرح مسکراتا ہُوا چلا گیا۔ اس کے بعد تمام لوگ اطمینان سے اپنے مشروب پیتے رہے اور سام باجرے کی راکھی بیٹھی مٹیار کی طرح پھیری والوں کو ...شکارتا رہا۔ ایک پھیری والا جسے شاید اُس کے ساتھیوں نے خبردار کر دیا تھا ہمارے قریب تو نہ آیا البتہ کچھ فاصلے پر ایک ریلنگ کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا اور انتہائی مسکین مسکراہٹ چہرے پر سجائے بیچارگی سے ہماری طرف دیکھنے لگا۔ چونکہ اُس نے ٹیرس کے اندر داخل ہونے کی کوشش نہیں کی تھی اس لئے ہم بھی چُپکے بیٹھے رہے مگر تھوڑی دیر بعد اُس کی مسکراتی موجودگی ہمارے اعصاب پر سوار ہو گئی اور ہماری گفتگو اُکھڑنے لگی۔ چنانچہ سام نے آواز دے کر پوچھا کہ بھئی تم یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟ اُس نے وہیں ...کھڑے کھڑے جواب دیا کہ بس اِدھر سے گزر رہا تھا، تم لوگوں کے ہنستے کھیلتے خوبصورت چہرے دیکھ کر قدم رُک گئے۔ ماشاءاللہ۔ بس تمہیں دیکھ رہا ہوں اور خوش ہو رہا ہوں ...ہو تو چلا جاتا ہوں۔ اب اس کا کیا جواب دیا جاتا۔ تمام لوگ مجرموں کی طرح سر ...جھکا کر بیٹھ گئے۔ پانچ منٹ کی خاموشی کے بعد فیصلہ ہُوا کہ اس بھلے مانس کو بُلا کر پوچھ ہی ...لیا جائے کہ... جب وہ بھلا مانس ہم سے رخصت ہُوا تو میرے پاس ایک ایسا رومال تھا

جس میں اگر پھونک ماری جائے تو فوراً ایک گول سوراخ نمودار ہو جائے۔ پال اور مونیکا نے رسے بین کی عینک خرید رکھی تھی جس کے فریم کا رنگ ابھی سے اُتر رہا تھا۔ سام نے ایک انگوٹھی پہن رکھی تھی جس کی چاندی مدھم ہوئی جاتی تھی۔ جارج نے اپنے دستانوں میں ہاتھ ڈالا تو انگوٹھا باہر جھانکنے لگا۔ گرتھ کے پاس جرابوں کا ایک جوڑا تھا جسے کھینچا گیا تو وہ کھنچا ہی رہا۔

"اب میں ان جرابوں کا کیا کروں؟" اُس نے سیبل کی طرف ہنستے ہوئے دیکھا۔

"بہت بہت شکریہ لیکن میں سکرٹ کے نیچے جرابیں نہیں پہنتی۔"

اس بے تکی خریداری کا دلچسپ پہلو یہ تھا کہ ہم سب کو اپنے لُٹنے کا ذرہ برابر بھی ملال نہ تھا بلکہ ہم مصریوں کی چرب زبانی کے قائل ہو چکے تھے... جانے یہ لوگ اسرائیل سے مذاکرات کرنے کے لئے کسی پھیری والے کو کیوں نہیں بھیج دیتے۔

ایک ویٹر نے آکر اطلاع دی کہ جناب کھانا لگا دیا گیا ہے، تشریف لائیے۔ کھانے کی میز کی سجاوٹ دیکھ کر ایک مرتبہ پھر سب کے چہرے اُتر گئے۔ ہم نے تو آج تک اخباروں میں صدارتی ضیافتوں کی تصاویر میں ہی اس قسم کی آرائش دیکھی تھی، بہرحال سام نے پھر یقین دلایا کہ بل مونگ پھلیاں ہی ہو گا۔ سب سے پہلے سام ہی آگے بڑھا اور کرسی کھینچ کر اس پر بیٹھا ہی تھا کہ دھڑام سے نیچے جا گرا۔ کرسی کی ایک ٹانگ پرواز کرتی ہوئی شیشے کی کھڑکی سے جا ٹکرائی۔ منیجر بھاگتا ہوا آیا اور سام کو سہارا دے کر اُٹھانے لگا۔

"یہ کس قسم کا ریستوران ہے..." سام غصے سے بولا اور اپنے کپڑے جھاڑنے لگا، حالانکہ فرش پر قالین بچھا ہوا تھا۔

"یقین کیجیے فرنیچر بالکل نیا ہے... میں بے حد شرمندہ ہوں... پلیز... میری سمجھ میں نہیں آتا۔" وہ واقعی اتنا شرمندہ ہو رہا تھا کہ ہمیں ترس آ رہا تھا۔ پھر اس نے ویٹر کو اشارہ کیا جو دوسری میز سے ایک اور کرسی اُٹھا لایا۔

"پلیز"۔ منیجر نے سام سے گذارش کی۔

سام کرسی پر بیٹھا، پہلو بدل کر اس کی مضبوطی کے بارے میں اطمینان کیا پھر پُشت سے ٹیک لگانے کو ہی تھا کہ کرسی کی ایک ٹانگ جواب دے گئی اور وہ پھر فرش پر پڑا تھا۔

"میرا خیال ہے اس ریستوران سے چلا جائے۔" سام نے وہیں لیٹے لیٹے منیجر کو گھورتے ہوئے کہا۔

منیجر نے اپنی رونی صورت سے ہم سب کی طرف دیکھا اور پھر یکدم سام کے پاس بیٹھ کر منتیں کرنے لگا۔ "یقین کیجیے... خدا کے لئے... پلیز... میں آج ہی تمام کرسیاں بدل دوں گا۔ فرنیچر بدل دوں گا۔ فرنیچر والے کو بدل دوں گا... پلیز، پلیز..."

ایک اور کرسی منگوائی گئی۔ سام جھجکتے ہوئے اُس پر بیٹھ گیا۔ ہم سب ایک ایسے بچے کی طرح کان لگائے منتظر رہے جس نے پٹاخے کو دیا سلائی دکھا رکھی تھی۔ منیجر تو باقاعدہ جان کنی کے عالم میں تھا، اگر پلک جھپکتا تو تیزی سے جھپکتا کہ کہیں اس دوران کرسی پھر نہ ٹوٹ جائے۔ بہرحال سام سانس روک کے بیٹھا رہا اور خاصی دیر تک بیٹھا رہا۔

"کھانے کا مزا تو نہیں آئے گا۔" سام نے منہ بنایا۔ "بہرحال آپ لوگ بھی بیٹھ جائیں مگر ذرا احتیاط سے۔"

ہم اتنی احتیاط سے بیٹھے کہ اس عمل میں پورے پانچ منٹ لگ گئے۔ اب صورت یہ تھی کہ ہر شخص فرعونوں کی طرح ہاتھ آگے رکھے دم سادھے بیٹھا تھا۔ ویٹروں نے کھانا لگایا تو ہم بقیہ جسم کو بالکل منجمد کئے دھیرے دھیرے پوستیوں کی طرح ہاتھ بڑھا کر خوراک اُٹھاتے رہے۔ منیجر کچھ فاصلے پر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کی نظریں بدستور سام کی کرسی پر تھیں۔

"سُنو"۔ سام نے گردن آگے نکال کر سرگوشی کی۔ "آرام سے کھانا کھاؤ، کرسیاں ٹوٹ جائیں گی۔"

"یہ تم کہہ رہے ہو؟" گرتھ نے ہلے بغیر کہا۔

"انہیں بتاؤ جارج۔" سام نے کنگ کانگ کو اشارہ کیا۔

جارج نے چاروں طرف نظر دوڑا کر اطمینان کیا اور پھر بڑے فخر سے بولا "یہ میرا پرانا مشغلہ ہے۔ بیروت میں بھی جس ریستوران میں جاتا تھا کرسی پر بیٹھتے ہوئے کرائے کا ایسا خاموش وار کرتا تھا کہ سب کچھ بینگ بینگ ہو جاتا تھا اور یوں اکثر اوقات ہمیں خوراک مفت مل جایا کرتی تھی... ہاں ایک مرتبہ ذرا ٹریجڈی ہو گئی۔ ہوٹل کا مالک بھی کراٹے کا ماہر تھا وہ چپ چاپ یہ تماشہ دیکھتا رہا اور جب بل آیا تو اس میں دو کرسیوں کی قیمت بھی شامل تھی، ادا کرنی پڑی۔"

ہمارا بل آیا تو اس میں کرسیوں کی قیمت شامل نہیں تھی بلکہ انتظامیہ نے اظہار پشیمانی کے طور پر پچاس فیصد کی خصوصی رعائت دی تھی۔ واقعی مونگ پھلیاں!

گر تھ غسل خانے سے ہاتھ دھو کر آیا تو مسکرا رہا تھا۔ جارج اور سام بھی سرجھکائے ہنستے ہوئے لوٹے۔ یہاں تک کہ پال ایسا خاموش طبع شخص بھی جب فارغ ہو کر واپس آیا تو منہ پر ہتھیلی جما کر بیٹھ گیا اور آہستہ آہستہ ہلنے لگا۔ میں نے نیپکن تہہ کر کے پلیٹ میں رکھا اور مسکراہٹ کے اس عقدے کو حل کرنے کے لئے غسل خانے کی طرف چلا گیا۔ راستے میں منیجر کھڑا تھا۔ اُس نے مجھے دیکھتے ہی ایک مرتبہ پھر کرسیوں کی لاغر صحت کے بارے میں بھرپور معذرت کی اور آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ اپنے آپ کو ہلکا کرنے کی خاطر میں نے ابھی پتلون کی زپ کو ہاتھ لگایا ہی تھا کہ عقب سے ہلکی ہلکی نقرئی ہنسی کی آواز آئی۔ میں نے ایک دم ہراساں ہو کر یوں پیچھے دیکھا جیسے سیف کھولتا ہوا چور کسی آہٹ پہ بدک جاتا ہے... چار نمکین ہوائیں سفید اوور آل پہنے جاپانی گیشا گرلز کی طرح ہاتھوں میں تولیے تھامے ہنس ہنس کر بے حال ہو رہی تھیں۔ پتہ نہیں اُنہوں نے کیا دیکھ لیا تھا۔ اب میں اُن ترنوں بچے کی طرح تھا جسے خطرہ ہو کہ نیکر ڈھلک کر نیچے گر جائے گی اور وہ دونوں ہاتھوں سے اُسے تھامے کھڑا ہو۔ اُدھر نمکین ہوائیں منتظر تھیں کہ جس دباؤ کے تحت میں غسل خانے میں ہوں اُسے کم کرنے کا عمل شروع کر دوں مگر ظاہر ہے اُن کی کھی کھی کرتی موجودگی میں...

پیدا انہیں ہوتا تھا چنانچہ میں گھیرے میں آئے ہوئے ایک شکار کی مانند فرار کے راستے یعنی دروازے پر نظریں جمائے کھڑا رہا۔ اس پر ایک نسبتاً کم سن نمکین ہوا نے آگے بڑھ کر واش بیسن کا نلکا کھول دیا اور دانت نکالتے ہوئے مجھے ہاتھ دھونے کا اشارہ کیا۔ دوسری نے صابن پیش کیا اور باقی دونوں نے میرا ایک ایک ہاتھ تولیے میں لپیٹ کر نہایت اطمینان سے خشک کیا۔

واپسی پہ میری مسکراہٹ بھی میرے قابو میں نہ تھی۔

"دراصل مصر میں غربت بہت ہے۔" سام رنجیدگی سے بولا "طالب علم لڑکیاں ریستورانوں میں پارٹ ٹائم ملازمت کر کے اپنے تعلیمی اخراجات پورے کرتی ہیں۔"

مصر میں غربت بہت ہے، یہ فقرہ میں پہلے بھی سن چکا تھا۔ اپنے دوست خواجہ عباد ایک عرصہ تک عرب ریاستوں میں مقیم رہے۔ واپسی پر میں نے کہا۔ یار عباد وطن سے نکلے تھے تو یورپ بھی ہو آتے۔ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولے، کیسے ہو آتا مصر میں غربت بہت ہے۔ میں نے کہا ہو گی مگر آپ تو دوبئی اور شارجہ وغیرہ گئے تھے؟ بڑے دکھ سے کہنے لگے، ہاں وہیں گیا تھا مگر مصر میں غربت بہت ہے۔ چنانچہ اس کے بعد جب بھی غیر ممالک کا ذکر چھڑتا وہ تان اسی بات پر توڑتے کہ مصر میں غربت بہت ہے۔ لاہور چھوڑنے سے پیشتر اُن سے خصوصی ملاقات کی اور پوچھا کہ یا حضرت مصر جا رہا ہوں، یہ بھی جانتا ہوں کہ وہاں غربت بہت ہے مگر اپنے تجربوں کی بنا پر کچھ سفری مشوروں سے نوازیئے۔

کہنے لگے قاہرہ پہنچتے ہی برج کے علاقے میں چلے جانا... وہاں رہائشی فلیٹ بڑے مناسب کرایوں پر ملتے ہیں، ایک تم بھی لے لینا۔

میں نے پوچھا۔ اچھا پھر؟

کہنے لگے کہ تم اپنا سامان ابھی فلیٹ میں رکھ ہی رہے ہو گے کہ دروازے پر دستک ہو گی اور تین چار خواتین اندر آ جائیں گی۔ وہ پوچھیں گی کہ جناب آپ کو یہاں قیام

کے دوران باورچی خانے میں کام کرنے کے لئے خادمہ درکار ہے؟... تم حسب منشا اُن میں سے ایک کو رکھ لینا۔

میں نے عرض کیا۔ یا خواجہ مجھے باورچی خانے کے لئے خادمہ کی کیا ضرورت، کھانا تو باہر کھاؤں گا۔ فرمانے لگے، ویسے تو اُس فلیٹ میں باورچی خانہ بھی نہیں ہوگا مگر تم رکھ لینا... بس قاہرہ سے روانگی کے وقت اُس بیچاری کی خدمات کے عوض کوئی چھوٹا موٹا تحفہ دے دینا، خوش ہو جائے گی... دراصل مصر میں غربت بہت ہے۔

میں نے پوچھا۔ فرض کیجئے اس فلیٹ کے دروازے پر دستک نہیں ہوتی پھر؟ کہنے لگے، ہوگی۔

میں نے کہا پھر بھی فرض کر لیجئے کہ...

"ہوگی"۔ وہ غصے سے بولے۔ "ایک تو تم بحث بہت کرتے ہو۔ بہرحال اگر نہ ہوئی تو پھر نیچے اُتر آنا اور برج کے پل پر کھڑے ہو کر عبداللہ کو آواز دے دینا وہ بندوبست کر دے گا۔"

"کونسے عبداللہ کو؟" میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"بس تم پل پر کھڑے ہو کر زور سے نعرہ لگانا "عبداللہ"! اور تین چار عبداللہ آ جائیں گے..."

"اور اگر نہ آئے تو؟"

"ضرور آئیں گے۔" وہ گہرے یقین سے سر ہلاتے ہوئے بولے۔ "دراصل تمہیں پتہ نہیں ہے ناں کہ مصر میں غربت بہت ہے۔"

... اگر میں کسی طور آج قاہرہ پہنچ جاتا تو صرف شغل کے طور پر برج کے پل پر کھڑے ہو کر "عبداللہ۔ عبداللہ" کے نعرے لگانا میرے پروگرام میں شامل تھا... صرف یہ جاننے کے لئے کہ کیا واقعی مصر میں غربت بہت ہے۔

تین بج رہے تھے اور ہم تھکے ہوئے قدموں سے بندرگاہ کی جانب چل رہے تھے۔ ہمارے پیچھے پیچھے پھٹی ہوئی نیکر اور گندی بنیان میں ملبوس ایک چھ سات برس کا لڑکا سیٹیاں بجاتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ ہم میں سے کوئی بھی پیچھے دیکھتا تو وہ مزے سے آنکھ ٹکا دیتا۔

"اس مصری بچے سے عربی میں پوچھو کہ یہ ہمارا تعاقب کیوں کر رہا ہے"، گرتھ نے تنگ آ کر سام سے درخواست کی۔ سام ابھی کچھ کہنے کو تھا کہ وہ مصری بچہ اُڑتا ہوا ہمارے قریب آ گیا۔

"تم عربی بول سکتے ہو؟" اُس نے گرتھ سے انگریزی میں پوچھا۔

"نہیں"۔ گرتھ نے ڈانٹا۔

"انگریزی بول سکتے ہو؟"

"میں انگریزی بھی نہیں بول سکتا"۔ گرتھ نے دانت پیسے۔

"بول تو رہے ہو۔" اُس نے گرتھ کو آنکھ ماری۔

ایک غفیلی سنجیدگی کے ساتھ گرتھ نے اپنے آپ کو سیدھا کیا اور بولا "بچے اگر تم مصری ہو تو میں دُنیا کی کوئی بھی زبان نہیں بولتا... اس لئے کہ میں صبح سے ایک بیگ، دو درجن بال پوائنٹ اور جرابوں کا ایک جوڑا خرید چکا ہوں۔"

"لیکن میں کچھ بیچنا تو نہیں چاہتا۔" بچے نے اپنے خرانٹ چہرے پر اب معصومیت سجالی۔

"تو پھر کیا چاہتے ہو مشکوک مصری بچے؟" گرتھ دھاڑا۔

"میں تو آپ کو ایک لطیفہ سنانا چاہتا ہوں اور آپ ہنس ہنس کر بے حال ہو جائیں گے۔"

"دفع ہو جاؤ۔"

بچے نے نہایت ناراض اور رونی سی شکل بنالی۔ اس پر مونیک اور سیبل نے گرتھ کو بہت لعن طعن کی کہ کیوں بیچارے بچے پر گرم ہو رہے ہو، صرف لطیفہ ہی تو سنانا چاہتا ہے سُن لو۔

"ہنسی آئے گی۔" بچہ ہوشیار ہو گیا۔

"اور اگر... مجھے ہنسی نہ آئی... تو؟" گرتھ نے بچے کو کچا چبا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

"تو آپ مجھے جوتے ماریں۔" وہ ابرو چڑھا کر بولا۔

"اور یقین رکھو کہ میں واقعی ماروں گا... یہ جوکر مجھے ہنسائے گا!" گرتھ نے رُعب بنا کر اپنا سینہ ٹھونکا اور ہم سب بچے کی ہمراہی میں چلنے لگے۔

لطیفہ شروع ہو گیا۔

"ایک عورت کا امیر خاوند فوت ہو گیا۔ عورت نے ساری جائداد پر قبضہ جمانے کے لئے ایک وکیل سے قانونی مشورہ طلب کیا۔ وکیل نے ایک لاکھ ڈالر فیس کے طور پر وصول کئے اور اُسے ایک نہایت قیمتی مشورہ دیا..." بچہ خاموش ہو گیا۔

"کیا مشورہ دیا بچے؟" گرتھ بے دھیانی میں پوچھ بیٹھا۔

"جو مشورہ وکیل نے ایک لاکھ ڈالر وصول کر کے دیا وہ یونہی تو نہیں بتایا جا سکتا۔ آپ ایک ڈالر دے دیجئے، بتا دوں گا..."

گرتھ نے ایک آنکھ بند کر کے بچے کو گھورا اور زیر لب کوئی گالی دیتے ہوئے ایک ڈالر اُس کے حوالے کر دیا۔

"وکیل نے عورت کو مشورہ دیا کہ وہ اُس سے شادی کر لے اور اس طرح وہ ساری عمر اُس کے لئے مفت مقدمے لڑتا رہے گا۔"

"یہ تو بکواس قسم کا مشورہ ہے۔" گرتھ کو اب احساس ہوا کہ اُس نے اپنا ایک ڈالر ضائع کر دیا ہے۔

"تم وکیل ہو؟" بچے نے دریافت کیا۔

"نہیں۔"

"تو پھر تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ وکیل اسی قسم کے مشورے دیا کرتے ہیں... بہرحال شادی ہو گئی اور وکیل نے عدالت میں جا کر عورت کی حمایت میں ایسے دلائل دیئے کہ جج

بے ہوش ہو گیا..."

"اچھا؟" گرتھ چونکا مگر پھر سنبھل گیا۔ "میرا مطلب ہے ٹھیک ہے۔"

"تو جناب جج بے ہوش ہو گیا لیکن وکیل نے اُس کے کان میں ایک ایسی بات کہی کہ جج چھلانگ مار کر میز پر چڑھ گیا..."

"کیا بات کہی بچے؟" گرتھ نے بے اختیار پوچھا۔

"اگر آپ ایک ڈالر عنایت کر دیں تو..."

بندرگاہ کے داخلے پر پہنچے تو لطیفہ جاری تھا اور گرتھ کی امارت میں سات ڈالر کی کمی واقع ہو چکی تھی۔

"مصری بچے۔" گرتھ نے بالآخر دانت نکال دیئے۔ "خدا کا شکر ہے کہ اب میں جہاز پر سوار ہو جاؤں گا ورنہ آج میں دیوالیہ ہو جاتا... یہ لو ایک اور ڈالر اور دفع ہو جاؤ۔"

"تھینک یو سر۔" بچے نے مؤدب ہو کر سلام کیا، سب کو باری باری آنکھ ٹکائی اور سیٹی بجاتا ہوا شہر کی جانب چلا گیا۔

"اب سمجھ آئی ہے کہ مصر میں آنے والے سیاح مصریوں کی بجائے ممیوں کی رفاقت میں زیادہ وقت کیوں گزارتے ہیں، وہ بولتی نہیں!"

کسٹم ہال میں اُونٹ بک رہے تھے۔ چمڑے کے بنے ہوئے مزیدار شکلوں والے اُونٹ جن کی آنکھوں میں کاجل بھرا تھا اور وہ ایک قطار میں درجہ بہ درجہ کھڑے تھے پہلا اُونٹ سائز کا تھا یعنی باقاعدہ اُونٹ۔ اس کے بعد اُس سے قدرے چھوٹا اور آخری اُونٹ دو انچ اُونچا تھا مگر مکمل۔ میں نے آخری سائز کا ایک منی اُونٹ خریدا اور اُس کے پیٹ تلے "سکندریہ" لکھ کر جیب میں ڈال لیا، سوونیئر!

جہاز پر کاریں اور تربوز لوڈ ہو رہے تھے۔ یہ بے شمار تربوز اُن مصریوں کا اثاثہ تھے جو سکندریہ سے سوار ہو رہے تھے۔ میں سستانے کی غرض سے اپنے پُرسکون ہال

میں داخل ہُوا تو وہاں مصریوں کا ایک ہجوم موجیں کر رہا تھا، چرس پی جا رہی تھی اور
تربوز کھائے جا رہے تھے۔ فضا میں دُھواں گاڑھا تھا۔ میرے بستر پر بھی ایک تربوز
دھرا تھا۔ نچلے بستر سے ایک منحنی سا مصری اُٹھا اور لمبا ہوتا گیا "... میرا نام صلاح الدین
اس کی ٹھوٹھنی اُس اُونٹ سے بہت ملتی تھی جو اُس وقت میری جیب میں تھا"... یہ
تربوز آپ کے لئے ..." وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر جُھکا اور جُھکتا چلا گیا "برادر برادر"
میں نے تھوڑی دیر صلاح الدین سے گپ لگائی جو نیپلز میں پھیری لگانے جا رہا تھا
اور پھر چرس کی بُو سے تنگ آکر عرشے پر آ گیا۔

پورے چار بجے جہاز کو دھچکا سا لگا جیسے سات گھنٹے کی ہم آغوشی کے بعد
سکندریہ نے اُسے دھتکار دیا ہو اور دھیرے دھیرے بندرگاہ سے پیچھے ہٹنے لگا کھلے
سمندر میں آتے آتے ہمیں شام ہو گئی۔ میں نے اپنا ممی اُونٹ ہتھیلی پر رکھا، اُس کی
کاجل بھری آنکھیں مجھے تکنے لگیں، سکندر۔ سکندریہ!

انتونی نے خنجر سے خودکشی کر لی، سکندر۔ سکندریہ!

قلوپطرہ کو ناگن نے ڈس لیا، سکندر۔ سکندریہ!

:———:

اوڈیسیس کشتی روک دو

"دریائے اوشن کے بہتے پانیوں میں سے میرا جہاز گزرا اور سمندر کی وسعت
میں داخل ہُوا اور ہم جزیرہ طلوعِ آفتاب کے قریب پہنچے جہاں صُبح کا گھر ہے۔"

رات کے بعد صُبح آئی۔

جہاں گرد کے سفر کی ایک اور صُبح۔

جہاز نیم تاریک سمندر کے فریب میں گھِرا ہُوا تھا۔ یونانی دیوی دیوتاؤں کے
سمندر ایجیئن میں جہاں ٹرائے سے واپسی پر اوڈیسیس نے عرشے پر کھڑے ہو کر صُبح
کی آمد کے لاتعداد مناظر دیکھے تھے۔

رات بے چینی میں گزری۔ ڈیک میں خوابیدہ جسموں کی باس اور گھٹن، میں نیند
کو ساتھ لئے عرشے پر آ گیا۔

جہاز نیم تاریک سمندر کے فریب میں گھِرا ہُوا تھا اور صُبح آنے کو تھی۔

سمندر کے سلوٹوں سے پاک سرمئی فرش نے آسمان کی گِرتی محراب کو روک رکھا
تھا۔ نیند غالب آ گئی۔

جب پیوٹے دوبارہ اُٹھے تو، دیکھو اب وہاں روشنی تھی۔

سُورج کا روشن دائرہ سمندری فرش کے کنارے پر سے جھانک رہا تھا۔ سُنہری
کرنوں کی ڈاریں سنسناتے تیروں کی طرح میرے سر پر سے پرواز کرتی گزر رہی تھیں اور

سمندر اُن کا عکس ہو رہا تھا۔ بقول ہومر انگوروں کی شراب ایسا سیاہی مائل سرخ
اُس اندھے شاعر نے اِسی دیومالائی سمندر پر یہیں کہیں وارد ہوتی اسی قسم کی صُبح کو
ہزاروں برس پہلے "دیکھا" اور بیان کیا۔

تازہ، خوشگوار صُبح آئی اور اپنے نارنجی جھنڈے سے آسمان روشن کر دیا۔
صُبح نارنجی لبادے میں ملبوس آئی۔
صُبح نے گلابی رنگت والے ہاتھوں سے مشرق کو روشن کیا۔
صُبح اپنے بستر پر بیدار ہوئی جہاں وہ ٹھتونس دیوتا کے ساتھ سوتی ہے تاکہ وہ
انسانوں کو روشنی مہیا کرے۔
صُبح جب چمکتے سورج نے ستاروں کو فرار ہونے پر مجبور کر دیا۔
بابرکت صُبح آئی اور مشرق کو سُرخ روشنی میں لپیٹ دیا۔
اور پھر صُبح اپنے بابرکت تخت پر بیٹھ گئی۔

اوڈیسیس ایک بادبانی کشتی میں سوار اپنے ساتھیوں کے ہمراہ جادوگرنیوں،
یک چشم جنوں، اسیری کے ہاتھ بڑھانے والی دیویوں اور سمندر کے قہر میں سے گزرتا
اپنے گھر کی جانب بڑھ رہا تھا اور میں اُسی راستے پر لیکن مخالف سمت میں اپنے گھر سے
دُور ہو رہا تھا۔ اس پُرانے جہاز میں، اکیلا کہ سیّاح ہمیشہ تنہا ہوتا ہے اور میں بھی حادثوں
اور جنگوں کے عفریتوں سے بچ نکلا تھا، مگر ابھی سفر باقی تھا... مجھے ابھی ٹرائے پہنچنا
تھا اور گھر کو واپسی کا خیال اس لمحے نَم آنکھ کے آگے دھُندلائے منظر کی طرح تھا۔
صُبح اپنے بابرکت تخت پر بیٹھ چکی تھی اور مسافر ناشتے سے فارغ ہو کر عرشے
پر پھیل رہے تھے۔

"بریکفاسٹ سر۔" مونیک کی آواز آئی۔
میں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا تو ایک لمحے کے لئے بھونچکا سا رہ گیا۔ اُس کا طویل بدن
بالکل بدن تھا۔ قریب آئی تو معلوم ہُوا کہ اُس نے اپنی جلد کی رنگت کی بکینی پہن رکھی ہے

چار گرہ کپڑا جو دو گرہ باندھ لیا جاتا ہے اور دو گرہ اٹکا لیا جاتا ہے مگر مونیک نے
[...] بالائی حصے کی وجہ سے وہ دو گرہ بھی باندھ رکھا تھا کہ اسے اٹکانے کے لئے مناسب
[...] موجود نہ تھی یعنی اُس کا نِکر کچھ اس قسم کا تھا کہ پتہ نہ چلتا تھا کہ وہ آ رہی ہے یا
[...] ہے۔ وہ بالکل ہموار تو نہ تھی، بس شائبہ سا ہوتا تھا کہ یہاں کچھ ہے۔
"کافی؟" اُس نے فلاسک میری گود میں رکھ دی۔ "اور بسکٹ؟" اور ایک بسکٹ
تھما دیا۔
"شکریہ۔"
"آج چونکہ ہمیں کہیں بھی لنگر انداز نہیں ہونا اس لئے میں نے سوچا کہ عرشے پر
دھوپ سینک کر دن گزارا جائے۔" وہ ڈیک چیئر پر دراز ہوتی ہوئی بولی اور آنکھیں
بند کر لیں۔
"پال کہاں ہے؟"
"اُسے اُبکائیاں آ رہی ہیں، صبح سے واش بیسن کو آغوش میں لئے کھڑا ہے۔"
تھوڑی دیر بعد جارج اور سام کا جوڑا بھی نمودار ہو گیا۔ سیبل بھی ان کے ہمراہ
[...] اور بکینی میں تھی۔ لگتا تھا جیسے کچھ دیر پہلے کی نسبت جب اُس نے نہانے کا یہ لباس
پہنا تھا وہ مزید موٹی ہو چکی ہے کیونکہ وہ باقاعدہ سانس سمیٹ سمیٹ کر گفتگو کر رہی
[...] مبادا کپڑا دھاگوں میں نہ بدل جائے۔ جارج حسبِ عادت ایک پُر مسرّت ریچھ کی طرح
[...] پر نچھاور ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ تینوں مصری لڑکیاں بھی بکمشت گھوم رہی تھیں
[...] لمبائی، کپڑوں میں مقفّل۔
[...] گرتھ آیا، کولہوں پر ہاتھ رکھ کر ایک گہرا سانس لیا۔ "صُبح کے وقت تازہ ہوا میں
سانس لینا صحت کے لئے مفید ہے، صرف ایک سانس... اب میں سیلون میں جا کر
[...] پیوں گا۔"
"خالی پیٹ شراب پینا صحت کے لئے مُضر ہوتا ہے۔" سیبل نے بڑی ہمدردی
[...] سمجھایا۔

گرمتھ نے میری گود میں رکھے پیکٹ میں سے ایک بسکٹ اُٹھایا اور نگل لیا۔ "اب ٹھیک ہے ؟" اور لٹکتا ہوا چلا گیا۔

سمندر کے بے انت پھیلاؤ میں جہاز کا تنہا وجود ہل چلاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

تیسرے پہر ہم سے خاصے فاصلے پر سفید زمین کا ایک تودہ اُبھرا ہوا دکھائی دینے لگا رہوڈز۔ جس کی بندرگاہ کے دہانے پر دُنیا کے سات قدیم عجائبات میں سے ایک یعنی کلاسس آف رہوڈز ٹانگیں پھیلائے کھڑا تھا۔ مجسّمہ ساز چارس کا تراشا ہوا یہ عظیم بُت ایستادگی کے پانچ برس بعد ایک زلزلے سے اوندھا ہو کر گرا اور سمندر کی تہہ میں جا لیٹا۔ پھر روایت کے مطابق ایک شامی نے اسے خریدا اور اس کے ٹکڑے پانی میں سے نکال کر اُونٹوں پر لادے اور شام لے گیا۔ روایت میں یہ نہیں بتایا گیا کہ رہوڈز اور شام کے درمیان پڑتے سمندر پر اُونٹ کس طرح چلتے گئے، یا تو بڑے پہنچے ہوئے اُونٹ ہوں گے اور یا پھر اُن دنوں تیرتے بھی ہوں گے۔ اُونٹ کو صحرائی "جہاز" بلا وجہ تو نہیں کہا گیا . . . رہوڈز کے وجود میں آنے کی روایت بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ذیوس دیوتا ایک روز بڑے خوشگوار مُوڈ میں تھا چنانچہ اُس نے دریا دلی بلکہ سمندر دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سمندر میں واقع بارہ جزیرے مختلف جونیئر دیوتاؤں کو الاٹ کر دیئے۔ آخر دیوتا تھا اس لئے بے چارے اپالو کو بھول گیا جو ان دنوں کہیں چھٹیاں منانے گیا ہوا تھا۔ واپسی پر اپالو بڑا سیخ پا ہوا اور دھمکی دی کہ آج کے بعد اس سمندر میں سے جو بھی جزیرہ ظہور میں آئے گا، میرا ہو گا۔

ایک چمکیلی صبح پُورا سمندر زلزلے سے لرزا اور ایک آتش فشاں چٹان سمندر کی تہہ میں سے اُبھرتی ہوئی سطح پر نمودار ہو گئی۔ یہ رہوڈز تھا اور اپالو کا تھا۔

سمندر کے بے انت پھیلاؤ میں جہاز کا تنہا وجود ہل چلاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

سیبل گنگنا رہی تھی۔

سمندر پر دُھوپ کی چادر چمکتی تھی۔ کورے لٹھے میں چلتی قینچی کی طرح جہاز اس ددر کو کاٹتا چلا جا رہا تھا۔

سفید چٹانوں کا ایک اور جزیرہ نظر آیا جیسے سمندر میں کسی سفید براق وہیل کی ت اُبھری ہوئی ہو۔ ہم اس کے قریب ہوئے اور پھر ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ دُھوپ تیزی میں پگھلتی ہوئی سفیدی کے علاوہ وہاں کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ سفید چٹانوں کا کس پانی پر تھا جس کے سکوت میں جہاز مخل ہوتا چل رہا تھا۔

"مجھے تو یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے ابھی ان چٹانوں کے عقب میں سے ایک آنکھ والا سائیکلوپ دیو نمودار ہو گا اور جہاز پر ایک بھاری چٹان گرا دے گا۔" جارج خاموشی سے گزرتے سفید جزیرے کی ہیبت سے سہم گیا۔

"اور اگر سائیکلوپ نے تمہیں دیکھ لیا تو وہ احساسِ کمتری میں مبتلا ہو کر سمندر میں ڈوب مرے گا۔" سیبل لاپرواہی سے بولی۔

ایک ناراض جارج نے ہچکی لی۔ "تم محبّت کے اظہار کے لئے کتنی خوبصورت زبان استعمال کرتی ہو۔"

جہاز جزیرے کے بالکل قریب ہو کر چل رہا تھا۔ چٹانیں ہم پر جھکی ہوئی تھیں اور میں اپنی سیاہ آنکھوں میں حیرت اور خوف لئے اُن کی سفید بے جان آنکھوں کو تک رہا تھا۔ دُھوپ کی چمک تیز اور ڈراؤنی تھی۔ ہر شے پر مکمل خاموشی چھا چکی تھی، سوائے سیبل کے جو اب بھی آنکھیں بند کئے گنگنا رہی تھی۔

اوڈیسیس کی کشتی یقیناً اسی جزیرے کے قریب سے گزری ہو گی۔

ایک روز ایک چٹانوں کے جزیرے میں اُس نے سائرنز کو دیکھا . . . "ہمارے پاس آؤ، اے شاندار اوڈیسیس، کشتی روک دو اور آ جاؤ . . ."

لیکن اوڈیسیس کو سِرکے دیوی نے خبردار کر دیا تھا کہ سب سے پہلے تم اُس

جزیرے میں پہنچو گے جہاں سائرنز نام کی ڈائنیں رہتی ہیں جو مردوں کے ساتھ ہم بستری کرتی ہیں۔ مگر جو کوئی اُن کے قریب جاتے وہ کبھی اُس جزیرے سے واپس نہیں آتا، کیونکہ وہ پھولوں کے کھیتوں میں لیٹی ہوئی خوبصورت گیت گا کر مسافروں کو مسحور کر دیتی ہیں اور ان کے گرد اُن کے شکار مردوں کی لاشیں پڑی ہوتی ہیں۔

سیبل گنگنا رہی تھی اور سفید جزیرے کی چٹانیں ہمارے سروں پر سایہ کرتی گزر رہی تھیں۔

"ہمارے پاس آؤ اے شاندار اوڈیسیس، کشتی روک دو اور آ جاؤ... آؤ ہم تمہیں اُن کارناموں کے گیت سنائیں جو تم نے ٹرائے کی دیواروں تلے سر انجام دیئے ... کشتی روک دو۔"

یہ سائرنز کا بلاوا تھا۔ سمندری ڈائنیں جن کے چہرے خوبصورت ترین عورتوں کے تھے اور دھڑ پرندوں کے... لیکن اوڈیسیس کو سِرسے خبردار کر چکی تھی۔ اُس نے سفید جزیرے کے قریب آنے سے پہلے اپنے ساتھیوں کے کانوں میں پگھلی ہوئی موم ڈال دی تھی تاکہ وہ سائرنز کے مسحور کن گیت سن کر کشتی سے کود کر جزیرے میں نہ پہنچ جائیں اور خود کو بادبان کے مستول سے باندھ لیا تھا... "ہمارے پاس آؤ اے شاندار اوڈیسیس" ... سائرنز کا گیت اتنا سحر انگیز اور رسیلا تھا کہ اوڈیسیس بے اختیار ہو گیا اور اپنے آپ کو مستول سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگا مگر اُس کے بہرے ساتھیوں نے اُسے اور مضبوطی سے باندھ دیا... یوں جب اُس کی کشتی سائرنز کے چٹانوں والے جزیرے کے قریب سے گزر گئی تو سب نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا اور اوڈیسیس کو کھول دیا۔

ہمارے جہاز نے جب خاموشی کے اس سفید جزیرے کی آخری چٹان پیچھے چھوڑی تو سب نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا۔ میں نے ریلنگ پر جکڑے ہاتھوں کو کھول دیا۔

سیبل بدستور گنگنا رہی تھی مگر اُس کی آواز میں وہ سحر باقی نہ تھا۔

دوپہر کے کھانے کا اعلان ہوا تو سب لوگ اُٹھ کر چلے گئے۔ مونیک حسب معمول جاتے ہی لوٹ آئی۔

"لنچ سر۔" اُس کی چوہوں ایسی دندیاں لبوں میں سے جھانکنے لگیں۔

"شکریہ"۔

وہ ڈائننگ روم میں واپس جانے کے بجائے ڈیک چیئر پر لیٹ گئی اور آنکھیں بند کر لیں۔

"کیا تم کھانا نہیں کھاؤ گی؟" میں نے بالکل ایک ایسے فقیر کی طرح محسوس کیا جو خیرات میں سے پہلا نوالہ اُٹھانے کے بعد اپنے اَن داتا کی جانب کھسیانی بلّی کی طرح دیکھتا ہے۔

"نہیں تم کھاؤ... میں اپنے جسمانی تناسب کا دھیان رکھ رہی ہوں۔"

"مجھ سے پوچھو تو تمہیں خوراک کی سخت ضرورت ہے۔" میں نے اُس کے لم ڈھینگ پیکر پر ایک نظر ڈالی۔

"عجیب بات ہے۔" وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ "یورپ میں تو..." اُس نے اپنی ہتھیلی استری کی طرح پورے جسم پر پھیری۔ "اس قسم کے ماڈل گرلز ایسے فگر کو پسند کیا جاتا ہے مگر مشرقی لوگوں کو جانے کیوں بڑے گوشت سے ہی رغبت ہوتی ہے... یہ سیبل عربوں میں بہت پاپولر تھی، کیا خیال ہے ایسا کیوں ہے؟ آخر عورت اور گائے میں کچھ تو فرق ہوتا ہے..."

میں چپکے سے سنتا رہا اور اُس کا مہیا کردہ کھانا کھاتا رہا...

"کل صبح ہم اطالیہ پہنچ جائیں گے..." لنچ کے خاتمے پر میں نے کہا۔

"ہاں کل نیپلز اور پرسوں مارسیلز اور اُس سے اگلے روز میں پیرس میں ہوں گی، آزاد اور خود مختار۔"

"ہاں بہت وسیع القلب خاوند ہے کیا؟"

"وہ میرا خاوند نہیں ہے۔" مونیک آنکھیں بند کر کے پھر لیٹ گئی۔ "تمہارے مشرق کی نام نہاد اخلاقیات کے خوف سے ہم میاں بیوی کے طور پر سفر کرتے رہے ہیں ورنہ

ہم صرف دوست ہیں ... اگر ہم اس سفر کے دوران ایک دوسرے کو سمجھ لیتے پسند کر لیتے تو شاید شادی بھی کر لیتے مگر پال نے مجھے مایوس کیا ہے ... اُس نے فلسطینی کیمپوں کی جو تصویریں اُتاری ہیں وہ سب ان کے خلاف استعمال کی جائیں گی۔"

"وہ کیسے؟" میں نے سگرٹ سُلگا کر دانتوں میں دبا لیا۔

"پال نے فلسطینی مہاجروں کی ایسی تصاویر اُتاری ہیں جن سے ظاہر ہو کہ یہ لوگ اپنے وطن سے نکل کر عیش کر رہے ہیں۔ اقوامِ متحدہ کی مُفت خوراک کھاتے ہیں۔ عربوں کے خیرات کردہ کپڑے پہنتے ہیں اور خیموں میں پڑے سوتے رہتے ہیں ... اور اُن لوگوں نے مجھے اور پال کو سر آنکھوں پر بٹھایا، پورے قیام کے دوران محبت سے دوہرے ہوتے رہے اور ہمیں ایک پیسہ بھی خرچ کرنے نہیں دیا ... اتنے مہربان لوگوں سے اس قسم کا سلوک؟ ... اسی لئے بیروت میں ہمارا جھگڑا ہو گیا تھا ... اُس کا مؤقف یہ ہے کہ اُسے ان تصویروں کے بدلے اتنی رقم ملے گی کہ ہم ایک شاندار گھر خرید سکتے ہیں اور میں کہتی ہوں کہ ایسے انسانوں کے ساتھ دھوکہ کرنا مکروہ ترین فعل ہے ... میں کبھی بھی ایک ایسے شخص کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی ... اور پھر وہ مکمل مرد بھی تو نہیں ..."

"ہیں ..." میرا سگرٹ لبوں میں سے گر گیا۔ "یعنی وہ ... یعنی اُس کے کچھ ساڑھے چھ بجے ہوتے ہیں؟"

"نہیں"۔ وہ چوہیا کے دانتوں سے ہنسی۔ "ساڑھے چھ تو نہیں ... چھ بج کر پینتیس منٹ کہہ لو ... لیکن اگر وہ ایک ایماندار شخص ہوتا تو شاید میں اس کمی کو کبھی محسوس نہ کرتی ... جہاز کچھ زیادہ نہیں ڈول رہا؟" اُس نے ڈیک چیئر کے بازو کو گرفت میں لیتے ہوئے چونک کر کہا۔

سمندر کی چادر پر حرکت کرتی ہوئی سلوٹیں نمودار ہو رہی تھیں۔

"یہ سب تمہاری جنسی گفتگو کا اثر ہے ... سمندر میں بھی اُبال آ رہا ہے۔"

"ابھی فوراً ہی دھیما ہو جائے گا ... پال کی طرح۔" اُس نے پورے یقین سے کہا۔

لیکن سمندر دھیما نہ ہوا، اُس کی شہوت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ایک نامعلوم سی درخت سنسناہٹ ہر سُو پھیلنے لگی۔ دس منٹ تک یہی کیفیت رہی اور پھر سورج کے آگے بھی غبار آ گیا۔ جہاز اس بُری طرح لڑکھڑانے لگا جیسے یونانی دیومالا کا کوئی عفریت سمندر کی تہہ میں سے ہاتھ بڑھا کر یونہی تفریحاً اسے جھلا رہا ہو۔

ایجین جو ایک پُرسکون سمندر کی شہرت رکھتا ہے یکدم اپنا مزاج بدلنے لگا۔ اسے یونانی دیوتاؤں کا سومنگ پُول بھی کہا جاتا ہے اور لگتا تھا جیسے تمام دیوتا ابھی ابھی کوہ اولمپس سے اُتر کر اس میں کُود پڑے ہوں ... جہاز سے ٹکراتی لہروں کی پھوار سے ہمارے چہرے بھیگنے لگے اور تیز ہوا ہمیں سرد کرنے لگی۔

"ہے تم لوگ"۔ عرشے پر آنے والی سیڑھی پر گرتھ کھڑا تھا بلکہ کھڑے ہونے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ "کیا واقعی باہر طوفان ہے؟"

ہم دونوں اُٹھ کھڑے ہوتے۔ "آثار تو ایسے ہی ہیں۔"

"ہاہاہا"۔ وہ ہنستا ہوا سیڑھی پر جھک گیا۔ "سیلون میں وسکی پیتے ہوئے مجھے لگ رہا تھا کہ باہر طوفان ہے مگر جہاز کا کپتان اصرار کر رہا تھا کہ نہیں سمندر بالکل پُرسکون ہے۔"

"جہاز کا کپتان ... وہ سیلون میں کیا کر رہا ہے؟"

"وسکی پی رہا ہے۔"

"تو پھر ..." مونیک نے ایک خوفزدہ ہچکی لی۔ "جہاز کون چلا رہا ہے؟"

"میری پالتو لڑکی فکر مت کرو، اُس کا کہنا ہے کہ اتنے قدیم جہاز سے زیادہ چھیڑ چھاڑ کی جائے تو اس کے بخئے اُدھڑنے لگیں۔ راستے میں آئس برگ یا چٹانیں تو ہیں نہیں اس لئے سمت متعین کر کے اسے کھلا چھوڑ دینا ہم سب کی صحت کے لئے مفید ہے۔"

"راستے میں جزیرے تو ہیں ..."

"ہم ڈبکی لگا کر ان کے نیچے سے گزر جائیں گے ..."

"گرتھ پلیز مجھے خوفزدہ مت کرو ..." مونیک نے منت کی۔ "کیا تمہیں یقین ہے کپتان سچ کہہ رہا ہے؟"

"بالکل... وہ صبح سے مجھے شراب پلا رہا ہے، ایسا شخص جھوٹ نہیں بول سکتا۔"

"میں تو اپنی کیبن میں جا رہی ہوں..." وہ لائف بوٹس میں سے گزرتی ایک کشتی پر رکی۔

"لائف بوٹ نمبر پانچ... کیا خیال ہے ابھی سے اس میں سوار نہ ہو جائیں۔"

"عمدہ مشورہ ہے... میں بھی آتا ہوں۔" گرتھ چیخا مگر سمندر کے بے پناہ شور نے اس کی آواز کو جذب کر لیا۔

سیڑھیوں کے قریب پہنچ کر مونیک نے پوچھا "تم نے کچھ کہا تھا؟"

گرتھ نے اپنا فقرہ دُہرایا۔

"لائف بوٹ خطرے سے بھاگنے کے لئے ہوتی ہے نہ کہ خطرے کو ساتھ لے کر بھاگنے کے لئے..." اُس نے خوش دلی سے گرتھ کے رُخسار پر ایک دوستانہ بوسہ جڑا اور نیچے چلی گئی۔

میں اپنے ہال کمرے میں آگیا۔ سام تو اپنے بستر پہ دراز ایک پاکٹ سائز ریڈیو کان سے چپکائے سر ہلا رہا تھا اور جارج خرّاٹے لے رہا تھا۔ اُس کے خرّاٹوں کی آواز کبھی کبھی سمندر کے شور پر بھی حاوی ہو جاتی۔ بقول سام اس مقابلے میں سمندر کے جیتنے کا امکان بہت کم تھا۔

مصریوں کا ایک گروہ دائرے کی صورت فرش پر براجمان تھا اور چرس کا ایک سگرٹ گردش میں تھا۔ کش لگانے کے بعد سگرٹ دوسرے اُمیدوار کو تھمانے کا مرحلہ خاصا دشوار نظر آ رہا تھا۔ سگرٹ کو چٹکی میں تھام کر دائرے کے درمیان میں لایا جاتا، پانچ چھ ہاتھ اُس کی طرف بڑھتے مگر نشے اور جہاز کے ڈولنے کے باعث وہ خلا میں ہی ٹٹولتے رہتے۔ ہاتھوں کا یہ سرکس کافی دیر تک جاری رہتا اور بالآخر اتفاقاً کسی خوش نصیب کا ہاتھ سگرٹ پر جا پڑتا اور وہ اُسے دبوچ کر مُنہ کو لگا لیتا... کچھ مسافر سوئے تھے اور باقی تربوز کھا رہے تھے۔

میں نے اپنے بستر پہ ہاتھ رکھا تو وہ نچڑ رہا تھا۔ پاٹ ہول کھلا تھا اور چھینٹے اندر آ رہے تھے۔ میں سام کے ساتھ بیٹھ گیا۔

"آج رات فرسٹ کلاس کے سیلون میں الوداعی پارٹی کا ہنگامہ ہو رہا ہے سیبل بھی ہو گی۔"

"اتنے شدید طوفان میں؟"

"یہ تو جعلی قسم کا طوفان ہے، شام تک ختم ہو جائے گا... چلو گے؟"

"اگر پارٹی فرسٹ کلاس کے سیلون میں ہے تو وہاں صرف فرسٹ کلاس کے مسافروں کو ہی داخل ہونے دیا جاتا ہو گا۔"

"تم ہامی بھرو طریقہ میں بتا دیتا ہوں۔"

"میں کھلے کانوں سے سُن رہا ہوں۔"

"لباس معقول قسم کا پہنو، دربان سے آنکھ ملائے بغیر بے دھڑک اندر چلے جاؤ اور جاتے ہی بار پر سب سے مہنگے مشروب کا آرڈر دے کر بار مین کو بھاری ٹپ کر دو... یوریکا... کوئی نہیں پوُچھے گا۔ میں پچھلی تین راتوں سے یہی کچھ کر رہا ہوں۔"

"اور اگر کسی نے ٹکٹ چیک کر کے باہر نکال دیا تو... بے عزّتی ہو گی۔"

"وہ تو ہو گی... مگر وہاں سیبل بھی تو ہو گی۔"

چرس کی بُو نے مجھے بیزار اور پیاسا کر دیا۔ جارج بدستور خرّاٹے لے رہا تھا۔ اور میرا بستر نچڑ رہا تھا۔ میں پھر باہر آ گیا۔

سمندر دھیما نہیں ہوُا تھا۔ میں راہداری کی ریلنگ کو تھام کر چلنے کی کوشش کرنے لگا۔ کبھی اپنے آپ کو دھکیل کر قدم بڑھاتا اور کبھی جسم بے اختیار ہو کر آگے نکل جاتا۔ تلاطم سے ڈولتے جہاز میں چلنے کی کوشش بیک وقت چاروں سمتوں میں قدم اُٹھانے کے مترادف ہے اور وہ بھی بے اختیار ہو کر۔ جہاز رعشہ زدہ ہاتھ میں پکڑے جھنجھنے کی طرح لرز رہا تھا۔ انجن روم میں سے مشینوں کی مشقّت کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یہ ایک کھُلی راہداری تھی۔ دائیں ہاتھ پر سمندر اور بائیں پر ترچھی ہوتی جہاز کی دیوار۔ چند قدم کے اس کھُلے فاصلے پر سمندر کی بوچھاڑ اتنی شدید تھی کہ میں کافی دیر اسی

تذبذب میں رہا کہ اس پُل صراط کو پار کرنے کا خطرہ مول لیا جائے یا پسپائی کا بگل بجا کر واپس اپنے کمرے میں چلا جائے۔ بہرحال ایک مرتبہ جب لہریں پیچھے ہٹ رہی تھیں تو میں کچی برف پر چلنے والوں کی طرح دھیمے دھیمے قدم رکھتا دوسری طرف پہنچ گیا کہ لمحے میرے پیچھے آتی لہروں کا ایک ریلا پوری قوت سے راہداری کی دیوار سے آ ٹکرایا۔

سمندر کی پھنکار اُس بھینسے سے مشابہ تھی جو پہلی مرتبہ بُل رِنگ میں داخل ہوتا ہے اور اپنے سامنے آنے والی ہر شے کو فنا کر دینا چاہتا ہے۔ وہ کھولتا ہوا اُبل رہا تھا اور اُس کی شوک کی گونج کبھی گھٹ رہی ہے اور کبھی بڑھ رہی ہے۔ وہ جہاز کے اس منحنی کھلونے کو اپنے آبی وجود سے بھر دینا چاہتا ہے۔ اسے اپنی آبی کائنات میں شامل کر کے پانی کر دینا چاہتا ہے۔۔۔ اور وہ تمہارا تعاقب کرتا رہتا ہے، پیچھے پیچھے چلا آتا ہے، کیبن میں، راہداری میں، ڈائننگ روم میں، ہر جگہ وہ تمہاری پُشت پر ہے ایک مسلسل موجودگی۔ کبھی وہ سانس روک لیتا ہے مگر اُس کے آنے والے قہقہے کی گُم گونج کا شائبہ باقی رہتا ہے اور پھر وہ ہنستا ہے اور ڈرا دیتا ہے۔ وہ مسلسل موجودگی تو ہے مگر مسلسل شور نہیں جب وہ آگے بڑھتا ہے تو اُس کی آواز میں بادلوں کی گڑگڑاہٹ دندناتی چلی آتی ہے اور جب پیچھے ہوتا چلا جاتا ہے تو اُس کی سمٹتی شوک میں بے بسی ہوتی ہے جیسے اُس کی شہ رگ کٹ گئی ہو اور مُردہ سانس اُبلتے ہوئے باہر آ رہے ہوں۔۔۔ طوفان میں پانیوں کا تو کوئی حصّہ نہ تھا، وہ تو وہی تھے پُرسکون اور ہموار۔ وہ صرف سواری کا کام دے رہے تھے اُس کے لئے۔ وہ اُن لہروں پر سوار تھا جہاز کے چھوٹے سے کھلونے پر حملہ آور ہونے کے لئے۔ اسے اپنے آبی وجود سے بھر دینے کے لئے۔ جیسے ایک ہجوم گلیوں، بازاروں، درس گاہوں میں پُرسکون ہوتا ہے، پھر وہی ہجوم بپھرتا ہے اور حملہ آور ہو جاتا ہے۔ وہ صرف سواری ہوتا ہے۔

شیطان اور سمندر کے درمیان

سیلون میں گرتھ اکیلا بیٹھا ہوا تھا اور ہاتھ میں پکڑے گلاس کو آنکھوں کی سطح تک اُٹھائے اُسے چھلکنے سے بچا رہا تھا۔ تمام کرسیاں رسّوں سے بندھی ہوئی تھیں اور بار کاؤنٹر کے شیلفوں میں رکھی بوتلیں جل ترنگ بجا رہی تھیں۔

"چیئرز" اُس نے گلاس اونچا کیا جو اونچا ہی ہوتا چلا گیا۔ گرتھ نے بمشکل ایک چسکی لی اور بقیہ شراب اُس کے کپڑوں پر چھلک گئی۔ اُس نے اپنے کوٹ کی جیب میں محفوظ بوتل کھینچ کر نکالی اور گلاس پھر بھر لیا۔

"پورے جہاز میں اس وقت صرف یہی جگہ ہے جہاں نسبتاً سکون ہے۔" میں نے رومال سے اپنا بھیگا ہوا چہرہ پونچھا۔

"یہ کسی بھی وقت جہاز میں سب سے پُرسکون جگہ ہے۔" گرتھ بولا۔ "بس اپنے اپنے ظرف کی بات ہے۔" اُس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا، سُرخ انار۔

"کیا اتنی بلانوشی سے تمہیں متلی نہیں ہو رہی؟"

"نہیں۔۔۔" وہ بمشکل بات کر رہا تھا۔ "اندر اور باہر کا موسم ایک ہے۔ میں مزے

میں ہوں . . . اور میں بلانوش ہرگز نہیں ہوں، بس مجھے سمندر اچھا نہیں لگتا۔ میں ٹیکساس کا رہنے والا ہوں۔ بے انت میدانوں اور ویران خوبصورتیوں کا دھول سے اٹا ٹیکساس۔ میں جس زمین پر قدم رکھتا ہوں اُس کے ہلتے رہنے کا عادی نہیں ہوں جہاز پر اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے میں اس کی لرزش اور سمندر کی موجودگی سے اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتا ہوں اور یہ مجھے پسند نہیں . . . اسی لئے چیئرز۔" اُس نے گلاس اونچا کر دیا۔

"سمندر میں انسان سفر کرتے ہیں، دریا بہتے ہیں، زلزلے آتے ہیں، آبی جانوروں کی صورت میں خوراک اُگتی ہے . . . یہ بھی تو ایک طرح کا میدان ہے۔"

"ہاں، لیکن کیا تم اس کی سطح پر ایک بپھرے ہوئے سٹالین گھوڑے کو دوڑا سکتے ہو، . . . ایک بھاری تھنوں والی گائے کو کھونٹے سے باندھ کر رکھ سکتے ہو . . . جب بارش ہوتی ہے تو اس میں سے اُٹھتی دھول میں خوشبو ہوتی ہے . . . بہت بہت شکریہ مگر مجھے اپنے میدان چاہئیں . . ."

انسان مشترک قدروں، رنگ و نسل یا مذہب کے حوالوں سے قریب آتے ہیں مگر ہمیں میدانوں نے قریب کیا اور میرا میدان اُس کے ٹیکساس کی طرح ویران اور خاردار جھاڑیوں سے اٹا ہوا نہیں تھا بلکہ وہ تو ہریاول تھا۔ کپاس کے پھولوں والا جوہڑ تھا۔ مکئی کے دانے، مکھن کی سفیدی، گندم کی سنہری چمک، بسنت رُت، گرم دوپہر اور سرد چاندنی تھا۔

گھر کی باتیں شروع ہوئیں تو گرتھ اپنا گلاس بھول گیا اور ہم دونوں باہر بپھرتے سمندر کو۔ یہاں تک کہ اُسے خاموش ہونا پڑا۔ شیلفوں میں رکھی بوتلیں ساکت ہو گئیں بارمین اپنے سٹول سے اُٹھا اور کاؤنٹر پر گلاس سجانے لگا۔ عرشے کا جو حصّہ کھڑکی میں سے دکھائی دے رہا تھا اُس پر جہاز کے ملازمین صفائی میں مشغول تھے . . . سمندر دھیما ہو چکا تھا۔

"میں تازہ ہوا کا ایک اور سانس لے آؤں، صبح والا شاید ختم ہو رہا ہے۔" گرتھ اُٹھ کر باہر چلا گیا مگر فوراً ہی بھاگتا ہوا واپس آ گیا۔ "لینڈ او ہائے" اُس نے مُنہ بجا کر

بلند کیا اور مجھے باہر لے گیا۔

عجیب سرزمین تھی۔ دائیں طرف اطالیہ کے پُر ہیبت پہاڑ تھے دھند میں ظاہر ہوتے اور ڈوبتے اور بائیں جانب جزیرہ سسلی کی پُر آسیب چٹانیں گزر رہی تھیں اور روشنی تھی اور جو بھی اُسے چٹانوں کی سیاہی اور دھند نے جذب کر رکھا تھا اور جہاز ان وحشی بلندیوں کے درمیان میں سے ایک سہمے ہوئے بچّے کی طرح دم سادھے گزر رہا تھا۔

"ہم سسلین سٹریٹس میں سے گزر رہے ہیں۔" گرتھ ریلنگ پر ہاتھ رکھے مُنہ اُٹھائے چٹانوں کی دہشت کے بوجھ تلے گویا ہوا۔ "جہاز رانی کی تمام قدیم کتابوں اور یونانی داستانوں میں ان کا ذکر ملتا ہے مگر میں انہیں آج تک ایک دیو مالائی قصّہ ہی سمجھتا رہا . . ."

جہاز پر دونوں طرف سے اُمڈتی ہوئی سیاہ اور بلند چٹانوں اور ان میں رینگتی دھند کی مافوق الفطرت آمیزش کسی بھی نادان شخص کو وہی سوچنے پر مجبور کر سکتی تھی جو قدیم یونانی سوچتے تھے۔ یہ ایک دیو مالائی سرزمین تھی، دیوتاؤں کا بلند مسکن اور عفریتوں کی آماجگاہ۔ اوڈیسیس کی کشتی بھی اسی تنگ آبی درّے میں سے گزری تھی۔

"اس طرح ہم سسلین سٹریٹس میں داخل ہوئے، خوف سے کراہتے ہوئے کیونکہ ہمارے ایک جانب سکائلہ ڈائن تھی اور دوسری جانب چیریڈس جو خوفناک انداز میں سمندر کا نمکین پانی اپنے اندر کھینچ رہی تھی . . . میرے ساتھی خوف سے زرد پڑ گئے۔"

(ہومر "اوڈیسے")

ہم اُسی آبی درّے میں سے گزر رہے تھے اور شاہد تھے کہ ہزاروں برس پیشتر ہومر نے "اوڈیسے" نام کا جو کلاسیک تخلیق کیا وہ جغرافیائی حقائق پر مبنی تھا، آج بھی دائیں طرف گزرتی اطالوی چٹان "سکائلہ" کے نام سے جانی جاتی ہے اور جانب صرف چار میل کے فاصلے پر سسلی کی کیپ پی لورو کا خوفناک بھنور موجود سمندر کے نمکین پانی کو اپنے اندر کھینچتا ہے۔ انگریزی کا مشہور محاورہ "BETWEEN THE DEVIL & THE DEEP BLUE SEA" اسی مقام کی

نسبت سے مشہور ہُوا... ایک طرف ڈیول یعنی سکائلہ چٹان اور دوسری طرف بھنور
جو ڈیپ ملبوسی ہے اور ان کے درمیان "اکڈنیز" جہاز اور اس کے عرشے پر میں اور گرتھ
مُنہ اُٹھائے دُھند کے کفن میں سے نظر آتی کالی چٹانوں کے جسموں میں وہ غار تلاش کرتے
جس میں سکائلہ ڈائن رہتی تھی۔

اُس نے اپنی کشتی چٹانوں کے ساتھ ساتھ چلائی اور سکائلہ نے اپنی پناہ گاہ میں سے ٹانگیں لٹکا کر اُس کے چھ ساتھی اُٹھا لئے۔ "اوڈیسیس ہمیں بچالو۔" انہوں نے اوڈیسیس کا نام آخری مرتبہ پکارا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟ میں تمہارے خیالات کے لئے ایک پینی دیتا ہوں؟" میں نے گرتھ سے کہا۔

"اوڈیسیس کی کشتی بھی اسی درّے میں سے گزری تھی۔"

"صرف وہ مخالف سمت میں سفر کر رہا تھا۔"

"ہائیں"۔ گرتھ چونک اُٹھا۔ "تم نے ہومر پڑھ رکھا ہے؟"

"HE WAS ALL GREEK TO ME" میں نے مُسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"لیکن تم امریکی ہوتے ہوئے بھی اتنے پڑھے لکھے کیسے ہو؟"

"میں سکول میں بچّوں کو ہومر جو پڑھاتا ہوں ایسے... اور اگر تمہارا خیال ہے کہ امریکی پڑھے لکھے نہیں ہوتے تو تم آج تک غلط امریکیوں سے ملتے رہے ہو..." اُس نے مصنوعی سنجیدگی سے بیان دیا اور پھر بڑے عالمانہ انداز میں سر ہلا کر کہنے لگا "تمہیں شاید معلوم نہ ہو کہ مشہور انگریزی محاورہ..."

"مجھے معلوم ہے... بٹوین دی ڈیول..."

"اوہ فنی مین..." اُس نے شور مچا دیا۔ "سُن لیتے تو کیا حرج تھا، آخر اچھا اختتام بھی تو کوئی چیز ہوتا ہے۔"

"ہوتا ہوگا... لیکن یہ بتاؤ کہ کیا آج فرسٹ کلاس کی سیلون میں واقعی سیل نائٹ

بی ہے؟"
گرتھ نے کچھ کہنے کے لئے لب کھولے اور اُسی لمحے سسلی کی سیاہ چٹانوں پہ
یے ہوئے بادلوں میں روشنی کا ایک چُندھیا دینے والا سانپ لہرایا۔ عرشہ روشن ہُوا،
ن کا سفید پینٹ چمکا، دونوں طرف بہتا نیلا سمندر نظر آیا۔ اُس کے کنارے اُبھری
ہوئی بلند چٹانیں دُھند کے پردے میں سے عُریاں ہوئیں اور پھر ایک زوردار کڑک
ے میں گُونج گئی۔ "اوڈیسیس ہمیں بچالو... اوڈیسیس۔" ساتھ ہی ہلکی بارش
ہ شور اُترا اور ہمارے چہرے بھیگنے لگے۔

میں اپنے معقول ترین پیراہن یعنی جین جیکٹ میں ملبوس تھا جس کی شکنیں اس
طرح نمایاں تھیں جس طرح کھیت میں مینڈھیں اُبھری ہوتی ہیں اور فرسٹ کلاس سیلون
کے دروازے کو تک رہا تھا جس کے اندر دھما دھم دھما چوکڑی مچی ہوئی تھی مگر باہر ایک
تنومند ترک ویٹر ہر آنے والے کا سفری ٹکٹ چیک کر رہا تھا کہ فرسٹ کلاس کا مُسافر
بھی ہے ناں... میں ہمت کر کے آگے بڑھا۔ ہتھیلیوں میں پسینہ تھا۔ سام نے کہا تھا
دربان سے آنکھ ملائے بغیر... مگر میں اُس کی طرف دیکھتا چلا جا رہا تھا اور اُس
نے یہ بھی کہا تھا کہ بے دھڑک اندر داخل ہو جانا اور میرا دل بے دھڑک ہونے کے خیال
سے ہی بے تحاشا دھڑک رہا تھا... ویٹر مجھے دیکھ کر مُسکرایا اور ٹکٹ کے لئے ہاتھ آگے
بڑھایا۔ میں نے بھی ہاتھ بڑھا دیا اور خوب زور سے مصافحہ کیا۔ "مسلمان؟" اُس نے سر ہلایا
"الحمد للہ" میں نے جلدی سے کہا اور اندر چلا گیا۔ جاتے جاتے میں نے اس کے چہرے
سے مُسکراہٹ غائب ہوتے دیکھی۔

بار پر جا کر میں نے دونوں کُہنیاں کاؤنٹر پر ٹکانے کی کوشش کی مگر وہ پھسل گئیں۔
ندامت اُن تک پہنچ چکا تھا۔ بہر حال میں نے سب سے مہنگا مشروب خریدا اور بارمین
کی طرف دس ڈالر کا نوٹ بڑھا دیا۔ اُس نے پانچ ڈالر واپس کئے تو میں نے تین نوٹ

اُسے تھما دیئے۔

"تھینک یُو" وہ ابھی جُھک ہی رہا تھا کہ دربان میرا پیچھا کرتا ہُوا وہاں پہنچ گیا۔

"مسلمان؟" میں نے پُوچھا اور بقیہ دو نوٹ اُس کی جیب میں اُڑس دیئے۔ اُس نے جیب میں سے نوٹ نکال کر اُن کا معائنہ کیا۔ "الحمد اللہ" اُس نے مُسکراتے ہوئے کہا اور واپس چلا گیا۔

میں نے اطمینان اور اعتماد کا ایک سانس اپنے اندر کھینچا اور ایک ویران میز پر جا بیٹھا۔ مشروب کا ایک گھونٹ بھر کر میں نے صورتِ حال کا جائزہ لیا۔۔ چہرے تو سبھی دیکھے بھالے تھے مگر اُن پر کچھ کر گزرنے کی تحریر صرف آج ہی دیکھنے میں آ رہی تھی۔ سام کے ہمراہ وہی اُونچے دانتوں والی لمبی آسٹریلوی لڑکی تھی اور جارج سیبل پر اُمڈا بیٹھا تھا۔ مونیک اور پال بیزار چہرے کھینچے ایک دوسرے کی بجائے دوسروں کو دیکھ رہے تھے۔ السیشن والا جرمن اپنے جانور کو گود میں لئے اُس کے بالوں میں کنگھی کرنے میں مصروف تھا۔ آرکسٹرا کوئی اُداس سی ترک دُھن بجا رہا تھا اور فرش پر چند جوڑے اُس پر رقص کرنے کی کوشش میں ٹھوکریں کھا رہے تھے۔ اتنی دیر میں گرتھ اندر داخل ہُوا۔ کاؤنٹر سے وہسکی کی پوری بوتل خریدی، مجھے دیکھا اور بتیسی نکالتا ہُوا میرے پاس آ گیا۔ جارج اور سام نے گرتھ کی بوتل دیکھی اور حسبِ مقدور مُسکراتے ہوتے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ہمارے پاس آ گئے۔ میز آباد ہو گئی۔

"تم کب ناچو گی سیبل ڈیئر؟" گرتھ نے وہسکی کی آبی سرسوں کا پہلا گھونٹ لیا۔

"جب حاضرین اتنے مخمور ہو جائیں کہ میرا موٹاپا اُنہیں دلکش نظر آنے لگے۔۔۔" وہ لہک کر بولی۔

"تو پھر میں اس وقت یقیناً مخمور ہوں۔"

سام نے آرکسٹرا بجانے والوں کے ساتھ کچھ مذاکرات کیے جن کے نتیجے میں اُنہوں نے ڈسکو کی دھمک آمیز دھمال شروع کر دی۔ میزیں خالی ہو گئیں اور فرش دھمکنے لگا۔

"تم کیوں نہیں ناچتے؟"

"اگر میں کھڑا ہو سکتا تو ضرور ناچتا۔" گرتھ نے نیم وا آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔ "یہی سوال اب میں تم سے کرتا ہوں۔"

"کس کے ساتھ ناچوں؟"

"وہ جو حسین سی لڑکی ہے کاؤنٹر کے قریب۔۔۔"

"وہ حسین لڑکی موٹا دربان ہے۔"

"اچھا۔" گرتھ پریشان ہو گیا۔ "یہاں سے تو لڑکی ہی نظر آتی ہے، بلکہ دو نظر آتی ہیں، بلکہ شاید تین۔۔۔"

گرتھ پر خمار مکمل طور پر حاوی ہو چکا تھا۔

جارج اپنے موٹاپے کے باوجود بڑی رِدھم سے ناچ رہا تھا اور سیبل تو تھی ہی رقاصہ۔ سام بھی رقص تو کر رہا تھا مگر اُس کی ٹانگیں اور ہاتھ کراٹے کے انداز میں چل رہے تھے۔

"ہائے"۔ گرتھ ایک دم مُنہ کھول کر پکارا۔

"کیا ہے گرتھ؟"

"تمہیں نہیں کہہ رہا، اُس لڑکی کو کہہ رہا ہوں۔۔۔"

اس مرتبہ اس کا اندازہ درست تھا۔ سیلون میں وہ تینوں ہو بہو مصری بیبیاں داخل ہو رہی تھیں۔ گرتھ نے ایک اور زوردار "ہائے" کی اور اُن کا رُخ ہماری طرف ہو گیا۔

"کیا یہ کرسیاں خالی ہیں؟"

گرتھ نے حیرت انگیز پھُرتی دکھائی اور فوراً اپنی کرسی سے اُٹھ کھڑا ہُوا۔ "یہ کرسی بھی خالی ہے۔"

وہ نمکین مسکراہٹوں سمیت دھیرے سے بیٹھ گئیں۔

گرتھ نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر میرے کان میں سرگوشی کی۔ "اس کو رقص کے لئے کہو۔"

"ان میں سے کس کو؟"

"ان میں سے کا کیا مطلب؟" وہ چمک کر بولا۔ "ایک ہی تو ہے۔"

"[illegible] مرتبہ ایک نہیں ہے گرتھ۔ سچ مچ تین ہیں۔۔۔ وہی مصری نمک کے مجسمے۔"

"اچھا" گرتھ نے منہ کھول دیا۔ "میں سمجھا مجھے تین نظر آرہی ہیں۔" اُس نے تینوں کو باری باری نہایت اہتمام سے گھورا۔ ویسے اگر میں ذی ہوش ہوتا تب بھی انہیں ایک ہی سمجھتا۔۔۔ ہیں ہی ایک جیسی۔"

اور گرتھ تھا بھی درست۔ ایک سے لباس، ناک نقشے کسی مشترکہ سانچے میں ڈھلے ہوتے، ایک دوسرے کی فوٹوسٹیٹ کاپیاں۔

"اچھا اب چلو ان میں سے کسی ایک کو رقص کے لئے کہو۔۔" اُس نے پھر سرگوشی کی۔

"اتنا عرصہ ہو گیا ہے اس فعلِ قبیح کو چھوڑے ہوئے کہ ڈر لگتا ہے کہیں بھول نہ گیا ہو۔"

"تیراک تیرنا نہیں بھولتے۔۔ جلدی کرو تم ایک کو لے جاؤ تو میں دوسری سے باتیں کروں۔"

"تیسری بھی ہے۔"

"بے شک ہے مگر مجھے دوسری پسند ہے۔"

"ان میں سے دوسری کونسی ہے؟"

"پتہ نہیں۔"

میں نے اُن میں سے کسی ایک کو رقص کی دعوت دی اور ہم فرش پر آگئے۔

"میرا خیال ہے کہ میں نے آپ کو اس سے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔" میں نے ایک گھسے پٹے جملے سے گفتگو کا آغاز کیا۔

"آپ کا خیال درست ہے کیونکہ پچھلے چند روز سے ہم اس جہاز میں اکٹھے سفر کر رہے ہیں۔"

"بے شک۔۔۔" میں جھینپ گیا۔

یہ میری جارج تھی، اُس کی بہنیں اَینی جارج اور شیری جارج تھیں اور یہ تینوں جارج بہنیں مارسیلز جا رہی تھیں جہاں یہ مصری بچوں کو فرانسیسی پڑھاتی تھیں۔ موسیقی ختم ہوئی تو ہم واپس میز پر آگئے جہاں گرتھ بے حد خوشگوار ہو رہا تھا۔ اُس نے پھر سرگوشیاں شروع کر دیں۔ "ان میں سے کوئی ایک اَینی ہے اور دوسری شیری ہے۔ مجھے بتاؤ کہ شیری کونسی ہے کیونکہ وہ مجھے پسند ہے۔"

میں نے میری سے پوچھا کہ ان میں سے شیری کونسی ہے تو اُس نے کہا کہ میں تو اَینی ہوں، میری وہ ہے، ظاہر ہے کہ تیسری شیری تھی۔ میں بھی کنفیوز ہو رہا تھا۔ سام کی ساتھی لڑکی ٹائلٹ میں گئی تو گرتھ نے ایک سازشی سرگوشی میں اُس کو قائل کر لیا کہ وہ اَینی کو رقص کے لئے لے جاتے۔ سام بھی اُس آسٹریلوی بلندی سے بیزار ہو چکا تھا اس لئے فوراً راضی ہو گیا۔ اُن کے جانے کے بعد گرتھ نے میری منت کی۔ "اب اگر تم ان میں سے میری کو رقص کے لئے کہو تو باقی شیری رہ جائے گی۔"

میں نے میری سے درخواست کی تو اُس نے معذرت کر دی۔ وہ بہت تھکی ہوئی تھی۔

"تو پھر اسے میری کیبن میں لے جا کر لٹا دو، آرام کر لے گی۔" گرتھ نے خفیہ آواز میں پیشکش کی۔

"احمقوں جیسی باتیں کرتے ہو۔۔۔ اتنی مختصر ملاقات کے بعد ایسی پیشکش کیسے کر سکتا ہوں؟"

"تو پھر عرشے پر لے جاؤ، وہاں لائف بوٹس ہیں۔" وہ دھیمے سے بولا۔

"یہاں تو دم گھٹ رہا ہے۔" میں نے میری سے مخاطب ہو کر کہا۔ "دھواں بہت ہے، چند لمحوں کے لئے عرشے پر نہ چلیں۔"

میری توقعات کے عین برعکس مسکراتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی اور گرتھ نے ایک کان سے دوسرے کان تک پھیلتی ہوئی مسکراہٹ سے میرا شکریہ ادا کیا۔

عرشے پر خاموشی تھی اور خاموشی سے زیادہ سیاہ تاریکی۔ انجن کی ہلکی سی گونج تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ہم کھُلے سمندر میں نہیں بلکہ چٹانوں سے گھرے ایک آبی درّے میں سے گزر رہے ہیں۔

"آپ میری جارج ہی ہیں ناں؟" میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ "میرا دوست قدرے اُونچا اُڑ رہا ہے اس لئے ..."

"ہم تینوں واقعی ہم شکل ہیں ..." اُس کا گندمی چہرہ اندھیرے میں بھی لَو دے رہا تھا۔ "بلکہ کئی مرتبہ ہم ایک دوسرے کے سکول میں جا کر پڑھا آتی ہیں اور بقیہ سٹاف کو علم تک نہیں ہوتا۔"

"آپ ذرا ریلنگ سے ہٹ کر کھڑی ہوں، اِدھر میری طرف ... اُدھر سمندر ہے۔"

"شیطان اور سمندر کے درمیان ..." میری جارج کے دانت شعلوں کی طرح روشن ہوئے اور پھر بجھ گئے۔

فیصلہ حسبِ معمول شیطان کے حق میں ہُوا۔

"میری جارج!" عرشے پر آنے والی سیڑھیوں سے آواز آئی۔

"شیری جارج!" اُس آواز کے پیچھے سے ایک اور آواز آئی۔

تینوں جارج بہنیں پھر اکٹھی ہو گئیں۔ سام اور گرتھ بھی اندھیرے میں گرتے پڑتے آن پہنچے۔

"حضرات ہم بہنیں آپ کی بے حد مشکور ہیں کہ آپ نے ہمیں آج شام اتنی خوشگوار رفاقت دی۔ مدر جارج یعنی ہماری والدہ نے مصر سے روانگی کے موقع پر تاکید کی تھی کہ ہم تینوں ہر رات دس بجے سو جایا کریں۔ دس بجنے والے ہیں، خدا حافظ۔" اور وہ ہنستی ہوئی اندھیرے میں گم ہو گئیں۔

گرتھ نے اُن کی والدہ محترمہ کے بارے میں کچھ نازیبا سے الفاظ بڑبڑائے جن کا

مفہوم یہ بنتا تھا کہ صرف دس بجے سونے کو کہا تھا، تینوں بہنوں کو اکٹھے سونے کو تو نہیں کہا تھا۔

ہم نے ناآسودگی کے غصّے سے پھُنکارتے ہوئے چند سگرٹ پھُونکے اور سیلون میں واپس آ گئے۔ اب وہاں سیبل برائے نام کاغذی سے لباس میں بیلے ڈانس کر رہی تھی۔ اور بیشتر حاضرین میزوں پر کھڑے ہو کر داد دے رہے تھے۔ اُس کا گھنا جسم اور چھوٹا قد ٹکڑے لینے کی بجائے دھچکے کھا رہا تھا مگر حاضرین واقعی اتنے مخمور ہو چکے تھے کہ وہ انہیں اس وقت دُنیا کی خوبصورت ترین رقاصہ نظر آ رہی تھی۔ ہم لمبے چہرے کھینچے مُنہ بنائے بیٹھے رہے۔ رقص ختم ہُوا تو عرب مدّاحوں نے اُسے گھیر لیا۔ آرکسٹرا نے عربی موسیقی سے دامن چھڑا کر دوبارہ ڈِسکو میوزک کو پلّے باندھ لیا۔

"تم نے جہاز کا نوٹس بورڈ دیکھا تھا؟" سام نے گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہوئے مجھ سے دریافت کیا۔ "ہم گیارہ بجے کے قریب سِسلی کے ایک آتش فشاں پہاڑ کے قریب سے گزریں گے۔"

"آتش فشاں تو دس بجے ہی سو جاتے ہیں۔" گرتھ بڑبڑایا۔

تھوڑی دیر بعد سام اپنی نشست سے اُٹھ کھڑا ہُوا۔ "یہاں کچھ بھی نہیں رکھا، آؤ باہر چلتے ہیں۔"

عرشہ جہاز کے اندرونی ہیجان سے لاتعلق اندھیرے میں آرام کر رہا تھا۔ میں اور سام ریلنگ پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہو گئے اور آنکھیں پھیلا کر تاریکی میں مرکوز کر دیں۔ کچھ بھی نہ تھا۔ پھر آہستہ آہستہ عرشے پر مسافروں کے ہیولے حرکت کرنے لگے جو ہماری طرح آتش فشاں کو دیکھنے کے لئے اکٹھے ہو رہے تھے۔ اردگرد تاریک فضا تھی کچھ نظر آتا تھا لیکن کسی شے کی موجودگی کا احساس ہو رہا تھا۔ وہاں پرے کچھ ہے مگر اس کا وجود تاریکی سے الگ نہیں ہو رہا تھا، اُسی کا حصّہ تھا۔ کچھ ہے تو سہی، مگر کیا!

ہم آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے رہے۔

"میرا خیال ہے کہ آتش فشاں میں آگ ہوتی ہے اور آگ کو اندھیرے میں ڈھونڈنے کے لیے اتنا تردّد نہیں کرنا پڑتا جتنا ہم کر رہے ہیں۔"

"درست کہتے ہو" سام بدستور اندھیرے میں گھورتا رہا۔

تھوڑی دیر بعد اُس نے تاریکی کے ایک ایسے حصّے کی طرف اشارہ کیا جو تاریک تر ہونے کی بنا پر کچھ الگ سا نظر آ رہا تھا۔ پہاڑ... ایک شائبہ سا تھا مگر آتش نہ تھی، مسافروں کے درمیان کھسر پھسر ہوئی۔ ہم خاموشی سے حرکت کرتے رہے۔ پھر ایک سایہ نظر آیا، جہاز کے رُخ میں تبدیلی ہو رہی تھی اور سیاہ شائبے کے اُوپر انتہائی گہری توجّہ سے دیکھنے پر ایک نامعلوم سی روشنی دکھائی دی جیسے اندھیری رات میں مُردہ جگنو کے بدن کی بُجھتی لَو ہو۔ تمام نظریں اُس پر مرکوز تھیں۔ روشنی کچھ گلابی ہوئی اور دیکھتے دیکھتے دہکتے ہوئے اُپلوں کے ایک ڈھیر میں بدلنے لگی۔ پھر اُس میں سے ایک پھلجھڑی چھوٹی اور ہلکی سی گڑگڑاہٹ ہوئی۔

انجن بند کر دیئے گئے اور جہاز ساکت ہو گیا۔

اب وہاں پھر وہی نامعلوم سی روشنی تھی۔ چند لمحوں بعد ایک اور پھلجھڑی چھوٹی اور پھر ایک دہکتا ہُوا گلابی انگارہ تاریک فضا میں بلند ہُوا۔

"النار۔ النار" مصری مسافروں نے شور مچا دیا۔

گڑگڑاہٹ اب باقاعدگی سے سنائی دے رہی تھی مگر اس میں طنطنہ اور دہشت نہ تھی، جیسے چڑیا گھر کا بوڑھا شیر کنکر مارنے والے بچّوں سے تنگ آ کر بے چارگی سے دھاڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ اب وقفوں وقفوں سے آتشی انار چھُوٹنے لگے اور آتش فشاں پہاڑ کی چوٹی پر دہکتا الاؤ روشن تر ہوتا چلا گیا۔

جب کبھی لاوے کے اُبلتے چھینٹے تاریکی کے سیاہ کاغذ میں جلنے لگتے، مصری مسافروں کی آواز "النار۔ النار" سنائی دیتی۔

دس منٹ بعد انجن دوبارہ سٹارٹ ہوئے اور جہاز پھر سے تاریکی میں رینگنے لگا۔

ڑھتے فاصلوں سے سسلی کا یہ نامعلوم آتش فشاں اُپلوں کے ڈھیر میں بدلنے لگا۔ پھر مُردہ جگنو کے بدن کی بُجھتی لَو اور پھر آہستہ آہستہ شائبہ۔ گڑگڑاہٹ اتنی مدھم صرف گمان ہوتا تھا... "اوڈیسیس... کشتی روک دو" جہاز چلتا رہا۔

روم سویٹ روم

خیمے کا پردہ اُٹھایا اور ایک تھکے ہوئے چوپاتے کی مانند رینگتا ہُوا اپنے خود ایستادہ عارضی گھر میں جا بیٹھا۔

ماؤنٹ ایٹنا کیمپنگ سائٹ پر پھیلے چیڑ کے درختوں تلے میں نے اپنے ہلکے سبز خیمے کا کپڑا زمین پر بچھایا اور چاروں کونوں میں میخیں ٹھونک دیں، پھر اس کے اندر راڈ کھڑے کئے اور طنابیں کس دیں۔ خیمہ تیار ہو گیا.. خیمے کو ایستادہ کرتے ہوئے میں ہمیشہ ایک خوشگوار سنسنی سے دوچار ہوتا۔ کیا کپڑے کا یہ ٹکڑا اور چند میخیں واقعی ایک گھر میں تبدیل ہو جائیں گی؟... اور میں ہمیشہ قدرے حیرت زدہ رہ جاتا کیونکہ ایسا ہمیشہ ہو جاتا۔ ہسپانیہ کے بعد، چھ برس تک لاہور میں ایک پُرانے ٹرنک میں لپٹے رہنے کے بعد، آج اس خیمے نے روم میں، اطالیہ کی سرزمین پر سر اُٹھایا تھا۔

سلیپنگ بیگ پر لیٹا تو خیمے کے کپڑے میں سے گذشتہ سفروں کی مہک نے مجھے بُلایا، سفروں کی، بدنوں کی مہک اور گئے وقتوں کی زنگ آلود خوشبو، یہ خیمہ ایک قدیم حویلی تھا جہاں لوگ میرے لئے آئے اور چلے گئے۔ ان کی خوشبو کو بھی زنگ لگ چکا تھا۔ وہ اپنی اپنی زبان بولتے تھے اور پھر خاموشی ہوتی تھی، جب مجھ سے ہم زبان ہوتے تھے اُن کی آوازیں بھی مجھے یاد نہیں۔ ہاں اُن کے بدنوں، اُن کی زبانوں کی مہک موجود تھی لیکن الگ الگ نہیں، اجتماعی طور پر... کھُلے پردے میں سے چیڑ کے تنے دکھائی دے رہے تھے، اُن کے عقب میں، پہاڑی سے نیچے روم تھا... اندر خیمے میں "ہوم سویٹ ہوم"

اور باہر "روم سویٹ روم"۔

آج صبح عرشے پر آیا تو دائیں ہاتھ پر اطالیہ کے پہاڑ گزر رہے تھے۔ سلسلۂ کوہ میں سے گزرتی ایک ٹرین ایک کینچوے جتنی دکھائی دے رہی تھی۔ ایک شاہراہ کی لکیر تو دکھائی دے رہی تھی مگر اُس پر موجود کاریں فاصلے کی بنا پر معدوم تھیں البتہ کبھی کبھار جب سورج کی شعاعیں کسی ونڈ شیلڈ پر پڑتیں تو ہلکی سی چمک نظر آتی۔ پھر کیپری نظر آیا، زمین سے رُوٹھا ہُوا ایک ٹکڑا جو نیلگوں سمندر میں جا بسا تھا۔ دس بجے ہم آبنائے نیپلز میں داخل ہوتے اور جہاز رہائشی عمارتوں اور ٹریفک سے بھری پُری شاہراہوں کے عین سامنے جا کھڑا ہُوا۔۔۔ اوّل بیروت، آخر نیپلز۔ گرتھ گذشتہ شب کی شراب نوشی کی بنا پر کیبن سے باہر آنے کے قابل ہی نہ تھا۔ جارج اور سام نے بڑے برادرانہ انداز میں میرے گالوں پر الوداعی بوسے دیتے اور ان کے بعد میری جارج، اینی جارج اور شیری جارج نے بھی یہی عمل دُہرایا۔ چند روز کی غیر جذباتی رفاقت بھی الوداعی لمحوں میں جذباتی ہو جاتی ہے۔

۔۔۔ بندرگاہ سے باہر آ کر ارادہ کیا کہ جزیرہ کیپری کی خوشنمائی کی جانب بڑھا جائے پھر خیال آیا کہ وہاں پہنچنے کے لئے پھر سے سمندر کا سفر کرنا پڑے گا اور اگر نیپلز میں قیام کرتا ہوں تب بھی سمندر سامنے ہو گا۔ بہت بہت شکریہ، مجھے میرے میدان دے دو اور میں روم جانے والی گاڑی میں سوار ہو گیا۔ اب میں شہر سے باہر ماؤنٹ اٹینا کی بلندی پر خیمہ زن تھا اور سلیپنگ بیگ پر لیٹا ہُوا تھا اور خیمے کے پردے میں سے چیڑ کے درخت نظر آ رہے تھے اور اُن کے پیچھے روم تھا، روم سویٹ روم۔۔۔ لیکن ابھی نہیں، ابھی آرام سویٹ آرام، سمندر پر ڈولتے ہوئے کسی لوہے کے صندوق پر نہیں بلکہ زمین کے آشنا سکوت سے ہم آغوش ہو کر۔۔۔ مٹی کے قریب اور مٹی، مٹی میں بدل جاتی ہے۔

وِیا رَدما، نمبر ۱۰۲، دوسری منزل، میں نے آہستہ سے دستک دی۔ دوسری دستک سے پہلے ہی چٹخنی اُترنے کی آواز آئی اور دروازہ کھلا۔۔۔ گنجا تر

رُ مٹول، بنیان اور ڈھیلی پتلون میں ایک اطالوی بوڑھا۔ وہ شاید میرا ہی منتظر تھا، زا میرے کندھے تھام کر گالوں پر بوسے دیتے اور "پراگو۔ پراگو" کہتا مجھے گھر کے اندر لے گیا۔ بید کی کرسی میں بیٹھی ایک غم زدہ شباہت کی پُرامن عورت سیاہ شال اوڑھے کھڑکی سے باہر تک رہی تھی۔ آہٹ سُن کر اُس کا چہرہ ہماری جانب ہُوا اور وہ چہرہ اُن تمام محبتوں کا عکس ہو گیا جو مائیں اپنے بیٹوں سے کرتی ہیں۔ وہ ایک جوان لڑکی کی سی پھرتی سے اُٹھی اور میری پُشت پر ہاتھ پھیرا۔ "پراگو۔ پراگو"۔ میں پندرہ سال بعد اس گھر میں داخل ہُوا تھا اور اُن کی پہچان میں ایک لمحے کی جھجک بھی نہ تھی۔

"پیٹر لوجی کہاں ہے سنیور لودی؟" میری نظریں متلاشی تھیں۔

"ہا۔۔۔ تم اپنے دوست سے ملنے آئے ہو، ہمیں نہیں۔" سنیور لودی کے خوش نظر چہرے پر خوشگوار ناراضگی تھی۔

"وہ اکثر تمہیں یاد کرتا ہے۔" سنیورا لودی کی زرد ہتھیلیاں میرے گالوں پر کپکپا رہی تھیں۔ "تم پندرہ برس بعد آئے ہو۔۔۔ آؤ میں تمہیں وہ کمرہ دکھاؤں جہاں تم ٹھہرے تھے۔"

کمرے کا فرنیچر بلکہ دیوار پر ٹنگی رافیل کی تصویر بھی جوں کی توں تھی جیسے پندرہ برس بعد اُسے آج ہی کھولا گیا ہو۔ کھڑکی سے باہر وِیا ردما کے درخت البتہ بلند ہو چکے تھے۔ سنیور لودی بار بار میرے کندھے کو تھپک کر اپنی بے پناہ مسرت کا اظہار کرتے اور اُن کی بیوی مجھے دیکھے چلی جا رہی تھی۔

"تمہیں یاد ہے جب تم ولایت سے پاکستان واپسی پر روم اُترے تو تم نے ایئرپورٹ سے پیٹر لوجی کو فون کیا، میں تین روز کے لئے یہاں آیا ہوں، پلیز میرے لئے کسی ہوٹل میں کمرے کا انتظام کر دو مگر مہنگا نہ ہو۔"

"ہاں۔" میں اُن کی شفقت کی تاب نہ لاتے ہوئے مسکراتا جا رہا تھا۔ "اور اُس نے کہا تھا کہ پہلے میرے گھر آؤ، میرے ماں باپ سے ملو پھر ہوٹل کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔ اور یہاں آ کر جب میں نے اُس سے پوچھا کہ کمرے کا انتظام ہو گیا ہے تو

اُس نے کہا تھا، ہو تو گیا ہے مگر قدرے مہنگا ہے۔ روم کے مشہور وکیل سنیور لَودی کے گھر کا کمرہ ظاہر ہے سستے کرائے پر تو نہیں مل سکتا۔"

وہ دونوں ہنسنے لگے۔

"اور مجھے یاد ہے کہ تم آڑوؤں پر چینی کی بجائے نمک لگا کر کھاتے تھے۔" سنیور لَودی نے دانائی سے سر ہلایا۔

"پیئر لتوجی کہاں ہے؟"

سنیور لَودی نے اپنی بیوی کے ساتھ کچھ خجالت آمیز نظروں کا تبادلہ کیا اور پھر اپنے گنجے سر کو جو فلسفی سنیکا سے بے حد مشابہت رکھتا تھا، آہستہ آہستہ سہلایا۔ "وہ یہیں ہے روم میں، لیکن ... میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم اُسے ملو گے کیسے؟"

سنیورا لودی نے دانت بھینچ کر غصّے سے سر جھٹکا۔ "ہمارا بیٹا بالکل خچر ہے۔"

"لیکن ایک قابلِ فخر خچر۔" سنیور لَودی نے متانت سے سر ہلایا۔ "وہ اب ایک بڑا آدمی ہے، ایک جج۔ شادی شدہ ہے اور اپنے ذاتی فلیٹ میں رہتا ہے... تین روز بعد وہ عدالتِ عالیہ کی نشست کے لئے ایک امتحان میں بیٹھ رہا ہے چنانچہ اُس نے بیوی کو سٹاک ہوم بھیج دیا ہے۔ پورے تین روز کی خوراک فرج میں جمع کر لی ہے اور اپنے آپ کو فلیٹ میں مقفّل کر کے امتحان کی تیاری کر رہا ہے... ہمیں بھی ملنے کی اجازت نہیں۔"

"تو پھر فون پر تو بات ہو سکتی ہے ناں؟"

"نہیں ہو سکتی۔" سنیور لَودی چلّائے۔ "اُس نے سختی سے ہدایت کی تھی کہ صرف دو صورتوں میں اُسے مخل کیا جا سکتا ہے، اگر اُس کی ماں وفات پا جائے یا تیسری عالمی جنگ چھڑ جائے... ان سانحوں کے علاوہ اگر اُس سے رابطہ قائم کیا گیا تو وہ ہمیشہ کے لئے ہم سے قطع تعلق کر لے گا... خچر ہے ناں، یعنی اگر میں فوت ہو جاؤں تب بھی اُسے مخل نہیں کیا جا سکتا۔"

میں نے ایک زبردستی کی مسکراہٹ سے اپنی مایوسی چھپانے کی کوشش کی۔ وہ دونوں مجھے اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے میں ایک انتہائی بے بس گم شدہ بچّہ ہوں جس کی بے چارگی کی تاب نہ لا کر وہ ابھی رو دیں گے۔ چند لمحوں کے اُداس توقف کے بعد سنیور لَودی نے ہونٹ بھینچ کر نعرہ لگایا۔ "میرا خیال ہے کہ تیسری عالمی جنگ چھڑ چکی ہے۔" اور فون اُٹھا کر پیئر لتوجی کا نمبر ڈائل کر دیا۔ تقریباً پانچ منٹ تک وہ ریسیور کو تھامے رہے لیکن اُدھر سے کوئی جواب نہ آیا۔

"وہ جان بُوجھ کر فون نہیں اُٹھا رہا۔" سنیور لَودی نے غصّے سے کہا۔ "لیکن وہ اُٹھائے گا۔ اگر وہ خچر ہے تو میں بھی خچر ہوں... لیکن اس دوران میں ہم کافی پئیں گے۔"

سنیورا لُودی فوراً کچن سے چھوٹے چھوٹے اطالوی کیک اور کافی پاٹ اُٹھا لائیں۔

سنیور لَودی نے اپنے اور میرے مگ میں کافی کے چند قطرے ٹپکائے اور پھر کیبنٹ میں سے کونی آک کی بوتل نکال کر بقیہ حصّے کو برانڈی سے لبریز کر دیا۔

"دُودھ نہیں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ بچّے پیتے ہیں۔ یہ مردانہ کافی ہے۔"

میں نے ایک چُسکی لی تو جتنے بھی موجود طبق ہوتے ہیں اُن سے سوا ایک دو مزید روشن ہو گئے۔ سنیور لَودی نے پھر نمبر ڈائل کیا، انتظار کیا، اُدھر سے خاموشی۔

جونہی میری کافی کی سطح قدرے نیچی ہوتی سنیور لَودی بوتل اُٹھا کر اُسے مزید مردانہ کر دیتے۔ اُدھر سنیورا لَودی کا کہنا تھا کہ اگر میں نے وہ درجن بھر کیک سارے کے سارے نہ کھائے تو وہ سمجھیں گی کہ مجھے اُن کی کُکنگ پر اعتماد نہیں۔ میں مردانہ کافی پیتا رہا اور کیک کھاتا رہا۔

چوتھی مرتبہ جب سنیور لَودی نے نمبر گھمایا تو دوسری جانب سے کلِک ہوئی اور ایک نامناسب قسم کی دھاڑ سُنائی دی۔ سنیور لَودی اُسی طرح ریسیور کان سے لگائے کُرسی سے اُٹھے اور اٹینشن ہو گئے اور انگریزی میں بولے۔ "بیٹا تیسری عالمی جنگ

شروع ہو چکی ہے۔" اُدھر سے تیز لہجے کا ایک سیلاب آتا چلا گیا اور سنیور لُودی جواب میں صرف ہکلاتے رہے۔ بالآخر پدرانہ حاکمیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ زور سے اطالوی میں گرجے اور اس گرج میں "مستنصر" اور "پاکستان" کے لفظ نمایاں تھے... فون بند ہو گیا۔

"کہتا ہے، میں مستنصر سے بات نہیں کرنا چاہتا" سنیور لُودی نے سنجیدگی سے اطلاع دی "ملنا چاہتا ہوں... دیا ما تیرہ نمبر ۹... بس نمبر ۱۶... تارنتو کے سٹاپ پر اتر جانا... اور ہاں یہ لو بیس لیرے کا سکہ، لفٹ میں ڈالنے کے لئے، فلیٹ تیسری منزل پر ہے۔"

"روم آؤ اور دیا روما سے گزرو تو اپنے گھر آنا نہ بھولنا... تم پیئر لیوجی کے سب سے پرانے دوست ہو۔" سنیور الُودی کی زرد ہتھیلیاں میرے گالوں پر سرد ہونے لگیں۔ میں اپنا ماتھا اُن کے کپکپاتے ہونٹوں تک لے گیا۔

میں نے لفٹ میں بیس لیرے کا سکہ ڈالا تو اس کا دروازہ تھیٹر کے پردے کی طرح بغلی دیواروں میں سما گیا۔ تیسری منزل کے بٹن پر ہاتھ رکھتے ہی میں قید میں آیا اور لفٹ میں سفر کی بے چین خلائی کیفیت بدن میں بیٹھنے لگی۔

آج روم تھا، پندرہ برس پیشتر ایک موسم گرما میں آوارگی کا پڑاؤ نیلی شفق کے شہر سٹاک ہوم میں تھا۔ میں "کیفے غزال" میں پہلی مرتبہ آیا تھا اور پچھتا رہا تھا۔ لڑکیاں اتنی اقلیت میں تھیں کہ بڑے بڑے پلے لواتے قسم کے نوجوان ایسی خواتین کی منتیں کر رہے تھے جن کی صورت اور بناوٹ میں نسوانیت کا بس واجبی سا شائبہ ہی ہوتا تھا۔ فلور پر صرف چند خوش نصیب ناچ رہے تھے اور بقیہ پبلک میری طرح کونوں کھدروں میں منہ کھولے کھڑی انگلیاں چٹخا رہی تھی۔ میرے پہلو میں کھڑے ایک انتہائی وجیہہ اور انتہائی بور ہوتے ہوئے نوجوان نے ایک انتہائی طویل جمائی لی اور میری جانب دیکھے بغیر گفتگو شروع کر دی۔ زبان اطالوی تھی۔ وہ کبھی کندھے سکیڑتا، کبھی ہاتھ سے ڈوئی سی بنا کر فلور کی طرف اشارہ کرتا اور باتیں کرتا چلا جاتا۔ بالآخر

میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انگریزی میں پوچھا "کیا آپ مجھ سے کچھ کہہ رہے ہیں؟"

اُس کے مردانہ خدوخال پر حیرت براجمان ہو گئی۔ "ماما میا... کیا تم اطالوی نہیں ہو؟"

"میں آپ کا دل نہیں توڑنا چاہتا مگر نہیں ہوں۔"

"ہا۔" اُس نے پورا منہ کھول کر کہا اور چپ ہو گیا۔

ہم غزال سے نکلے تو سوچ میں تھے۔ کن اکھیوں سے ایک دوسرے کو تکتے ہوئے جھینپی ہوئی مسکراہٹوں کے ساتھ اور قدرے گریزاں۔ یہ شخص دوست ہو سکتا ہے؟

دوسرے روز میں کام سے فارغ ہو کر اپنے فلیٹ میں آیا تو میرے بستر میں ایک سنہری بالوں والی لڑکی تھی... یہ کوئی انہونی بات تو نہ تھی مگر اُس وقت تھی کیونکہ میں اُس لڑکی کو جانتا تک نہیں تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی "سوری لیکن تمہارے کمرے میں بستر کے علاوہ اور کوئی شے ایسی نہیں تھی جس پر بیٹھا جا سکے..."

اُسی لمحے کچن کا دروازہ کھلا، پیئر لیوجی ہاتھوں میں ایک ٹرے تھامے کھڑا تھا۔ "زندہ باد ہے اے میری بے مثال خوبصورتی..." مگر اپنے سامنے اپنی بے مثال خوبصورتی کی بجائے مجھے دیکھ کر قدرے بھونچکا رہ گیا "اوہ... تم یہاں تھے ہی نہیں، دروازہ کھلا تھا ہم اندر آ گئے اور ہم قدرے بھوکے تھے..." میں نے ڈوبتے دل سے ٹرے کی طرف دیکھا۔ وہ اتنے بھوکے تھے کہ میرے فرج میں ذخیرہ شدہ خورد و نوش کی تمام اشیاء اُس میں سجی تھیں۔

"یہ آپ کا اپنا گھر ہے۔" میں نے بظاہر لاپروائی سے کہا۔

رخصت ہونے سے پہلے وہ مجھے ایک طرف لے گیا "خوراک کے لئے شکریہ دوست۔" اُس نے چند نوٹ میری جیب میں ڈال دیئے۔

"یہ ریستوران نہیں ہے پیئر لیوجی" میں نے نوٹ واپس کر دیئے۔

اگلے دن کام سے واپسی پر میں نے اپنا فرج کھولا تو اُس میں کم از کم ایک ماہ کے لئے کافی خوراک اور مشروبات ٹھنسے پڑے تھے۔ ایک روسٹ چکن کی ٹانگ سے ایک چٹ لٹک رہی تھی "اب یہ ایک ریستوران ہے... پیئر لیوجی"

ہاں یہ شخص دوست ہو سکتا ہے۔

ایک روز اُس نے مجھے اپنے ہاں مدعو کیا۔ نہایت اعلیٰ قسم کی ڈیکور والا فرانسیسی طرز کا کمرہ، صفائی اور مہنگائی کی مہک لئے ہوئے۔ دس منٹ کے عرصے میں اُس کی لینڈ لیڈی نے کم از کم بیس مرتبہ کسی نہ کسی بہانے اندر جھانکا۔

"دیکھا دوست میں اذیت میں ہوں" پیئر لیوجی نے بے چارگی سے کہا "تم لڑکے ہو تو اُس نے اتنی مرتبہ اندر جھانک کر دیکھا ہے کہ کہیں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہو رہی... بھلا میں یہاں کسی لڑکی کو کیسے لا سکتا ہوں..."

"میرے ساتھ اُٹھ آؤ"

"تمہارے بستر میں جگہ بچے تب ناں"

پیئر لیوجی واقعی اذیت میں تھا۔ ایک سیاہ حس مزاح کا مالک، منہ بسورتا ہوا اور سٹاک ہوم سے بیزار۔ "میرا تو سارا سیزن تباہ ہو گیا ہے۔ میں روم واپس جا کر اُن تمام دوستوں کی پٹائی کروں گا جنہوں نے سویڈن کی سنہری خوبصورتیوں کے بارے میں مجھے بھڑکایا تھا کہ پیئر لیوجی وہ تو تمہیں دیکھتے ہی اپنے کپڑے پھاڑ ڈالیں گی، دو ماہ ہو گئے ہیں اور میں کسی فرشتے کی طرح معصوم پھر رہا ہوں"

"اور اُس روز میرے فلیٹ میں؟"

"تم آ گئے تھے... میں بے حد مایوس ہوں دوست" اُس نے ایک رقت آمیز آہ بھری۔

میں نے اُسے دلاسا دیا کہ مایوسی گناہ ہے۔

"لگتا ہے کہ میں اس شہر میں ہمیشہ گنہگار ہی رہوں گا..." وہ ہونٹ لٹکا کر بولا۔ "ذرا خیال کرو کہ موسم گرما ہے، سالانہ چھٹیاں ہیں تو یورپ اور امریکہ کی بیشتر خوبصورت لڑکیاں اس وقت کہاں ہوں گی۔ روم میں، ہسپانوی زمینوں کے آس پاس... اور میں ایک رومن کہاں ہوں، روم میں نہیں، سویڈن میں... لعنت ہے مجھ پر"

اور یہ کچھ کچھ میرے لئے بھی ناقابلِ فہم سی بات تھی کہ پیئر لیوجی جو یقیناً مجھ سے کہیں زیادہ خوش شکل اور خوش مزاج تھا، خواتین کے معاملے میں جانے کیوں انتہائی بدقسمت واقع ہوا تھا...

وہ راہ چلتے جوڑوں کو دیکھ کر آپے سے باہر ہو جاتا "مستنصر میرے دوست تم ذرا بتاؤ تو سہی کہ کیا میں اس لڑکی کی کمر میں ہاتھ ڈال کر چلنے والے گاؤدی سے کئی لاکھ گنا بہتر نہیں ہوں... میری رومی ناک، سیاہ گھنگھریالے بال، یہ سانڈھوں ایسی چمکتی آنکھیں... اور میرا یہ روم کے بہترین درزی کے ہاتھوں کا سلا ہوا براؤن سوٹ... لعنت ہے پر مجھ پر" اُسے یقین تھا کہ اُس کے دوستوں نے جان بوجھ کر اسے روم سے چلتا کیا ہے تاکہ وہ اُس کی غیر موجودگی میں ہسپانوی زمینوں کے آس پاس پائی جانے والی لڑکیوں کو بلا مقابلہ جیت سکیں۔

"تم خوش قسمت ہو" وہ ہمیشہ کہتا۔ "سٹاک ہوم آ رہے تھے تو ایک ایسے سویڈش جوڑے سے ملاقات ہو گئی جنہوں نے اپنی ہسپانوی ہالیڈے پر جاتے ہوئے اپنا پورا فلیٹ تمہارے سپرد کر دیا۔ جدھر جاتے ہو لوگ تمہاری طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔ وہ کپڑے پھاڑنے والی بات کا، تو میں بھی گواہ ہوں کہ یہاں ہوتی ہے مگر میرے ساتھ نہیں، تمہارے ساتھ۔ بس نصیب کی بات ہے ورنہ یہ تو تم بھی مانو گے کہ میں تم سے زیادہ ہینڈسم ہوں۔

ایک روز پوچھنے لگا "یہ تم اُس سکاچ ٹیپ کی فرم میں کلرکی کرتے کرتے اُکتا نہیں جاتے، سکانسن ریستوران آ جاؤ، لطف رہے گا"

میں نے پوچھا کس قسم کا کام ملے گا، کہنے لگا "وہی جو میں کرتا ہوں، برتن دھونے کا"

میں نے اُسے بتایا کہ جاٹ حضرات تو کھیتی باڑی کے علاوہ عام تجارت کو بھی معیوب گردانتے ہیں۔ چہ جائیکہ کسی ہوٹل میں برتن مانجھنے شروع کر دیں۔

دو روز بعد میں بھی پیئر لیوُجی کے پہلو میں کھڑا برتن مانجھ رہا تھا۔

سٹاک ہوم کے مہنگے ترین ریستوران "سکانسن" کے باورچی خانے کا ماحول ایک ہالیڈے کیمپ ایسا تھا۔ تقریباً تین درجن طالب علم لڑکے لڑکیاں ایک ایسی مشین کے گرد ایپرن باندھے کھڑے رہتے جس میں سے دُھلے دُھلائے برتن برآمد ہوتے اور ہمارا کام صرف یہ تھا کہ ہم انہیں سفید تولیوں کی مدد سے خشک کر کے رکھ دیتے۔ وہ مشین اتنی آہستگی سے چلتی کہ پورے دن میں فی کس چار پانچ پلیٹیں یا گلاس ہی آتے۔ خوراک نہایت اعلٰے پائے کی تھی اور مفت تھی۔ ڈیوٹی چار بجے سہ پہر سے رات گیارہ بجے تک۔ میں اور پیئر لیوجی سارا دن جی بھر کے سوتے، چار بجے سکانسن پہنچتے، وہاں ایپرن باندھ کر گپ بازی ہوتی، درمیان میں ایک آدھ پلیٹ خشک کر دی اور بس کبھی گلاس توڑنے کا مقابلہ شروع ہو جاتا۔ سینکڑوں کرونر کے بیش قیمت گلدان سائز شراب کے گلاس بڑی معصومیت سے فرش پر گرا دیئے جاتے۔ "اوہ آج تو اُنگلیاں صابن ہو رہی ہیں"۔ ..."میری بھی۔" اُدھر سے دَھپ کی آواز آتی۔ "اور میری بھی"۔ پیئر لیوجی افسوس سے کہتا اور ساتھ ہی ایک ہلکا سا چوُر ہوتا دھماکہ۔

گیارہ بجے ہم ایپرن اُتار کر ریستوران کی کلب کی طرف چلے جاتے جہاں داخلے کی قیمت ہماری ایک ماہ کی تنخواہ سے بھی زیادہ تھی مگر ہم چونکہ بے چارے ریستوران کے سٹاف میں سے تھے اس لئے گیٹ پر کارڈ دکھا کر مفت اندر داخل ہو جاتے۔ سٹاک ہوم کے امیر گھرانوں کی خواتین جب ہر شب دو نوجوانوں کو ایک مخصوص میز پر لاپرواہی سے سگار پھونکتے ہوئے دیکھتیں تو یقیناً اُنہیں کسی یونانی جہازوں کے مالک کے بیٹے یا راک فیلر کے بھتیجے بھانجے وغیرہ ہی سمجھتیں۔ ہم بھی اُنہیں یہی بتاتے کہ دراصل ہم ابھی ابھی کسی ڈیوک وغیرہ کے ڈنر سے کھا پی کر آرہے ہیں اور یہاں تو صرف سگار نوشی کے لئے

چلے آئے ہیں مبادا اُن میں سے کوئی کسی مشروب یا کھانے کی فرمائش کر بیٹھے بلکہ اکثر اوقات وہ ہمیں سگار خرید کر دیتیں اور اپنے پلّے سے کھا پی لیتیں۔ قسمت یاوری کرتی تو وہی پلا بعد میں کھُل بھی جاتا۔

پیئر لیوجی اور میں جُڑواں بچّوں کی طرح تھے البتہ کبھی کبھار مجھے علیحدہ ہونا پڑتا اور ان موقعوں پر وہ ہمیشہ کہتا۔ "تم ہو ہی خوش قسمت، لعنت ہے مجھ پر۔"

گرمیوں کی چھٹیاں اختتام کو پہنچیں۔ وہ سٹاک ہوم میں میری آخری شام تھی۔ ... اُس روز میں نے ایک آرٹ شاپ میں پابلو پکاسو کے بناتے ہوتے چارکول کے چند سکیچ دیکھے جن میں بُل فائٹنگ کے مختلف انداز تھے۔ سکیچ برائے فروخت تھے میں نے فلیٹ میں آکر اپنی کُل پونجی کا حساب کیا، اگر میں سٹاک ہوم سے لنڈن تک صرف ڈبل روٹی کھا کر گزارہ کرتا اور مجھے سارا رستہ لفٹیں ملتی چلی جاتیں تو میرے پاس تقریباً چار سو سویڈش کرونر بچتے تھے۔ ایک سکیچ کی قیمت بھی چار سو کرونر تھی ... پکاسو کے ہاتھ کا بنایا ہُوا سکیچ۔ میں فلیٹ سے باہر نکل رہا تھا کہ پیئر لیوجی آگیا۔

"ہا... میرے دوست آج سٹاک ہوم میں ہماری آخری شام ہے، میں بہت اُداس ہوں، آؤ اس اُداسی کو دُور کریں۔"

"اس اُداسی کو دُور کرنے کے لئے تمہاری جیب میں کچھ ہے؟ میرے پاس تو کچھ نہیں۔" میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ "میں نے تو واپسی کے لئے روم تک کا ٹرین ٹکٹ خرید لیا ہے اور بقیہ رقم سے چمڑے کی یہ خوبصورت جیکٹ"... اُس نے جلدی سے گھڑی دیکھی۔ "شاید وہ دُکان ابھی کھُلی ہو آؤ اس بدصورت جیکٹ کو واپس کر آئیں۔"

"نہیں میں دیکھتا ہوں شاید کچھ نکل آئے۔" میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر چار سو کرونر کے نوٹوں کو محسوس کیا۔ تمہیں پکاسو کے ہاتھ کا بنا ہُوا ایک سکیچ زیادہ عزیز ہے یا آج کی شب پیئر لیوجی کے ہمراہ؟ ... پکاسو یونہی قسم کا مصوّر ہے، اتنا مشہور بھی نہیں

اور پھر سکیچ بھی کوئلے کا بنا ہُوا ہے، چند برس میں مدھم ہو جائے گا۔" آؤ اپنی اُداسی دُور کرتے ہیں۔"

فلور نمبر تین کا خانہ روشن ہُوا۔ لِفٹ رُکی اور دروازہ کھُل گیا۔

راہداری میں متعدد سفید دروازے تھے۔ ایک پر پیئر لیوجی لودی کے نام کی تختی آویزاں تھی۔ میں گھنٹی بجانے کی نیت سے بٹن پر اُنگلی رکھنے کو ہی تھا کہ دروازہ خود بخود کھُل گیا۔ سامنے پیئر لیوجی کھڑا تھا۔

"ہیلو مستنصر..." اُس نے بے حد رُوکھے اور بیزار لہجے میں کہا۔ میرے بڑھے ہوئے ہاتھ اور مسکراہٹ ساکت ہو گئے۔ اُس نے احتیاط سے دروازہ بند کیا اور سر کے اشارے سے اندر آنے کو کہا۔ میں اتنی سرد مہری پر پیچ و تاب کھاتا سر جھکائے اُس کے پیچھے چلنے لگا۔ ڈرائنگ روم میں سے گزر کر ہم ٹیرس پر آ گئے۔ وہ پیچھے مڑا اور پھر ایک وحشی گوریلے کی طرح اپنی چھاتی پر مُکّے چلاتے ہوئے انتہائی خوفناک آوازیں "ہاؤ ہاؤ، ہُو ہُو" کرنے لگا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" میں پریشان ہو گیا۔

"میں تمہاری آمد پر خوشی کا وحشیانہ اظہار کر رہا ہوں... ہاؤ ہاؤ، ہُو ہُو..." اور پھر مجھ سے لِپٹ گیا۔ جب قدرے نارمل ہُوا تو میں نے کہا "مجھے دیکھ کر تو تم سخت بیزار ہوئے تھے، اُس وقت خوشی کا اظہار نہیں ہو سکتا تھا؟"

"نہیں ہو سکتا تھا۔" اُس نے مزید دو مُکّے اپنی چھاتی پر رسید کئے "میں اذیت میں ہوں دوست... میرے ہمسائے میں ایک خبطی بڑھیا رہتی ہے اور اگر میں اپنے فلیٹ کا دروازہ کھولتے ہی ذرا سا بھی شور کرتا تو وہ سیدھی پولیس سٹیشن چلی جاتی کہ یہ لڑکا میرے آرام میں مخل ہوتا ہے۔ چنانچہ میری مجبوری تھی کہ میں وہاں پر اپنی وحشیانہ خوشی کا اظہار نہیں کر سکتا تھا اس لئے یہاں آ کر کر لیا... "ہاؤ ہاؤ، ہُو ہُو"

...اور میں اُوپر سے دیکھ رہا تھا جب تم عمارت میں داخل ہوئے تھے... ہاؤ ہاؤ، ہُو ہُو۔"

میں بے اختیار مسکرانے لگا۔ پندرہ برسوں نے پیئر لیوجی کا چہرہ بھر دیا تھا، اُس کے سیاہ گھنگھریالے بالوں میں کہیں کہیں سفید لکیریں تھیں مگر آنکھوں کی چمک بدستور سانڈھوں ایسی تھی۔

"مجھے افسوس ہے کہ تمہیں مجھ تک پہنچنے میں دُشواری پیش آئی... تین روز بعد امتحان ہے اور اگر میں کامیاب ہو گیا تو ایک اعلیٰ عدالت میں جج کی کرسی میری ہو گی... پچھلے سات روز سے میں اپنے بیڈ روم میں مقیّد ہوں، پورے دن میں صرف پانچ منٹ کے لئے ٹیرس پر آ کر سورج کی روشنی دیکھتا ہوں اور پھر واپس کتابوں میں۔"

"میں تمہاری پڑھائی میں حارج ہو رہا ہوں..." میں نے بے آرام سا محسوس کیا۔ "نہیں اطالیہ صرف میری وجہ سے ایک اعلیٰ پائے کے جج سے محروم نہ ہو جاتے۔"

"اگر ایسا ہُوا تو یہ اطالیہ کی بدقسمتی ہو گی..." اُس کی مسرّت چمکتی تھی اور چہرے کی جلد تلے برسوں کی دوستی کی حدّت روشن ہو رہی تھی۔ "مجھے خوشی ہے کہ میں نے وہ فون اُٹھا لیا اور تم آ گئے... اطالیہ ایک جج سے محروم ہو جائے مگر میں تم سے محروم نہیں ہونا چاہتا... جہاں ٹھہرے ہو فوراً میرے پاس آ جاؤ... کتنے روز کے لئے آئے ہو... ہا... ایک حیرت ناک خبر... میں اب ایک شادی شدہ شخص ہوں... اور جانتے ہو میری بیوی کون ہے؟... برگیتا۔"

"اچھا۔"

"اچھا کیا... برگیتا کو نہیں جانتے؟"

"نہیں۔"

"یا تو تم بوڑھے ہو گئے ہو اور یا مجھے احمق بنا رہے ہو، بوڑھے تم لگتے نہیں،

اس لیے... بھئی بر گیتا۔"

"اچھا، بر گیتا۔" میں نے پھر سپاٹ لہجے میں کہا۔

"ہا۔" اُس نے جھلّا کر ہاتھ فضا میں بلند کیے اور اُنہیں اُسی طرح اُٹھائے ہوئے فلیٹ کے اندر چلا گیا۔ واپسی پر اُنہی ہاتھوں میں ایک سُنہری فریم والی تصویر تھی... اُس کی شادی کی تصویر۔ "یہ والی بر گیتا۔" اُس نے سُنہری بالوں والی سیب نما دُلہن کی طرف اشارہ کیا۔

"اچھا یہ والی بر گیتا..." میرا لہجہ پہلے سے بھی زیادہ سپاٹ تھا۔

"تم بوڑھے ہو گئے ہو..." وہ نچلا ہونٹ لٹکاتے ہوئے کہنے لگا۔ "بھئی ہمارے ساتھ سکانسن ریستوران میں برتن صاف کیا کرتی تھی اور تم تو اکثر اسے پارک کیفے میں لے کر بیٹھے رہتے تھے... بلکہ ایک روز یہ تمہارے فلیٹ میں سے برآمد ہوتی ہوئی بھی دیکھی گئی تھی۔"

میں نے ذہن پر بہت زور دیا مگر تصویر کی شکل اجنبی ہی رہی۔ "نہیں پیٹرلوجی تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے، میں اس خاتون کو بالکل نہیں جانتا۔"

پیٹرلوچی کھڑا ہو گیا اور ایک ہاتھ سینے پر جما کر دوسرا ہوا میں لہراتے ہوئے انتہائی سنجیدگی سے کہنے لگا۔ "مائی ڈیئر فرینڈ کیا ایک شریف النسل خود دار اطالوی کبھی یہ تسلیم کر سکتا ہے کہ اُس کی موجودہ بیوی اس کے ایک عزیز دوست کے فلیٹ میں سے باہر آتی دیکھی گئی تھی اگر وہ نہ دیکھی گئی ہوتی..."

"یار تم پلیز بیٹھ جاؤ۔" میں نے اُس کا ہوا میں لہراتا ہُوا بازو پکڑ لیا۔ "مجھے واقعی یاد نہیں... لیکن ہم دونوں تو سٹاک ہوم سے ایک ہی روز واپس لوٹے تھے پھر..."

"پھر میں اگلے برس دوبارہ سٹاک ہوم گیا اور خوش قسمتی سے تم وہاں موجود نہیں تھے... اور پھر اس سے اگلے برس بھی... اور یوں چودہ برس کے مختصر عرصے میں میں نے بر گیتا کو اپنی طرف مائل کر ہی لیا..."

"مبارک ہو پیٹرلوچی... تم انتہائی خوش قسمت ہو۔"

"چودہ برس میں ایک لڑکی... اسے تم خوش قسمتی کہتے ہو۔"

میں نے ایک مرتبہ پھر ذہن پر زور ڈالا، صورت پہچان کے دھندلکوں میں گم ہوتی رہی مگر یکدم سب کچھ ظاہر ہو گیا... بر گیتا، ایک نہایت پڑھاکو قسم کی شے صرف ایک مرتبہ میرے فلیٹ میں کوئی کتاب وغیرہ مانگنے کے سلسلے میں آئی تھی۔ میں نے پیٹرلوچی کو بتایا تو وہ بے حد راضی ہُوا۔ "اب میرا شادی شدہ مستقبل بے حد درخشاں ہو گیا ہے ورنہ یہ بات ہمیشہ مجھے کھٹکتی رہتی۔"

ٹیرس مختصر تھا۔ پُرانے مجسّمے سفید گملوں میں چوڑے پتوں والے نمائشی پودے اور باریک پتیوں کی پھپھوندی نما بیلیں، ایک دیوار پر کسی رومی دیوتا کا سر مُنہ کھولے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔

"یہ کسی عجائب گھر سے اُٹھا لائے ہو؟"

"گولڈن ہینڈز۔" وہ اپنے ہاتھ نچا کر بولا۔ "میں نے خود بنایا ہے، ان ہاتھوں سے۔" وہ مجھے فلیٹ کے اندر لے گیا جو آئیڈیل ہوم میگزین کی ایک تصویر لگ رہا تھا۔ وہ مختلف آرائشی اشیاء کی طرف اشارہ کرتا اور ہاتھ نچا کر کہتا۔ "گولڈن ہینڈز... میں نے خود بنائی ہے، ان ہاتھوں سے۔"

ٹیرس پر واپس آئے تو تیوری چڑھا کر کہنے لگا۔ "تم نے مجھے ابھی تک بتایا ہی نہیں کہ تم کہاں ٹھہرے ہوئے ہو۔"

میں نے اُسے بتایا کہ ابھی تک اُس نے مجھے اطمینان سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں دیا اور پھر بتایا۔

"کیمپنگ کر رہے ہو؟" وہ ہنسا۔ "کیا وہی والا خیمہ ہے؟"

"نہیں۔" میں بھی ہنسا۔ "اب اُس کا پوتا ہے۔"

سٹاک ہوم میں پیٹرلوچی نے ایک مریل سی لڑکی کو بڑی مشقّت سے راضی کیا

کہ وہ اس کے ہمراہ نزدیکی جھیل پر ویک اینڈ منانے کے لئے چلے۔ چونکہ اُس نے جان بُوجھ کر ایک ویران جھیل کو منتخب کیا تھا اور ایسی جگہوں پر ہوٹل نہیں ہُوا کرتے اس لئے میرا خیمہ اُدھار لے گیا۔ وہاں پہنچ کر اُنھوں نے قریبی جنگل میں خیمہ نصب کیا اور جھیل میں تیرنے کے لئے چلے گئے۔ واپس آئے تو خیمہ موجود تھا مگر کسی آوارہ گرد نے اُن کے رُک سیک اور بدن کے کپڑے غائب کر دیئے تھے۔ چنانچہ اُسی دوپہر جب وہ دونوں سٹاک ہوم واپس لوٹے تو خاتون مختصر بکینی میں تھی اور پیئر لیوجی سر پر خیمہ اُٹھائے نہانے کے جانگیے میں . . .

"نہیں، وہ والا خیمہ تو نہیں۔" میں بھی ہنسا۔ "اب اُس کا پوتا ہے۔"

"اُس کے پوتے کو سمیٹو اور میرے فلیٹ میں آجاؤ۔ برگیتا بھی موجود نہیں چنانچہ ہم ایک مرتبہ پھر کنوارپنے کے وقت زندہ کریں گے۔"

میں نے اُسے بتایا کہ میرے پاسپورٹ پر اطالیہ کے قیام کے لئے صرف سات روز کا ویزا ہے، دو روز روم کے لئے، چار دن فلارنس اور شاید ایک دو روز وینس . . . پھر سوئٹزرلینڈ، فرانس، بہرحال واپسی پر شاید . . .

وہ بہت آزردہ ہُوا۔ "کہیں تم میرے امتحانوں کی وجہ سے تو گریز نہیں کر رہے؟"

"نہیں . . . میرے پاس وقت کم ہے۔"

"ہاں وقت کم ہے۔ اب شام ہو جاتی ہے، دوپہر گزر جاتی ہے۔" اُس نے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ "کبھی دوپہریں اور شامیں ختم ہی نہیں ہوتی تھیں۔" وہ مجھ سے علیحدہ ہو کر کہیں اور چلا گیا، پھر واپس آیا آہستہ آہستہ اور کہنے لگا۔ "اس کا مطلب ہے کہ ہمیں صرف ایک دوپہر اور ایک شام مل رہی ہے . . . آؤ باہر چلتے ہیں۔"

"تو پھر تم روم میں ہو۔" پیئر لیوجی نے فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے ایک پُرمسرت بے یقینی سے کہا۔ "مگر تم آ کیسے گئے؟"

"پچھلی مرتبہ تریوی کے فوارے میں جو سکے ڈالے تھے اُنھوں نے بلا لیا ہے۔"

"تو پھر پہلے وہیں چلتے ہیں تریوی کا شکریہ ادا کرنے کے لئے۔"

پُرہجوم گلیوں میں پوشیدہ تریوی کے آبشار نما فوارے میں نیپچیون دیوتا کا مجسمہ بے مُنہ زور گھوڑوں کی باگیں کھینچ رہا تھا . . . اور نیچے تالاب میں سکے تھے۔ کچھ زنگ آلود جو سیاحوں نے برسوں پہلے پھینکے تھے اور بیشتر چمکتے ہوئے جو ہمارے گرد کھڑے سیاحوں کے ہاتھوں میں سے ابھی ابھی نکلے تھے۔

"عجیب پاکھنڈ ہے اس فوارے کا بھی۔" پیئر لیوجی کہہ رہا تھا۔ "جو لوگ دوبارہ روم آجاتے ہیں وہ اسے پچھلی مرتبہ تریوی میں پھینکے ہوئے سکوں کا کرشمہ سمجھتے ہیں اور جو نہیں آتے . . . انتظار کرتے رہتے ہیں۔"

ایک مفلوک الحال بوڑھا پتلون کے پائنچے چڑھا کر تالاب میں اُتر گیا اور اس سے پیشتر کہ سپاہی اُسے روکتا وہ چند سکے سمیٹ کر بھاگ کھڑا ہُوا . . . اُس کے بھُوکے پیٹ کے لئے روٹی سویّوں کی آدھی پلیٹ کی قیمت . . . سکے جو اُس کی ہتھیلی میں گرنے کی بجائے پانی میں گرتے تھے اور زنگ آلود ہوتے رہتے تھے۔ چند بچے دھاگے کے سرے پر مقناطیس باندھ کر اُسے تہہ میں پڑے سکوں پر پھینک رہے تھے۔ کبھی کبھار کوئی سکہ چپک جاتا تو وہ احتیاط سے ڈور سمیٹ لیتے اور اُسے اُتار کر جیب میں ڈال لیتے . . . ایک سکہ، ایک پلیٹ روٹی۔

"چلیں؟" میں نے پوچھا۔

"اس مرتبہ سکے نہیں پھینکو گے؟"

"نہیں۔ اس مرتبہ مہنگائی بہت ہے، خواہ مخواہ سکے ضائع کرنے سے فائدہ؟"

"مہنگائی نہیں، تم بُوڑھے ہو چکے ہو۔"

ہم رومن فورم میں گئے اور ایک دو ستونوں کا معائنہ کر کے باہر نکل گئے . . . وکٹر ایمانوئیل کی سالگرہ کیک نما سفید یادگار کے قریب سے گزرے۔ کلاسیئم کے اندر

داخل ہوتے کہ جس میں نو ہزار تماشائی بیٹھ سکتے تھے۔ چھ ایکڑ رقبے میں ہے۔ ایک سو پچاس فٹ بلند ہے وغیرہ وغیرہ اور اس پُرہیبت اکھاڑے میں رومی سپاہیوں اور شیروں کا لُقمہ بننے والے عیسائی شہداء کے لئے دُعائے خیر مانگ کر باہر آ گئے۔ پیازا دی سان پیترو میں کھڑے ہو کر چند کبوتروں کی پیٹھ تھپکی۔ کلیسائے سینٹ پیٹر کے گنبد پُرسرا کو مائیکل انجلو نے بنایا تھا اور اسی کلیسا کے اندر جا کر اسی مائیکل انجلو کا شاہکار "پیتیا" دیکھا کہ سنگِ مرمر کی مریم بیٹے کی لاش پر سوگوار جُھکی ہے اور سِستین چیپل کی چھت دیکھی صرف ایک نظر کہ اُس پر بارِیش اللہ میاں مصوّر تھے، دوسری نظر کی تاب کہاں۔ ایک اور کلیسا میں مائیکل انجلو کے حضرتِ موسٰے براجمان تھے۔ ہم نے متعدد تاریخی فوّاروں کا مختصر جائزہ لیا پھر دریائے ٹائبر کے کنارے پر جا کر چند گز مٹرگشت کی... ہر تاریخی مقام پر پیٹرلیتوجی یہی کہتا کہ پچھلی مرتبہ پورا ایک ہفتہ ان کھنڈروں اور گرجوں اور فوّاروں کا طواف کرتے رہے تھے۔ اس مرتبہ سرسری زیارت پر اکتفا کر لو... وقت بہت کم ہے۔

دوپہر گزر گئی۔ روم کی ایک دوپہر اس کی قدیم تہذیبوں کی طرح فنا ہوئی مگر شام روم کی مانند ہی پھر سے زندہ ہونے لگی۔ کلیساؤں کی گھنٹیاں مترنّم اذانوں کی طرح ہر سُو گونج رہی تھیں... اور ہم بے حد تھک چکے تھے اور گھر جانا چاہتے تھے۔ وِیا کندوتی میں سے نکلے تو ہسپانوی زینے کسی سفید پہاڑ کی ڈھلوان میں سے تراشے ہوئے کھیتوں کی طرح سامنے آ گئے۔ میں نے ہمّت ہار دی "ان سینکڑوں سیڑھیوں پر چڑھنے کے لئے مجھے پہلے آرام درکار ہے اور اس کے ساتھ کافی کی ایک پیالی۔"

"اُوپر پہنچو گے تو بڑا دلفریب منظر دیکھنے کو ملے گا۔" پیٹرلیتوجی رُکنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

"زندگی کی تھکاوٹیں اسی طرح جنم لیتی ہیں کہ لوگ کہتے رہتے ہیں، اُوپر پہنچو گے تو بڑا دلفریب منظر دیکھنے کو ملے گا... اور وہاں پہنچنے پر ایک اور ہسپانوی زینہ سامنے آ جاتا ہے... مجھے معلوم ہے کہ اُوپر کچھ بھی نہیں سوائے ایک اور پُرہجوم شاہراہ کے جہاں سے تمہارے فلیٹ کو جاتی ہوئی ٹرامیں ملتی ہیں۔"

"ہا" پیٹرلیتوجی نے اپنے مخصوص انداز میں ہاتھ اُٹھا دیئے "میں بھول گیا تھا کہ تم پہلے بھی یہاں آ چکے ہو۔"

ہم ہسپانوی زینوں کے سامنے ایک قہوہ خانے کے باہر بیٹھ گئے۔ سنگِ مرمر کے زینوں پر موسمی پھولوں کے دلکش سٹال رنگین دھبّوں کی طرح نمایاں ہو رہے تھے۔

میں نے رومن کافی کا ایک گھونٹ بھرا۔ سنیور لوُدی کی پلائی ہوئی کافی کے مقابلے میں یہ خاصی "زنانہ" تھی۔

"موسم گرما ہو، سالانہ چھٹیاں ہوں تو یورپ اور امریکہ کی بیشتر خوبصورت لڑکیاں یہاں ہوں گی، روم میں، ہسپانوی زینوں کے آس پاس... کہاں ہیں پیٹرلیتوجی؟"

"شام گہری ہو جانے دو پھر دیکھنا، میں تو ایک برس کے بعد اِدھر آیا ہوں۔"

اس نے آزردگی سے کہا "خیر اتنی دیر میں تم مجھے بتا سکتے ہو کہ تم پاکستان میں کیا کر رہے ہو؟"

میں نے اُسے اپنی ادبی اور ٹیلی ویژنی مصروفیات کے بارے میں کچھ بتایا۔

"ہا" اُس نے ہاتھ اُٹھا دیئے۔ "تو تم مشہور ہو۔ میں نہ کہتا تھا کہ تم خوش قسمت ہو۔"

"ہاں پندرہ برس میں چند کتابیں اور ڈرامے... اور کرائے کا مکان اور تنگدستی اور ایک پُرحقارت ماحول، اگر تم اسے خوش قسمتی کہنا چاہتے تو کہہ لو۔"

اُس نے میرے ہاتھ پکڑ کر غور سے دیکھے "گولڈن ہینڈز... میرا خیال ہے مجھے ایک کتاب لکھنی چاہیئے۔ "مستنصر مائی فرینڈ"۔ پاکستانی مصنّف کی ذاتی زندگی اور یورپ میں قیام کے بارے میں ہوشربا انکشافات... اس طرح میں امیر ہو جاؤں گا۔"

"لیکن تم تو جج بن رہے ہو۔"

"جج امیر نہیں ہوتے؟"

"ہمارے ہاں تو ہوتے ہیں۔"

ہم باتیں کرتے رہے۔

فٹ پاتھ پر لگی تمام کی تمام کُرسیاں پُر ہو چکی تھیں۔ زیادہ تعداد امریکی سیّاحوں

کی تھی جو شام ہو جانے کے باوجود تنکوں کے بڑے بڑے ہیٹ پہنے ہوئے تھے... دو
سیاح لڑکیاں پاؤں گھسیٹتی ہوئی آئیں اور کرسیوں پر ڈھیر ہو گئیں۔ ان کی سُرخ سُرخ
شکلوں سے لگتا تھا کہ وہ سارا دن کڑی دُھوپ میں روم کے کھنڈروں میں دھکے کھاتی
پھری ہیں۔ اُن کے صحت مند جسموں، سنہری بالوں اور بے خوف نظروں سے سویڈش
ہونے کا پتہ ملتا تھا۔

''اوہ نو''۔ پیٹر لیوجی جس کی نظریں اُن کے ساتھ ساتھ چلتی آئی تھیں اور اُنہیں
باقاعدہ کرسیوں پر بٹھایا تھا، ہڑبڑا کر سیدھا ہوا اور اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا
''میں ایک وفادار خاوند ہوں، پرائی لڑکیوں کی طرف بالکل نہیں دیکھتا لیکن...'' اُس نے
بے چارگی سے میری طرف دیکھا۔ ''میں بھُوکا ہوں... ہاؤ ہاؤ۔'' پھر اُس نے میرا ہاتھ
پکڑ کر اپنے سینے پر جما لیا۔ ''کیا تمہیں ناخن چُبھ رہے ہیں؟

''کِس کے؟

''میرے جیبی بٹوے میں میری بیوی کی تصویر ہے۔ مجھے ہمہ وقت احساس رہتا
ہے کہ اُس کے ناخن میرے سینے پر رکھے ہیں کہ خبردار... آہ میرے دوست شادی شدہ
انسان بھی کتنا ڈرپوک ہوتا ہے...'' اس کے بعد پیٹر لیوجی کی گفتگو خاصی بے ربط ہو گئی
اور وہ اِدھر اُدھر کی ہانکنے لگا حالانکہ ہم زنانہ کافی ہی نوش کر رہے تھے... کچھ دیر
بعد اُن لڑکیوں نے بل ادا کیا اور باہر جانے لگیں۔

''میں ایک وفادار خاوند ہوں...'' پیٹر لیوجی بھی تیزی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ ''لیکن میں
بھُوکا ہوں... آؤ دوست ان کا پیچھا کریں۔''

میں نے ہچکچاہٹ ظاہر کی تو ہنس کر کہنے لگا۔ ''یہ شام بھی ختم ہو جائے گی، آؤ...''

ہم باہر نکلے تو وہ دونوں ویا کندوتی کی ایک دُکان کے شوکیس میں جھانک رہی تھیں
جس میں سلک کی ٹائیاں سجی تھیں۔ پیٹر لیوجی اُن کے پاس گیا اور مؤدب ہو کر بولا۔ ''خواتین
اگر آپ میرے لئے کسی تحفے کا انتخاب کر رہی ہیں تو مجھے وہ گہری سُرخ ٹائی پسند ہے

انہوں نے پیٹر لیوجی کو حقارت آمیز نظروں سے دھکیلا اور آگے چل دیں۔ پیٹر لیوجی نے
مجھے پیچھے گھسیٹ لیا۔ ''وہ یقیناً ہمیں پسند کرتی ہیں اور صرف بھرم رکھنے کے لئے کچھ
بے نیازی کا تعاقب کروانا چاہتی ہیں... ہاہا میں ابھی یہ کھیل نہیں بھُولا۔''

ویا کندوتی سے نکل کر وہ ہسپانوی زینوں کی طرف بڑھیں۔ پیٹر لیوجی لپکتا ہوا
ایک سٹال پر گیا اور چند پھُول خرید کر اُنہیں پھر جا لیا۔ میں نے دُور سے دیکھا کہ وہ جھک کر
انہیں کچھ کہہ رہا ہے، وہ بھی کچھ کہہ رہی ہیں اور پھر وہ تینوں میری جانب آنے لگے۔
پیٹر لیوجی بدستور قدرے جھکا ہوا تیزی سے باتیں کرتا ہوا اور لڑکیاں پھُولوں کو سونگھتی
ذرے محتاط مگر کھچاؤ سے آزاد۔ وہ ہاتھ بڑھا کر میری طرف آیا اور تعارف کروایا۔ ''یہ ہے
میرا دوست اور کزن سنیور تورو... سسلی سے آیا ہے۔ ڈیوک آف وینڈیٹا کا ساتواں
پوتا... بے حد خونخوار۔''

''ہیلو...'' اُن میں سے ایک نے قدرے بے یقینی سے میری طرف دیکھا کیونکہ میری میلی
کچیلی جین اور جیکٹ اتنی شاہانہ نہ تھیں۔ اس سے پیشتر کہ میں اُسے کچھ کہتا پیٹر لیوجی نے میرا
گال پیار سے تھپکا اور کہنے لگا۔ ''بے چارہ انگریزی بالکل نہیں جانتا.. صرف تھینک یُو
کہہ سکتا ہے... کہو تھینک یُو۔''

میں نے ہونٹ بھینچ لئے اور پیٹر لیوجی کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ ''ہاں خونخوار
ہے...'' وہ ہنس کر کہنے لگا۔ ''تھینک یُو بھی نہیں کہتا اتنی سویٹ لڑکیوں کے لئے...
فوراً کہہ دو۔''

''تھینک یُو۔'' میں نے ایک زہر آلود مُسکراہٹ کے ساتھ جُھک کر کہا۔ دونوں خواتین
بے حد محظوظ ہوئیں۔

اس کے بعد پیٹر لیوجی اُن کے ساتھ نان سٹاپ گفتگو کرتا رہا اور چلتا رہا۔ ہر پانچ دس
منٹ کے وقفے کے بعد مجھ سے ''تھینک یُو'' کہنے کی فرمائش ہوتی جو میں دانت کچکچاتے ہوئے
پُورا کر دیتا۔ پیٹر لیوجی نے جس طور مجھے سسلی کے ایک ڈیوک کا پوتا بنا دیا تھا اُسی طرح

روم کے بیشتر سرکاری دفاتر اور پوسٹ آفس کی عمارات وغیرہ کو فلاں سیزر اور نیرو کے محلات کے طور پر پیش کرتا رہا۔ پھر پتہ نہیں کیسے اُس نے اُنہیں اپنے فلیٹ پر شام کے کھانے کے لئے مدعو کر لیا۔

اُس نے بڑی آہستگی سے فلیٹ کا دروازہ کھولا، مُنہ پر اُنگلی رکھ کر سب کو خاموشی سے اندر آنے کو کہا اور پھر بلیوں کی طرح دبے پاؤں چلتا ٹیرس پر آ گیا۔

"آپ تشریف رکھیے۔۔۔" وہ تسلی سے ہاتھ مَلتا ہُوا کہنے لگا۔ "اور کھانے سے پیشتر کچھ پینے کے لئے۔۔۔ اپریٹیف"۔ اور کچن میں چلا گیا۔ میں تیر کی طرح اُس کے پیچھے گیا۔

"یہ کیا بیہودگی ہے پیئر لیوجی۔"

"دیکھو دوست۔۔۔" وہ ابرو چڑھا کر بزرگانہ انداز میں بولا۔ "یہ سیاح لڑکیاں رُومانس کی بھُوکی ہوتی ہیں۔ کسی اطالوی یا زیادہ سے زیادہ کسی سسلی کے رہنے والے کے ساتھ روم کی ابدی شاموں کو راتوں میں بدلنے کا ارمان۔۔۔ اب اگر میں یہ کہتا کہ میرا دوست پاکستانی ہے تو وہ کبھی ہمارے قریب نہ آتیں۔۔۔"

"اور میں انگریزی کیوں نہیں جانتا؟" میں نے بھڑک کر پُوچھا۔

"یہ بھی ایک طرح کا رُومانس ہے۔۔۔ سسلی کا خونخوار نواب، مافیا کا خفیہ رُکن جو صرف تھینک یُو کہہ سکتا ہے۔۔۔ اور سوچو تو سہی دوست کہ اگر تم انگریزی نہیں جانتے اور جدوجہد کے بعد ایک خاص مقام پر پہنچ کر وہ کہہ دیتی ہے کہ "نہیں، نہیں" تو تم سمجھ ہی نہیں سکتے۔۔۔ فائدہ۔۔۔ اور بعد میں تم اُسے "تھینک یُو" کہہ سکتے ہو۔"

میں اُس کے ترنگ آمیز موڈ سے متاثر ہو کر مسکرانے لگا۔ "اور مجھے موسیو تورو کا نام کیوں دیا گیا ہے۔ تورو تو ہسپانوی میں سانڈھ کو کہتے ہیں۔"

"تو پھر؟"

اُس نے فرج میں سے چند بوتلیں اور گلاس نکالے اور باہر چلا گیا۔۔۔ لڑکیاں

آپس میں کھُسر پھُسر کر رہی تھیں۔ "میری سہیلی کہتی ہے کہ تمہارے دوست کا رنگ سسلی کے رہنے والوں ایسا نہیں ہے، کچھ ڈارک ہے۔" اُن میں سے ایک بولی۔

"یہ دھُوپ میں بہت پھرتا ہے۔" پیئر لیوجی نے جلدی سے کہا۔ "کیوں تورو۔۔۔ کہو تھینک یُو۔"

"تھینک یُو"۔ میں نے مسکرا کر کہا۔

"ہاؤ سویٹ"۔ وہ خوش ہو گئیں۔

"آپ کیا پئیں گی؟ اطالوی وائن، شیمپین یا جِن؟"

"ہم سارا دن تاریخی عمارتوں اور کھنڈروں میں گھُومتی رہی ہیں اور کہیں بھی۔۔۔" اُن میں سے ایک نے جھجکتے ہوئے کہا "اور کہیں بھی۔۔۔ میں پہلے فدا باتھ روم میں جانا چاہتی ہوں۔"

"ڈرائنگ روم کے سامنے بیڈ روم کا دروازہ ہے، اندر جاتے ہی دائیں ہاتھ پر۔" پیئر لیوجی نے خوش دلی سے کہا۔

وہ اندر چلی گئی تو پیئر لیوجی نے دُوسری سے پُوچھا۔ "آپ روم میں کتنی راتیں سوئیں گی؟"

"کیا مطلب؟" وہ چونکی۔ اُس کے لب اگرچہ پُرکشش تھے مگر ہمیشہ کھُلے رہتے تھے، قدرے احمقانہ انداز میں۔ "ہم چھ روز کے لئے روم آئی ہیں، اِنگے اور میں۔"

"اوہ آپ کی دوست کا نام اِنگے ہے، اور آپ کا؟"

"برگیتا۔"

پیئر لیوجی تو جیسے بجلی کی ننگی تار سے چھُو گیا ہو۔ "ہا"۔ اُس نے خوفزدہ ہو کر کہا "برگیتا۔۔۔ سٹاک ہوم؟"

"ہم سٹاک ہوم سے ہی آئی ہیں۔"

"برگیتا"۔ وہ دوسری لڑکی دہاڑتی ہوئی فلیٹ میں سے نکلی۔ "یہ تو شادی شدہ ہے۔"

اُس کے ہاتھ میں پیئر لتوجی کی شادی والی تصویر کا فریم تھا... پیئر لتوجی کا رنگ اُڑ گیا مگر فوراً ہی سنبھل گیا۔ "یہ میرے چھوٹے بھائی کی شادی کی تصویر ہے، ہماری شکل ملتی ہے۔"

"تم تو راستے میں کہہ رہے تھے کہ تم اکلوتے بیٹے ہو اور اس خوبصورت دُنیا میں بالکل تنہا اور بے یار و مددگار ہو۔" اِنگے باقاعدہ دہک رہی تھی۔

"یہ میرا سو فیصد بھائی ہے... یقین کیجیے خواتین... مجھے مقدس مریم کی قسم ہم ایک ہی باپ کی اولاد ہیں۔" وہ سینے پر صلیبیں بنا بنا کر نڈھال ہو رہا تھا۔ اُس نے اِنگے کے شانے پکڑ کر سمجھانے کی کوشش کی اور اس دوران اپنی اطالوی عادت سے مجبور ہو کر اُس کے رُخسار کو بھی تھپتھپا دیا۔ وہ مزید جوش میں آگئی۔ "یہ تم نے میرے گال کو کیوں ہاتھ لگایا ہے؟"

"آپ کو ایک اچھے عیسائی کی طرح اپنا دوسرا گال آگے کر دینا چاہیے۔" میں نے صورتِ حال سے لُطف اندوز ہوتے ہوتے اطمینان سے کہا۔

"میں اُن عیسائیوں میں سے نہیں ہوں جو تم جیسے چھوٹے شیروں کے آگے ہتھیار ڈال دیتے ہیں..." وہ لال بھبھوکا ہو کر بولی اور پھر فوراً ہی خاموش ہو گئی۔ مجھے نظر بھر کر دیکھا "تو تم انگریزی بھی بولتے ہو۔" اُس نے اپنی سہیلی کا بازو تھام لیا "مجھے پہلے ہی شبہ تھا کہ یہ والا اِسسلی کا نہیں... آؤ اِنگے ہم یہاں محفوظ نہیں ہیں۔ یہ دونوں دھوکے باز ہیں"

اِنگے نے قدرے تامّل سے کام لیا تو برگیتا اُسے جھنجھوڑ کر بولی "تم اٹھتی کیوں نہیں؟"

"او ہو برگیتا، اگر یہ شادی شدہ ہے تو پھر کیا ہُوا اور اگر یہ والا اِسسلی کا نہیں اور انگریزی بولتا ہے تو کیا حرج ہے؟"

"حرج؟" وہ چیخی۔ "یہ معصوم لڑکیوں کو ورغلاتے ہیں، دھوکے باز ہیں... چلو"

اِنگے نے خوش نظر ٹیرس اور ہم حسین مجرموں کو حسرت سے دیکھا اور مجبوراً اُٹھ کھڑی ہوئی اور پھر دونوں باہر نکل گئیں۔

پیئر لتوجی مُنہ کھولے کھڑا تھا اور اُس کے دونوں ہاتھ ہوا میں بلند تھے جیسے کوئی

گٹھڑی اُٹھا رکھی ہو۔ اتنے میں وہ پھر واپس آگئیں "ہمارے پاس لفٹ میں ڈالنے کے لئے ریزگاری نہیں ہے، ایک سکہ دو۔"

"لفٹ کے عین پہلو میں سیڑھیاں اُترتی ہیں، اپنی صحت مندی کا فائدہ اُٹھائیے اور اُتر جائیے، رات تک نیچے پہنچ جائیں گی، خدا حافظ۔" پیئر لتوجی نے دونوں ہاتھ ہلائے۔ وہ پاؤں پٹختی ہوئی واپس چلی گئیں۔

"بُری بات پیئر لتوجی۔"

"اور یہ اچھی بات ہے کہ اُنہوں نے ہماری شام ضائع کر دی۔ شادی شدہ زندگی میں پہلی بے وفائی کی شام... خیر دفع کرو ان چڑیلوں کو، آؤ کمپاری کی اس بوتل کو کھولتے ہیں..." اُس نے بوتل کے کارک میں تار گھمائی اور مجھے تھما دی۔ "تم کھولو مگر احتیاط سے..."

"پھٹنے کا خطرہ ہے؟" میں نے ہراساں ہو کر پوچھا۔

"نہیں... اس کا کارک بہت بلندی تک جاتا ہے اور اکثر اوقات ذرا ترچھا ہو کر ساتھ والے ٹیرس پر جا گرتا ہے... وہی خبطی بڑھیا... اور وہ شور مچا دیتی ہے کہ کوئی مجھے چھیڑ رہا ہے..."

میں نے دھیرے دھیرے تار گھمائی، کارک ٹھک سے علیحدہ ہُوا، ہماری نظریں اُس کے ساتھ اُٹھیں اور وہ ٹیرس سے بلند ہو کر روم کے آسمان میں تیرا اور نیچے آگیا۔ پیئر لتوجی نے ہاتھ بڑھا کر اُسے دبوچا اور میز پر رکھ دیا۔

میں نے کمپاری چکھی اور مُنہ بنا لیا "یہ تو کڑوی یعنی بٹر ہے۔"

پیئر لتوجی نے بوتل اُٹھا کر اُس کا لیبل آگے کر دیا جس پر کمپاری بٹر لکھا تھا۔

یہاں روم کے دن تمازت میں چمکتے ہیں وہاں راتیں اکثر سرد ہو جاتی ہیں ہم نے اُس ٹیرس پر بیٹھے ہوئے سرد رات کی بتدریج آمد کو اپنے بدنوں میں محسوس کیا۔

پیئر لتوجی اگرچہ پوری طرح بحال ہو چکا تھا مگر شوخی اور مسرت کی جھاگ بیٹھ چکی تھی۔

وہ اپنے دنوں اور سالوں کا حساب کر رہا تھا۔ "میں چھتیس برس کا ہو گیا ہوں اور اب تک پڑھ رہا ہوں... تمہیں پتہ ہے ناں کہ میں تمہارے علاوہ آج کسی اور کو نہ ملتا... دیکھو۔" اُس نے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ "میں بوڑھا ہو رہا ہوں۔"

"بوڑھا نہیں، گریس فُل۔"

"ایک ہی بات ہے... تم نے یہی کہا تھا ناں کہ زندگی کی تھکاوٹیں اسی طرح جنم لیتی ہیں کہ لوگ کہتے رہتے ہیں کہ اُوپر پہنچو بڑا دلفریب منظر ہے اور اُوپر پہنچنے پر ایک اور ہسپانوی زینہ سامنے آجاتا ہے... میں اب بھی ایک چھوٹی عدالت کا جج ہوں مگر لوگ کہتے ہیں کہ اُوپر پہنچو، بڑا دلفریب منظر ہے... بڑی عدالت میں چلا جاؤں گا تو پھر بھی یہی کہیں گے کہ اُوپر پہنچو..."

"تم عدالت میں سفید وِگ لگا کر سنجیدہ کیسے بیٹھے رہتے ہو پیئر لتوجی؟"

"تم آج کی بات مت کرو۔ آج میں تمہارے ساتھ تھا اور ہم دونوں سٹاک ہوم میں تھے پندرہ سال پہلے... روم تو اب آتے ہیں۔ میں بہت سنجیدہ اور سخت جج ہوں... بس دوپہریں گزر رہی ہیں اور شامیں ختم ہو رہی ہیں..."

اُس نے کمپاری کے بعد کیانتی کی ایک بوتل کا کارک ڈھیلا کیا تو وہ آسمان پہ تیرتا ہوا ساتھ والے ٹیرس پر جا گرا۔ پیئر لتوجی نے کان پہ ہتھیلی رکھ کر انتظار کیا "میرا خیال ہے سو گئی ہے۔"

پھر ہم ایک طویل عرصے کے لئے خاموش ہو گئے۔ ہمارے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا۔

"ہا"۔ وہ یکدم کھڑا ہو گیا اور ہاتھ اُٹھا دیئے۔ "مجھے یاد آگیا۔" اُس نے فرش پہ ایک گھٹنا ٹیک کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ "کیا تم اُردو بولتے ہو؟" پیئر لتوجی نے نہایت مزیدار اطالوی لہجے میں اُردو کا یہ فقرہ ادا کیا جو میں نے اُسے پندرہ برس پیشتر سٹاک ہوم میں سکھایا تھا۔

"ہاں"۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"مجھے تم سے موہابت ہے... اُردو میں آئی لو یُو کو یہی کہتے ہیں ناں؟"

"ہاں پیئر لتوجی... اور مجھے بھی تم سے موہابت ہے۔"

رات کے بارہ بجے تو روم کی ہواؤں میں موسیقی سے لبریز، کلیساؤں کی گھنٹیوں کی آوازیں پھیلیں اور ہم تک پہنچیں۔

"مجھے چلنا چاہیئے۔"

"ہاں۔ رات بھی ختم ہو گئی۔"

فلیٹ میں سے گزرتے ہوئے وہ ایک آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ "اس فلیٹ میں ہر شے نئی ہے سوائے اس آئینے کے جو میں اپنے ماں باپ کے گھر سے اُتار لایا تھا۔ اس کے سامنے کھڑے ہو کر میں اپنی ناکامیوں پر رو دیا اور خوشیوں پر مسکرایا۔ اسی آئینے کے رُوبرو جوان ہُوا اور اب سفید بال نوچتا ہوں... تم بھی اتنے برسوں بعد ایک پُرانے آئینے کی طرح میرے سامنے آگئے ہو۔"

دِیا نارنتو کے سٹاپ پر ماؤنٹ اٹینا کیمپنگ کے لئے آخری بس آئی اور میں سوار ہو گیا۔

"ارے دی ڈاچی... پیئر لتوجی"

بس سٹارٹ ہوئی تو وہ پیچھے ہٹ کر فٹ پاتھ پر کھڑا ہو گیا۔ "ہا"۔ اُس نے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کر دیئے۔ "میں آج ہی تمہاری جانب سے تریوی فوارے میں چند سکے پھینک دوں گا... پانیوں کو کیا پتہ کس نے پھینکے ہیں... روم واپس آنا۔"

روم سویٹ روم۔

:•———————•:

پتّھر کا شہر

آج اتوار تھا، صُبح کے دس بجے تھے۔ ہم روم سے باہر آ رہے تھے۔

دس بجے تھے مگر دُھوپ میں ایک نامعلوم سی سیاہی گھُلی ہوئی تھی۔

ابدی شہر سے نکلنے والی سڑک کے دو رویہ سرو کے درخت پتّھر کے بنے تھے
کہ بالکل ساکت کھڑے تھے جیسے روم سے بغاوت کے جرُم میں مصلوب غلاموں کے
لاشے اکڑ رہے ہوں۔

ایک کھنڈر ہوتا ہوُا رُومی اکھاڑہ نظر آیا۔ شکستہ اینٹوں میں گھاس اور سرکنڈے
اور درمیان میں ایک نوجوان جس کی نگاہیں اپنے گرد مسمار ہوتی ہوئی عمارت میں کچھ
تلاش کر رہی تھیں۔

آج اتوار تھا، صُبح کے دس بجے تھے۔ ہم روم سے باہر آ رہے تھے۔

ہلیری کی جبین میں منڈھی ہوئی بائیں ٹانگ موسیقی کی تال پر ٹائپ رائٹر کے ایک
ہی لفظ پر بار بار پڑنے والی اُنگلی کی طرح حرکت کر رہی تھی۔ کرخت شباہت، مرد
ہونے سے بال بال بچتی ہوئی ہلیری جس کی واحد جاذبیت تال پر دھمکتی متحرک ٹانگ
تھی سٹیئرنگ وہیل پر تھی۔ اُس کے پہلو میں لنڈا نیم دراز تھی۔ پچھلی نشست پر
خانہ بدوشوں ایسے گھیر دار لباس میں شیلا تھی جو اپنے بے ترتیب سُوکھے ہوئے بالوں
کو بڑھے ہوئے ناخنوں سے کھُجلا رہی تھی۔ اور میں تھا اور باہر دیکھ رہا تھا۔

فوکس واگن کا ڈبّہ فلارنس جانے والی شاہراہ پر مُڑ گیا اور باہر ٹریفک سے دُور

بیلوں سے سیاہ انگور لنگوروں کی طرح لٹک رہے تھے۔

آسٹریلیا کی ہلیری اینڈ کمپنی سے پچھلی شب کیمپنگ کے اوپن ایئر کا فی بار میں سرسری ملاقات ہوئی تھی۔ اُنہوں نے روم سے فلارنس کی جانب روانگی کا ذکر کیا تو میں نے لفٹ کا دستِ سوال دراز کر دیا... اور راب میں اُن کی یہ خیرات وصول کر رہا تھا۔
ان دیکھے شہروں کی جانب سفر کرتے ہوئے جو بے دھڑک کشش بدن کو گرفت میں لیتی ہے، وہ کہاں ہے؟ آوارگی کا وہ عالمِ وارفتگی کیا ہوا؟ کیا دیوانگی سفر کے کلبلاتے ہوئے جرثومے مرتے جاتے ہیں... مرتے جاتے ہیں۔

دو بجے ہم فلارنس پہنچ گئے۔ پلازا ڈیکیو میں دانتے کے مجسمے کے نیچے ہلیری نے اپنی میوزیکل ٹانگ بریک پر رکھی اور فوکس واگن پارک کر دی۔ مجسمے کے سر پر ایک گدھ بیٹھا ہوا تھا۔

ہلیری اور لنڈا نے پلازا ڈیکیو میں اُتری ہوئی دھوپ کی چمک میں نہایت بے اعتنائی سے ایک ایک سگرٹ پیا اور چلی گئیں... شیلا ڈرک سیک کے بوجھ سے جھکی جھکی بالوں میں اُنگلیاں چلا رہی تھی "جرمنی میں ان کے دوست لڑکے ان کا انتظار کر رہے ہیں، کسی جھیل کے کنارے... اس لئے اُنہوں نے فلارنس ایسے شہر میں ایک شب رُکنا بھی گوارا نہیں کیا مگر میں..." وہ مَیلے دانتوں سے ہنسی "میرا کوئی انتظار نہیں کر رہا۔"

"کہاں ٹھہرو گی؟"

"یوتھ ہوسٹل میں، اگر وہاں جگہ نہ ملی تو... ان دنوں فلارنس میں سیاحوں کی بھرمار کی وجہ سے چھت کا حصول ناممکن ہو جاتا ہے۔" وہ بڑی مایوس اور بے چاری دکھائی دی۔

"اگر کہیں جگہ نہ ملی تو میرا خیمہ اتنا چھوٹا نہیں ہے، آ جانا۔" میں نے لفٹ کا بدلہ چکانے کی خاطر پیشکش کی۔

"میں شاید آ بھی جاؤں لیکن پہلے یوتھ ہوسٹل۔" وہ سر کھجاتی ہوئی چل دی۔

دانتے کے سر پر گدھ بیٹھا ہوا تھا مجسمہ چبوترے پر ساکت تھا اور میں چبوترے کے ساتھ ٹیک لگائے سگرٹ پی رہا تھا... پلازا ڈیکیو میں ٹہلتے سیاح بیحد سُست رہے تھے۔ وہ اطمینان سے تصویریں کھینچ رہے تھے، لاپرواہی سے دھوپ اینک رہے تھے اور سٹالوں پر سے فلارنس کی فنکارانہ مصنوعات خرید رہے تھے۔ ہانپ نہیں رہے تھے اور اُن کے پاس دُنیا کا تمام تر وقت پڑا تھا اس لئے کہ فلارنس روم نہیں تھا... روم جس کی وسعت اور تاریخ اور ہجوم سیاح کو حقیر کر دیتے ہیں، اُسے بھگا بھگا کر نڈھال کر دیتے ہیں۔ فلارنس تو اتنا مختصر تھا کہ اس میں تیز چلنے والا انسان یا توسکنی کی پہاڑیوں میں پہنچ جاتا تھا اور یا سیدھا سیدھا دریائے آرنو کے پار نکل جاتا تھا۔ اس کی تاریخی اہمیت کے لئے گائڈ کا مُنہ نہیں دیکھنا پڑتا تھا بلکہ یہ ایک ایسا ورق تھا جسے جدید انسان کئی مرتبہ پڑھ چکا تھا۔ دانتے، مائیکل اینجلو، رافائیل، بکاشیو، گلیلیو اور مونا لیزا کو جاننے کے لئے کیا کسی گائڈ کے لیکچر کی ضرورت ہے؟ روم شہنشاہوں اور سیزروں کا شہر ہے اور فلارنس مصوّروں، بُت تراشوں اور دانشوروں کا، روم جلال اور فلارنس جمال... اور میں کبھی بھی جلال سے مرعوب نہیں ہو سکا البتّہ جمال کے لئے میں ایک ایرانی قالین ہوں، وہ مجھ پر بے شک ننگے پاؤں چلے... اور فلارنس میرے وجود پر چلا اور اُس کے نقشِ پا آج تک میرے بدن پر موجود ہیں۔

گول ہیٹ اور اُس کے نیچے ایک گھیرے دار میکسی اور ایک کیمرہ۔ ایک پادری دانتے کے مجسمے کی تصویر اُتارتا میرے قریب آ گیا۔

"سینور" اُس نے مسکین مسکراہٹ سے درخواست کی "اگر آپ ایک لمحے کے لئے چبوترے سے ہٹ جائیں تو میں دانتے کی ایک مکمل تصویر اُتار لوں۔"

"اور اس گدھ کی بھی جو سنیور دانتے پر براجمان ہے۔" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"شی شی" - پادری نے ہاتھ لہرا کر گدھ کو خوفزدہ کرنے کی کوشش کی۔ "نہیں اُڑتا۔"

اُس نے خجالت میں سر کی بجائے ہیٹ کو کھجلایا اور پھر تصویر اُتار لی۔

"فلارنس میں تم پہلے شخص ہو جس کے ساتھ میں نے بات کی۔" وہ اب میری جگہ پر ٹیک لگا کر بہ اطمینان ہو گیا۔ "مجھ سے تو کوئی بات ہی نہیں کرتا، پتہ نہیں لوگ پادریوں سے کیوں خوفزدہ رہتے ہیں حالانکہ کل صبح تک میں بھی انہی کی طرح ایک عام شہری تھا۔"

"یہ دستار اور جُبّہ آپ نے کراتے پر حاصل کئے ہیں؟" میں مُسکرایا۔

"نہیں"۔ وہ بھی مُسکرایا "صرف پانچ برس کی مشقّت اور یہ مُفت میں مل جاتے ہیں... میں روم کی ایک خانقاہ میں اتنے برس مذہبی تعلیم حاصل کرتا رہا۔ کل دوپہر ہم میں سے ہم پاس آؤٹ ہوتے اور عزّت مآب پوپ نے ہمیں باقاعدہ پادری ہونے کی سند عطا فرمائی اور مجھے پوپ کی دست بوسی کا شرف حاصل ہُوا..."

"فلارنس میں آپ کیا کر رہے ہیں، یہاں کوئی گرجا وغیرہ سنبھالنے کا ارادہ ہے؟"

"میری یہ قسمت کہاں..." وہ آزردہ ہو کر بولا۔ "یہاں تو صرف سینیئر پادری آتے ہیں یا جن کی سفارش ہو... میں تو ابھی نووارد ہوں۔ کسی غربت زدہ گاؤں میں بھیجا جاؤں گا۔ اور فلارنس میں کیا کر رہا ہوں، میں نے سوچا روحانیت کی زندگی کا آغاز اس شہر کے عالیشان کلیساؤں کو دیکھ کر کروں... آج صبح سے آٹھ تو دیکھ چکا ہوں تم بھی ضرور دیکھنا اور ہاں پٹی پیلس کے قریب ایک ائیر کنڈیشنڈ قبرستان بھی دیکھا۔ انتہائی پُرفضا، وہ بھی دیکھنا۔"

"آپ یقین رکھیں کہ میں قبرستان تو ضرور جاؤں گا... لیکن خود سے نہیں، دوسروں کے کندھوں پر سوار ہو کر۔"

وہ کیمرہ گود میں رکھ کر سر ہلانے لگا... مجھے خدشہ سا ہُوا کہ شاید وہ جذبہ ہمدردی کے تحت میری آخری رسومات کی ادائیگی کے لئے اپنی خدمات پیش کرنے کو ہے۔ "فلارنس کی کیمپنگ سائٹ کا کچھ پتہ ہے؟"

"دریائے آرنو کے کنارے تیرہ نمبر بس پر سوار ہو جاؤ، کیمپنگ مائیکل انجلو..."

ہے وہ قبرستان ایسا نہیں کہ اس کی بات ہنسی میں اُڑا دی جائے..." وہ مجھ سے دُور دُبکا سا بیٹھا رہا اور پھر چوغے میں سے چیونگم نکال کر چبانے لگا۔

بس نمبر تیرہ دریائے آرنو کے پُل سینٹ نکولا کے پار ہوئی اور فلارنس پر جُھکی ہوئی سرسبز پہاڑی پر چڑھنے لگی۔

دفتر میں پاسپورٹ جمع کروانے کے بعد جب میں کیمپنگ مائیکل انجلو میں داخل ہُوا تو خیموں، کاروانوں اور سیاحتی ویگنوں کا ایک عارضی شہر آباد تھا۔ میں کسی مناسب جگہ کی تلاش میں بوجھ اُٹھائے چلتا رہا۔ جہاں ڈھلوان ختم ہوتی تھی وہاں ایک سرسبز ٹکڑا تھا جو بالکل خالی تھا۔ پہاڑی کے عین نیچے دریائے آرنو اور اُس کے دیدہ زیب پُل تھے۔ اور اُن کے ساتھ فلارنس تھا جس کے چوکور مینار اور گنبد بلند ہوتے ہوتے اس سطح پر ختم ہو جاتے تھے جس سطح پر میری ہموار نظر سفر کر رہی تھی... بعد میں معلوم ہُوا کہ اتنی ہجوم کیمپنگ میں اتنا آئیڈیل ٹکڑا کیوں خالی تھا... ایک تو یہاں سے قریب ترین ٹائلٹ فرلانگ کے فاصلے پر تھا اور دوسرے ڈھلوان اتنی یکلخت تھی کہ انسان اگر ایک بڑا قدم اُٹھائے تو دھڑام سے دریائے آرنو میں جا گرتا تھا... میں نے رُک سیک کو اُتار کر زمین پر رکھا اور سب سے پہلے سٹوو جلا کر فرائنگ پین میں انڈے، آلو اور پنیر وغیرہ ڈال کر پتہ نہیں کونسی نسل کا ایک ملغوبہ سا تیار کیا جو ڈبل روٹی کے ساتھ میں نے انتہائی ذوق و شوق اور ولولے سے نوش کیا۔ پھر خیمہ اس طور نصب کیا کہ وہ فلارنس کے وسیع منظر پر کُھلتا تھا۔ اس کے بعد کافی تیار کی اور رنگ کے چلتے ہوئے ہینڈل کو تھام کر خیمے میں رینگ گیا۔ سلیپنگ بیگ پر نیم دراز ہو کر میں نے گرم مشروب کا پہلا گھونٹ حلق سے اُتارا... خیمے کی سبز دیواریں اور اس کا تکونی دروازہ جس میں سے فلارنس شہر کا ایک حصہ کٹ کر تکون ہو رہا تھا اور اس تکون میں، ڈومو...

ڈومو!

فلارنس کا باشندہ کہتا ہے "میں کبھی بھی ڈومو کے نظارے سے جدا نہیں ہو سکتا اور اگر ایسا ہوا تو سمجھو کہ میں زندہ نہ رہا۔"

اور ڈومو ہے کیا؟ ڈوم... رینے سان کلیسا کا عظیم گنبد جو شہر کے درمیان میں ایک موٹے اور کاہل پادری کی طرح توند نکالے لیٹا ہے۔

فلارنس پتھر کا بنا کہ اس کے باسی سینکڑوں برسوں سے نواحی تسکن پہاڑیوں سے پتھر کاٹ کاٹ کر لاتے رہے اور ان سے حفاظتی دیواریں، قلعے، کلیسا، محل اور مجسمے بناتے رہے۔ پیٹرا سرینا یعنی گداز پتھر جسے تسکن اس طرح ہاتھ لگاتا ہے جیسے عاشق محبوب کے گداز بدن کو چھوتا ہے اور اسی طور موم کر لیتا ہے۔ فلارنس والے کہتے ہیں کہ اگر تم پتھر کو اس طرح مارو جس طرح جاہل کسان بیل کو مارتا ہے تو وہ مر جاتا ہے۔ ہاں اس سے پیار کرو تو وہ تمہیں خدا بنا دے گا، تم تخلیق پر قادر ہو جاؤ گے۔

فلارنس کو پہلی صدی قبل مسیح میں رومنوں نے آباد کیا مگر بقیہ یورپ کی طرح دریائے آرنو اور تسکن پہاڑیوں کے درمیان واقع یہ قصبہ بھی ایک ہزار برس تک جہالت کی تاریک رات میں سوتا رہا۔ اس دوران معدودے چند انسان ذہن کے تہہ خانوں میں نیند کے عالم میں چلتے رہے مگر عام طور پر روم اور یونان کے علوم توہم پرستی اور مذہبی تنگ نظری میں گم ہو گئے۔ راہبوں نے ہمیشہ اگلے جہان کی باتیں کیں اور اس جہان کو بھول گئے اور پھر یہیں سے، فلارنس کے پتھر دل سے آواز آئی "زندگی کو اس جہان میں بھی خوبصورت طریقے سے بسر کرو۔"

تب تسکنی کی ان پہاڑیوں میں سے ایسے ایسے جینئس اٹھے جنہوں نے آج کے جدید انسان کے ذہنی سانچوں کو ڈھالا اور یورپ میں تہذیب کا اولین سنگ بنیاد رکھا۔ ... گلیلیو "میں نے زمینوں کی اشیاء چھوڑ کر اپنی آنکھیں آسمان پر لگا دیں۔" اس نے زندگی کا رخ آسمانوں کی طرف موڑا اور مذہبی جہالت کے پاگل پن کا شکار ہونے کے باوجود انسان کو کائنات کے قریب لے گیا۔ دانتے اظہار کی ان بلندیوں تک پہنچا جہاں اس

نظم "کامیڈی" کو ڈیوائن کہا گیا۔ مائیکل انجلو "انسان کے ہاتھ مصوری نہیں کرتے، انسان کا ذہن برش چلاتا ہے۔" پتھر میں پوشیدہ مجسمے کو دیکھ لینے والا بت تراش... علم سیاسیات کا ولی مکاولی جس کی "دی پرنس" نئی سیاست کی بائیبل ٹھہری.... لیونارڈو ڈاونچی کی مونالیزا جو مسکراتے مسکراتے دنیا کی سب تصویروں پر حاوی ہو گئی۔ بکاشیو اور پترارچ نے ادب کے نئے رجحانات کو تقویت دی۔

ہینی بال جو افریقہ سے چل کر کوہ الپس کو عبور کر کے اپنے پیارے ہاتھیوں سمیت ادھر آنکلا تھا، دریائے آرنو کے کنارے بسنے والوں کے بارے میں کہتا ہے کہ وہ جنگ کی بجائے فنونِ لطیفہ کے دلدادہ تھے۔ فلارنس کے رہنے والے اب بھی بنیادی طور پر آرٹسٹ ہیں۔ زندگی کرنے کا فن جانتے ہیں اور خوبصورت زندگی اور دانش الگ الگ خانوں میں نہیں بانٹتے۔ ریستوران کا ویٹر بھی اپنے ہم شہر دانتے کے حوالے سے بات کرتا ہے جبکہ شیکسپیئر کے گاؤں سٹریٹفورڈ میں شراب خانے تو اس کے ڈراموں کے نام پر ملتے ہیں مگر ان میں مخمور ہوتی ہوئی مخلوق کو اس کی تحریروں سے آگہی نہیں ہوتی فلارنس کا باشندہ بجا طور پر کہتا ہے کہ میں کبھی بھی ڈومو کے نظارے سے جدا نہیں ہو سکتا اور اگر ایسا ہوا تو سمجھو کہ میں زندہ نہ رہا۔

ستانے کے بعد میں خیمے سے باہر آیا تو شام ہو چکی تھی۔ ڈومو کے پہلو میں کھڑے برج مینار پر چند کرنیں زرد ہو رہی تھیں اور آرنو کے پل پانیوں پر کسی پر پیچ لیس کی طرح کاڑھے ہوئے تھے۔ گھاس میں شام کی تر اور سبز مہک تھی۔ فلارنس کا نازک جمال میرے سامنے تھا۔ بادیا، ویکیو اور گیوٹو کے چوکور مینار، خزاں رسیدہ رنگوں کی گلیاں، افیزی گیلری کی محرابیں، لونتو ویکیو کا ڈھکا ہوا پل اور آرنو... اور میرا خیمہ...! اور سبز گھاس اور ہوا... اور میں... اور میں آزاد تھا... سانس لے رہا تھا... مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں اب بھی افغانستان کی اسی پر شور بلندی پر اکیلا بیٹھا ہوا ہوں

اور میرے سامنے فلارنس نہیں پُر ہیبت صحرا اور ویرانے اور خاردار جھاڑیاں ہیں۔ کلیسا کا گنبد ایک عظیم بگولا ہے جو ٹھہر گیا ہے۔ آرنو کے پانی سراب ہیں میرے اس پاس سیاحوں کے خیمے نہیں، بے چین بگولے ہیں جو پل بھر کے لئے رُکے ہیں ابھی پھر رواں ہو جائیں گے... میں آزاد ہوں۔

میں کپڑے بدل کر کیمپنگ سے باہر آنے لگا تو منیجر کہنے لگا "آپ مایوس ہوں گے سنیور، رات کو فلارنس ایک مُردہ شہر ہے۔"

شہر کی گلیاں واقعی سنسان تھیں مگر پلازا سائنوریا میں چند قہوہ خانے کھُلے تھے۔ پلازا ویکیو میں بھی صرف کبوتروں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دے رہی تھی جو میڈیچی محل کی منڈیروں میں رُوپوش تھے۔ البتہ دانتے کا مجسمہ گِدھ کی رفاقت سے محروم ہو چکا تھا۔ بڑے چوکوں سے ہٹ کر فلارنس کی پرانی پتھریلی گلیاں تھیں اور ان میں سے ایک میں میں نے دانتے کا گھر دیکھا... پتھر کی بڑی بڑی سِلوں سے تعمیر کردہ، سُرخ جھکی ہوئی چھتوں والا ایک قلعہ نُما گھر... دروازے پر کھُلنے اور بند ہونے کے اوقات درج تھے اور میں بہت دیر سے آیا تھا۔

واپسی پر ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی۔ بجلی کی چمک گلیوں کے پتھروں پر پڑتی تو جیسے چقماق کا ایک شرارہ، چمکا اور بجھ گیا۔ آرنو کے کنارے پر واقع بس سٹاپ پر پہنچتے پہنچتے تیز بارش آسمان سے جھکنے لگی۔ دریا کے کنارے حفاظتی دیوار پر چند نہایت خوش لباس فلارنسی بیٹھے تھے اور بارش کے باوجود پانی میں ڈوریاں ڈالے مچھلیوں کے انتظار میں تھے۔ چونکہ بس سٹاپ پر کسی قسم کا شیڈ ناپید تھا اس لئے میں کھُلی جگہ پر بھیگنے کی بجائے سڑک کے پار ایک دکان کے برآمدے میں جا کھڑا ہوا۔ یہاں سے کیمپنگ سائیکل انجلو نظر آ رہی تھی مگر میرا خیمہ پہاڑی کی اوٹ میں چھُپا بیٹھا تھا، بلند ڈومو کی سطح پر کچھ دیر بعد سٹاپ پر ایک بس رُکی۔ میں اپنی پناہ گاہ سے نکل کر سڑک پار کرنے لگا تو کیمپ ٹریفک شروع ہو گئی۔ جتنی دیر میں کاروں کا سلسلہ ختم ہوا بس جا چکی تھی اور یہ آخری

...تھی۔ میں نے آسمان پر نگاہ ڈالی تو بارش نے آنکھوں کو بند کر دیا۔ میں سر جھکائے ...بدن پر پڑتے پانی کی خنک لکیریں بدن پر رینگتے ہوئے محسوس کرتا آرنو کے پار آیا۔ آہستہ آہستہ پہاڑی سڑک پر چلنے لگا۔ کیمپنگ تک پہنچتے پہنچتے میں اس طور شرابور ہو چکا تھا جیسے آرنو کا نصف پانی اُٹھا لایا ہوں۔ خیمہ نیم تاریکی میں بھیگ رہا تھا مگر اُس ...کے اندر کی عافیت کے خیال نے میرے ٹھٹھرتے بدن کو ایک گھنی گرماہٹ کا احساس ...دیا۔ اگر میں اُسی طرح نچڑتا ہوا کپڑے کے اس گھر میں داخل ہوتا تو باہر اور اندر کا ...موسم ایک ہو جاتا۔ چنانچہ میں نے جلدی سے چپکے ہوئے کپڑوں کو اپنے آپ سے علیحدہ ...کیا اور پھر خیمے میں داخل ہو کر تولیے سے بدن پونچھنے لگا۔

"کیا یہ تم ہو؟"

"ہائیں..." میں ایکدم خوفزدہ ہو گیا۔ یہ ایک نسوانی آواز تھی اور میرے خیمے میں تھی۔

"میں شیلا ہوں، یاد ہے؟"

"کونسی شیلا؟" میں اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر "دیکھنے" لگا۔

"ہلیری اور لنڈا کی دوست... تم ہی نے تو کہا تھا کہ اگر یوتھ ہوسٹل میں جگہ نہ ملے تو..."

اوہ خدایا، اس لڑکی نے ایک نیم مزاحیہ فقرے کو سنجیدگی سے لے لیا تھا اور اب ...میرے مختصر خیمے میں تھی... جہاں صرف ایک فرد بخوبی لیٹ وغیرہ سکتا تھا۔

"ہاں کہا تو تھا لیکن وہ تو میں نے... شیلا بی یہاں تو..."

"مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہیں پریشان کیا ہے مگر پورے فلارنس میں سوائے ...مہنگے ہوٹلوں کے کوئی بھی کمرہ خالی نہیں ہے... میں شام کو ہی یہاں آ گئی تھی خیمے ...میں بیٹھی تمہارا انتظار کرتی رہی مگر پھر بارش شروع ہو گئی..."

اس گفتگو کے دوران میں نے کمال عُجلت سے اپنے آپ کو قدرے ملبوس کر لیا۔

"اتنی وسیع کیمپنگ سائٹ میں میرا خیمہ تم نے کیسے تلاش کر لیا؟"

وہ ہنسی "مشکل نہ تھا، تم یہاں واحد پاکستانی ہو... بلکہ تمہارے قریب ہی انگریز لڑکوں کا ایک گروپ ٹھہرا ہوا ہے۔ اُن سے تمہارا پوچھا تو کہنے لگے کہ اگر رات ہی بسر کرنی ہے تو ہمارا خیمہ اُس پاکستانی سے زیادہ بڑا ہے... لفنگے کہیں کے۔"

میں نے سگرٹ سُلگانے کے لئے ماچس جلائی تو خیمے میں روشنی کا ایک گولہ سا مقید ہو گیا۔ شیلا بی بی میرے سلیپنگ بیگ میں مزے سے لیٹی ہوئی تھی۔ اُس کے بھورے بال خیمے کے کم از کم چوتھائی حصے میں بکھرے نظر آتے۔

"میرا خیال ہے کہ میں باہر سو جاتا ہوں۔"

"باہر تو بارش ہو رہی ہے۔"

ہاں باہر تو بارش ہو رہی تھی۔

اگلے دو روز میں نے جان بوجھ کر ایک سیاح کا لبادہ اُتارا اور ایک بے فکرے اطالوی نکمے کی طرح شہر فلارنس میں آوارہ گردی کرتا رہا۔ نہ ہاتھوں میں کتابچے اور نقشے کہ فلاں محلّہ کدھر ہے، فلاں میوزیم کتنے بجے بند ہو جاتا ہے اور اس برہنہ خاتون کا مجسمہ کس نے بنایا تھا اور کس طرح بنایا تھا اور ان دنوں یہ خاتون کہاں ہیں وغیرہ وغیرہ بلکہ ایسی مصروفیات میں مگن دوسرے سیّاحوں کو ایک احساسِ برتری کے ساتھ دیکھتا ہوا ہاتھ لٹکاتا گھومتا رہا۔ اگر پلازا گیووانی میں کوئی قہوہ خانہ پسند آیا تو پوری دوپہر اُسی میں اُونگھتے گزار دی۔ کبھی پلازا دیکیو کے سٹالوں پر نک چڑھی اطالوی لڑکیوں سے خواہ مخواہ بھاؤ تاؤ کرتے رہے اور کبھی آرنو کے کنارے مچھلیاں پکڑتے کسی صاحب کے ساتھ گپ لگائی... اس نکمّی زندگی نے مجھے بے حد تر و تازہ اور مسخرہ سا بنا دیا۔ میں ایک چھاج نما ہیٹ پہنے راہ چلتے لوگوں کی طرف دیکھ کر بلاوجہ مُسکراتا رہتا۔ ہانپتے ہوئے سیّاحوں پر پھبتیاں کستا اور نیم تاریک کونوں میں کھسر پھسر کرتے جوڑوں کو "آپ کو گرفتار کیا جاتا ہے" کہہ کر خواہ مخواہ خوفزدہ کر دیتا... تیسرے روز مجھے احساس ہوا کہ کچھ گڑبڑ ہوتی جا رہی ہے

...کچھ کچھ اطالوی اور بہت کچھ فلارنسی ہوا جاتا ہوں۔ بہرحال اس بے جواز سیر سپاٹے ...ان فلارنس نے مجھ سے بہت کچھ کہا، مثلاً...

ایک ادھیڑ عمر امریکی خاتون پلازا سینیورا میں نصب ایک برہنہ دیوتا کے مجسّمے کو سامنے ...دیکھے چلی جا رہی تھی۔ اُس کے چیونگم چباتے، جمائیاں لیتے بڈھے کھوسٹ خاوند نے تنگ ...پوچھا "آخر تم اتنی دیر سے کیا دیکھ رہی ہو؟"

بڑھیا بولی "ڈارلنگ میں دیکھ رہی ہوں کہ تم میں کون کون سی کمی تھی اور کہاں ...ہاں..."

ایک فلارنسی کلنک سے نکلتے ہوئے اپنی بیوی سے کہہ رہا تھا "قدرت شفا دیتی ...ہے اور ڈاکٹر اُس کے پیسے وصول کر لیتے ہیں۔"

...ویا پیکوری کے ایک قہوہ خانے میں کھانے کے ہمراہ مجھے دو گلاس دُودھ ...لاتے ہوئے ایک ویٹرس دیکھتی ہے اور کہتی ہے "کیا تم آج اپنی پانچویں سالگرہ منا رہے ہو؟"

...ویا ڈی نیری میں سے گزر رہا تھا تو ایک فلارنسی سڑک کے پتھروں کے بیچ میں ...پھوٹتی ہوئی ایک ننھی مُنّی کونپل کو بڑے اہتمام سے پانی دے رہا تھا۔ میں کھڑا ہو کر ...دیکھنے لگا۔ "میں جاننا چاہتا ہوں کہ یہاں کیا چیز جنم لے رہی ہے... زندگی۔"

آرنو کے کنارے ایک نوجوان بنسی ڈور پانی میں ڈالے اُونگھ رہا تھا۔ سڑک پر سے ...ایک راہرو دوشیزہ نے اُس پر کنکر پھینکا اور ہنستے ہنستے دوہری ہو گئی۔

"کیوں ہنستی ہو؟" نوجوان نے جھلّا کر پوچھا۔

"اگر تم یہاں وہیل مچھلی کے انتظار میں بیٹھے ہو تو وہ آرنو میں نہیں ہوتیں۔" لڑکی ...نے نعرہ لگایا۔

"اچھا۔" اُس نے کمال سنجیدگی سے سر ہلایا اور بنسی ڈور اُٹھا کر چُپکے سے چلا گیا۔

...ہاں فلارنس مجھ پر اثر انداز ہو رہا تھا۔ چنانچہ تیسرے روز میں نے بڑے اہتمام ...سے شیو بنائی، سیّاحوں کی وردی یعنی جین جیکٹ زیبِ تن کی اور بغل میں کتابچے اور

اور نقشے دبا کر ایک شریف النسل ٹورسٹ کی طرح اطالیہ کے تاریخی شہر فلارنس میں گھومنے لگا۔

"تین سو لیرے..." نیشنل میوزیم کے باوردی دربان نے ٹکٹ کاٹنے سے پیشتر فیس داخلہ سنائی۔

میں پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ ابھی مجھے درجن بھر آرٹ گیلریوں اور دیگر قابلِ دید مقامات کی خاک چھاننا تھی اور اگر ہر مقام پر خانہ بدوشی خزانے پر یونہی بوجھ پڑتا رہا تو قلتِ زر کا شدید خدشہ تھا... میں پھر آگے بڑھا، سودے بازی کی جائے۔

"تین سو لیرے کچھ بہت سارے نہیں ہیں؟"

"اندر تصویریں اور مجسّمے بھی تو بہت سارے ہیں۔" دربان یوں بے رُخی سے بولا جیسے درِ محبوب پر کھڑا ہو۔

دو ٹورسٹ لڑکیاں جو میرے سامنے ٹکٹ خرید کر اندر گئی تھیں، جلد ہی باہر آگئیں۔

"کیا اندر جو کچھ ہے وہ تین سو لیرے کا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تین لیرے کا بھی نہیں۔" وہ متوجّہ ہوئے بغیر چلی گئیں۔

میں نے بال پوائنٹ سے سیاحتی کتابچے میں درج نیشنل میوزیم کے آگے کراس لگا دیا... دیکھ لیا۔ اب "اکیڈمی" کی باری تھی جہاں مائیکل انجلو کے تراشیدہ اور نیم تراشیدہ مجسّمے محفوظ تھے... اور ہاں ڈیوڈ بھی تو تھا۔

"اکیڈمی" کی عمارت کا آغاز پلازا بیلے آرتی سے ہوا، پلازا مارکو تک چلی گئی اور وہاں سے دائیں ہاتھ مڑ کر پلازا انن زی آٹا تک پہنچ گئی مگر داخلے کا دروازہ کہیں دکھائی نہ دیا۔ میں پھر اپنے نقشِ پا کو گھراکرتا واپس پلازا بیلے آرتی میں آ گیا مگر داخلے کی کوئی صورت نظر نہ آئی البتہ نیشنل میوزیم کے باہر نظر آنے والی دونوں

...دہ تیں پھر نظر آگئیں۔

ان میں سے ایک جو قدرے زیادہ بیزار تھی میرے پاس آگئی۔ "ہو سکتا ہے جانتے ہوں کہ اکیڈمی کے اندر جانے کا راستہ کہاں پر واقع ہے..."

"میرا خیال ہے اندر صرف دیوار پھلانگ کر ہی جایا جا سکتا ہے..." میں نے بھی بڑی بیزاری سے جواب دیا۔

"اوہ"۔ دوسری جو صرف نیم بیزار تھی بولی۔ "آپ کو بھی نہیں مل رہا؟"

"نہیں..."

"تو پھر مل کر تلاش کریں۔"

ہم پانی پیتے بگلوں کی طرح مُنہ نیچے کر کے نقشے پر گلی یا چوک کا نام دیکھتے پھر بُوتھی اُٹھا کر اُسے تلاش کرتے، اور یہ کرتے کرتے گردنیں ہلاتے پلازا مارکو میں پہنچ گئے۔

"میرا خیال ہے کہ اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے "اکیڈمی" کو بھول کر کسی فضول موضوع پر گفتگو کریں اور پھر دوبارہ تلاش شروع کر دیں تو زیادہ بہتر ہو گا..." ...بیزار تھکی تھکی سی بولی۔

"مثلاً کونسے فضول موضوع پر؟"

"مثلاً یہ کہ تم بتاؤ کہ تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟"

میں نے مختصراً اپنی عمر، نام اور قومیت کے کوائف پیش کئے۔

"میں وینڈی ہوں۔" نیم بیزار بولی "اور یہ میری دوست جینیفر ہے اور ہم دونوں ...میں انگریزی پڑھاتی ہیں... اور کیا یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ ہم امریکی ہیں..."

...ن ہے، کیونکہ میں نے آج تک اتنی بیزار امریکی لڑکیاں نہیں دیکھیں..."

اس فقرے پر مکمّل بیزار نیم بیزار میں بدل گئی اور نیم بیزار قدرے خوشگوار ہو گئی۔

"تُم نے صبح سے کتنے عجائب گھر اور آرٹ گیلریاں دیکھی ہیں؟"

"نیشنل میوزیم مہنگا بہت تھا اور اکیڈمی کا دروازہ نہیں مل رہا اس لئے فی الحال ایک بھی نہیں ۔"

"ہم اب تک چھ میوزیم اور چار کلیسا دیکھ چکی ہیں ... کیا تمہیں اب بھی حیرت ہے کہ ہم اتنی بیزار کیوں نظر آتی ہیں؟"

"آپ کو کس حکیم نے کہا تھا کہ اتنے میوزیم اور کلیسا ضرور دیکھیں؟"

"اس کتابچے نے کہا تھا۔" وینڈی نے مزید خوشگواری سے کہا۔"اس گائیڈ بک میں لکھا ہے کہ ان قابلِ دید مقامات کی دید کے بغیر فلارنس کی سیر نامکمل ہوگی... اور اگر ہم مائیکل انجلو کا ڈیوڈ اور دوسرے مجسّمے نہ دیکھ سکے تو واقعی یہ سیر نامکمل ہوگی.. آؤ پھر دروازہ ڈھونڈتے ہیں..."

ہم پھر پانی میں چونچیں ڈبوتے بگلوں کی طرح اپنے اپنے نقشوں میں ناکیں ڈبو ڈبو کر چلنے لگے۔

سنِ بلوغت میں قدم رکھنے والی اکثر لڑکیاں قدرے بے ڈھنگی اور بے زاویہ سی ہو جاتی ہیں۔ جینیفر نے مجھے یقین ہے کہ اس سمت میں کئی قدم رکھے ہوں گے مگر پھر بھی وہ شکل سے قدرے کچّی سی لگتی تھی اور اُس کی سُرخ ناک دیکھ کر اُسے رُومال پیش کرنے کی خواہش سر اُٹھاتی تھی۔ وہ پھیکی پڑتی ہوئی جین اور مختصر بلاؤز میں تھی اور ہر وقت ایک ہتھیلی پُشت پر رکھ کر چلتی تھی... وینڈی عام امریکی لڑکیوں کی نسبت چھوٹے قد کی تھی۔ چمڑے کی جیکٹ، سیاہ جین اور سیاہ بالوں میں وہ ایک گول چہرے والی لڑکی تھی جو حسین تو نہ تھی مگر جسے صنفِ مخالف کی توجّہ حاصل کرنے کے لئے ہرگز تردّد نہیں کرنا پڑتا تھا کہ وہ جیکٹ میں جتنی تھی، اُس سے زیادہ باہر تھی اور بہت تھی۔

جینیفر نے اپنی ہِپ پاکٹ سے ایک گائیڈ بک نکالی اور صفحے اُلٹنے لگی۔ "نوجوان مائیکل انجلو کے اُستاد نے کہا کہ اگر تم ایک پتھر کاٹنے والے کی بجائے ایک بُت تراش بننا چاہتے ہو تو سب سے پہلے انسانی بدن کو جانو۔ اُن دنوں علمِ بدن پر لکھی ہوئی کتابیں

ہونے کے برابر تھیں۔ چنانچہ وہ ایک شب باورچی خانے کی چھُری لبادے میں اُڑس کر سانتو سپرتو کی دیوار پھاند کر اُس تہہ خانے میں چلا گیا جہاں گداگروں کی لاشیں رکھی ہوتی تھیں..."

"لاشیں؟" وینڈی نے تھوک نگلی۔

"ہاں، اور اُس نے تازہ ترین لاش کو چھُری سے چاک کیا اور ایک موم بتّی کی روشنی سے خون آلود اندرونی اعضاء کا مطالعہ کرنے لگا..."

"پلیز جینیفر میرا دل اُلٹ رہا ہے۔" وینڈی نے مُنہ پر ہاتھ رکھ کر اُبکائی کو روکا۔

مگر جینیفر کہاں ماننے والی تھی، اُستانی تھی، لیکچر جاری رکھا۔"مائیکل انجلو ہر رات سانتو سپرتو میں چوری چھُپے داخل ہوتا اور علمِ بدن کا ایک اور باب ذہن نشین کر کے موت کی بُو اپنے پیراہن میں لیے گھر واپس آجاتا اور کاغذ پر انسانی رگوں، نسوں اور شریانوں کی تصویریں بنا کر اُسے محفوظ کر لیتا۔ ایک شب اُس کے والد نے اُسے خون آلود کپڑوں اور چھُری سمیت گھر لوٹتے دیکھا تو اُسے یقین ہو گیا کہ نوجوان مائیکل کسی کو قتل کر کے آیا ہے... اُدھر شہر میں دُھوم مچ گئی کہ کوئی شخص گداگروں کی لاشیں پھاڑ کر پتہ نہیں کیا کرتا ہے..."

"کیا مائیکل انجلو کے بارے میں کوئی خوشگوار قسم کی معلومات نہیں ہیں اس گائیڈ بک میں؟" وینڈی نے تنگ آکر پوچھا۔

"میں تو صرف یہ بتانا چاہتی تھی کہ بے چارے مائیکل نے علمِ بدن کس مصیبت سے حاصل کیا..."

حالانکہ یہ علم حاصل کرنے کا ایک اور آسان طریقہ بھی تھا..." میں نے لُقمہ دیا۔

"وہ بُت تراش تھا، کاسانووا نہیں۔" جینیفر نے سُرخ ناک چڑھائی۔"اور کیا یہ حیرتناک بات نہیں کہ اُس نے اپنے مشہور مجسّمے "پائتا" یعنی سوگواری میں حضرت عیسیٰؑ کے چہرے کے لئے ایک نوجوان یہودی کو ماڈل بنایا تھا؟"

"میں نے "پائتا" دیکھا تھا۔ روم میں، سینٹ پیٹرز کے آسمانی گنبد تلے چھائی نیم تاریکی میں ایک ماں... بی بی مریم، اپنے بیٹے... عیسےٰ کی لاش گھٹنوں پر بچھائے سر جھکائے سوگوار۔ بے جان بازو لٹکے ہوئے اور عالمِ فنا کی تمام آخرت رگوں اور جسم میں ٹھہری ہوئی۔

بی بی مریم کے سینے پر اطالوی زبان میں ایک عبارت کندہ تھی۔

پیٹر لتوجی نے بتایا کہ مائیکل انجلو نے ایک گمنام تخلیق کار کی حیثیت میں "پائتا" کو دو برس کے عرصے میں تراشا اور پھر ایک رات چپکے سے سینٹ پیٹرز کے ہال میں رکھ دیا۔ اگلی صبح اس شاہکار کی سوگواری نے زائرین کو اپنی طرف بلایا۔ وہ کہتے، ہاں یہ تو روم کے فلاں مجسمہ ساز کی تخلیق لگتا ہے، یہ تو وینس کے فلاں بُت تراش کا ہاتھ ہے۔ ایک ستون کے پیچھے پوشیدہ مائیکل انجلو پیچ و تاب کھاتا رہا اور سارا دن لوگ اس کے مجسمے کو معروف بُت تراشوں کی تخلیق قرار دیتے رہے۔ اُس رات اُس نے ہتھوڑا اور چھینی اُٹھائے اور اس مکمل مجسمے کے سینے پر یہ الفاظ کھود دیئے "مائیکل انجلو بوناروتی نے تخلیق کیا جو فلارنس کا باشندہ ہے"... اور وہ اس قسم کی حرکتیں بعد میں بھی کرتا رہا۔ اُس نے پوپ جولیئس کے مقبرے میں رکھے گئے حضرت موسےٰ کے مجسمے کو بھی ہتھوڑی مار کر کہا تھا "تم ہی تو مکمل موسےٰ ہو، بولتے کیوں نہیں" حضرت موسےٰ کے گھٹنے پر آج بھی اس ضرب کا نشان موجود ہے۔

ایک ادھیڑ عمر کی امریکی عورت، کھلے پھولدار فراک میں مٹکتی ہوئی، کیمرہ گلے میں، ہاتھ میں گائڈ بک اور آنکھوں پر سنہری فریم کی عینک، ہمیں بھٹکتے ہوئے دیکھ کر سیدھی ہماری طرف آئی "کیا تم ڈیوڈ کو ڈھونڈ رہے ہو؟"

"کونسا ڈیوڈ؟" ہم نے سمجھا مائی کسی گمشدہ بچے کے بارے میں پوچھ رہی ہے۔

"وہی مائیکل انجلو والا۔" اُس نے بے پناہ مسرت سے اپنی پوری نقلی بتیسی ہمیں دکھائی۔

"ہاں۔" ہم نے فوراً سر ہلائے۔

"تو اس برآمدے میں چلے جاؤ، دائیں طرف مڑو گے تو وہاں داخلے کا دروازہ ہے۔"

"ہم تو اس برآمدے کے قریب سے دسیوں مرتبہ گزر چکے ہیں..."

"اندر جاؤ ناں... ڈیوڈ ابھی وہیں کھڑا ہے۔"

ہم "اکیڈمی" کے اندر داخل ہوئے تو ڈیوڈ واقعی وہیں کھڑا تھا بلکہ پچھلے کئی سو برسوں سے وہیں کھڑا تھا۔

ڈیوڈ کو دیکھنے کے لئے دستار تھامنی پڑتی ہے۔ وہ مجسموں کا اہرام تھا۔ اُس کا ...ٹکوہ برف پوش کوہِ آرارات کی پہلی جھلک تھا۔ سربلند، سفید اور آپ پر چھاتا ہوا، ...یٹ میں لیتا ہوا، لیکن ایک فرق کے ساتھ کہ نہ تو اُس کی تخلیق میں لاکھوں غلاموں ...ے پسینے تھے اور نہ ہی وہ قدرت کا ایک مظہر تھا... اُسے صرف ایک انسان مائیکل انجلو ...ے اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا... میں نے ڈیوڈ کو اُن مناظر میں شامل کر لیا جو صرف مجھ ایسے خانہ بدوشوں کے لئے ہی تخلیق کیے جاتے ہیں۔ عام طور پر خدا کی جانب سے اور ایک بار مائیکل انجلو کی طرف سے۔

اُن دنوں مصوّر لیونارڈو ڈی ونچی فلارنس کے ایک تاجر گیاکاندو کی چوبیس سالہ ...یوی کی تصویر بنا رہا تھا جو بعد میں اُس کے نام سے زیادہ مشہور ہوئی، مونا لیزا۔ ایک ...ملاقات کے دوران اُس نے مائیکل انجلو کو حقارت سے کہا "بُت تراش تو پتھر کاٹنے ...والے ہوتے ہیں۔ یہ ایک مشقتی سا کام ہے، تخلیقی نہیں۔" مائیکل انجلو نے سوچا ایک ...روز میں ڈی ونچی کو یہی الفاظ واپس لینے پر مجبور کر دوں گا... اُس نے دو ہزار ...پاؤنڈ وزنی سنگِ مرمر کا ایک تودہ منتخب کیا اور اُس میں سے ڈیوڈ کو نکالنے کے لئے ...بیس گھنٹے روزانہ کام کرنے لگا۔ وہ ستائیس برس کا تھا، ڈیوڈ مکمل ہوا تو وہ تیس ...برس کا ہو چکا تھا۔ اس عظیم الشان مجسمے کو ایک پلیٹ فارم پر رسّوں سے باندھ کر ...مائیکل انجلو کے گھر سے پلازا سنیورا تک لانے میں چار دن لگے۔ اہلِ فلارنس نے اسے ...ہرکولیز کے مجسمے سے بھی عظیم قرار دیا اور لیونارڈو ڈی ونچی نے بھی گردن جھکا لی۔

...ایک خانہ جنگی کے دوران ڈیوڈ کا بایاں بازو ٹوٹ گیا اور پھر اسے اس "اکیڈمی"

میں محفوظ کر لیا گیا۔

ہم سب سنگِ مرمر کے اس دیوزاد مجسّمے کے گرد گھومتے ہوئے گردنیں اُٹھائے اس کی کشش کو محسوس کرتے رہے۔ اتنا زندہ اور دھڑکتی ہوئی رگوں والا تنا ورجسم۔

"اس کے بازو عام انسانوں سے زیادہ لمبے نہیں ہیں؟" جینیفر مُنہ اُٹھائے کولہوں پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

"تمہیں کسی اور حصّے کی لمبائی پر بھی اعتراض ہو تو وہ بھی بتا دو۔" وینڈی چڑ کر بولی۔ "مائیکل انجلو نے جان بوجھ کر بازو لمبے بنائے تھے کیونکہ ڈیوڈ کی تمام تر طاقت اُس کے بازوؤں میں تھی۔ گولائتھ کو یونہی تو زیر نہیں کر لیا تھا اُس نے۔"

مجھے پہلی مرتبہ احساس ہُوا کہ "ڈیوڈ" تو دراصل اپنے حضرت داؤد ہیں۔

"اکیڈمی" میں اکلوتا ڈیوڈ ہی نہیں تھا اور مجسّمے بھی تھے مگر وہ سب ڈیوڈ سے عُمر میں پینتالیس برس بڑے تھے... مائیکل انجلو بوڑھا ہُوا تو اندھا بھی ہو گیا مگر پتھروں سے جدا نہ ہُوا۔ اُس کا کہنا تھا کہ جب میں سنگِ مرمر پر وار کرتا ہوں اور اُس میں سے اُٹھنے والی سفید دُھول میرے نتھنوں میں جاتی ہے تب میں سانس لیتا ہوں۔ آخری عمر میں وہ ایک اور "پائتا" بنانا چاہتا تھا... ایک مجسّمہ میری میگڈالن کا ہے جس نے حضرت عیسیٰ کے ہاتھ پر گناہوں سے توبہ کر کے معصومیت اختیار کی۔ وہ اپنے پیغمبر کو سُولی سے اُتار رہی ہے۔ یوسف پاس کھڑا ہے اور مائیکل انجلو نے یوسف کے رُوپ میں اپنی شباہت تراشی ہے۔ عمر رسیدہ اور اندھا۔ اُس کا آخری مجسّمہ "قیدی" بھی یہیں رکھا ہُوا ہے۔ ایک زور آور جسم پتھر میں سے نکلنے کی کوشش میں۔ کوشش اس لئے کہ اس سے پیشتر کہ مجسّمہ پتھر کی گرفت سے آزاد ہوتا، مائیکل انجلو نوّے برس کی عُمر میں خود زندگی سے آزاد ہو گیا... "قیدی" اُسی طرح ادھورا پڑا ہے۔ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ کو سُولی سے اُتارنے والے مجسّمے کو ایک روز مائیکل انجلو نے ٹٹولا تو اُس کی کھُردری تراش پر آبدیدہ ہو کر ہتھوڑا ہاتھ میں پکڑ لیا کہ میں اسے توڑ ڈالوں گا مگر

اہلِ فلارنس نے اُس کے بازو تھام لئے... یہ مجسّمے اُس کی اندھی بے بسی کا آخری نقش ہیں۔

ہم اکیڈمی سے باہر آئے تو سر جُھکا کر چل رہے تھے، ڈیوڈ کو دیکھ دیکھ کر ہماری گردنیں تھک چکی تھیں اس لئے۔

"مائیکل انجلو کے مجسّموں کے بعد اُس کے گھر جانا چاہیئے۔" وینڈی نے گائڈ بُک کی ہدایت پڑھی۔

"کیا اُس نے تمہیں بُلایا ہے؟" جینیفر نیم بیزاری نے پہلی مرتبہ مُسکرا کر پُوچھا۔ "بن بُلائے کسی مرد کے گھر چلے جانا خلافِ آداب ہے۔"

وینڈی گائڈ بُک کے مطالعے میں مگن تھی چونک کر بولی۔ "مجھے پیدا ہونے میں ساڑھے چار سو برس کی تاخیر ہو گئی ہے ورنہ وہ مجھے بُلا بھی لیتا۔"

مجھے فوراً احساس ہُوا کہ ہماری رفاقت صرف "اکیڈمی" ڈھونڈنے کی خاطر قائم ہوئی تھی اور اب میں بھی بن بلائے اُن کے ساتھ نتھی ہُوا چلا جا رہا تھا۔ "خواتین کبھی سیانے نے کہا تھا کہ دو شخص رفاقت ہوتے ہیں اور تیسرا آ جائے تو پھر ہجوم بن جاتا ہے..."

جینیفر نے پُشت پر جمے ہاتھ کو بے دھیانی میں ہٹایا اور کہنے لگی۔ "تو میں چلی جاتی ہوں"... صاف ظاہر تھا کہ ایک مرد کی موجودگی میں خاموشی کے باوجود لڑکیوں کے درمیان جو ایک مسلسل رابطہ قائم رہتا ہے کہ یہ حضرت کیسے ہیں، اگر پسند ہیں تو بے شک لے جاؤ یا پھر میں آگے ہو جاتی ہوں میں جینیفر نے ریٹائر ہونے کا اعلان کر دیا تھا اور مجھے بخوشی وینڈی کے کھاتے میں ڈال دیا تھا۔

"اوہ جینیفر..." وینڈی کی نظریں اُس کی پُشت پر تھیں۔

"اوہ سوری..." جینیفر کا ہاتھ پھر سے پُشت پر جم گیا۔

"ویسے اگر تمہیں کوئی اور مصروفیت نہیں ہے تو بے شک ہمارے ساتھ چلے آؤ..." وینڈی نے سنجیدگی سے مجھے دعوت دی۔ "ہم اکیلی ہوتی ہیں تو کوئی نہ کوئی

فلارنسی لفنگا ہمارے گرد منڈلاتا رہتا ہے، تم کم از کم اُن سے تو بہتر ہو۔"

"بہت بہت شکریہ میڈم"۔ میں نے جُھک کر کہا۔ "آپ بے حد توصیفی موڈ میں ہیں۔"

"اکیڈمی" کی طرح مائیکل انجلو کا گھر تلاش کرنے میں بھی خاصی دِقت پیش آئی۔ وِیا بونوراتی میں جس کسی سے پُوچھتے کہ جناب یہاں مائیکل انجلو کا گھر کدھر ہے تو وہ کندھے سکیڑ کر پُوچھتا۔ "آہ... بونیتو؟" ہم کہتے کہ بھئی بونیتو نہیں چاہیئے، مائیکل انجلو چاہیئے۔ یہ مشکل بھی ایک اور امریکی ٹورسٹ نے حل کی۔ معلوم ہُوا کہ اہلِ فلارنس مائیکل انجلو کو صرف بونیتو کے نام سے پکارتے ہیں اور اُس کا گھر "کاسا ڈی بونیتو" کہلاتا ہے۔

دروازے کے عین اُوپر مائیکل انجلو کا ایک چھوٹا سا مجسمہ نصب تھا۔ گھر قدیم وضع کا تھا مگر پانچ سو سال پُرانا ہرگز نہ لگتا تھا، باہر ایک سکوٹر کھڑا تھا۔

"وہ اندر ہی ہے۔" وینڈی ہنسی۔ "باہر سکوٹر جو کھڑا ہے۔"

گھر کا دروازہ مقفل تھا، داخلے کے اوقات ختم ہو چکے تھے۔

"اب کس کے گھر جانا ہے؟"

"دانتے کے۔" جینفر بولی۔

"اور وہ کہاں رہتا ہے؟"

"وِیا دانتے اَل میں۔"

میں پچھلی شب یہاں آ چکا تھا مگر تب صرف ویرانی تھی اور اب صرف ٹورسٹ تھے۔ فلارنس کی دیگر رہائش گاہوں کی طرح پتھروں سے بنا ہُوا ایک قدیم گھر جس میں متعدد گیلریاں تھیں اور بے شمار ٹورسٹ تھے۔ اطالوی ادب کے باوا آدم دانتے کے مسوّدے شو کیسوں میں محفوظ تھے جن میں "ڈیوائن کامیڈی" کے اوراق بھی تھے۔

باہر جانے لگے تو دروازے کے ساتھ میز پر سکیچ اور کتابیں سجائے ایک شریف قسم کا بوڑھا بیٹھا ہُوا تھا، ہمیں دیکھ کر چوکنا ہو گیا۔ "کیا آپ دانتے کے گھر کا سکیچ خریدنا پسند کریں گے؟"

"کتنے کا ہے؟" جینفر کی نگاہوں میں پسندیدگی تھی۔

"سات سو لیرے کا..." بوڑھا بولا۔ جینفر ٹھنڈی ہو گئی۔

"دانتے کے گھر کا ہے..." اُس نے ہم تینوں میں سے صرف جینفر کو مخاطب کرنا مناسب جانا۔

"قیمت بہت زیادہ ہے۔"

"کم بھی ہو سکتی ہے۔" بوڑھا جینفر کی طرف ہی دیکھتا رہا۔ "بلکہ مُفت بھی مل سکتا ہے، سات بجے آ جانا۔"

"لیکن سات بجے تو یہ گھر بند ہو جاتا ہے۔"

"اسی لئے تو کہہ رہا ہوں..." بوڑھے کی کمر سیدھی ہو گئی۔ "میں یہیں ہوں گا، خلوت رہے گی۔"

جینفر نے زیرِ لب "ڈرٹی اولڈ مین" کے الفاظ کہے۔ میں بھی مُسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ بُڑھا تھا مگر دل جوان رکھتا تھا۔

"کیا کہا؟" اُس نے اپنے نیم بہرے کان کے آگے ہاتھ رکھ کر پُوچھا۔

"جو کچھ بھی کہا ہے اطالوی میں نہیں تھا..." جینفر ایک بوڑھے کے مائل ہونے پر بے مزا تو ہو رہی تھی مگر لُطف بھی لے رہی تھی۔

"اگر اطالوی میں کہتیں تو میں نثار ہو جاتا۔" بُوڑھا بلا جھجک فلرٹ کر رہا تھا۔ "اطالوی تو دُنیا کی سب سے میٹھی زبان ہے۔ ایک ہاپسبرگ بادشاہ نے کہا تھا کہ وہ خدا سے ہسپانوی زبان میں بات کرتا ہے، مردوں سے فرانسیسی میں، گھوڑوں سے جرمن میں اور عورتوں سے... اطالوی میں۔"

جینفر نے پھر زیرِ لب کچھ کہا۔

"کیا کہا؟" بُوڑھے نے پھر پُوچھا۔

"میں نے تم سے جرمن میں بات کی تھی۔" جینفر ناک چڑھا کر بولی۔

"آہا... تم میں حسِ مزاح موجود ہے... بُوڑھا ہنسنے لگا۔" مگر سوچ تو سہی کہ دانتے کا گھر اور خلوت... اور میں تم سے اطالوی میں باتیں کروں گا اور بائرن نے کہا تھا کہ اطالوی مُنہ سے یوں بہتی ہے جیسے کسی حسینہ کے مُنہ سے بوسے..."

ہم باہر نکلے تو جینفر بے حد اپ سیٹ تھی اور اسی پریشانی میں اُس نے پُشت پر رکھی ہتھیلی ہٹالی۔

"جینفر..." وینڈی نے اُسے فوراً ڈانٹا، ہتھیلی واپس چلی گئی۔

"ایک لڑکی کو ایک دن میں اور کیا چاہیئے..." جینفر کی مکمل بیزاری لَوٹ آئی "درجن بھر میوزیم اور ایک بُوڑھا عاشق... میں واپس جا رہی ہوں، تم آجانا..." اس سے پیشتر کہ وینڈی لب کھولتی وہ پاؤں پٹختی ہوئی چل دی۔ اُس کا ہاتھ بے دھیانی میں پھر نیچے ہوگیا۔

"جینفر"۔ وینڈی نے زور سے پُکارا مگر وہ اُس کی آواز کی حدود سے نکل چکی تھی۔

اب وینڈی جھینپتی ہوئی مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "بے چاری جینفر، آج صُبح اُس نے اپنی جین کو ذرا بوسیدہ بنانے کی خاطر پُشت پر سے ایک چوکور ٹکڑا کاٹا اور اُس پر ایک سُرخ پیچ لگا دیا۔ پلازا سائیو نورا میں پہنچ کر احساس ہُوا کہ اطالویوں کا ایک ہجوم ہمارے پیچھے پیچھے چلا آرہا ہے اور وہ سب مُسکرا بھی رہے تھے۔ معلوم ہُوا کہ جینفر کا چسپاں کردہ پیچ کہیں گر چکا ہے اور جین کے چوکور سُوراخ میں سے تھوڑی سی جینفر نظر آرہی تھی چنانچہ بے چاری صُبح سے اُس پر ہاتھ رکھے گھُوم رہی تھی۔"

ہم چلتے ہوئے آرنو کے ڈھکے ہوئے پُل "پونتے وکیو" پر آگئے۔

مائیکل انجلو کے زمانے میں اس پُل پر قصابوں کی دُکانیں ہُوا کرتی تھیں پھر میڈیچیوں نے پیلازا سائنوریا کا محل چھوڑ کر دریا پار ایک وسیع رہائش گاہ تعمیر کی تو انہیں اس پُل پر سے گزرتے ہوئے گوشت کی بُو ناگوار گزرتی چنانچہ اُن کے حکم سے قصاب نکالے گئے اور یہاں ایسی دُکانیں ظہور میں آئیں جن کی مصنوعات صرف امیر لوگوں کو خوشبو دیتی ہیں۔

سونے اور چاندی کی مصنوعات شوکیسوں میں سنہری تیندوے، مچھلیاں اور دریائی گھوڑے سجے تھے۔ دانتے کی جنّت کے ننھے مُنّے طلائی فرشتے اور جہنّم کے سُرخ زبانوں والے شیطان۔ میں نے ایک شیطان کی قیمت دریافت کی تو وہ میرے تمام تر سفری اخراجات سے بھی تجاوز کرتی تھی۔ شیطان ہمیشہ مہنگے بکتے ہیں۔

دریا کے پار ایک طویل چڑھائی تھی جس کے آخر میں پٹّی پیلیس کھڑا تھا۔ ہم ہانپتے ہوئے وہاں تک پہنچے تو معلوم ہُوا کہ مرمتیں ہو رہی ہیں، بند ہے۔

شام قریب تھی، پونتے وکیو کی دُکانوں کا عکس پانی میں منتقل ہونے کو تھا۔ پٹّی پیلیس کے ایک کھمبے سے ٹیک لگا کر وینڈی نے اپنی گائڈ بُک نکالی۔ "اب صرف باپتستری، ڈومو کا کلیسا اور اوفیزی آرٹ گیلری باقی رہ گئے ہیں جو ہم کل دیکھیں گے۔"

"ہم؟"

"ہاں، کیوں نہیں۔ تم یقیناً ایک اطالوی لفنگے سے بہت بہتر ہو۔" اُس کی آنکھیں رفاقت کو طول دینے کی خواہش میں تھیں۔

"جینفر بھی آئے گی؟"

"تیسرا شخص ہجوم ہوتا ہے۔"

"چلو میں تمہیں واپس شہر چھوڑ آتا ہوں۔"

"میں شہر میں نہیں، اُدھر کیمپنگ میں رہتی ہوں۔"

"کیمپنگ مائیکل انجلو میں؟"

"ہاں۔"

"میں بھی تو وہیں ہوں۔" میں نے ایک حیرتی مسکراہٹ سے کہا۔

"اچھا؟" اُس کی مسکراہٹ ایکدم سمٹ گئی۔ "لیکن میں ابھی واپس نہیں جانا چاہتی مجھے شہر سے ٹوتھ پیسٹ اور خوراک کے چند ڈبے خریدنا ہیں... کل پلازا سائنوریا۔

... دس بجے۔" اور وہ پٹی پیلس سے اُترتی سڑک پر سے اُتری اور پانتو ویکیو میں گم ہو گئی۔

ٹوتھ پیسٹ وغیرہ تو کیمپنگ کے سٹور میں سے بھی دستیاب ہو سکتی تھی میں نے سوچا۔ بہرحال ... اور پھر بس نمبر ۱۳ پر سوار ہو کر واپس کیمپنگ پہنچ گیا۔ خیمے کے باہر فلارنس اور اُس کے اندر صرف ڈومو کا روشن گنبد۔

رات کا کھانا میں نے کیمپنگ کے ریستوران میں کھایا اور پھر چند انگریز ٹورسٹوں کے ہمراہ پہاڑی کی چوٹی پر پھیلے پلازا مائیکل انجلو میں چلا گیا جس کے وسط میں "ڈیوڈ" کی ایک نقل ایستادہ تھی۔ یہاں سے فلارنس کا شہر تسکانی کی پہاڑیوں میں گھرا دکھائی دیتا تھا۔ پرے بلندی پر سان منیاتو کلیسا اور نیچے پٹی پیلس کی حفاظتی فصیل کا اژدہا آرنو کے کناروں پر لیٹا ہوا۔ فٹ پاتھ پر ہپیوں نے میکسیکن کھیس بچھا کر اُن پر اپنی دستکاریاں سجا رکھی تھیں۔ لوہے کے کنگن، بریسلٹ، موتی منکے، ایک جوڑے نے اپنے نوزائیدہ بچے کو فٹ پاتھ پر لٹا رکھا تھا... چوک میں روشنی کم تھی۔ میں نے ایک سٹال سے کافی خریدی اور گتے کے کپ میں سے محسوس ہوتی حدّت کو اُنگلیوں میں سموتا چسکیاں لینے لگا۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر ایک طویل قامت باریش نوجوان اور ایک چھوٹے قد کی بھری بھری لڑکی پتھریلی دیوار پر کہنیاں ٹکائے کھڑے تھے، وہ کبھی سرگوشیاں کرنے لگتے اور پھر کبھی فلارنس کی طرف دیکھتے ہوئے چُپ ہو جاتے... کافی ختم کر کے میں واپس کیمپنگ کی طرف اُترنے لگا... مجھے یونہی واہمہ سا ہوا کہ لڑکی کی پُشت وینڈی کی طرح تھی، شاید بال بھی۔ مگر اس واہمے میں مادۂ حسد کا ایک قطرہ بھی نہ تھا۔ ایک روز کی رفاقت جس میں آنکھیں ایک دوسرے پر ہونے کی بجائے مجسموں اور تصویروں پر تھیں، کسی جذبے کو جنم نہیں دے سکتی... میں نے خیمے کا پردہ گرایا، ڈومو اوجھل ہو گیا اور میں تھکاوٹوں کے بوجھ تلے آسودہ ہو کر سو گیا۔

.....

اطالوی شہروں کے مرکزی چوکوں کی مانند پلازا سائنوریا میں بھی بے شمار کبوتر پھڑپھڑا رہے تھے اور وینڈی اُن کے نیم سیاہ غول میں کھڑی سیٹیاں بجا رہی تھی۔

"ہیلو۔"

"ہیلو..." اُس نے کبوتروں کو متوجہ کرنے کے لئے ہتھیلی پھیلا رکھی تھی اور سیٹیاں بجا رہی تھی۔ "دیکھو یہ میرے قریب ہی نہیں آتے، میں نے ان کے لئے پچاس لیرے کا دانہ خریدا ہے اور یہ کھاتے ہی نہیں..."

"اگر یہ ہر ٹورسٹ کی ہتھیلی پہ بیٹھ کر دانہ چُگنے لگیں تو ایک گھنٹے کے اندر اندر بلاخوراکی کے باعث انتقال کر جائیں..."

"ہاں... تبھی اتنے موٹے اور بھدے ہو رہے ہیں..." اُس نے ہتھیلی سمیٹ لی اور اُسی لمحے ایک کبوتر اُس کے کندھے پر آ بیٹھا۔ وینڈی نے وحشت سے کندھا جھٹکا اور کبوتر اُڑ گیا۔ "میں پنجوں کو اپنے جسم پر برداشت نہیں کر سکتی..."

"کیا تمہیں اس کی عادت نہیں ہے؟" میرے لہجے میں پچھلی شب کا تشک بولا۔

"کیا مطلب؟" اُس نے میرا بازو تھام لیا۔ "مجھے اس قسم کے فقرے اچھے نہیں لگتے۔ ... اور تم بہت دیر سے آئے ہو..."

"اور میرا خیال تھا کہ تم آؤ گی ہی نہیں۔"

"کیوں؟" وہ میرا بازو چھوڑ کر سامنے آ گئی۔

"میرا خیال ہے کہ میں نے تمہیں کل رات دیکھا تھا۔"

"میں نے بھی تمہیں دیکھا تھا کافی پیتے ہوئے۔" وہ ایک گہرا سانس لے کر بولی۔ "اب میرے ساتھ تھا۔"

"اور یہ باب کون ہے؟"

"آؤ کہیں بیٹھتے ہیں۔"

کل دانتے کے گھر کے قریب ایک قہوہ خانہ نظر آیا تھا، اُسے تلاش کیا اور اندر چلے

گئے۔ ویٹر سے کافی لانے کو کہا تو وہ قدرے ناراض ہو گیا "سنیور آپ ٹورسٹ ہیں اور سرزمینِ شراب میں ہیں۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ اطالیہ کے سات فیصد حصّے پر صرف انگور کی کاشت ہوتی ہے...."

"بہرحال میں صُبح کے ساڑھے دس بجے صرف کافی ہی پیتا ہوں۔"

"تو پھر سنیوریتا کے لئے۔" وہ بانس کی ٹوکری میں پھنسی کیانتی کی ایک بوتل لے آیا۔ "یہ پرونتا بیرا ہے یعنی ایسی شراب جو جوانی میں پی جاتی ہے۔"

"تو یہ شراب تو اخلاقاً بھی مجھ پر حرام ٹھہرتی ہے۔ میں ایک عرصے سے تیس برس کا ہو چکا ہوں۔"

"نہیں سنیور۔" ویٹر نے سر ہلایا "جوانی سے مُراد شراب کی جوانی ہے، یعنی اسے تیار کر کے سٹور نہیں کیا جاتا بلکہ فوراً پی لیا جاتا ہے۔"

وینڈی نے ایک گھونٹ بھرا۔ "بڑی شدید جوان ہے، جسم کو فوراً گرفت میں لے لیتی ہے۔" وہ ہنسی اور پھر لب پونچھتے ہوتے بولی "باب اور میں سپین میں ایک ہی سکول میں انگریزی پڑھاتے ہیں۔ وہ بہت شفیق انسان ہے۔ میں اُس کے ساتھ محبت تو نہیں کرتی مگر اُس کے ہمراہ زندگی بسر کرنا میرے لئے ایک سکون آور تجربہ ہے۔ ہم اکٹھے سفر کر رہے ہیں اور جینیفر ہمارا ساتھ دے رہی ہے... باب کو گھومنا پھرنا زیادہ پسند نہیں، وہ صرف میرا ساتھ دینے کی خاطر سفر پر نکلا ہے۔ سارا دن دین میں بیٹھ کر مصوّری کی کتابیں پڑھتا ہے، شطرنج کھیلتا ہے اور اُس نے مجھ سے کبھی نہیں پُوچھا کہ تم کہاں تھیں، کس کے ساتھ تھیں اور عام طور پر میں جینیفر کی رفاقت میں ہی گھومتی رہتی ہوں۔ میں نے اُس کے ساتھ کبھی بے وفائی نہیں کی لیکن ہم شادی شدہ تو نہیں، آزاد فرد ہیں۔ ... اگر میں کسی کی رفاقت پسند کروں تو وہ مجھے روک تو نہیں سکتا..."

"کیا تم نے اُسے بتایا ہے کہ آج تم مجھے ملنے کے لئے شہر آئی ہو؟"

وینڈی نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ بہت شفیق انسان ہے، ظاہر نہیں کرے گا مگر

سے دُکھ ہو گا۔ میں خواہ مخواہ اُسے کیوں دُکھ دوں..."

"لیکن اس صُورتِ حال میں مَیں اپنے آپ کو کچھ کچھ مجرم سا محسوس کرنے لگوں گا..."

"لیکن کیوں؟" وینڈی نے میز پر تہہ شدہ میرے بازوؤں پر ہتھیلی رکھ دی۔

"میرے اندر کی مشرقیت مجھے بے چین کرتی ہے..."

"دیکھو بھائی پاکستانی... ہم کل ملے ہیں اور آئندہ کل تک ہمارے درمیان کے فاصلے سینکڑوں کلومیٹروں کے ہوں گے... تو پھر کیا فرق پڑتا ہے... اور ہم ایک دوسرے کے ساتھ محبت وغیرہ بھی تو نہیں کرتے... صرف رفاقت ہے ایک اور انسان کی..."

"بالکل درست۔" میں بھی نارمل ہو گیا۔ بلکہ کل اس وقت میں وینس کے کسی گنڈولے میں بیٹھا تمہاری یاد میں آہیں بھر رہا ہوں گا اور ڈائری نکال کر چیک کروں گا کہ خاتون کا نام وینڈی ہی تھا یا کچھ اور..."

"ہیں!" وہ چونک اُٹھی۔ "کل صُبح تو ہم بھی وینس جا رہے ہیں۔ اُس نے جلدی سے بالوں میں اُنگلیاں چلائیں اور پھر ماتھے پر ہتھیلی رکھ کر بولی۔ "تم ہمارے ساتھ ہی کیوں نہیں چلتے؟"

"نہیں میں ہچ ہائکنگ کے ذریعے سفر کرنا چاہتا ہوں..."

"دین میں بہت جگہ ہے اور ہم ویسے بھی راستے میں ہچ ہائکرز کو پک کرتے رہتے ہیں، ہمیں تمہاری کوئی تکلیف نہیں ہو گی..."

"اور باب کو؟"

"اُسے کہہ دوں گی کہ ایک خانہ بدوش قسم کا غریب پاکستانی ملا تھا اور مَیں نے اُسے وینس تک لفٹ دینے کی پیشکش کی ہے، اُسے شک بھی نہ ہو گا۔"

"بہت شفیق انسان ہے ناں بے چارہ اس لئے..."

"اوہ خدا کے لئے اس مشرقی موڈ سے نکل آؤ..." وہ بیزار ہو کر بولی۔ "اگر اتنی ہی سی بات کے لئے تمہارا احساسِ جرم اتنا شدید ہے تو خدا حافظ..."

"نہیں نہیں"۔ میں نے بات بگڑتے دیکھی تو ایکدم ہتھیار ڈال دیئے۔ "میں اتنا مشرقی بھی نہیں ہوں"۔

"تو پھر تم کل صبح دس بجے پانتو ویکیو پر پہنچ جانا، ہم تمہیں پک کر لیں گے..."

قہوہ خانے سے نکل کر ہم نے پھر ٹورسٹوں کی مقدس کتاب یعنی گائیڈ بک سے رجوع کیا۔ اب ہمیں باپتسری دیکھنا تھی جس کے ایک دروازے کی نقاشی سے متاثر ہوکر مائیکل انجلو نے کہا کہ اسے تو جنّت کا دروازہ ہونا چاہیئے۔

"جنّت کا دروازہ" اگر ہمارے ہاں ہوتا تو بہشتی دروازہ کہلاتا اور خاص و عام دھڑا دھڑ اس میں سے گزر کر "جنّت" کا ایک طرفہ ٹکٹ حاصل کر لیتے مگر یورپ والوں نے اپنے اس بہشتی دروازے کو بند رکھا ہے۔ شاید اُنہیں وہم ہے کہ صرف اعمال کے زور پر ہی انسان جنّت میں داخل ہو سکتا ہے۔ اس کے کواڑوں پر بائبل کی مختلف حکایتیں تصویروں کی صُورت میں اُبھری ہوئی ہیں۔ کُل چھ نقش تھے۔ وینڈی بائبل کے حوالے سے مجھے ان کی تفصیل بتانے لگی۔ ایک نقش کے بارے میں وہ فیصلہ نہ کر پائی کہ یہ کس کہانی کی ترجمانی کرتا ہے۔ چنانچہ اُس نے قریب کھڑے ہوئے ایک عمر رسیدہ امریکی سے مدد چاہی۔

امریکی نے ہماری طرف دیکھا اور اُس کی نگاہ وینڈی کی ان اُنگلیوں پر رُک گئی جو میرے بازو کو تھامے ہوئے تھیں۔ اُس کے چہرے کو کچھ ہوا اور وہ نقش کی تفصیل بتانے لگا "اس پر حضرت نوح کی حکایت بیان ہے کہ کس طرح وہ عظیم طوفان کے بعد ایک سرزمین پر اُترے۔ سب سے پہلے انگور کاشت کئے اور پھر اُن کا رس پی کر ایک خیمے میں جا لیٹے۔ اُن کا بیٹا ہَیم خیمے کے اندر گیا اور اپنے باپ کی برہنگی کو دیکھ لیا... بعد میں حضرت نوح نے بد دعا دی کہ ہَیم پر اَبد تک خدا کی پھٹکار ہو گی۔ تب اس خدائی پھٹکار کی وجہ سے ہَیم کا رنگ کالا پڑ گیا۔ تمام کالے لوگ ہَیم کی اولاد ہیں اور وہ ہمیشہ کے لئے خدا کے معتوب ہیں۔ ان سے نفرت بائبل کے عین مطابق ہے... اور کالے لوگوں سے میل ملاپ

ھنا بھی ایک گناہ ہے..." وہ سفید فام مذہبی مریض مجھے حقارت سے دیکھتا رہا اور ں چُپ رہا۔ مجھ پر، ایک کالی رنگت والے پر ہمیشہ کے لئے پھٹکار خدائی احکام جو تھے۔ ینڈی بھی چُپ تھی مگر اُس کے گال تمتما رہے تھے، بالآخر وہ غصّے کی شدّت کو نگلتے ہوتے شکل بولی۔ "تم جیسے لوگ کھُلے نہیں چھوڑنے چاہئیں، تم مریض ہو"۔ اُس نے میرے بازو ر اپنی گرفت مزید مضبوط کر لی اور ایڑیاں اُٹھا کر میرے گال پر بوسہ دیا۔ "دیکھو یہ کالا شخص مجھے پسند ہے اور میں ایک سفید فام امریکی ہوں"۔

ہمارے اردگرد لوگ جمع ہونے لگے۔ میں نے وینڈی کو بازو سے تھاما اور اُس کے کندھوں کو تھپکتا باہر لے آیا۔

"تم مجھے معاف کر دو..." وہ آبدیدہ ہو رہی تھی۔ "مجھے افسوس ہے کہ ہمارے ہاں اب بھی ایسے لوگ پائے جاتے ہیں"۔

"مذہب اور مقدس کتابوں کو نفرت اور تشدّد کے لئے استعمال کرنے والے لوگ ہمارے ہاں بھی کم نہیں... تم ملال نہ کرو"۔

وینڈی بہت دیر تک اپنے تپتے ہوتے رخساروں کو ایک ستون کے ساتھ لگائے کھڑی رہی اور خاصی دیر بعد نارمل ہوئی۔

اوفیزی آرٹ گیلری میں داخلہ مُفت ہونے کی بنا پر آج بے پناہ رَش تھا۔ ینڈی پر ابھی تک اس امریکی کے فقروں کی وحشت کا اثر تھا اور وہ دیواروں پر آویزاں وٹ چیلی، ریمبرانٹ، مائیکل انجلو اور رُوبنز کے شاہکاروں کو سرسری طور پر ہی دیکھے جا رہی تھی۔

"اوفیزی کی سب سے بڑی عمارتی خصوصیت اس کا مانومینٹل سٹیئر کیس ہے"۔ ہانے گائیڈ بک کا حوالہ دیا۔ "آؤ اس کو دیکھیں"۔

ساری آرٹ گیلری چھان ماری مگر اس عظیم الشان زینے کا سُراغ نہ ملا۔ ایک ہال ں داخل ہو کر ڈھیر ساری سیڑھیاں طے کر کے جب ہم ہانپتے ہوتے اُوپر پہنچے اور ایک

چوکیدار سے دریافت کیا کہ جناب یہ مانومنیٹل سٹیئر کیس کہاں پر واقع ہے؟ اُس نے ہماری پشت پر نگاہ کی اور اطمینان سے بولا۔ جناب آپ ابھی ابھی اُسے طے کر کے یہاں پہنچے ہیں اور اسی لئے ہانپ رہے ہیں“۔

اوفیزی کم از کم مجھے تو میڈرڈ کے پرادو، پیرس کے لُوور اور ایمسٹرڈیم کے رائک میوزیم کے ہم پلہ دکھائی نہ دی البتہ اس کی چھتیں انتہائی شاندار اور سنہری تھیں بیل بوٹے اور نقش پوشیدہ روشنیوں سے چمک رہے تھے۔

”یہ چھتیں لڑکیوں کے لئے ہنی مون منانے کے لئے نہایت موزوں ہیں“۔ میں نے مصنوعی بے دھیانی سے بات کر دی۔

”صرف لڑکیوں کے لئے ہی کیوں؟“ وینڈی اُوپر دیکھنے لگی۔

”اس لئے کہ وہ اس دوران صرف چھت کی طرف ہی دیکھ سکتی ہیں“۔

وینڈی قدرے تاخیر سے اس فقرے کے رموز سے آشنا ہوتی اور اُس کا چہرہ چین کی کسی زرد شہزادی کی طرح پیلا ہو گیا۔ پھر پیلاہٹ ہلکی سُرخی میں بدلی ”شرم“ اُس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔

اوفیزی سے نکل کر ہم فلارنس کی قدیم مارکیٹ میں گئے جو ایک فوّارے کی وجہ سے مشہور ہے جس میں ایک آہنی سوّر تھوتھنی اُٹھائے کھڑا ہے۔ میں نے ایک دکان سے گنڈولا ہیٹ اُٹھا کر پہن لیا۔

”احمق لگ رہے ہو“۔ اُس نے فوراً کہا۔ میں نے فوراً اُتار دیا۔

یہاں پر ہم نے اطالوی پیتزا کا لیس دار پنیر اور قیمے کا پراٹھا کھایا۔ کافی پی اور پھر اپنی گائڈ بکوں پر نگاہ ڈالی۔ چھوٹے موٹے دو تین چرچ چھوڑ کر صرف بڑا کلیسا رہ گیا تھا۔ کلیسا جس پر ”ڈومو“ تھا۔

کلیسا کے اندر ایک خلائی تاریکی تھی۔

کہیں دُور گنبد ایک موہوم گولائی تھی جو شاید تھی یا نہ تھی۔

ستون تھے۔

مجسمے تھے۔

فرش تھا اور اُس پر گھسٹتے قدموں کی خراش۔

دُور آلٹر پہ بے شمار موم بتیاں روشن تھیں۔

وینڈی مجھے چھوڑ کر آگے بڑھ گئی۔ پہلے تاریکی میں سایہ پھر موم بتیوں کے اُجالے میں داخل ہوتے ہی وہ بھی جھلملانے لگی۔ میں ایک قریبی چبوترے پر بیٹھ گیا۔ چبوترے کے ساتھ کچھ مجسمے ایستادہ تھے۔ فلارنس کی دھوپ داخلے کے دروازے میں سے آتے ہی فرش پر بجھ رہی تھی۔ صرف چند میٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ بھی کلیسا کی تاریکی میں تاریک ہو رہی تھی۔ ایک جانب روشن دھوپ دروازہ، دوسری طرف فاصلے پر جگمگاتا ہُوا آلٹر اور موم بتیاں روشن اور میں تاریکی میں گھرا قدموں کی چاپ سُنتا اور آس پاس چلتے ہیولوں کو دیکھتا... ایک گول مٹول گڈا پادری ہاتھ میں چندے کی صندوقچی تھامے بہت دیر تک کھڑا سکے چھنکاتا رہا کہ شاید اُن میں اضافہ کر کے اپنی عاقبت سنوار لوں اور پھر ڈولتا ہُوا کسی اور زائر کی طرف چلا گیا۔

وینڈی واپس آ رہی تھی۔ وہ میرے قریب پہنچی اور اُس کی آنکھیں تاریکی میں ہی بڑی ہو گئیں۔ ”شرم کرو تم مائیکل انجلو کی قبر پر بیٹھے ہوئے ہو“۔

”تم یقیناً مذاق کر رہی ہو، وہ تو روم میں فوت ہُوا تھا“۔

”ہاں مگر اُس نے وصیت کی تھی کہ اُسے بالآخر فلارنس میں دفن کیا جائے۔ وہ یہیں ہے، پتھر کی اس سِل کے نیچے جس پر تم بیٹھے ہو“۔

میرا جسم ٹھنڈا ہو گیا۔ سِل کی سردی موت بن کر شریانوں میں اُترنے لگی۔ میں اگرچہ بیکار ہوں مگر زندہ ہوں اور وہ عظمت کے باوجود مُردہ ہے اور اس زندگی کے بدلے میں اُسے پتھر کا چبوترہ سمجھ کر اُس پر بیٹھا رہا۔ فنا اور بقا... فنا کی عظمت

وقتی بقا کے پاؤں تلے تھی۔ شرمندگی کتنا چھوٹا لفظ ہے۔

"یہ دیکھو۔" وہ فرش پر بیٹھ کر اُس پر کندہ عبارت پر ہاتھ پھیرنے لگی جیسے کوئی نابینا بریل پڑھ رہا ہو۔ "مائیکل انجلو بُونا روتی اور اُوپر اُس کی یاد میں تین مجسمے۔ فنِ تعمیر، مصوری اور بُت تراشی کی دیویاں، اُس کی قبر پر جھکی ہوئی، نوحہ کناں..."

میں ساکن کھڑا رہا۔

"آؤ" اُس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

مائیکل انجلو کی قبر کے ساتھ دانتے کی یادگار تھی۔ اس پر اطالیہ اور شاعری کی دیویاں سوگوار کھڑی تھیں۔

تیسری قبر "پرنس" کے مصنف میکاولی کی تھی۔

مگر میں ابھی تک مائیکل انجلو کی قبر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سِل کے نیچے، کلیسا کے فرش تلے کہیں گہرائی میں اُس کا تابوت تھا، نیچے۔ اور "اکیڈمی" میں اُس کا ڈیوڈ کھڑا تھا اُوپر آسمانوں کو چھُوتا ہُوا۔

ایک ٹھگنی بُڑھیا قدم گھسیٹتی نمودار ہوئی۔ اُس کے ہاتھ میں موم بتیوں کا ایک بنڈل تھا، "کلیسا میں جلانے کے لئے۔"

وینڈی نے ایک موم بتی اُٹھالی۔ "کتنے کی؟"

"سو لیرے"۔ بڑھیا بولی۔ وینڈی نے چپکے سے رقم ادا کی اور موم بتی بیگ میں رکھ لی۔

"اسے جلاؤ گی نہیں آلٹریز؟" میں نے پوچھا۔

"اتنی مہنگی موم بتی تو ہرگز نہیں جلاؤں گی، ساتھ لے جاؤں گی۔"

کلیسا کے باہر آکر ہم بڑی دیر تک آنکھیں میچے کھڑے رہے اور تب کہیں جا کر دھوپ میں دیکھنے کے قابل ہوئے۔

فلارنس میرے لئے صرف آج تھا، کل مجھے وینس جانا تھا۔ پلازا دیکیو میں

نے جب وطن لے جانے کے لئے چمڑے کی دستکاریاں خریدنے کی خواہش کا اظہار یا تو وینڈی کہنے لگی۔ تم اکیلے جاؤ، مجھے ساتھ دیکھ کر اطالوی زیادہ قیمت بتائیں گے۔ سٹالوں پر اطالویاں کھڑی تھیں یعنی بھری بھری میدے بن سندھور والی قدرے فربہ پُتلیاں۔ تیز طرار اور زبردست سیلز گرلز۔ میں نے چمڑے کے دو سگرٹ کیس اور بیگ پسند کیا۔ کتنے پیسے؟"

"سولہ ہزار لیرے۔"

"کچھ کم کرو..." میں نے سیلز گرل کے ساتھ ذرا بے تکلف ہونے کی کوشش کی۔

"لینا ہے تو لو ورنہ راستہ ناپو۔" وہ چمک کر بولی۔

"کم کرو میں کوئی امیر امریکی تو نہیں ہوں۔"

"اور میں کوئی امیر اطالوی نہیں ہوں جو مُفت میں دے دوں۔" اُس نے فوراً کاؤنٹر پر سے اشیاء اُٹھالیں۔

مجھے معلوم تھا کہ تمام سٹالوں پر قیمتیں یکساں ہیں "خواہ مخواہ ناراض ہوتی ہو۔" میں نے چپکے سے سولہ ہزار لیرے نکال کر رکھ دیتے۔ "اتنے خوبصورت چہرے پر غصّہ اچھا نہیں لگتا۔" اُس نے اشیاء پیک کر کے میرے حوالے کیں اور ساتھ میں پانچ سو لیرے کا ایک نوٹ بھی تھما دیا۔ "یہ تمہارے فقرے کے لئے۔" اور ہنس دی۔

پارسل اُٹھائے میں واپس پلازا دیکیو میں آیا تو وینڈی کبوتروں کے درمیان گھری کھڑی تھی اور ایک موٹا کبوتر اُس کے کندھے پر آسودگی سے براجمان تھا۔

"قریب نہ آنا ورنہ اُڑ جائے گا۔" اُس نے وہیں سے اشارہ کیا۔

"اس کے پنجے تمہارے جسم کو ناگوار نہیں گزرتے؟" میں وہیں کھڑا ہو گیا۔

"نہیں۔" وہ ماتھے پر سے بال سمیٹتی ہوئی بولی۔ "یہ کبوتری ہے۔"

دوپہر ڈھل رہی تھی۔ پلازا دیکیو میں ایستادہ انسانی شکلوں کے پتھروں کے سائے طویل ہو رہے تھے۔ دھوپ چوک کو بتدریج خالی کر رہی تھی۔ وینڈی کبوتروں کے درمیان

گہری کھڑی تھی، اپنے کندھے پر براجمان کبوتر یا کبوتری کے لئے ساکت، اُس کے بال بار بار سر نہ اُٹھاتے تو وہ بھی پلازا دیکیو کے مجسّموں میں شامل ہو جاتی بلکہ بہت سالوں بعد جب میں نے اُس کا نقش تلاش کیا تو وہ ایک مجسّمے کی صورت میں ہی ملا۔ کندھے پر کبوتر، ہوا میں منجمد بال، ڈھلتی دُھوپ اور پلازا دیکیو۔ میں نے کندھے سے کیمرہ اُتار کر اُسے فوکس میں لیا اور بٹن دبا دیا... زندہ شکل کاغذ پر منتقل ہو گئی، ساکت اور اُسی لمحے قدیم ہوتی ہوئی۔

"وینڈی۔"

"کیا ہے؟" وہ اُسی طور ساکت رہی، صرف اُس کی آنکھیں کبوتر پر لگی تھیں "میں بات نہیں کر سکتی، اُڑ جائے گا۔"

میں نے اس منظر سے مُنہ موڑا اور دریا کورنو کی جانب چل دیا۔ میرے پیچھے پلازا ویکیو میں دوپہر ڈھل رہی تھی اور دُھوپ چوک کو بتدریج خالی کر رہی تھی اور وینڈی ایک مجسّمہ تھی۔

مشہور چوکوں اور کلیساؤں کے عقب میں فلارنس کی تنگ گلیوں میں بیحد خاموشی تھی۔ مقامی باشندے کھڑکیوں کے کواڑ بند کئے دوپہر کی نیند میں تھے۔ مجھ پر ڈھلتی دُھوپ کی اُداسی اثر انداز ہو رہی تھی اور یہ وینڈی سے جُدا ہونے کی وجہ سے نہیں تھی۔ وہ میرے لئے ایک مختصر، پُر کشش مگر غیر جذباتی دوستی کے دو دن تھی۔ یہ تو گھر سے دُوریوں اور اُن افغان صحراؤں، تُرک پہاڑوں اور آئیونین سمندروں کی اُداسی تھی جو مجھے دھکیلتے ہوئے یہاں اطالیہ تک لے آئے تھے اور آنے والی سوس جھیلوں، جرمن جنگلوں اور سویڈش وسعتوں کا خوف تھا جنہوں نے مجھے گھر سے مزید دُور کر دینا تھا... تو پھر کیوں؟ واپسی کا نقارہ بجانے کے لئے ہاتھ کیوں نہیں اُٹھ جاتا... ڈیلفی کا اوریکل میرے نصیب کی خبر ابھی کیوں نہیں دے دیتا... نہیں، میں نے اپنے آپ کو تسلی

دی۔ اُس امریکی بوڑھے کے نفرت انگیز لفظ ہیں جنہوں نے تمہیں اپنی زمین کی اپنائیت کے لئے اُداس کر دیا۔ پلازا ویکیو میں کھڑی وینڈی ہے جس سے تم نے مُنہ موڑا... پتہ نہیں کیا تھا... مگر کچھ تھا... اور میں بے حد تھک چکا تھا... ویازا نیتی کے اختتام پر پلازا میڈونا آیا جس کے سامنے ایک کلیسا تھا۔ میں اُس کی تاریک وسعتوں میں پناہ لینے کی خاطر اندر داخل ہو گیا۔ ایک عبادت گزار پادری نے میری موجودگی محسوس کی اور سر اُٹھا کر بولا "میڈیچی خاندان کے تابوت زیر زمین تہہ خانے میں رکھے ہیں۔" میں نے آگے بڑھ کر صندوقچی میں چند لیرے ڈالے اور ایک موم بتّی روشن کر کے الٹر پر ٹمٹماتی موم بتّیوں کی قطار میں رکھ دی "میں بہت تھک چکا ہوں"۔ پادری نے پھر سر اُٹھایا۔ اُس کی آنکھوں میں ایک ابدی سکون تھا "کلیسا کے پہلو میں راہب خانے کا ایک گوشہ ہے، وہاں چلے جاؤ۔"

کلیسا کی تاریکی کم ہوئی اور پتھریلی راہداری مجھے راہب خانے کے باغیچے میں لے گئی۔ ایک چوکور سادہ سی خاموش عمارت جس کے درمیان سرو کے چند درخت چُپ تھے اور باریک پتوں کی باڑیں خوابیدہ تھیں۔ میں ایک پتھریلی نشست پر بیٹھ گیا... سب کچھ پیچھے رہ گیا تھا، فلارنس، مائیکل انجلو کے مجسّمے، میرا خیمہ، وینڈی اور لوگ اور سارا شور... ماضی تھے۔ یہ جگہ کہیں اور تھی، وقت اور زمین سے علیحدہ، کٹی ہوئی، پتہ نہیں کہاں... دُھوپ صرف چھتوں پر تھی اور ایک مؤدب خاموشی تھی جیسے گہرے کنوئیں میں جھانکنے سے سُنائی دیتی ہے، جیسے قبر کی تاریکی میں محسوس ہوتی ہو گی... باہر کی دُنیا سے ایک کبوتر اُترا اور باغیچے میں بیٹھ گیا۔ اُس کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ بھی مجھے ناگوار گزری۔ کچھ دیر گردن پھُلا پھُلا کر اِدھر اُدھر دیکھتا رہا اور پھر شاید راہب خانے کے سنّاٹے سے تنگ آ کر اُڑا، پھڑپھڑاتا ہوا جیسے ابھی گر جائے گا... اور خاموشی تھی، جیسے گہرے کنوئیں میں جھانکنے سے سُنائی دیتی ہے، جیسے قبر کی تاریکی میں محسوس ہوتی ہو گی...

اگلی صبح میں نے خیمہ سمیٹا تو دروازے میں سے نظر آنے والا "ڈومو" پھر سے فلارنس شہر کا ایک حصّہ بن گیا۔ پتھر کا شہر میرے لئے پتھر ہو گیا، پتھر!

وینس کی موت

یہ ایک وسیع اور سبزے کی بُو باس والا میدان تھا۔ دُور ٹسکانی کی پہاڑی ڈھلوانوں پر انگوروں کے باغ تھے اور ان کے پار ایک پتھریلے پیالے کے بیچ میں کہیں فلارنس تھا جسے ہم تین گھنٹے قبل چھوڑ چکے تھے۔ بلند گھاس تیز ہوا سے جھکی جا رہی تھی اور اس میں سے کبھی یہاں کبھی وہاں ایک سفید دھبّہ دکھائی دے جاتا، باب کا روسی کُتّا جو کُھلی فضا میں بھاگتا بھاگتا پاگل ہو رہا تھا۔ ٹورسٹ وین سڑک سے ہٹ کر ایک کھیت کے کنارے کھڑی تھی اور وینڈی اور جینفر گھٹنے بازوؤں میں سمیٹے اُن پر ٹھوڑیاں ٹکائے بیٹھی تھیں اور ہوا میں اُن کے بال موٹے کبوتروں کی طرح سُستی سے پھڑپھڑا رہے تھے۔ باب ہتھیلیاں سر کے نیچے رکھے لیٹا تھا اور اس کی طویل داڑھی کسی کلاسیکی رقّاصہ کی ہتھیلی کی طرح دائیں بائیں ہل رہی تھی۔

ہم دوپہر کے کھانے کے لئے رُکے تھے۔

آج صبح وہ تینوں پانتو وکیو پر میرے منتظر تھے۔ باب واقعی ایک شفیق شخص تھا۔ دھیما اور اُس کے کُتّے کی طرح فرمانبردار جو ڈرائیونگ کرتے ہوئے چُپ چاپ اس کی گود میں بیٹھا رہتا۔ وہ وینڈی کے اشارے کا منتظر رہتا۔ یہاں تک کہ دائیں بائیں مُڑنے سے پیشتر بھی اس کی طرف دیکھ ضرور لیتا۔

باب سستی سے اُٹھا اور وینڈی کے اُٹھے ہوئے مُنہ پر جُھکا۔ پھر اُس نے وین میں سے ایک پُرانا رک سیک نکال کر کاندھے پر ڈال لیا اور سیٹی بجا کر گھاس میں اُچھلتے

کتے کو متوجہ کیا۔" وینڈی جینفر تم اب جاؤ... میں پرسوں شام جنیوا کی کیمپنگ میں تمہارا انتظار کروں گا..." وہ سر جھکا کر پیدل آ کو جاتی شاہراہ کی طرف چلنے لگا۔ ایک کار رکی اور اُسے فوراً ہی لفٹ مل گئی۔

"تم ڈرائیو کرو۔" وینڈی نے وین کا دروازہ کھول دیا۔

میں اندر داخل ہوا اور سٹیئرنگ کے نیچے کھسکتا دوسرے دروازے کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا "میں ڈرائیو نہیں کر سکتا۔"

"باب ہمارے ساتھ کیوں نہیں آیا؟"

"اُسے دمے کی شکایت ہے اور وینس کی ٹھنڈی ہوا اُسے سُوٹ نہیں کرتی..." وینڈی نے میری طرف دیکھا... "اور میں وینس دیکھنا چاہتی تھی۔"

جینفر جو ہمارے درمیان میں پھنسی بیٹھی تھی، ڈیش بورڈ پر ہاتھ مار کر بولی لیکن وینڈی ہمیں ہر صورت میں پرسوں تک جنیوا پہنچ جانا چاہیے۔"

"یہ ہم دیکھیں گے۔" وینڈی نے آہستگی سے کہا۔

ساڑھے چھ بجے ایک جدید مگر بے ترتیب سا شہر شروع ہو گیا کہیں ایک بورڈ دکھائی دیا۔ "وی نیزیا"۔

"یہ وینس ہے؟" میں نے بے یقینی سے پوچھا۔

"ہاں!"

"لیکن سمندر کہاں ہے؟"

"سمندری وینس میں پہنچنے کے لئے ہمیں اس وین کو سٹیمر پر لے جانا ہو گا جو بہت مہنگا سودا ہے... ہم اسی جانب کسی کیمپنگ میں ٹھہر جاتے ہیں۔"

ہم رہائشی فلیٹوں اور کاروباری مراکز میں پھنسی ہوئی "کیمپنگ پارک" میں داخل ہوئے تو مجھے اُونچے اُونچے درختوں میں گھری ایڈریاٹک سمندر کے کنارے پھیلی ہوئی

"کیمپنگ لیڈو" یاد آ گئی جہاں آج سے چھ برس پیشتر میں نے اور میرے خیمے نے پہلی مرتبہ وینس دیکھا تھا۔ یہاں زمین سخت تھی اور میرے خیمے کے پردے میں سے ٹوتھ پیسٹ کا ایک جہازی اشتہار اور ایک غسل خانہ نظر آ رہا تھا!

"کافی پیو گے؟" وینڈی نے اپنی وین میرے خیمے کے پہلو میں پارک کر رکھی تھی۔

"پہلے ایک خنک شاور... پھر کافی۔" میں نے تولیہ کندھے پر ڈالا اور غسلخانے کی جانب چل دیا۔

جولائی کے مہینے میں بھی شاور کا پانی اولوں کے ہمراہ برسنے والی بارش کی طرح برفیلا تھا۔ مُنہ کے صندوق میں دانتوں کا جل ترنگ بجنے لگا۔ وینڈی کی وین میں پہنچتے ہی میں نے کافی کا نصف مگ اس میں انڈیلا تب جا کر کہیں یہ کٹ کٹا کٹ بند ہوئی۔

"معزز خواتین! اس عمدہ کافی کے بدلے میں آپ نے وینس دکھانے کے لئے ایک گائیڈ کی بلا معاوضہ خدمات حاصل کر لی ہیں۔ پتھر کے شہر فلارنس کے بعد پانی کا شہر وینس، تیار ہو جائیے...!"

جینفر نے ناک پر رومال جما کر ایک شُرلی سی چھوڑی... "مجھے زکام ہے۔"

"ذرا خیال کیجئے کہ چاندنی رات میں نہروں میں رواں سبک گنڈولے، اُن کے کنارے سنگ مرمر کے محلات، کُبڑے پُل۔ اور سان مارکو چوک..."

وینڈی نے دروازہ دھکیل کر باہر جھانکا "چاندنی رات؟ باہر تو گھپ اندھیرا ہے۔"

"خیرات تو ہے ناں... کہتے ہیں کہ نصف شب سان مارکو میں ایستادہ گھوڑوں کے مجسّمے ہنہناتے ہیں اور..."

"ہنہناتے ہوئے گھوڑے...؟" وینڈی نے لمبا مُنہ کھینچ کر ایک اور شُوں کی۔ "تم وینس کے گائیڈ ہو یا کسی اصطبل کے..."

"خواتین پلیز خیال کیجئے کہ ہم وینس میں ہیں اور زندہ ہیں... وینس میں تو موت بھی خوبصورت ہے... ہے ہے ہے..." میری چرب زبانی کا ریکارڈ

اس فقرے کے آخر میں اٹک گیا ... ربیکا۔ ربیکا۔ ربیکا ...

"سمندر کے اس حصے میں لہریں تیز تھیں جن کی وجہ سے مانجھی کو گنڈولا چلانے میں خاصی دشواری پیش آ رہی تھی۔ ہمارے پاس سے سیاہ مخمل میں لپٹے ہوئے چھ گنڈولے بڑی آہستگی سے گزر گئے۔ درمیان والے گنڈولے میں ایک سیاہ تابوت رکھا تھا جس پر پھولوں کی ایک چادر بچھی تھی۔ پانی کی سطح پر تیرتا یہ خاموش قافلہ "سان مشل" کے قبرستان کی جانب رواں تھا۔" وینس میں موت بھی خوبصورت ہے۔" ربیکا کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔"

وینڈی نے مگ کے کنارے سے آنکھیں اٹھائیں "تم خاموش کیوں ہو گئے ہو؟"

میں انگوٹھے کو ناخنوں پر پھیرتا رہا... شہر پہلی محبت کی طرح ہوتے ہیں۔ طویل جدائیوں کے بعد ان کی طرف لوٹنا بے حد اذیت ناک ہوتا ہے۔ تمہارے اندر ماضی کی آوازیں اور مہک محفوظ ہوتی ہے مگر وہ چہروں کی طرح وقت کے ساتھ بدل چکے ہوتے ہیں ..." ہاں باہر شاید گھُپ اندھیرا ہی ہے چاندنی رات نہیں ... وینس میں رات کے وقت نم سمندری ہوا چلتی ہے جو صحت کے لئے انتہائی مضر ہے۔"

"اور مجھے بے حد زکام ہے۔" جینیفر نے ایک اور شُں کی۔

"اور سفر کی تھکاوٹ بھی تو ہے... میں نے بہت طویل ڈرائیونگ کی ہے، کل صبح چلیں گے..." وینڈی بھی جمائیاں لے رہی تھی۔

میں اپنے خیمے میں آ کر لیٹ گیا۔ میرے پاسپورٹ پر چسپاں اطالوی ویزے کے ختم ہونے میں صرف ایک روز باقی تھا اور مجھے ہر حالت میں کل شام تک اطالوی سرحد عبور کر کے سوئٹزرلینڈ پہنچنا تھا۔ اطالیہ میں میری آخری رات اور وینس میں بھی ...!

"اور میں ..." اُس نے میرے ہونٹوں پر اپنے خنک ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "روم کے تریوی فوارے میں سکے ڈال کر دُعا کروں گی کہ ہم دونوں پھر وینس میں ملیں ..."

اور میں وینس میں تھا ... شاید آخری مرتبہ ... میں نے کپڑے تبدیل کئے اور کیمپنگ

سے باہر آ گیا۔

پلازا روما تک بس جاتی تھی، وہاں سے گھاٹ قریب ہی تھا۔ میں نے ریالٹو کے لیے ٹکٹ خریدا اور پانی میں ڈولتی لکڑی کی انتظار گاہ میں جا بیٹھا۔ سٹیمر کے آنے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ چاروں طرف شیشے تھے جن میں سے سمندر کا سیاہ وجود اور اس میں اُبھرتی اکا دکا روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔

"یہ کب چلے گا؟" میرے قریب بیٹھی ایک ادھیڑ عمر امریکی عورت نے دریافت کیا۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"میں کتنی دیر سے ٹکٹ خرید کر بیٹھی ہوئی ہوں اور یہ چلتا ہی نہیں۔" وہ معصومیت سے بولی۔

میں اپنی ذہنی افسردگی کے باوجود مسکرا دیا۔ "میڈم یہ تو صرف انتظار گاہ ہے سٹیمر تو ابھی آئے گا۔"

"میں بھی کتنی احمق ہوں۔" وہ اپنی حماقت پر لطف اندوز ہوتے ہوئے ہنسنے لگی۔

سٹیمر پر بہت کم لوگ تھے اور جو تھے وہ نم ہوا سے بچنے کی خاطر اندرونی حصے میں اُونگھ رہے تھے۔ میں ریلنگ کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر ہم کھلے سمندر میں رہے اور پھر دُنیا کا خوبصورت ترین شہر تاریکی کی اوٹ میں سے ہمیں دیکھنے لگا۔ وہ ہمارے قریب آیا اور سٹیمر کو اپنے بدن میں داخل ہوتی ہوئی ایک نہر میں راستہ دے دیا۔ گرینڈ کینال کے کناروں پر دریائی گھوڑوں ایسی گردنیں نکالے، لہروں کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے گنڈولے خالی پڑے تھے۔ گلیوں کی بجائے چھوٹی چھوٹی نہریں تھیں جو اس آبی شاہراہ سے نکل کر جزیروں کے شہر میں داخل ہو رہی تھیں اور ان پر اُٹھتے ہوتے محرابی پُل پانی میں سے دھڑ اُٹھائے کسی مُردہ عفریت کی طرح ساکن دکھائی دے رہے تھے۔ سٹیمر کے گزرنے سے بل کھاتا ہوا پانی کنارے پر ایستادہ دم بخود کر دینے والی خوبصورت عمارتوں اور رہائش گاہوں کی سنگِ مرمر کی دیواروں سے جا ٹکراتا۔ سنگ مرمر لمحہ بھر کے لئے پانی میں ڈوبتا اور پھر ننگا ہو جاتا، جیسے سمندر میں ایک دُودھیا بدن، مدوجزر کے دوران کبھی

کندھوں تک پانی صرف چہرہ دکھائی دے اور کبھی وہ یوں پیچھے ہٹتا چلا جائے کہ پاؤں تک کی برہنگی نظروں کے سامنے آجاتے... وینس ابدی تھا۔ وینس ڈی میلو کے مجسمے کی طرح... وینس دراصل وینس تھا، پانی سے نکلتا ہوا سنگ مرمر کا بدن چند اُونچی کھڑکیاں کھلی تھیں اور ان میں روشنی تھی۔

سٹیمر پر ایک سناٹے نے حرکت کی، ریالٹو کا پُل گزر گیا۔ دوسری طرف سٹاپ تھا۔ شہر کے اندر گلیاں پتھر کی تھیں اور قدیم مکانوں کے باہر آرائشی لالٹینوں کی روشنی کو سیاہ رات چوس رہی تھی۔ مرسیریا سٹریٹ بند ہو چکی تھی۔ میں تیز تیز چلتا ہوا سان مارکو کے چوک میں آنکلا۔

"موسیقی کا شور مدھم ہو گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے پورا سان مارکو چوک خالی ہو چکا تھا اور اُس کے بیچ صرف ربیکا کھڑی مسکرا رہی تھی۔ سنہری بالوں سے ملتا ہوا پھولدار لباس اور اُس کے اُوپر ہلکا زرد کوٹ پہنے وہ بے حد خوبصورت لگ رہی تھی۔"

سان مارکو چوک واقعی خالی ہو چکا تھا کسی قسم کی مسکراہٹ یا سنہری بالوں سے خالی۔ اس میں اُڑنے والے ہزاروں کبوتر ڈوجے پیلس اور کلیسا سان مارکو کی دیواروں اور چھجوں میں محوِ استراحت تھے۔ گھوڑوں کے آہنی مجسمے جیسے ایک وسیع اور تاریک میدان میں جنگ کے منتظر کھڑے ہوں۔ میں نے ایک سگرٹ سُلگایا اور چبوترے پر بیٹھ کر پھونکنے لگا۔ ڈوجے پیلس میں پوشیدہ کبوتروں کی ہلکی ہلکی سرسراہٹ سنائی دے رہی تھی۔ کبوتر جو وینس کے لئے موت کا گدھ بن گیا ہے۔ پچاس ہزار سے زائد کبوتروں کی تیزابیت سے بھرپور بیٹ وینس کے سنگِ مرمر کو پاؤڈر میں بدل رہی ہے۔ مجسّمے بے شکل ہو رہے ہیں اور محل نما عمارتوں کو گھُن لگ چکا ہے... وینس میں موت حسین ہو تو ہو، وینس کی موت حسین نہ ہو گی۔

وینس کے بدن میں نکلتی نہر نے ہمیں واپس کھُلے سمندر میں چھوڑ دیا۔ گھاٹ پر اُتر کر جب میں پلازا روما میں پہنچا تو آخری بس کب کی جا چکی تھی، میں آہستہ آہستہ کیمپنگ کی طرف چلنے لگا۔

میرے خیمے میں روشنی تھی۔

چور!

لیکن وہاں ہے کیا؟ پاسپورٹ، کیمرہ اور کرنسی تو میں ہمہ وقت اُٹھائے پھرتا تھا... تو پھر؟

میں یقیناً اس امریکی بڑھیا کی طرح سٹھیا چکا تھا، بھلا کوئی چور ایک ننھے منے خیمے میں داخل ہو کر روشنی کر سکتا ہے، پھر بھی میرا ہاتھ پردے تک گیا تو جھجک تھی۔

کافی کا مگ اُلٹا رکھا تھا اور اس پر موم بتی جل رہی تھی۔ سلیپنگ بیگ پر جوڈو کے کھلاڑیوں ایسے گاؤن اور پاجامے میں ڈینڈی ایک یوگی کی طرح آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔

"ہیلو" میں نے وہیں جھکے جھکے کہا۔

"ہیلو" اُس نے گاؤن کی بیلٹ کی گرہ ڈھیلی کرتے ہوئے بڑے گھریلو انداز میں کہا "کیا ایک شریف آدمی اتنی رات گئے اپنے خیمے میں واپس آتا ہے؟"

"تم یہاں کیا کر رہی ہو..."

"اندر آجاؤ تمہارا اپنا ہی خیمہ ہے۔"

میں اندر جا کر ایک کونے میں لگ گیا۔

"میں یہ موم بتی جلانے کے لئے یہاں آئی تھی۔ اب سولبرے کی یہ موم بتی فلارنس کے کلیسا میں جلا کر ضائع تو نہیں کی جا سکتی تھی ناں...؟"

میں نے شعلے کے عین اُوپر خیمے کے کپڑے پر ہاتھ پھیرا، خاصا گرم ہو رہا تھا "ویسے اگر یہ موم بتی کچھ دیر اور یہیں جلتی رہتی تو خیمے میں روشندان کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔"

"اوہ۔" وہ اُٹھنے لگی تو اس کا سر خیمے سے جا ٹکرایا... "مجھے خیموں میں رہنے کی عادت نہیں ہے۔" اور پھر مگ پر جمی موم بتی کی جگہ بدل دی۔

"وینس کیسا تھا؟"

"چھ برس پہلے تو بہت خوبصورت تھا۔"

"اور اب؟"

"سنگِ مرمر پاؤڈر ہو رہا تھا اور عمارتوں کو گھن لگ رہا ہے، مگر پھر بھی خوبصورت ہے۔"

"اور تم کل پلازا ساتنوریا میں خدا حافظ کہے بغیر اچانک کیوں غائب ہو گئے تھے؟"

"میں خود لاعلم ہوں کہ میں بعض اوقات جو کچھ کرتا ہوں وہ کیوں کرتا ہوں۔"

"میرا خیال تھا کہ تم آئس کریم وغیرہ خریدنے کے لئے دیا پانیزنی میں گئے ہو، آ جاؤ گے، میں بہت دیر وہیں کھڑی رہی۔"

"میں تمہیں متوجہ کر کے تمہارے کندھے پر براجمان کبوتر کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا تھا۔"

"کبوتری۔" وہ ہنسی۔ "وہ تو اسی وقت اُڑ گئی تھی... کافی؟" اُس نے قریب رکھی فلاسک اُٹھائی۔

ہم دونوں کافی پینے لگے... خاموشی کا ایک طویل وقفہ... پگھلتی موم گولائی کے ساتھ لپٹتی ایک رواں بیل کی طرح نیچے اُتر کر مگ کی پشت پر پھیل رہی تھی۔

"تم ایسی حسین لڑکیوں کو تو جوڈو کا لباس پہننے کی ضرورت نہیں..." بالآخر میں نے اس وقفے کو توڑا۔ "تمہیں تو دیکھ کر ہی ہتھیار ڈال دینے کو جی چاہتا ہے..."

اُس کے گول چہرے پر موم بتی لشکی۔ "تم اطالویوں کی طرح جھوٹی مگر خوب صورت باتیں کرتے ہو۔"

میرے سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی ربیکا نہیں تھی، مگر تھی کہ نقطے وہی رہتے ہیں۔ اس کے سامنے میں تھا اور میرے نقطے بھی وہی تھے مگر اب ان میں جھوٹ تھا... میں نے اسے ربیکا کے بارے میں بتایا۔

"کیا تمہیں اس سے محبت تھی؟" اُس نے لاتعلقی سے پوچھا۔

"نہیں... لیکن چہرے کا پس منظر بھی تو انسان کے جذبات کو گہرا کرتا ہے۔ ربیکا میڈرڈ یا برسلز ایسے شہر میں ملتی تو شاید میں صرف ایک نظر دیکھ کر آگے بڑھ جاتا مگر وینس... جس

طرح تم کل فلارنس کے پلازا ساتنوریا میں کبوتروں میں گھری کھڑی تھیں... پس منظر اثر انداز ہوتا ہے۔"

شاید ملال کا ایک سایہ آیا اس کے گول چہرے پر۔ "اگر میں فلارنس کی بجائے کسی اور شہر میں ملتی تو تم مجھے ایک نظر بھی نہ دیکھتے؟ ہوں؟"

"وہ چہرہ صرف ایک ہوتا ہے وینڈی، اگر انسان خوش قسمت ہو تو وہ اس مختصر زندگی میں سامنے آ جاتا ہے۔ ایسا چہرہ جس کے لئے کسی پس منظر کی ضرورت نہیں ہوتی، وہ خود پس منظر تخلیق کرتا ہے۔ اور میں اور تم ایک دوسرے کے لئے وہ چہرہ نہیں ہیں۔"

خاموشی کا ایک اور وقفہ ہمارے درمیان حائل ہوا۔

"کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک وہ چہرہ سامنے نہ آئے انسان نقاب پہن کر دُنیا کے تمام چہروں سے پردہ کرے... مجھے معلوم ہے کہ تمہاری یہ خواہش ہے کہ میں اس شہر میں تمہاری رفاقت میں چلوں، باتیں کروں، ہنسوں لیکن تمہارے اندر ایک بے چین بے جہتی ہے۔ تم کوشش کر کے خوش رہتے ہو اور مشقت سے خوبصورت فقرے کہتے ہو، اور اُداسی کی ایک ہلکی سی حدت ہمہ وقت تمہاری آنکھوں میں جلتی رہتی ہے... تمہاری اس خواہش کا مجھے یقین نہ ہوتا تو میں باپ کے ہمراہ سوئٹزرلینڈ چلی جاتی کیونکہ میں کبھی بھی کسی ایسے شخص کے ساتھ باہر جانا پسند نہ کروں جو میرے لئے بھی پسندیدگی کے جذبات نہ رکھتا ہو..."

"بھئی میں تو تم سے محبت کرتا ہوں، شدید اور نہایت جذباتی قسم کی، اور اگر میرا اطالوی ویزا کل ختم نہ ہو رہا ہوتا تو میں تمام وقت تمہاری وین کے پیچھے لٹک کر آہیں بھرتا رہتا... میں قسم کھاتا ہوں..." میں نے ہنستے ہوئے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنا لیا۔

"اوہ تم بہت ہی ناقابلِ یقین قسم کے آدمی ہو مستنصر۔" وینڈی مسکرا دی۔ "جس طرح تم مجھے بتائے بغیر پلازا ساتنوریا میں چھوڑ کر غائب ہو گئے تھے تو مجھے اُسی وقت شک

ہوا تھا کہ تمہارے ذہن میں کچھ فتور ہے۔ اور میں ایک نیم دیوانے شخص کے ساتھ وینس میں ہرگز گھومنا نہیں چاہتی۔"

"بالکل۔" میں نے سر ہلا دیا۔

"لیکن ہم ایک دوسرے کو اچھے لگے، تھوڑی سی مدت کے لئے، فلارنس میں!"

"ہاں"۔ میں نے پھر سر ہلا دیا۔ "بہت اچھے لگے۔"

"تم دراصل مجھے پلازا سائنوریا میں ہی چھوڑ آئے ہو۔۔۔" اُس نے سر جھٹک کر میری طرف دیکھا۔ مسکراہٹ سمٹنے لگی، چہرہ آگے آیا، ہونٹ جدا ہوتے، نیم دائرے میں بدلے اور ایک گہرا سانس موم بتی کے شعلے پر بچھ گیا۔ یکدم اس کا چہرہ اندھیرے میں یوں چمکا جیسے کسی نے ماچس جلا دی ہو۔ یہ روشنی لمحہ بھر کے لئے میرے گالوں پر نم آلود حدت کے ساتھ پھیلی۔ پھر وہ اُٹھی اور پردہ اُٹھا کر خیمے سے باہر نکل گئی۔

الپس

"سنیور یہ کار آپ کی ہے؟" اطالوی پولیس مین نے گرجے کے فٹ پاتھ پر چڑھی ہوئی کار کی طرف اشارہ کیا۔۔۔ پچھلی نشست پر ایک بہت ہی دہشتناک تہہ دار میک اپ میں دفن خاتون پھیلی ہوئی تھی۔

"یہ کار میری نہیں ہو سکتی۔"

"کیوں؟" اُس نے ابرو چڑھا کر پوچھا۔

"اس خاتون کو دیکھ رہے ہو؟"

وہ مسکراتا ہوا غلط پارک شدہ کار کے مالک کی تلاش میں نکل گیا۔

میرے سامنے ڈومو تھا۔ فلارنس کا نہیں بلکہ میلان کا کلیسائے اعظم جو ڈومو ہی کہلاتا ہے۔ میں میلان میں تھا۔

آج صبح آنکھ دیر سے کھلی۔ گیارہ بجے خیمے سے باہر آیا تو وینڈی کی ٹورسٹ وین کی بجائے کچی زمین پر صرف ٹائروں کے نشان تھے۔

میں نے خیمہ سمیٹا اور وینس کے ریلوے سٹیشن پر پہنچ کر اطالوی سرحد سے نزدیک ترین سوئٹزرلینڈ کے شہر لوگانو تک کا ٹکٹ خرید لیا۔ پڈوا اور وچینزا کے بعد ساڑھے پانچ بجے میلان آ گیا۔ لوگانو کے لئے گاڑی ساڑھے چھ بجے روانہ ہوتی تھی۔ گوتھک محل نما ریلوے سٹیشن پر پورے ساٹھ منٹ خواہ مخواہ انتظار کرنے کی بجائے میں نے سامان لگیج روم میں جمع کروایا اور ٹرام پکڑ کر یہاں چلا آیا۔۔۔ اور

یہاں حسب معمول ایک بڑا چوک تھا، شاندار گرجا تھا اور بے شمار کبوتر تھے جن میں
پلاسٹک کی وہ چڑیاں بھی اُڑتی پھرتی تھیں جو اطالوی بچے مجھ ایسے سیاحوں کو متحیر
کرنے کے لئے چابی بھر کر فضا میں چھوڑ رہے تھے۔ میرے پاس صرف اتنا وقت تھا
کہ میں میلان کیتھڈرل کو باہر سے ہی ایک نظر دیکھوں، دو تصویریں اُتاروں اور فوراً
سٹیشن واپس پہنچنے کے لئے ٹرام میں سوار ہو جاؤں اور میں نے ایسا ہی کیا یعنی
وہی امریکی سیاحوں کا رویّہ کہ ... دیکھ لیا۔

میلان سے نکلنے کے تھوڑی دیر بعد سوئٹزرلینڈ کے آثار شروع ہو گئے۔
... سبزہ گہرا ہونے لگا۔ پہاڑوں کا حجم اور بلندی بڑھنے لگی، ٹرین کی رفتار آہستہ
ہو گئی۔ کھڑکی سے آنے والی ہوا بدن کو یوں چھُو رہی تھی جیسے کورے گھڑے پر ہاتھ
رکھ دیا ہو۔ ہلکی کُہر نیلی چٹانوں کے گرد سفید ہالے بناتے ہوئے تھی۔ ٹرین کسی وادی
میں سے گزرتی تو معدوم ہوتی ہوئی گُونج ساتھ ساتھ چلی آتی۔ ایک جھیل کا پانی نزدیک
ہوتا گیا اور پھر ہم اُس سے پرے ہٹتے چلے گئے۔

ایک گھنٹے کے سفر کے بعد گاڑی رُک گئی۔ یقیناً کوئی اطالوی سٹیشن تھا ورنہ
سرحد نزدیک آتے ہی اطالوی اور سوِس کسٹم والے پاسپورٹوں پر ٹھپّے لگانے کے لئے
نمودار ہو جاتے۔ میں اطمینان سے بیٹھا رہا۔ پانچ منٹ بعد ایک نیلی وردی والے
گارڈ آئے کہنے لگے، اگر آپ لوگانو میں اُتر جائیں تو ہم آپ کی اجازت سے ٹرین
کو واپس میلان بھیج دیں۔

باہر آیا تو لوگانو ہی تھا۔ چھوٹے سے پہاڑی سٹیشن پر کوہ ایلپس کی شام گہری
ہو رہی تھی۔ دُور سرسبز پہاڑیوں اور مکانوں کی سُرخ چھتوں کے درمیان غروب
آفتاب کے بعد کی ہلکی روشنی میں جھیل لوگانو کا پانی ظاہر ہو رہا تھا۔ ٹورسٹ بیورو بند
ہو چکا تھا۔ سٹیشن کے باہر سڑک پر بھی سرد ویرانی تھی۔ میں حیران کھڑا تھا کہ اب رُخ

کدھر کو ہو کہ اتنے میں گھاٹی پر سے ایک پچاس سی سی کا ہونڈا پھٹ پھٹ کرتا اُترا۔
سوار نے ہیلمٹ اُتار کر اپنے سُنہری بال جھٹکے اور بولی "مجھے افسوس ہے کہ آپ کو یوں
انتظار کرنا پڑا۔ آپ کو یقیناً کیمپنگ کی تلاش ہو گی کیونکہ آپ کے رُک سیک پر خیمہ
بندھا ہوا ہے تو "کیمپنگ آنیو" میں چلے جائیے۔ بس نمبر ۱۲، یہاں سے چار کلومیٹر
کے فاصلے پر۔" اُس نے بڑی پھرتی سے بیگ میں سے لوگانو کا ایک نقشہ نکال کر اُس
پر کیمپنگ کے مقام پر نشان لگایا اور میرے حوالے کر دیا "میں ابھی ابھی ٹورسٹ بیورو
بند کر کے گئی ہوں کیونکہ آخری گاڑی میں سے کوئی ٹورسٹ نہیں اُترا تھا۔ آپ شاید
بائی روڈ آئے ہیں۔ بہر حال میں نے حسب عادت اُس درّے کے قریب جا کر پیچھے
نگاہ ڈالی تو آپ سٹیشن کے باہر کھڑے نظر آ گئے ... مجھے افسوس ہے کہ آپ کو زحمت
ہوئی، خدا حافظ۔" اس سے پیشتر کہ میں جھک کر کورنش بجا لاتا اُس نیک دل بی بی نے
ہونڈا کو ایک کِک رسید کی اور پھٹ پھٹ کرتی گھاٹی پر چڑھنے لگی۔

ایک بازار کا مختصر قصبہ "آنیو" اور ایک جنگل نُما پارک میں سے جاتا رستہ اور جھیل
لوگانو کے کنارے "کیمپنگ آنیو"... کافی بار، سٹور، چمکتے ہوئے شاورز اور چمکتے ہوئے
چارجز۔ صرف خیمہ لگانے کا کرایہ تیس روپے فی شب۔ ایک عرصے کے بعد میں نے اپنے
پسندیدہ سوِس چاکلیٹ ٹابلر، تازہ مہک والے الپائن دُودھ کے ساتھ نوش کئے
اور پھر سلیپنگ بیگ میں گھُس کر لیٹ گیا، سردی تھی۔

دوسری صبح خیمے سے باہر آیا تو جھیل لوگانو کو نظر بھر کے دیکھنا مشکل ہو رہا تھا۔
سبز پانیوں پر اُتری ہوئی روشنی وہ دُھوپ تھی جو سوئٹزرلینڈ کے اس اطالوی حصّے
کا خاصا ہے۔ ایلپس کے اُس پار جرمن حصّے میں سے آنے والی کاریں اکثر بارش میں
بھیگتی آتی ہیں اور ان میں ٹھٹھرتے ہوئے سوِس جھیل لوگانو کے کنارے پہنچتے ہی جاگنے
ہنستے ہیں اور آنے والی تاریک سردیوں کے لئے دُھوپ سمیٹنے لگتے ہیں ... میں نے بھی

جھیل میں قدم رکھا تو معلوم ہوا کہ پانی نہیں گلیشئر ہے، پاؤں گھسیٹ کر آگے بڑھا تو گھٹنے تالیاں بجانے لگے۔ چپکے سے باہر آ گیا۔

"آج تو پانی اُبل رہا ہے۔" کیمپنگ کا مالک کرُوتہ جھیل میں ڈبکیاں لگاتے ہوئے بولا۔

پچھلے پہر میں نے اپنے آپ کو جھیل کنارے بلند ہوتے ہوئے پہاڑوں میں ایک پگڈنڈی پر پایا۔ خواہش تھی کہ میں الپس میں رُوپوش چھوٹے چھوٹے غیر معروف دیہات کو دیکھوں۔ چڑھائی بے حد دشوار تھی مگر میں اپنے تھکتے ہوئے جسم کو انجانے مناظر اور گمنام بستیوں کی نوید دیتا رہا اور آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ ایک ویران مقام پر ایک بدمزاج کسان میرے پیچھے پڑ گیا کہ میں اُس کے ذاتی کھیت میں سے بلا اجازت کیوں گزر رہا ہوں... ایک بوسیدہ قصبے میں چند خوش مزاج بُل ڈوگز نے میری ٹانگوں کی قربت حاصل کرنے کے لئے شدید وابستگی کا اظہار کیا... چوٹی پر واقع ایک تاریک چوبی مکان میں سے ایک لڑکی باہر نکلی اور مجھے وہاں سے فوراً غائب ہو جانے کا حکم دیا... ان دلفریب انجانے مناظر کے بعد میں نے واپسی مناسب خیال کی اور جوگی اُتر پہاڑوں آیا۔

کیمپنگ واپسی کے لئے میں شاہراہ کے کنارے پر چلنے لگا۔ یکدم سامنے سے آتی ہوئی ٹریفک کے نظام میں کچھ گڑبڑ سی ہو گئی، کاروں کے ہارن بجنے لگے۔ ڈرائیور اپنے آدھے دھڑ باہر نکال کر ہاتھ ہلانے لگے۔ لڑکیاں بے قابو ہو کر میری طرف ہوائی بوسے پھینکنے لگیں۔ میں نے سوچا ہو نہ ہو کسی مواصلاتی سیارے کی بدولت سوئٹزرلینڈ کے اس حصّے میں پاکستان ٹیلی وژن کے پروگرام اُترنے لگے ہیں اور یہ سب حضرات میری "بے مثل" اداکاری وغیرہ سے دیوانے ہو کر خراجِ تحسین پیش کر رہے ہیں۔ پھر ایک سکوٹر سوار دوشیزہ نے مجھے دیکھا، فوراً بریک لگائی اور گھسٹتی ہوئی میرے قریب آ گئی۔

"یہ سلیپنگ سُوٹ بہت ہی کیوٹ ہے۔" اُس نے میرے پیراہن کی طرف اشارہ کیا اور زور زور سے ہارن بجانے لگی۔

وہ "سلیپنگ سُوٹ" میرا کڑھا ہوا بوسکی کا کرتہ اور لٹھے کی شلوار تھی جو اُس صبح

یں نے ہالینڈ سے موڈ میں آ کر پہن لیا تھا۔

کیمپنگ پہنچنے تک موٹروں کے ہارن اور نعرے میرا پیچھا کرتے رہے...

ایک بات طے تھی کہ اگر کل صبح یہی کرتہ شلوار پہن کر میں برن جانے والی سڑک پر کھڑا ہو جاؤں تو یہ ڈرائیور حضرات کے لئے سمِ قاتل ثابت ہو گا اور وہ مجھے لفٹ دینے کی خاطر باقاعدہ قطاریں بنا لیں گے...

دوسری صبح وہ کرتہ شلوار واقعی سمِ قاتل ثابت ہوا مگر میرے لئے... اُسی طرح ہارن بجتے، ہاتھ ملنے لگتے مگر بریکیں بالکل نہ لگتیں۔ کاریں اور ٹرک شرلاٹے بھرتے ہوئے قریب سے گزر جاتے۔ میں پوری صبح اور ڈھلتی دوپہر تک ایک ہی مقام پر انگوٹھا بلند کئے اکڑتا رہا... تین بجے کے قریب ایک ٹریکٹر والے نے مجھ پر کرم کیا اور وہاں سے اُٹھا کر چند کلومیٹر کے فاصلے پر لا کھڑا کیا... برن پہنچنا تو دور کی بات تھی، اب میری صرف یہ آرزو تھی کہ کسی نہ کسی طریقے سے اگلے بڑے قصبے بیلن زونا تک پہنچ جاؤں... شام ہونے لگی تو ایک بوڑھے پادری کی کار چند سو میٹر کے فاصلے پر جا رُکی۔ میں بھاگتا ہوا اُس تک پہنچا تو وہ بولا "میں نے تمہارے لئے کار کھڑی نہیں کی، خود ہی کھڑی ہو گئی ہے پنکچر ہونے کی بنا پر۔"

"میں ڈِکّی میں سے ٹائر نکال لاتا ہوں۔" میں نے فوراً پیشکش کی۔

ٹائر بدلنے کی کوشش میں شریک ہونے کی بنا پر پادری صاحب نے مجھے ساتھ بٹھا لیا۔ "کہاں جاؤ گے؟"

"برن جاؤں گا۔" میں نے انتہائی شائستگی سے عرض کیا۔

"برن؟... ہوں... تمہارا خیال ہے کہ میں درّہ سینٹ گوتھارڈ عبور کر کے سوئٹزرلینڈ کے دوسرے سرے پر واقع دارالخلافے برن چلا جاؤں، صرف تمہیں چھوڑنے کی خاطر... میں یہاں سے چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر لوکارنو جا رہا ہوں۔"

"لوکارنو جاؤں گا۔" میں نے سرِ تسلیم فوراً خم کیا۔

سوئٹزرلینڈ کے سیاحتی کتابچوں میں حسین ترین تصاویر لوکارنو کی ہوتی تھیں جھیل لوکارنو کے کنارے اطالوی مزاج کی دھوپ سے دمکتا شہر، پام کے درخت اور رنگبرنگی پہاڑیوں والے جزیرے... جب کبھی سوئٹزرلینڈ آنا تو لوکارنو کسی نہ کسی طرح مِس ہو جاتا۔ اب میں ایک پادری کی برکت سے وہاں جا رہا تھا۔

زمین جیسے کار کے نیچے سے بیٹھنے لگی ہو۔ ہم ایک لینڈنگ کرتے ہوئے جہاز کی طرح نشیب میں اُترنے لگے۔ دائیں ہاتھ پر مانسہرہ وادی سے مماثلت رکھتا ہُوا ایک پیالہ نما میدان تھا جس میں بیلن زونا کا شہر دکھائی دے رہا تھا۔ پادری بابا نے کار دائیں طرف موڑ لی۔

"کہاں اُترو گے"؟ لوکارنو کے نواح میں پہنچنے پر اُس نے بے رُخی سے پُوچھا۔

"کیمپنگ"۔ میں نے بھی قدرے بے رُخی سے جواب دیا کہ طوطا چشمی کا یہی تقاضہ تھا۔

لوکارنو میں سوئٹزرلینڈ کی سب سے بڑی کیمپنگ سائٹ ہے مگر اس کے گیٹ پہ "کمپلیٹ" کا بورڈ آویزاں تھا یعنی جگہ نہیں ہے۔

"کیا بالکل جگہ نہیں ہے"؟ میں نے کاؤنٹر پر دریافت کیا۔

"بالکل نہیں ہے۔" نوجوان کلرک خاصا سرد مزاج تھا۔

"میرا خیمہ تو بالکل چھوٹا سا ہے... اتنا سا"۔ میں نے ہاتھ پھیلا کر بتایا۔

"چھوٹے سے خیمے کے لئے بھی جگہ درکار ہے... جو نہیں ہے۔"

باہر سڑک پر صرف ایسے لوگ تھے جو جھیل کے پانیوں پر جُھکے لوکارنو کی حسین شام سے ملنے آئے تھے۔ سپورٹس شرٹس اور شارٹس پہنے ہوئے سیاح لڑکے اور لڑکیاں، وحشی خوشی کی بے جہت بلند گفتگو... ان سب کے پاس پناہ گاہیں تھیں جہاں رات ڈھلے وہ کافی، وائن اور بدن کی خوشبوؤں میں رچے واپس لَوٹ سکتے تھے اور میں دن بھر کی تھکاوٹوں اور رُک سیک کے بوجھ سے جُھکا ہُوا، بھُوک سے نڈھال انہیں رشک اور نفرت کی اُن نگاہوں سے دیکھ رہا تھا جیسے ایک بھُوکا شخص ریستوران کے اندر خوراک

پر جُھکے لوگوں کو دیکھتا ہے... میں نے داہنی طرف نگاہ کی۔ ان خوش باش لوگوں سے پرے ایک پہاڑی تھی جس کی اوٹ میں سے لوکارنو شہر کے چند مکان اور اُن کی سُرخ چھتیں دکھائی دے رہی تھیں اور اُن کے نیچے شاید وہ جھیل تھی، پام کے درخت تھے اور وہ جزیرے تھے جن کے گرد حدّت کی وجہ سے دُھند سی چھائی رہتی ہے... لوکارنو پھر مِس ہو گیا تھا۔

میں ان خوش نصیبوں کی مخالف سمت میں شہر سے باہر جانے والی سڑک پر چلنے لگا جیسے ایک کوڑھی بستی سے گریز کرتا ہُوا نکلتا ہے۔

میرا خیال تھا کہ دو تین کلومیٹر چلنے کے بعد میں کُھلی فضا میں آنکلوں گا اور کہیں بھی خیمہ نصب کر لوں گا مگر آبادی ختم ہی نہیں ہوتی تھی۔ مکان، فلیٹ، دفتر برابر ساتھ دے رہے تھے۔ البتہ سڑک پر ٹریفک برائے نام تھی۔ لوگ لوکارنو میں تھے... میرے دائیں جانب ایک بلند پہاڑی تھی۔ ایک ہلکی سی روشنی کا احساس ہُوا چوٹی کے گرد سیاہ بادل کا ایک ٹکڑا تھا۔ لمحوں میں وہ وبا کی طرح پھیلنے لگا، بجلی چمکنے لگی، بادل نیچے تک آگیا اور بارش شروع ہو گئی... ریلوے لائن کے پار ایک راستہ جا رہا تھا۔ میں بھیگتا ہُوا کسی بے آباد جگہ کی تلاش میں اُس پر اُتر گیا۔ سردی تھی... کہیں کہیں رہائشی مکان، کھڑکیاں بند، روشنی باہر آتی ہوئی مجھے اُن کے مکینوں کی عافیت سے چڑاتی ہوئی۔ ایک دو منزلہ مکان پر گارنے "رولینڈ" درج تھا اور برآمدے میں سومنگ کاسٹیوم پہنے ایک جوڑا بھیگتے آسمان کی طرف افسردہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"کیا آپ انگریزی جانتے ہیں"؟ میں نے سڑک پر سے پُوچھا۔

"ہاں... ہم انگریز ہیں... اگر تم رہائش کی تلاش میں ہو تو یہ ہوٹل بھی فُل ہے"۔ لڑکے نے میرے شرابور حُلیے پر ایک رحم آمیز نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

"میں تو یہ دریافت کرنا چاہتا تھا کہ یہاں آس پاس کوئی ایسی جگہ ہے جہاں میں اپنا خیمہ نصب کر سکوں"؟

"ہاں۔" لڑکی بارش میں بھیگتی ہوئی جنگلے کے اُس طرف آکھڑی ہوئی۔ "لوکارنو میں ایک بہت بڑی کیمپنگ سائٹ ہے، وہاں چلے جاؤ۔"

"وہ فُل ہے۔" میں نے بالوں میں تیرتے پانی کے لئے سر جھٹکا۔ "ویسے کیا یہ ممکن ہے کہ میں ہوٹل کے اس مختصر لان میں خیمہ لگا لوں؟"

"پتہ نہیں..." وہ تذبذب میں تھی۔ "پتہ نہیں... تم ٹھہرو میں ہوٹل کے مالک رولینڈ کو بُلاتی ہوں۔"

رولینڈ مُنہ میں سگار دباتے برآمد ہُوا پستہ قد اور بے حد فربہ... میں بارش میں کھڑا زبردستی مُسکراتا رہا اور وہ برآمدے کی پناہ میں اطمینان سے سگار پیتا رہا۔

"اتنی تیز ہوا میں اور اس بارش میں... لان میں خیمہ؟... اُڑ جائے گا۔"

"میں اس میں بیٹھا رہوں گا... نہیں اُڑے گا۔"

"بارش اتنی شدید ہے کہ تم خیمے میں بھی بھیگ جاؤ گے..."

"اس سے زیادہ نہیں جتنا میں اب بھیگ رہا ہوں۔"

رولینڈ سوچ میں پڑ گیا۔ انگریز جوڑے نے بھی شاید میرے لئے سفارشی کلمات کہے۔

"پاسپورٹ ہے؟"

میں نے جیب تھپکی۔

"سلیپنگ بیگ؟"

میں نے رُک سیک کی طرف اشارہ کیا۔

"لانڈری روم میں سو جاؤ گے؟"

"اگر اُس کی چھت ہے۔"

"آجاؤ۔"

لانڈری روم ایک مختصر سا تہہ خانہ تھا جس میں استری کرنے کی میز اور دُھلی ہوئی تہہ شدہ چادروں کا ایک انبار لگا تھا شیلفوں میں جام، پنیر اور چینی کے سینکڑوں پیکٹ

رکھے ہوئے تھے۔ فرش پر ایک چھوٹا سا غالیچہ تھا اور دُھلی ہوئی کپاس کی حدت تھی۔ ...ایک روشندان بھی تھا جس کے چوکھٹے میں سے سڑک پر سے گزرنے والوں کے پاؤں نظر آتے تھے... میں نے کپڑے اُتار کر تولیے سے اپنے آپ کو خشک کیا اور پھر سلیپنگ بیگ بچھا کر اُس پر لوگانو سے خریدشدہ روسٹ چکن کا ایک حصہ اور ڈبل روٹی کے دو ٹکڑے سجا کر بڑے اہتمام سے ڈنر کرنے لگا... کھانے سے فارغ ہو کر میں نے سگریٹ سُلگایا اور بیگ پر لیٹ گیا... چند لمحے پیشتر میں ایک بے سہارا، بھیگتا ہُوا بھُوکا بدن تھا اور اب ایک آسودہ حال اور محفوظ سیاح... میں مزے میں تھا۔

"ہیلو۔" روشن دان پر ایک بھُوری داڑھی جھُکی ہوئی تھی۔ "کیسے ہو؟"

"میں جھُول رہا ہوں مزے سے۔" پتہ نہیں کون تھا۔

"اگر تم فارغ ہو تو آؤ سیر کریں۔"

بارش ختم ہو چکی تھی۔ آسمان نہلاتے ہوئے بچے کی طرح صاف تھا۔ روشندان کے قریب ایک طویل قامت بھُوری داڑھی والا سخت بے ڈھنگا سا شخص کھڑا تھا۔

"میں فلِپ ہوں۔" اُس نے ہاتھ آگے کر دیا۔ "اسی ہوٹل میں رہتا ہوں، اُوپر والے کمرے سے تمہیں دیکھ رہا تھا... شام کی سیر کے لئے نکلا تو سوچا تمہیں بھی پُوچھ لوں اور تو کوئی میرے ساتھ چلنے پر رضامند نہیں ہوتا۔"

تھوڑی دیر کے بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ اُس کے ساتھ چلنے پر اور کوئی رضامند کیوں نہیں ہوتا۔ فلِپ ایک آپرا سنگر تھا اور لوکارنو کے کسی کلب میں بقول اُس کے "پرفارم" کرتا تھا۔ تمام فن کاروں کی طرح اُسے بھی گِلہ تھا کہ اُس کی قدر نہیں کی جاتی۔

"اگر وہ میرے ٹیلنٹ کو نہیں پہچانتے تو خسارہ اُن کا ہے..." وہ اپنی بھُوری داڑھی سنوارتے ہوئے بولتا چلا جا رہا تھا۔ "مجھے یقین ہے کہ اگر میں میلان یا دی آنا کے آپرا ہاؤس میں پرفارم کروں تو شائقین کی تالیوں سے اُن کی چھتیں اُڑ جائیں۔"

اُسے یہ بھی یقین تھا کہ وہ ماریا کالاس سے بھی اُونچے سُروں میں گا سکتا ہے چنانچہ

اُس نے ہاتھ لہرا کر اپنا گلا کھولا اور شروع ہو گیا۔ پورے دس منٹ تک میرے کان بھرے کرنے کے بعد بولا "کیسا ہے؟"

اگر میں کچھ دیر پہلے بھوکے پیٹ یہ گانا سُن لیتا تو یقیناً بیہوش ہو جاتا۔۔۔"

"دراصل آرکسٹرا کا ساتھ نہیں ہے اس لئے تاثر میں شدت پیدا نہیں ہو رہی۔"

اُس نے میری رائے کا قطعی بُرا نہ مانا اور متانت سے گفتگو کرتا رہا "آج رات گیارہ بجے میں لوکارنو میں پرفارم کروں گا، تم بھی چلو، میرے دوست کی حیثیت سے تمہارا داخلہ مُفت ہو گا۔"

عام حالات میں شاید میں اس نیم خبطی آپرا سنگر کے ساتھ دوستی گانٹھ لیتا کہ ایسوں کی رفاقت ہمیشہ پُر لطف رہتی ہے مگر میں واقعی تھک چکا تھا۔ میں نے معذرت کرتے ہوئے اُسے اپنا کارڈ دیا "زندگی میں جب تم میلان کے آپرا ہاؤس کی سٹیج پر پہنچنے میں کامیاب ہو جاؤ تو مجھے خط لکھنا، میں خاص طور پر تمہیں سُننے کے لئے پاکستان سے آ جاؤں گا۔"

"واقعی؟" فلپ کا چہرہ یوں دمک اُٹھا جیسے اُسے میرے وعدے پر مکمل یقین آ گیا ہو۔ مجھے پاکستان میں رہتے ہوئے ہمیشہ خدشہ رہا کہ کسی روز واقعی فلپ کا دعوت نامہ آ جائے گا۔

دُوسری صُبح رولینڈ مجھے کچن میں لے گیا "میں نے آج تک جس کسی کو بھی لانڈری روم میں سونے کی اجازت دی ہے، اگلی صُبح پنیر اور جام کے ایک دو ڈبے ہمیشہ کم ہو جاتے تھے۔ تم میرے پہلے غریب مگر ایماندار ٹورسٹ ہو اس لئے تم سے کرایہ بھی نہیں لوں گا اور ناشتہ بھی میری طرف سے۔۔۔"

ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے رولینڈ کی غیر متوقع مہمان نوازی کا شکریہ ادا کیا اور سامان اُٹھا کر ایک تر و تازہ چلبلاتے ہوئے جذبے کے ساتھ "اوہ کیا خوبصورت

صبح ہے" گنگناتا ہُوا باہر آ گیا۔۔۔ اور یہ ایک خوبصورت صُبح تھی۔ نیلگوں آسمان اور سُنہری ڈھلی ہوئی دُھوپ۔۔۔ میں بیلن زونا جانے والی سڑک پر آ کھڑا ہُوا اور رک سیک زمین پر رکھ کر میں ابھی گرد و پیش کا جائزہ لے رہا تھا کہ ایک سفید جیپ مجھے روندنے کی آرزو میں بال بال ناکام ہوتی ہوئی سڑک پر قدرے بے قابو ہو کر رُک گئی۔ مجھے صرف ایش بلانڈ بالوں کا ایک سر دکھائی دیا۔ اتنے میں وہ ایک جھٹکے سے دوبارہ سٹارٹ ہوئی اور بیک گیئر پر پوری رفتار سے میری طرف آنے لگی۔ میں اُچھل کر فٹ پاتھ پر چڑھ گیا۔

ایش بلانڈ بال جو کسی عمدہ ڈائی سے بلیچ کئے گئے تھے۔ گول پُر اسرار اشیر نما چہرہ جس پر ڈکار کئے گئے شکاروں کی طمانیت۔ ایک واجبی سی ناک اور اُتنا ہی غیر واجبی کُھلے دہانے کا مُنہ اور اُس میں پیلے پڑتے ہنستے ہوئے دانت۔ وہ ایک ڈھیلے ڈھالے فراک میں تھی۔ فراک کے اندر بھی مگر باہر زیادہ اور بہت سفید سفید۔ خواتین پہلوانوں کے مقابلوں میں اس قسم کے وجود دیکھنے میں آتے تھے۔ اُس نے اپنی وسیع ران پر ہاتھ مار کر اطالوی میں پتہ نہیں کیا کہا اور لوٹ پوٹ ہو گئی۔ میں اُسے ایک ایسے بچے کی طرح گُم سُم کھڑا دیکھتا رہا جو اپنے والدین کی کوئی ایسی حرکت دیکھ لیتا ہے جو اُسے بالکل نہیں دیکھنی چاہیئے تھی۔ اُس نے پھر اطالوی میں کچھ کہا اور ہارن پر ہتھیلی مار مار کر اشاروں سے سمجھایا کہ بیٹھو بیٹھو۔

میں بیٹھ گیا۔ اُسی لمحے جیسے کسی نے میرے سینے پر ہاتھ مار کر دھکا دے دیا ہو، میں پیچھے کی طرف گرا اور جیپ ایک گیلی شرلی کی طرح سڑک پر پٹاختی تیرنے لگی۔ یہ مہربان خاتون چیخ چیخ کر کوئی اطالوی گیت بھی گا رہی تھی جس کے دوران وہ خوش ہو کر کبھی دائیں ہاتھ سے اپنی ران پر تالی سی بجاتی اور کبھی بائیں ہاتھ سے میری ران پر۔۔۔ ہم زیادہ بلندی پر تو نہ تھے مگر بل کھاتی ہوئی سڑک پر یہ جھومتی ہوئی سفید جیپ اگر کسی بھی موڑ پر سیدھی چلی جاتی تو ہم بھی یقیناً۔۔۔ چلے جاتے۔ سپیڈو میٹر کی سُوئی

سو کلومیٹر کے ہند سے کے آس پاس منڈلا رہی تھی اور وہ گا رہی تھی اور ہارن بجا رہی
تھی اور اس کا ہلکا لباس ایک پیراشوٹ کی مانند بار بار اُوپر اُٹھ رہا تھا اور جب بھی
اُس کا لباس اُوپر اُٹھتا میں بھی اُوپر دیکھنے لگتا کہ نیچے کیسے دیکھتا.. خاتون یقیناً
"کاروباری" تھی اور لوکارنو میں کسی سیاح کی جیب ہلکی کر کے صبح صبح واپس آ رہی تھی۔
ایک دو مرتبہ جب اُس نے نہایت دل ہلا دینے والے انداز میں موڑ کاٹے تو میں نے
اُسے رُکنے کے لئے کہا مگر وہ اُسی طرح ہنستی رہی اور گاتی رہی۔ اگر ہم سڑک پر اب
تک موجود تھے تو کمال قسمت کا بھی نہ تھا، دوسرے ڈرائیوروں کا تھا... ایک دم
جیپ رُکی اور میں تقریباً چھلانگ مار کر باہر آ گیا... یہ بیلن زونا کا مرکز تھا اور وہ
فٹ پاتھ پر کھڑی ہنسے چلی جا رہی تھی۔

میں نے ڈرتے ڈرتے اپنا رُک سیک باہر نکالا کہ کہیں جیپ خود بخود پھر نہ
چل پڑے اور ابھی اپنے اعصاب درست کر رہا تھا کہ اُس کی دو "سہیلیاں" نمودار
ہو گئیں۔ اُن کی صبح بھی اُن کی رات کا فسانہ کہہ رہی تھی۔ اُنہوں نے پہلے تو میرا
بغور معائنہ کیا۔ میرے کندھے محسوس کئے، گالوں کو تھپتھپایا جیسے گھوڑا خرید رہی
ہوں اور پھر اپنی سہیلی کو مبارکباد دینے لگیں۔ گفتگو میں بار بار "لا آمور" یعنی محبت
کا ذکر آ رہا تھا۔ پھر سفید جیپ والی نے اُسی طرح ہنستے ہنستے شاید اُنہیں بتایا کہ
یہ شکار نہیں ہے، ایک غریب سیاح ہے۔ اس پر اُنہوں نے کمال اُلفت سے مجھے
دوپہر کے کھانے کی دعوت دی... میں نے اُن تینوں کے ورزشی جُثّوں کی طرف
دیکھا اور اپنی ناتوانی کا اظہار کرتے ہوئے اجازت چاہی جو بے حد مشکل سے ملی کیونکہ
وہ خدا حافظ کہنے کے تمام یورپی رواجوں پر صدق دل سے عمل کرنے لگیں اور بہت
زیادہ کرنے لگیں، یہاں تک کہ عوام نے اس فعل کو ناپسندیدگی سے دیکھنا شروع کر دیا۔
میں اپنے گیلے گیلے گال سہلاتا شہر سے باہر آیا اور ایک سروس سٹیشن کے سامنے
کھڑا ہو کر لفٹ کے لئے قسمت آزمائی کرنے لگا... میرے سامنے اُس سروس سٹیشن پر

درجن بھر کاروں کو نہلایا دُھلایا گیا اور پالش کی گئی اور میں لفٹ کی اُمید میں دوپہر
تک وہیں کھڑا سُو کھتا رہا۔ بالآخر سامنے کے فلیٹوں سے ایک کار نکلی اور سیدھی میرے
پاس آ گئی۔

"تم نے میری چھٹی کا دن برباد کر دیا ہے، اخبار بھی نہیں پڑھنے دیتے" سلیپنگ
سُوٹ میں ملبوس ایک نوجوان جس کی ہڈیوں پر مڑھنے کے لئے اللہ تعالےٰ نے کم سے کم
گوشت استعمال کیا تھا، مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ اب میں اس فقرے کا کیا جواب دیتا،
خاموش کھڑا رہا۔

"اب بیٹھ بھی جاؤ۔" اُس نے دروازہ کھول دیا۔

میں بیٹھ گیا۔

"میں سامنے والے فلیٹ میں رہتا ہوں۔" اُس نے ناگواری سے ناک چڑھائی
اور کار سٹارٹ کر دی۔ "آج صبح کھڑکی کے سامنے بیٹھ کر اخبار کھولا تو تم نظر آ گئے۔
اور پھر نظر آتے رہے، تم میرے اعصاب پر سوار ہو گئے۔ مجھے کوفت ہو رہی تھی کہ یہ
شخص یہاں سے چلا کیوں نہیں جاتا، مجھے اخبار کیوں نہیں پڑھنے دیتا... اب واحد
علاج یہی تھا کہ میں خود ہی تمہیں اپنی کار پر چند کلومیٹر آگے چھوڑ آؤں..."

ایک کراسنگ پر اُس نے کار روک دی۔ "کوہ الپس پار کرنے کے لئے یہاں سے
دو راستے نکلتے ہیں۔ دائیں طرف درّہ سان برناڈینو اور بائیں جانب سینٹ گوتھارڈ
... کس طرف ڈراپ کر دوں؟"

"کہیں بھی اُتار دیں، مجھے کچھ فرق نہیں پڑتا۔"

"عجیب سیّاح ہو۔" اُس نے جھلّا کر کہا۔ "پتہ ہی نہیں ہے کہ کس طرف جانا
ہے... جلدی فیصلہ کر دیں واپس جا کر اپنا اخبار پڑھنا چاہتا ہوں۔"

میں نے جیب میں سے ایک سکّہ نکال کر ٹاس کیا۔ سینٹ گوتھارڈ کی قسمت نیز نکلی۔
کراسنگ سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر اُس نے مجھے اُتار دیا اور میں ایک مرتبہ پھر

سڑک کے کنارے ایستادہ ہوگیا۔ اب میرے اور برن کے راستے میں صرف الپس کا سلسلۂ کوہ حائل تھا جسے مجھے پار کرنا تھا اور یہ اتنا مشکل کام بھی نہ تھا کہ ہنی بال نے درجنوں ہاتھیوں سمیت اسے عبور کر لیا تھا۔ ایک گھنٹے کے بعد احساس ہُوا کہ شاید الپس کو عبور کرنے کے لئے ہاتھیوں کی کمپنی بہت ضروری ہوتی ہے۔ اسے اکیلا شخص پار نہیں کر سکتا... ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ بیلن زونا کی طرف سے کبھی کبھار کوئی کار آتی اور مجھے کنارے پر اُگا ہُوا کوئی الپائن درخت سمجھ کر بغیر رُکے چلی جاتی... مزید ایک گھنٹہ گزر گیا اور اس دوران مجھے سگرٹ کی طلب ہوئی جو ختم ہو چکے تھے۔ میں نے صدقِ دل سے دُعا مانگی کہ یا اللہ اگر کسی ڈرائیور کے دل میں رحم کی گنجائش پیدا نہیں کر سکتا تو کم از کم ایک سگرٹ کا تو انتظام کر دے...

اگلی کار جو سڑک پر نمودار ہوئی، فوراً رُک گئی۔

ڈرائیور نے سر باہر نکال کر کہا "یہ راستہ سینٹ گوتھارڈ کو جاتا ہے یا سینٹ برناڈینو کو۔ ہم پچھلی کراسنگ پر سائن نہیں پڑھ سکے۔"

"سینٹ گوتھارڈ کو۔"

"شکریہ۔" ڈرائیور نے سگرٹوں کا ایک پیکٹ کھڑکی سے باہر معلق کر دیا "سگرٹ؟"

میں نے مشکور ہوتے ہوتے سگرٹ نکالا اور ساتھ ہی کار سٹارٹ ہو کر میری نظروں سے غائب ہو گئی۔ بہرحال ماچس میرے پاس تھی۔

"اب سگرٹ پلایا ہے تو لفٹ کا انتظام بھی کر دے... میں نے ایک طویل کش لے کر آسمان کی طرف دیکھا... آخری کش سے پہلے ہی یہ دُعا بھی پوری ہو گئی۔

ایک کھلونا نما چھوٹی سی ستران میرے قریب اس طرح آ کھڑی ہوئی جیسے میرا ذاتی شوفر اُسے میرے لئے وہاں لے آیا ہو۔ ڈرائیور نے بٹھانے کے لئے دروازہ نہیں کھولا۔ کھڑکی میں سے ہی پوچھا "چرس پیتے ہو؟"

"نہیں۔"

"اور سگرٹ؟"

"پیتا ہوں۔"

"تو پھر تم میری کار میں نہیں بیٹھ سکتے۔"

"کیا وہ موڑ کاٹتے ہوئے تمہارے دل میں یکلخت یہ خواہش پیدا نہیں ہوئی کہ میں سڑک کے کنارے کھڑے اس مسافر کو فوراً اپنی کار میں بٹھا لوں...؟"

اُس نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا "ہاں... میں نے..."

"تو پھر تم مجھے کار میں کیوں نہیں بٹھاتے، یہ تو خدائی احکام ہیں جو تم پر نازل ہوتے..." میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور اُسے اپنی تازہ ترین دُعا کی تفصیل بتائی۔

"بیٹھ جاؤ۔" اُس نے فوراً دروازہ کھول دیا "لیکن سگرٹ تم پھر بھی نہیں پی سکتے، یہ ہمارے خدائی احکام ہیں۔"

میں کُبڑا ہو کر چھوٹی سی ستران میں گھُس گیا۔

حجام کی دُکان سے برآمد ہونے والے کسی شخص کی طرح ڈینیل بے حد صاف اور نفیس مہک والا ایک لڑکا تھا جو آنیو کیمپنگ میں ہی چند روز گزارنے کے بعد اپنے گھر واپس جا رہا تھا۔ اُس کی گفتگو میں ایک مہذّب اور متین آہستگی تھی جو اُس کی عمر کے نوجوانوں میں کم ہی پائی جاتی ہے۔

"کیا تمہیں یقین تھا کہ لفٹ کے لئے تمہاری دُعا قبول ہو جائے گی؟" اُس نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

"ہاں... آں... بس۔"

"میں خود لارڈ پر شدید اعتقاد رکھتا ہوں، میں مارمونائٹ ہوں۔"

"اچھا... تو آپ عیسائی نہیں ہیں۔"

"عیسائی تو ہوں۔" وہ کہنے لگا "مگر مارمونائٹ عیسائی ہوں۔"

"اچھا... بہت خوب۔" کوئی وہابی اور دیوبندی قسم کا جھگڑا تھا۔

"تم امریکی پیغمبر جوزف سمتھ کے بارے میں آگاہ ہو؟"

"امریکی پیغمبر؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "میرا خیال تھا امریکہ میں صرف صدر ہوتے ہیں یا گینگسٹر ہوتے ہیں یا دونوں ہوتے ہیں۔"

"اگر تم پسند کرو تو میں تمہیں اپنے مذہب کے بارے میں کچھ بتاؤں۔"

میں بھلا ناپسند کیسے کرتا، اُس کی کار میں سوار تھا۔

"جوزف سمتھ ایک مقدس رُوح تھا۔ ایک روز عبادت کے دوران پیغمبر مورونی نے اُسے بشارت دی کہ مانچسٹر نیویارک کے قریب ایک پہاڑی کموراہ میں ایک صندوق دفن ہے جس میں دھات کی چند قدیم پلیٹیں موجود ہیں، اُنہیں تلاش کرو اور اُن پر کندہ قدیم عبارت کو انگریزی میں ترجمہ کر کے خلقِ خدا کے سامنے لاؤ۔ جوزف نے ایسا ہی کیا اور یوں ہماری "بُک آف مارمون" وجود میں آئی جو بیت المقدس میں مقیم ایک ایسے خاندان کی تاریخ ہے جو قبل از مسیح ہجرت کر کے جنوبی امریکہ میں آباد ہو گیا... ہمارے عقیدے کے مطابق مصلوب ہونے کے بعد حضرت عیسےٰ کا نزول جنوبی امریکہ میں ہُوا..."

"کمال ہے حضرت عیسےٰ امریکہ میں..." میں حیرت زدہ ہو گیا۔ "وہ وہاں کیا کرنے گئے تھے؟"

"اُن کا نزول ہُوا تھا" وہ سختی سے بولا۔ "ہم سمجھتے ہیں کہ بائبل کے ساتھ "بُک آف مارمون" پر ایمان لانے سے ہی انسان ایک مکمل عیسائی ہو سکتا ہے ورنہ وہ کافر ہے... پُوری دُنیا میں ہمارے لاکھوں ہم مذہب ہیں اور ہم اپنی عبادت گاہوں کو "ٹمپل" کا نام دیتے ہیں جن میں بڑے بڑے تالاب ہوتے ہیں اور ہم ان میں اپنے آپ کو ڈبوتے ہیں..."

"اچھا" میرا منہ کُھل گیا۔ "یعنی آپ زندگی کے آخری ایام میں اپنے آپ کو ڈبو لیتے ہیں اور سیدھے جنت میں چلے جاتے ہیں۔"

"نہیں، ایسا نہیں۔" ڈینئل ایک بھینچے ہوئے بیر کی مانند میری کم علمی پر مُسکرایا۔ "ہم سمجھتے ہیں کہ جب تک کوئی شخص بپتسمہ نہیں ہوتا اُس کی بخشش ناممکن ہے... بپتسمہ سمجھتے ہو؟ جان دی بیپٹسٹ مسیح کی ولادت سے پیشتر عوام کو دریائے اردن میں غسل دے کر آنے والے پیغمبر کے لئے پاک کرتے تھے... چنانچہ بپتسمہ کے بغیر کوئی شخص بخشا نہیں جا سکتا۔ چنانچہ اب سوال یہ ہے کہ دُنیا کی موجودہ آبادی تو بپتسمہ ہو کر بخشی جائے گی لیکن ہمارے آباؤ اجداد کا کیا بنے گا جو عیسائیت کی آمد سے پیشتر اس دُنیا میں رہتے تھے، اُن بے چاروں کا کیا ہو گا..."

"ہاں... واقعی اس کے بارے میں سوچنا پڑے گا۔"

"چنانچہ ہم میں سے ہر ایک اپنے اُن رشتہ داروں کے لئے مقدس پانی میں ڈبکیاں لگاتا ہے... ایک رشتہ دار کے لئے ایک ڈبکی... میں فی الحال آج سے تین ہزار سال پیشتر پیدا ہونے والے رشتہ داروں کو تو بخشوا چکا ہوں، باقی تقریباً سات ہزار سال والے رہ گئے ہیں... برن کے نواح میں ہمارے ٹمپل کی عمارت ہے اور میرا باپ اُس کی دیکھ بھال پر مامور ہے۔"

"انشاءاللہ کبھی آپ کے تالاب میں نہانے کے لئے آئیں گے۔" میں نے خوشدلی سے کہا۔

"نہیں۔" وہ درشتگی سے بولا۔ "غیر مذہب کے لوگ ہمارے ٹمپل میں داخل نہیں ہو سکتے۔"

میں نے اپنی مایوسی ظاہر کرنے کے لئے ایک لمبی "اوہ" کی۔ شدید مذہبی ہونے کے باوجود ڈینئل بہت ہی عمدہ رفاقت تھا۔

مجھے خُنکی کا احساس ہُوا۔ باہر نگاہ کی تو سڑک کے دونوں طرف برف کی دبیز دیواریں تھیں اور اُن کا پانی پگھل پگھل کر تارکول پر پھیل رہا تھا۔ کار آہستہ آہستہ اُوپر اُٹھتی رہی۔ پھر ایک گلیشیئر شروع ہو گیا اور بالآخر ہم برف سے ڈھکے ہوئے درّہ سینٹ گوتھارڈ کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ ڈینئل نے کار پارک کر دی۔ باہر یخ بستہ ہوا تھی۔

مگر اُس میں آکسیجن اتنی کم تھی کہ سانس لینا محال ہو رہا تھا۔ میں نے کپکپاتے ہاتھوں سے اپنی جیکٹ کے تمام بٹن بند کئے مگر ہوا تھی کہ مجھے ننگا کئے دیتی تھی گلیشیر میں سے پگھلتے پانی کا ٹپکتا شور تھا اور میں اس بلند درّے پر تھا اور دوسری طرف نیچے کہیں برن کا شہر تھا... میں نے درّہ سینٹ گوتھارڈ کی چوٹی پر واقع ریستوران سے جپسی کو فون کیا۔

جپسی

یہ بھی اُنہی دنوں کا قصہ ہے جب نوخیز جسم سرحدیں عبور کرتا ہے۔ اوّلین تجربوں اور محبتوں کی کسک سے خائف بھی رہتا ہے اور اُس کا لُوں لُوں اُن کی خواہش بھی کرتا ہے۔ وہ ان گرم اور رِستے احساسات کی بُخار آلود دُھند میں ہر منظر ہر بدن کے اندر جانا چاہتا ہے۔ یہ وہی دن تھے جب ہر درخت سرسبز لگتا ہے اور ہر بطخ راج ہنس کی صورت دکھائی دیتی ہے اور جپسی تو تھی ہی راج ہنس وہ مجھے پتہ نہیں کیا دکھائی دی۔

پہاڑوں کی تاریک رات میں میں نے اپنا خیمہ ٹٹول ٹٹول کر نصب کیا کیمپنگ سائٹ میں خاموشی تھی اور پانی کے چلنے کی سرگوشی اور ایک ہوا جس میں برف کی خنکی تھی... یہ سوئٹزرلینڈ سے میری پہلی ملاقات تھی اور ایک کار ڈرائیور نے رات کی سیاہی میں مجھے جانے کہاں اُتار دیا تھا... صبح نے روشنائی دی تو میں نے دیکھا کہ یہ انٹرلاکن تھا اور میرا خیمہ جھیل برینز اور جھیل تھُن کو ملانے والی نہر کے کنارے ایک سرسبز ڈھلوان پر ایک سُست پرندے کی طرح پَر سمیٹے بیٹھا تھا۔ سامنے نہر کے پار شہر اور اس سے پرے ینگ فراؤ یعنی سفید دُلہن، ایک برف پوش پہاڑ۔

دوپہر کے کھانے کے لئے میں کیمپنگ کے کافی ہاؤس میں چلا گیا۔ مینو پر درج نام بدمزہ یورپی خوراکوں کے تھے۔ "کیا آپ کے پاس چاول وغیرہ نہیں ہیں؟" ویٹرس نے نفی میں سر ہلایا اور مجھے گیلی مچھلی کا ایک سینڈوچ دے گئی۔

پچھلے پہر میں نے شہر دیکھا، جھیل دیکھی۔

دوسرے روز میں نے سامان باندھا اور کافی ہاؤس میں آگیا۔ روانگی سے پیشتر میں کچھ کھا لینا چاہتا تھا۔ ویٹرس نے اس مرتبہ کمال مہربانی سے مینو میرے سامنے رکھا اور مسکراتے ہوئے آخری سطر پڑھنے کو کہا۔ اُبلے ہوئے چاول اور ہنگیرین گولاش ... صرف پاکستانی مسافر کے لئے۔" یہ یقیناً ایک انتہائی خصوصی توجہ تھی اور میں نے کھانے سے فارغ ہو کر ویٹرس کا خصوصی شکریہ ادا کیا۔ وہ مسکراتی رہی اور کاؤنٹر کی طرف دیکھتی رہی۔ میں ادائیگی کے لئے کاؤنٹر پر آگیا۔

"کیا آپ نے اپنی ملکی خوراک کو پسند کیا؟"

"جی ہاں، شکریہ۔"

"آپ کل بھی اسے مینو پر پائیں گے۔" کیشئر لڑکی نے کاروباری انداز میں کہا۔

"شکریہ لیکن کل تو میں یہاں نہیں ہوں گا، میں جا رہا ہوں۔"

"لیکن آپ نہیں جا سکتے ..." اُس کے لہجے کی کرختگی اُبھری اور یکدم وہ نرم پڑ گئی۔ "وہ ... میرا مطلب ہے آپ نے یہ شہر مکمل طور پر تو دیکھا ہی نہیں۔ ہم سوِس بھی برنیز اُوبرلینڈ کو ملک کا خوبصورت ترین حصّہ قرار دیتے ہیں۔"

میں نے اُسے بتایا کہ میں انٹرلاکن مکمل طور پر دیکھ چکا ہوں اور رُک سیک اُٹھا کر باہر آنے کو تھا کہ وہ اپنا کام چھوڑ کر کاؤنٹر سے باہر نکل آئی ... سیاہ بال اور آنکھیں ایک تاریک گہرائی جو کبھی نہیں چمکتی، ہمیشہ بُجھی رہتی ہے۔ اس کے خدوخال سوِس کی بجائے اطالوی تھے اور رنگت بھی برف سفید کی بجائے گاڑھے الپائن دُودھ ایسی۔ وہ اتنی صحت مند تھی کہ انسان دیکھتے ہوئے شرمندہ سا ہو جاتا تھا۔ اس معاملے میں وہ قدرے بے قابو سی لگتی تھی۔ مجھ سے عمر میں بھی دو تین سال بڑی ہو گی۔ "آپ کو معلوم ہے کہ آج رات جھیل تھُن کے کنارے آتشبازی چھوڑی جائے گی، اُسے دیکھے بغیر تو آپ یہاں سے جا ہی نہیں سکتے۔" وہ جلدی سے بولی۔

میں نے شدید اُکتاہٹ سے اُس کی طرف دیکھا۔ وہ ہاتھوں کی اُنگلیاں ایک دوسرے میں پھنساتے ایک کُند ذہن طالب علم کی طرح کھڑی تھی۔

"میں آتشبازی میں کچھ زیادہ دلچسپی نہیں رکھتا۔"

"لیکن یہ جھیل تھُن کے کنارے ہو گی، پانی کے عین اُوپر۔"

"اب رات کے بارہ بجے کون دھکے کھاتا پھرے ..." میرا لہجہ کسی سوِس گلیشیئر سے بھی سرد تھا۔ "اور پتہ نہیں اتنی طویل جھیل کے کونسے مقام پر یہ تماشا ہو گا میں تو راستہ بھی نہیں جانتا ..."

"میں جانتی ہوں ... میں لے چلوں گی۔ رات بارہ بجے ادھر کافی ہاؤس کے باہر آجائیے گا!" وہ جیسے ایک شاہی فرمان پڑھ کر فوراً کاؤنٹر کے پیچھے جا کھڑی ہوئی اور گاہکوں سے بل وصول کرنے لگی۔

دوبارہ خیمہ لگاتے ہوئے میں شدید غصّے اور بے چارگی میں مُبتلا رہا کہ آخر یہ سوِس لڑکی تقریباً تشدد کے ذریعے ہی کیوں مجھے یہ آتشبازی وغیرہ دکھانا چاہتی ہے۔ میں نہیں دیکھنا چاہتا تو کیوں دکھانا چاہتی ہے ... انکار میں اس لئے نہ کر سکا کہ اُس نے تو مجھے مُہلت ہی نہ دی۔ بس فرمان پڑھ دیا۔

اُس رات بارہ بجے میں ایک طویل میدان میں تقریباً دوڑتا ہُوا چل رہا تھا میرے لئے یہ میدان اس لئے تھا کہ اردگرد تاریکی اتنی گھنی اور گاڑھی تھی کہ کچھ نظر نہ آتا تھا۔ میرے ٹخنے اور گھُٹنے پتھروں سے چھل چکے تھے اور ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ ایک ندی کو عبور کیا پھر کوئی کوہستانی راستہ آگیا۔ میرا سانس پھُول رہا تھا ... البتہ وہ سیاہ بالوں والی خاتون بڑی لاپروائی سے میرے آگے آگے چلی جا رہی تھی۔ کبھی کبھار رُک کر پیچھے دیکھ لیتی کہ میں فرار تو نہیں ہو گیا اور پھر ایک قدرے صحت مند ہرنی کی مانند قلانچیں بھرتی پتھروں اور چشموں کو پھلانگتی چل دیتی۔ اُسے شاید تاریکی میں بھی نظر آتا تھا... بالآخر ہم اُس مقام پر پہنچ گئے جہاں آتشبازی کا مظاہرہ ہونا تھا۔ ہر طرف خاموشی تھی

اور جھیل کی سطح تاریک تھی۔ اُس نے ہاتھ اپنے کولہوں پر رکھے اور وہاں ہاتھ رکھنے کے لئے خاصی جگہ تھی اور تیزی سے بولی "میرا خیال ہے آتشبازی ختم ہو چکی، آؤ واپس چلیں۔" اس سے پیشتر کہ میں سانس درست کرنے کی مہلت مانگتا وہ پھر تاریکی میں تاریک ہو رہی تھی... ٹھوکریں کھاتے، گرتے پڑتے اور اپنی زندگی سے بیزار ہوتے ہوتے جب میں واپسی کی دوڑ میں تھا تو ایک خیال میرے ذہن میں تیرا کہ یہ لڑکی یا تو فاترالعقل ہے اور یا کوئی بدرُوح ہے بلکہ بدرُوح ہی ہے جو اندھیرے میں بھی بخوبی دیکھ سکتی ہے۔

کیمپنگ کے قریب برف پوش ینگ فرا کے سائے میں ایک سبزہ زار تھا وہاں ایک سفید پتھر کی نشست تھی، میں اُس پر ڈھیر ہو گیا۔ سبزہ زار کے درمیان دونوں جھیلوں کو ملانے والی نہر بہہ رہی تھی۔ اُس نے بڑے اطمینان سے نہر کے کنارے پر جا کر منہ ہاتھ دھویا اور برفیلے پانی میں پاؤں اُتار کر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد میں ایک اُبلتے ہوئے انتقامی جذبے کے تحت اُٹھا اور اُس کے قریب جا کر لیٹ گیا۔

وہ کچھ بولی نہیں۔

وہ بہت صحت مند تھی۔

"گھاس بہت ٹھنڈی ہے۔" بالآخر اُس نے سرگوشی کی۔

"ہُوں۔"

درختوں کی تاریک اوٹ میں سے ایک روشن کشتی یوں چلی آئی جیسے گھاس پر رواں ہو کہ نہر کا پانی لیٹے ہوئے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"کشتی میں سوار لوگوں نے تو ہمیں نہیں دیکھا ہو گا..." وہ دبی ہوئی بولی۔

"نہیں"۔ اوّلین تجربوں کی حدّت جسم کو چھوڑ رہی تھی۔ میں اُٹھا اور سفید نشست کی جانب چلنے لگا۔ مزید تھکاوٹوں سے میرا جسم ٹوٹ رہا تھا۔ کیا یہ سب کچھ ایسا ہی ہوتا ہے اور بس اتنا کچھ ہی ہوتا ہے... ایک جگہ گھاس کے نیچے کیچڑ تھا، میں نے

بمشکل اپنا پاؤں باہر نکالا اور نشست پر بیٹھ کر کیچڑ سے بھرے ہوئے بُوٹ کے تسمے کھولنے لگا۔

"میں کھولتی ہوں۔" اُس نے میرا ہاتھ بُوٹ سے ہٹا دیا۔

اُس نے بُوٹ اور جراب کو میرے گیلے پاؤں سے اتنی نرمی سے علیحدہ کیا جیسے عبادت کر رہی ہو، پھر نہر سے پانی لا کر اُنہیں دھونے لگی۔ میں اپنا ننگا پاؤں نشست کے سرد پتھر پر رکھے اُسے حیرت سے تکتا رہا۔ جراب پہنانے سے پیشتر اُس نے میرا پاؤں اپنی گود میں رکھا اور اُس پر جُھک گئی۔ اُس کے لبوں کی نمی محسوس کرتے ہی میں خوف زدہ ہو گیا۔

"تم ہو کون؟"

"جپسی"۔ اُس نے سر اُٹھا کر میری طرف دیکھا، اندھیرے میں اُس کی آنکھیں بُجھتی ہوئی دِیا سلائی کی طرح لَو دے رہی تھیں۔

"تم یقیناً سوچ رہے ہو گے کہ یہ لڑکی کسی ذہنی مرض کا شکار ہے۔"

"نہیں"۔ میں نے فوراً کہا حالانکہ میں یہی سوچ رہا تھا۔

"اور تم یہ بھی سوچ رہے ہو کہ میں بہت ہی آسان اور بُرے اخلاق کی لڑکی ہوں۔"

"بالکل نہیں۔" میں یہ بھی سوچ رہا تھا۔

"مجھ سے جھوٹ مت بولو، میں جانتی ہوں۔" وہ پھر سے میرے پاؤں پر جُھکنے لگی "لیکن مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تم میرے بارے میں کیا سوچتے ہو، کیونکہ اب تم میرے ہو۔"

میں نے اپنا پاؤں کھینچ لیا۔

"اور تم مجھ سے ڈرتے بھی ہو۔ سُنو کل دوپہر جب تم کافی ہاؤس میں داخل ہوئے میں نے تمہیں دیکھا اور اُس لمحے کے بعد میرے تمام اختیار زندگی اور بدن کے ہارے ہوئے کہ میں نے تمہیں پہچان لیا تھا... میری دادی نے بتایا تھا کہ جپسی اپنی

زندگی میں صرف ایک شخص سے محبت کرتی ہے اور وہ جب بھی اس کے سامنے آجائے اُسے پہچان جاتی ہے۔

"تمہاری دادی کون تھی؟"

"جپسی"۔ اُس نے مختصراً کہا۔

"اور آج رات جھیل تھن پر کوئی آتشبازی نہ تھی؟"

"اگر میں جھوٹ نہ بولتی تو تم چلے جاتے"۔ وہ پہلی مرتبہ مسکرائی "اور میں تمہیں جانے نہیں دوں گی"۔

"اور اگر میں اس کے باوجود چلا جاتا تو؟"

"تو میں تمہارا پیچھا کرتی، میں نے تمہارے پاسپورٹ اور کیمپنگ کارنٹ سے تمہارا لندن کا پتہ نوٹ کر لیا تھا"۔

ڈریسنگ فراک کے سفید دامن میں گلابی روشنی کا ایک بے آواز جھماکا ہوا اور چند لمحوں میں تیز برفانی ہوا چلنے لگی۔ وہ میرے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی "میرے دادا نے ہنگری کی ایک جپسی سے شادی کر لی تو والدین نے خانہ بدوش خون کی مخالفت میں انہیں گھر سے نکال دیا۔ وہ دونوں تنگدستی میں ہی مر گئے مگر ایک دوسرے کے ساتھ شدید محبت کرتے ہوئے۔ میرا باپ بالکل سوِس ہے، سنہری بال اور سُرخ و سفید کاربلی چہرہ اور میرے دو بہن بھائی بھی۔ لیکن میں —— جپسی ہوں اپنی دادی کی طرح اور میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔"

یہ صورتِ حال ایک اٹھارہ سالہ لڑکے کے لئے جسے ہفتے میں ایک آدھ بار ہی شیو کرنے کی حاجت پیش آتی تھی، بے حد اُلجھی ہوئی تھی اور مجھے وہ فی الحال اتنی اچھی بھی نہیں لگ رہی تھی۔

"میں تمہیں ابھی اچھی نہیں لگتی"۔ وہ جیسے میرے خیال کو آگے بڑھاتی ہوئی بولی۔

"لیکن تم دیکھو گے کہ میں لگوں گی"۔

وہ بَرن یونیورسٹی کی طالبہ تھی اور گرمیوں کی چھٹیوں کے دوران کیمپنگ کے کافی ہاؤس میں کام کر رہی تھی۔

"میں تمہیں نہیں جانے دوں گی"۔ میرے سینے پر پھیلتا سانس ایک بچے کا تھا جو مدتوں کھلے آسمان تلے گھومتا رہا اور اب گھر کی چوکھٹ پر منہ رکھے پناہ میں تھا۔

میں سارا دن خیمے میں سویا رہتا اور شام ڈھلے تیار ہو کر سبزہ زار کے بیچ بہتی نہر کے کنارے سفید نشست پر جا بیٹھتا۔ جپسی ڈیوٹی سے فارغ ہوتے ہی آجاتی۔ یہ عجیب بات تھی کہ وہ دن میں ہمیشہ بجھی بجھی اور ایک یتیم بچے کی اُداسی لئے ہوتی اور رات کی تاریکی میں اُس کی آنکھیں لَو دینے لگتیں۔ وہ واقعی مجھے اچھی لگنے لگی تھی لیکن میں انٹرلاکن میں کتنے روز پڑا رہتا۔ مجھے چھٹیوں کے خاتمے سے قبل جرمنی اور ہالینڈ کے راستے واپس لندن پہنچنا تھا۔ پانچویں روز میں نے خیمہ سمیٹ لیا۔ کیمپنگ کے دفتر میں جا کر کرایہ ادا کیا اور اپنا پاسپورٹ مانگا۔ منیجر نے فون اُٹھا کر جرمن میں کچھ کہا اور پھر دراز میں سے پاسپورٹ نکال کر میرے حوالے کر دیا۔

دفتر کے باہر جپسی تھی اور اُس کے ہاتھ میں ایک بیگ تھا۔

"میں کافی ہاؤس کی طرف ہی جا رہا تھا تمہیں خدا حافظ کہنے..."

وہ نچلا ہونٹ دباتے ہوئے مسکرا دی جیسے میں نہیں جا رہا تھا حالانکہ میں جا رہا تھا۔

"جرمنی جانے کے لئے تمہیں بَرن جانا ہوگا اور بَرن میں میرا گھر ہے۔ میں اپنے والدین سے مل لوں گی"۔

بَرن کے سٹیشن پر جپسی نے مجھے انتظار کرنے کو کہا اور اس سے پیشتر کہ میں کچھ پوچھتا وہ غائب ہو گئی۔ تین گھنٹوں کے بعد وہ واپس آئی تو میں اُسے پہچان نہ پایا۔ وہ ایک راج ہنس لگ رہی تھی۔ تازہ سیٹ کئے ہوئے بال، سِلک کا سفید لباس اور سمور کی شال، اُس کے ہاتھ میں اب ایک نیا سوٹ کیس تھا۔

"تم مجھے کسی کیمپنگ میں چھوڑ کر اپنے والدین سے مل آؤ"۔

"میں اُنہیں مل کر آ رہی ہوں۔ آؤ میں تمہیں کیمپنگ میں چھوڑ آؤں۔"

برن کے مشہور گھڑیال کے پہلو میں ایک قدیم سڑک ہے جس پر جھکی عمارتیں اور برآمدے چودھویں صدی کے سوئٹزرلینڈ کی یادگار ہیں۔ اُن کی ساخت میں ردّ و بدل کرنا خلافِ قانون ہے۔ وہ فوارے بھی موجود ہیں جن کے تالاب میں جانور پیاس بجھاتے تھے۔ جیسی اس سڑک پر کھلتے ایک ہوٹل "ایڈلر" میں چلی گئی۔ کاؤنٹر پر اپنا نام پتہ لکھا اور دوسری منزل پر واقع کمرے کا دروازہ کھول کر بولی۔ "کیمپنگ"۔

ہم دن کے وقت بہت کم باہر نکلتے کیونکہ باہر برن تھا اور کسی بھی موڑ پر اُس کا کوئی جاننے والا یا رشتہ دار مل سکتا تھا۔ رات کو ہم پتھریلی گلیوں میں ایک ہو کر چلتے یا بڑے پُل کے عین نیچے لبِ دریا ایک ریستوران میں جا بیٹھتے۔ میرے ساتھ اُس کا برتاؤ اس قسم کا تھا جیسے ہم ایک عرصے سے ساتھ رہ رہے ہوں بلکہ اولاد کو بیاہ کر اب ریٹائرڈ زندگی بسر کر رہے ہوں۔ وہ ایک نوکرانی کی طرح میری خدمت کرتی اور ایک حاکم کی طرح میرے بارے میں فیصلے کرتی۔ اُس کے اندر صرف دو جذبے تھے، محبت اور حسد۔ وہ میری طرف ایک نظر دیکھنے پر راہ چلتی لڑکیوں کے گلے پڑ جاتی۔ میں جس شے کے بارے میں بھی پسندیدگی کے کلمات ادا کرتا وہ اُس کے ساتھ اپنی نفرت کا اظہار کر دیتی۔ اُن دنوں میرے پاس ایک سیاہ جیکٹ تھی جو میں دن رات پہنے رہتا۔ ایک رات ہوٹل واپسی پر اُس نے وہ جیکٹ حسبِ معمول میرے کندھوں سے اتاری اور کھڑکی سے باہر پھینک دی... وہ شیو کرتے ہوئے بھی مجھے دیکھتی رہتی۔

ایک رات ہم دریا کے پار ایک پہاڑی سیرگاہ میں گئے۔ میں نے اُسے سمجھایا۔ "میں تم سے شادی نہیں کر سکتا۔ مجھے ابھی اپنی تعلیم مکمل کرنی ہے۔ میں ہمیشہ کے لئے سوئٹزرلینڈ میں نہیں رہ سکتا۔ مجھے یہاں سردی لگتی ہے اور میں ابھی بہت چھوٹا ہوں۔"

"تم بڑے ہو جاؤ گے تو میں بوڑھی ہو جاؤں گی..." اُسے عمروں کے فرق کا شدید احساس تھا حالانکہ مشکل سے اکیس برس کی تھی۔

"مجھے جانے دو، کرسمس کی چھٹیوں میں پھر آ جاؤں گا، ضرور!"

وہ اپنے آس پاس سے بے خبر ہو گئی۔ وہ ابھی سے کرسمس کے گیت اور سُریلی گھنٹیاں سُن رہی تھی۔ "سُنو"۔ وہ تھوڑی دیر بعد بولی۔ "یہاں نہیں... میں سلمانکا یونیورسٹی میں ہسپانوی سیکھنے کے لئے ایک مختصر کورس میں داخلہ لے رہی ہوں، تم سپین آ جانا... اور پھر میں تمہارے ساتھ ہی لنڈن واپس چلی جاؤں گی۔"

اگلے روز میں سامان پیک کر رہا تھا تو وہ چپکے سے باہر چلی گئی۔ واپس آئی تو اُس نے سیاہ چمڑے کی ایک جیکٹ پہن رکھی تھی جس کے بٹن بند نہیں ہو رہے تھے۔

"یہ میری طرف سے۔" اُس نے جیکٹ اُتار کر مجھے پہنا دی۔

مجھے احساس ہوا کہ اب تک کسی بھی مقام پر اُس نے مجھے ایک پیسہ خرچ کرنے کی اجازت نہیں دی۔ ہوٹل کا بِل بھی اُسی نے ادا کیا، حاکمیت کے ساتھ۔

سٹیشن جاتے ہوئے میں ایک شوکیس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ "اگر تمہیں یہ سویٹر پسند ہے تو میں خرید دیتا ہوں۔"

"یہ مجھے پورا نہیں آئے گا۔"

"اور سائز بھی تو ہوں گے۔"

"میرا سائز نہیں ہو گا، میں بہت بڑی ہوں، بالکل سوِس گائے... تم نہیں جانتے؟"

"بہرحال..." میں نے شرمندہ ہو کر کہا۔ "میری خواہش تھی کہ میں تمہیں کچھ دُوں"۔

وہ رُک گئی۔ "کیا تم مجھے اپنا بچّہ دے سکتے ہو؟"

میں بھی رُک گیا... وہ میری طرف اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے کوئی وِچ ڈاکٹر جادوئی پھونک مارنے سے پیشتر مریض کو دیکھتا ہے۔ سیاہ اور حکم دیتی ہوئی آنکھیں۔ "کیا تم میرے لئے اتنا بھی نہیں کر سکتے؟" میرے بازو میں کھُبتی اُنگلیاں مجھے اذیت دینے لگیں۔ "میں اُسے شہزادوں کی طرح پالوں گی۔" وہ اس وقت ایک تہذیب یافتہ سوِس لڑکی نہیں لگ رہی تھی اور وہ تھی بھی نہیں، وہ جیسی تھی،

اپنے قدیم جذبوں کی نگہبانی کر رہی تھی، کہیں وہ اِن جدید بستیوں میں کھو نہ جائیں۔۔۔ میں اُس کی یہ "بچگانہ" خواہش پوری نہ کر سکا۔

سٹیشن پر الوداع کہتے ہوئے وہ ہاتھوں کی اُنگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے ایک کُند ذہن طالب علم کی طرح کھڑی رہی۔

ولایت میں ہر صبح میری ناشتے کی میز پر اخبار کے علاوہ ایک سوئٹزرلینڈ کے ٹکٹوں والا لفافہ ضرور موجود ہوتا۔

کرسمس کی چھٹیاں آ گئیں اور پھر کرسمس بھی۔ شدید برفباری میں سب طالب علم پرنسپل کے گھر گئے جہاں روسٹ ٹرکی اور کرسمس پڈنگ کا روایتی ڈنر ہمارا منتظر تھا اور اُس کی بیٹیاں پیانو پر کرسمس کیرل گا رہی تھیں۔۔۔ جیسی سلمانکا میں تھی جو بہت دُور تھا۔

ناشتے کی میز پر رکھے خطوط قدرے بے قاعدہ ہونے لگے۔ میں کبھی کبھار ہی جواب دیتا۔ اگلے برس جیسی کا ایک طویل خط آیا۔ میں فلاں تاریخ کو ایک اطالوی بزنس مین کے ساتھ شادی کر رہی ہوں، اگر تم اب بھی آ جاؤ تو۔۔۔ میں نے اس خط کے جواب میں جیسی کو اُس کی آئندہ شادی شدہ زندگی کی مسرتوں کی خواہش کا ایک تار روانہ کر دیا۔۔۔ اب ناشتے کی میز پر صرف اخبار میرا منتظر ہوتا۔۔۔ اُس کے اگلے برس میں پاکستان لَوٹ آیا۔

ایک کرسمس تھی، سلمانکا کی کرسمس کے چھ برس بعد۔۔۔ میں نے مختلف یورپی دوستوں کے نام مبارکباد کے کارڈ روانہ کیے۔ ڈائری میں جیسی کا پتہ بھی موجود تھا۔ جنوری میں اُس کا خط آیا۔ میں فروری میں تمہیں ملنے کے لیے پاکستان آ رہی ہوں اور وہیں رہنے کے لیے۔

لاہور ائیرپورٹ پر جیسی اُتری تو اُس کی کلائیوں میں ایک ایرانی وزیر اعظم کی پیش کردہ درجن بھر سونے کی چوڑیاں تھیں اور انگلیوں میں مشرقِ وسطیٰ کے کسی

شہزادے کی دی ہوئی ہیروں کی متعدد انگوٹھیاں۔ وہ اب اپنے کروڑپتی باپ کے ساتھ بزنس پارٹنر تھی اور کاروبار کے سلسلے میں دُنیا کے مختلف ممالک میں آتی جاتی رہتی تھی۔ اُس کی شباہت اب بھی جپسیوں کی سی تھی مگر نشست و برخاست کے انداز نیم شاہانہ تھے۔ میں تمہارے موٹر سائیکل پر نہیں بیٹھ سکتی۔ فروری کے مہینے میں زکام آسانی سے لگ جاتا ہے۔ تم اتنے بوسیدہ اور تنگ گھر میں کس طرح سانس لیتے ہو، اس ملک میں اتنی دُھول ہے کہ میرے پھیپھڑے متاثر ہو جائیں گے۔ وہ ہمہ وقت گھڑی کی طرف دیکھتی رہتی۔ اُس کی آنکھوں میں لگے ہوئے کانٹیکٹ لینز میں بھی شاید وقت بتانے کا کوئی آلہ نصب تھا۔۔۔ اُن دنوں میرا خالہ زاد بھائی ساجد نذیر حسبِ عادت ایک کار کریش میں ٹانگ تڑوا کر بستر میں لیٹا اپنی ماں سے خدمتیں کروا رہا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جیسی کو دیکھ کر وہ مُسکراتے ہوئے اُٹھنے کی کوشش کرنے لگا "ہیلو" اور پھر پلستر میں بندھی ٹانگ کی طرف اشارہ کر کے معذرت کی۔ جیسی اُس کے پاس بیٹھی رہی اور بے تحاشہ ہنستی رہی۔ اُس نے ساڑھی بھی پہنی اور پھر میری بہنوں کے ہمراہ بانو بازار چاٹ کھانے بھی گئی۔

لاہور ائیرپورٹ پر اُس نے مجھ سے ایک زبردست ہینڈ شیک کیا "سوری میں یہاں نہیں رہ سکتی۔ تم اگر سوئٹزرلینڈ آ جاؤ تو میں تمہیں اپنی آرگنائزیشن میں ایک باوقار نوکری دے سکتی ہوں۔ تم اس گاڈ فارسیکن ملک میں پتہ نہیں کیا کر رہے ہو۔"

"اس ملک میں وہ گھر ہے جس کے فرش صاف کرنے اور برتن دھونے کی تمہیں آرزو تھی۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بچپن میں انسان کیا کچھ نہیں کہتا۔" وہ گھڑی پر سے نظریں ہٹا کر قہقہہ مار کر ہنس دی "لیکن میں یہاں آ کر مایوس ہوئی ہوں۔ تم بھی ایک مختلف انسان نظر آتے ہو۔۔۔ سوری میری فلائٹ کا وقت ہو گیا ہے۔۔۔" تاریکی میں دیکھنے والی لڑکی اب دن کی روشنی سے واقف ہو چکی تھی۔

چار برس بعد میرے پاؤں کا جنون مجھے سوئٹزرلینڈ لے گیا۔ برن کے کوچہ و بازار میں سے بھی گزر ہوا۔ آخری روز میں نے یونہی جلپسی کو فون کیا، وہ ناراض ہو گئی۔ "تمہاری بچوں ایسی حرکتیں مجھے سخت ناپسند ہیں۔ تم نے برن پہنچتے ہی مجھے کیوں فون نہیں کیا... کیا اب ہم دوست بھی نہیں ہیں؟ تمہیں مزید ٹھہرنا ہو گا۔" اُس کی حاکمیت برقرار تھی۔ مجھے رُکنا پڑا۔

... اور اب... یہ اِن دنوں کا قصہ ہے جب تجربے خود کار مشینیں بن جاتے ہیں، بٹن دبانے پر حرکت میں آتے ہیں اور کبھی نہیں آتے۔ سرد اور بامقصد احساسات ہر منظر کو ہر بدن کو ایک ہی فلم کے بار بار چلنے کی اُکتاہٹ سے دیکھتے ہیں۔ اور یہی دن ہیں جب سرسبز درخت بھی اچھے نہیں لگتے کہ ان کے پتے گر کر لان کو گندہ کرتے ہیں اور راج ہنس ہوتے ہیں مگر اُن پر نظر نہیں جاتی۔ نظر اُس گھڑی پر ہوتی ہے جو آپ کو ایک باقاعدہ اور ترتیب شدہ زندگی میں سے گزارتی ہے... آپ کو معلوم ہے کہ آج رات جھیل تھُن کے کنارے آتشبازی چھوڑی جائے گی، اُسے دیکھے بغیر تو آپ یہاں سے جا ہی نہیں سکتے... اس فقرے کی سولھویں سالگرہ ان دنوں میں تھی۔

جلپسی اور خاموشی

میں نے درّہ سینٹ گوتھارڈ کی چوٹی پر واقع ریستوران سے جلپسی کو فون کیا۔

"مادام سالانہ چھٹیاں گزارنے فرانسیسی رویئرا گئی ہوئی ہیں۔" دفتر کے کسی کارندے نے جواب دیا۔ "البتہ برن پہنچنے پر آپ پاکستان سے آئی ہوئی اپنی ڈاک ضرور وصول کر لیجیے گا، شکریہ۔"

ڈینئل کار کے باہر ٹھٹھر رہا تھا "جلدی چلو، اس درّے میں دوپہر کے بعد ہمیشہ تیز اور سرد ہوائیں چلنے لگتی ہیں۔"

درّے کے دوسری جانب ڈینئل نے انجن بند کر دیا اور ننھی منّی سِتران ایک سنپولیے کی طرح پہاڑ کے گرد گھومتی اُترنے لگی۔

انڈرماٹ کے آگے سڑک کے درمیان ایک بورڈ رکھا تھا "گرمزل پاس برف کی وجہ سے بند ہے۔" ہمیں برن جانے کے لئے ایک طویل راستہ اختیار کرنا پڑا۔ کبھی بارش شروع ہو جاتی، کبھی گیلے پہاڑ اور پہاڑی قصبوں کی چھتیں چمکنے لگتیں اور کبھی ہم دُھند میں اُترنے لگتے۔ ولیم ٹیل کے قصبے میں سے گزر کر ہم ایک آبشار کے قریب رُکے اور اپنی اپنی پوٹلیاں کھول کر دوپہر کا کھانا کھانے لگے۔ سامنے ندی پر ایک پُل تھا اور اس پر دو مجسّمے ایستادہ تھے۔

"کہتے ہیں کہ اس وادی کے باشندے جب بھی ندی پر پُل بنانے کی کوشش کرتے وہ پانی میں گر جاتا۔ بالآخر شیطان نے پیشکش کی کہ میں ایک ایسا پُل بنا دوں گا جو کبھی

نہیں گرے گا۔ شرط صرف یہ ہے کہ پُل پر سے گزُرنے والا پہلا شخص میرا ہو گا" پہاڑی لوگ بے حد کائیاں ہوتے ہیں، اُنہوں نے نوتعمیر پُل پر سب سے پہلے ایک بکری کو گزار دیا۔ شیطان نے غصّے میں آ کر ایک بڑا پتھر پُل کی جانب لڑھکا دیا مگر وہ خدا کے حکم سے راستے میں ہی ٹھہر گیا... اور اب ہم اُسی شیطانی پتھر پر بیٹھ کر کھانا کھا رہے ہیں۔" ڈینئل نے بتایا۔

آلٹ ڈارف سے جھیل لوُسرن شروع ہو گئی۔ ہم لوُسرن شہر کی اس کیمپنگ کے قریب سے بھی گزُرے جس کی زمین میرے خیمے سے آشنا ہو چکی تھی... پھر ایک وسیع میدان کا آغاز ہو گیا جس میں ستران نے ایک ایسے بچّے کی طرح بے تحاشا دوڑنا شروع کر دیا جو پہاڑی دروں میں گھُٹ گھُٹ کر چلنے سے اُکتا چکا تھا۔ جھیل تھُن کے پانی نظر آئے تو شام ہو چکی تھی... آپ کو معلوم ہے کہ آج رات جھیل تھُن کے کنارے...

برینیز نام کا ایک قصبہ آیا۔ گڑیوں کے گھروندوں ایسے سُرخ چھتوں والے سوِس شیلے جھیل کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ میں نے ایک کیمپنگ سائٹ بھی گزُرتے دیکھی۔ پھر آئیں گے گر خدُا لایا۔ پھر انٹرلاکن دکھائی دیا۔ ینگ فرا اتنے برس گزُر جانے کے بعد بھی نوجوان دُلہن ہی تھی۔

"آج ہم تقریباً نصف سوئٹزرلینڈ میں سے گزُرے ہیں، رات تک ہم برن پہنچ جائیں گے۔" ڈینئل تھکاوٹ سے بولا۔

برن سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر ذولی کوفن کے قصبے میں "مارونائٹ ٹمپل" کی عظیم الشّان عمارت کھڑی تھی۔ معبد کے پہلو میں رکھوالے کا مختصر گھر تھا۔ ڈینئل کے ماں باپ نے مجھے زبردستی روک لیا۔ "رات کے وقت برن جیسے شہر میں رہائش تلاش کرنا بے حد دُشوار ہو گا، صبح چلے جانا۔"

دُوسری صُبح مقامی ٹرین ایک سگرٹ کے خاتمے تک مجھے برن لے گئی۔

.....

وہی قدیم سڑک تھی۔ محراب دار برآمدے کے اُوپر "ہوٹل ایڈلر" کا بورڈ اب بھی موجود تھا، اُس کھڑکی کے آگے مستطیل گملے میں سے سُرخ پھُول لٹک رہے تھے... "ہوسپیز زرہت" سڑک کے پار دوسری جانب کے برآمدے میں تھا۔ میں اندر چلا گیا۔

"ٹورسٹ بیورو والوں کا کہنا ہے کہ آپ کے ہوسٹل میں کیمپنگ کی نسبت بھی کم کرائے پر رہائش دستیاب ہے..." میں نے کاؤنٹر پر ایک تباہ حال بوڑھے کو پایا جو مسلسل چھت کو گھُور رہا تھا۔ اُس نے کانپتے ہاتھوں سے ایک فارم پُر کیا۔ "اس پر دستخط کر دو اور دوسری منزل پر چلے جاؤ۔"

ایک وسیع ہال میں ڈارمیٹری طرز پر نیچے اُوپر تیس چالیس بستر لگے تھے۔ بیشتر لوگ ابھی سو رہے تھے اور چمکتے فرش کے باوجود فضا میں ایک نامعلوم بساند تھی۔ میں نے سڑک پر کھُلتی ایک کھڑکی کے قریب بستر پر اپنا سامان رکھ دیا۔ سامنے "ہوٹل ایڈلر" کی کھڑکی اب میری سطح پر تھی۔ اس کے پردے گرے ہوئے تھے۔ میں کپڑے بدل کر باہر آ گیا۔

برن ہمیشہ کی طرح قدامت میں سویا ہُوا ایک ایسا شہر تھا جو یورپ کی اندھادھند آبادیوں میں "لوٹس ایٹرز" کی طرح شانتی سے اُونگھتا رہتا ہے۔ درمیان میں بہنے والا دریا بھی اتنا نرم مزاج ہے کہ شہر کے دونوں حصّوں کو ملانے والے پُل پر کھڑے ہو کر اگر کان لگا کر سُنا جائے تو بھی اُس کی آواز بمشکل سُنائی دیتی ہے۔ شہر کے تفریحی چوک بارن پلاتز میں قہوہ خانوں کے باہر لگی کرسیوں پر سیّاحوں کے جمگھٹے تھے۔ ایک ہپّی گٹار پر جرمن لوک گیت سُنا رہا تھا اور اُس کی دوست بیئر کے لئے پیسے اکٹھے کر رہی تھی۔ ایک مخمور بُوڑھا باقاعدہ جھُک کر سب کو سلام کر رہا تھا اور پھر تالیوں کے جواب میں اُس نے چوک کے درمیان میں بیٹھکیں لگانی شروع کر دیں مگر اس احتیاط کے ساتھ کہ پتلون کی کریز خراب نہ ہو... ایک طرف فرش پر شطرنج کے خانے پینٹ کئے گئے تھے جن پر قدِآدم مُہرے حرکت میں تھے۔ تماشائی

دو بوڑھے فوجیوں کے درمیان لگتی بازی کو دیکھ رہے تھے۔ چال چلنے والا کھلاڑی غور و خوض کے بعد اُٹھ کر اپنے مہرے کو آغوش میں لیتا اور گھسیٹتا ہوا اگلے خانے میں رکھ دیتا... کیسینو پلاتز میں ایک خوبصورت خاتون اشارے کر رہی تھی اور لوگ رُک رہے تھے کیونکہ وہ وردی میں تھی اور ٹریفک کانسٹیبل تھی۔

بوم پلاتز شہر سے خاصے فاصلے پر تھا۔ ایک چار منزلہ جدید عمارت کے ماتھے پر بڑے حرفوں میں جیبسی کی کاروباری فرم کا نام دُور سے نظر آ گیا۔ اندر جا کر اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ سفر میں دنوں کا حساب تو رہتا نہیں، میں اتوار کے روز آ گیا تھا اور چھٹی تھی۔ عمارت کا بوڑھا رکھوالا، اس کی بیوی اور ان کی پلی ہوئی لڑکی مجھے مشکوک جان کر میرے گرد ہو گئے۔ میں نے اشارے سے سمجھایا کہ میں اُن کے مالکان کا جاننے والا ہوں اور صرف اپنی ذاتی ڈاک وصول کرنے آیا ہوں جو پاکستان سے اس پتے پر بھیجی گئی تھی۔ پلی ہوئی لڑکی نے فون پر ایک نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے بولنے والے سے مؤدب ہو کر بات کی اور چونگا مجھے تھما دیا۔

"ہیلو۔ دیکھئے میرا نام مستنصر ہے اور میں پاکستان سے آیا ہوں، جیبسی کا دوست ہوں، آپ جیبسی کو جانتے ہیں ناں..."

دوسری جانب سے ایک بے اختیار ہنسی کے درمیان میں مجھے اپنا نام سُنائی دیا۔ یہ تو جیبسی خود تھی۔

"تم تو چھٹیاں منانے کے لئے فرانسیسی رویترا جا چکی تھیں..."

"نہیں نہیں میں یہیں ہوں مستنصر" وہ ہنستی جا رہی تھی "جیبسی تو صرف تم مجھے کہتے ہو بیوقوف آدمی، میرا اسٹاف تو مجھے میرے خاندانی نام سے ہی جانتا ہے۔ اُنہوں نے سمجھا کہ شاید تم میری چھوٹی بہن کے بارے میں دریافت کر رہے ہو... مجھے فکر تھی کہ کہیں تم میری غیر موجودگی کی بنا پر سینٹ گوتھارڈ سے ہی واپس نہ چلے جاؤ..."

"میں صرف تمہارے لئے تو سوئٹزرلینڈ نہیں آیا..." اُسے برن میں پا کر مجھے

بے حد مسرت ہو رہی تھی۔

"اگر تم سوئٹزرلینڈ کی سرحد پار کرتے ہو تو میرے مہمان ہو..." وہ اسی طرح نان سٹاپ ہنستی چلی جا رہی تھی "چاہے تم میرے لئے یہاں آتے ہو یا نہیں... کہاں ٹھہرے ہو؟ کیا میں تمہارے لئے رہائش کا بندوبست کر دوں؟"

میں نے اُسے ہوسٹل کا نام بتایا۔

"غیر معروف جگہ ہے... بہر حال تلاش کر لوں گی۔ اس وقت میں مصروف ہوں، شام چھ بجے آؤں گی۔"

وہ ایک سوس گھڑی کی طرح پورے چھ بجے میرے ہوسٹل کے دروازے پر ٹک ٹک کر رہی تھی... پہلے سے قدرے دُبلی اور سمارٹ البتہ دانتوں اور بالوں میں ایک ماندگی تھی جیسے ایک وحشی جانور ایک عرصے تک قید رہے تو اُس کی آنکھیں بُجھی بُجھی سی رہنے لگتی ہیں۔ جیبسی بھی وحشی جذبوں کو کاروباری قید میں کھو چکی تھی، ایک عرصے سے۔

"تم ٹھیک لگ رہے ہو..." اُس نے پُر مسرت نظروں سے میرے چہرے کو جانچا۔

"اور تم کیسی ہو؟"

"پچھلے ہفتے میرے ڈاکٹر نے تفصیلی جسمانی معائنے کے بعد مجھے ایک گھوڑے کی طرح فٹ قرار دیا ہے..." وہ حسبِ معمول قہقہہ لگا کر بولی اور پھر فرداً فرداً میرے خاندان کے بارے میں پوچھنے لگی جنہیں وہ پاکستان میں مل چکی تھی۔ "اور ہاں وہ ڈیشنگ لڑکا کیسا ہے جس کی ٹانگ پلستر میں بندھی ہوئی تھی... اب بھی ریش ڈرائیونگ کرتا ہے؟"

"وہ اب فلائنگ کرتا ہے مگر ریش نہیں بے حد محفوظ، فوج میں کپتان ہے..."

"میرا بہت جی چاہتا ہے کہ میں اُن سب سے دوبارہ ملوں..." اُس نے گھڑی دیکھی۔ "اوہ مجھے ابھی تمہارے ڈنر کا انتظام کرنا ہے... آؤ۔"

کار میں بیٹھ کر میں نے "ہوٹل ایڈلر" کے بورڈ کی طرف دیکھا۔ "وہ کھڑکی ابھی تک ہے..."

"ہاں"۔ اُس نے اُدھر دیکھے بغیر چابی گھمائی۔"میں جب بھی یہاں سے گزرتی ہوں ... میں بھولی نہیں"۔

ہر چند سو گز کے فاصلے پر وہ کار روک کر نزدیکی سٹور میں چلی جاتی اور اشیائے خوردنی کے کاغذی تھیلوں سے لدی پھندی باہر آجاتی۔"تمہارا ڈنر..."

دو کمروں کا فلیٹ دھیمی امارت کی مہک لیے ہوئے تھا، پیریڈ فرنیچر، بھاری پردے اور دبیز قالین، سُنہری فریموں میں جڑے آئینے ... ٹیلی ویژن پر ایک چھوٹا سا مصری مجسّمہ رکھا تھا۔

"تم تہہ خانے سے اپنی پسند کا مشروب لے آؤ، اتنی دیر میں کھانا تیار کرتی ہوں"۔ اُس نے ایک بھاری چابی میرے حوالے کی اور کچن میں گھُس گئی۔

میں تہہ خانے سے مشروبات اُٹھا کر واپس آیا اور کچن میں چلا گیا۔

"دیکھو"۔ وہ ہنستے ہوئے بولی "کیا میرا کچن ونڈرفُل نہیں ہے؟ ... مشینیں ہی مشینیں ..."

وہ گیس رینج اور فرج کے درمیان ایک مشین کی طرح حرکت کرتی رہی اور میں مشروب پیتا رہا۔

میرے ڈنر میں زعفرانی چاول تھے، گوشت کے مصالحے دار قتلے، پنیر میں فرائی کی ہوئی مچھلیاں اور پتہ نہیں کیا کیا تھا۔ کھانے کے دوران وہ ایک بلا کی طرح میرے سر پر سوار رہی اور مجھے اپنی پلیٹ کی ننگی سطح دیکھنے کی حسرت ہی رہی۔

کافی کے لیے ہم ڈرائنگ روم میں آ گئے۔"تم بہت زبردست کُک ہو"۔

"میں؟" وہ قہقہہ لگا کر بولی۔"یہ کھانا تو میری مشینوں نے پکایا ہے ... میری ونڈرفُل مشینیں، خیر اب تم بتاؤ کہ تم سوئٹزرلینڈ میں کیا کر رہے ہو؟"

"جو پہلے کرتا تھا، آوارہ گردی۔ یہاں سے جرمنی اور سویڈن جاؤں گا"۔

"ہچ ہائکنگ کر کے؟" وہ ناک چڑھا کر پُوچھنے لگی۔

"ہاں، میرے پاس حسبِ معمول پیسے بہت کم ہیں۔ ہو سکتا ہے جرمنی سے ہی واپس چلا جاؤں ..."

"تم اطمینان سے پورا یورپ دیکھو۔ میں کل ہی اپنے ٹریول ایجنٹ سے تمہیں ریل کا ٹکٹ خرید دوں گی اور تمام ملکوں میں اپنے کاروباری رابطوں کو ٹیلیکس دے دوں گی کہ مستنصر کا خیال رکھا جائے ورنہ کاروبار ختم ..."

"نہیں ... اس مرتبہ نہیں"۔

"تم انکار نہیں کرو گے"۔ اُس کی حاکمیت اُبھر آئی۔"تم جونہی سوئٹزرلینڈ میں داخل ہوتے ہو، میری ذمّہ داری بن جاتے ہو۔ خیر کل صُبح تم کیسینو پلاٹز میں میرے ذاتی دفتر میں آ جانا، پھر طے کر لیں گے ..."

تپائی پر ایک ڈھلتی عُمر کے خرانٹ چہرے کی تصویر تھی۔"یہ کون ہے؟"

"یہ جانی ہے ..." وہ پیار سے بولی۔

"اچھا تو یہ جانی ہے ... منگیتر، سابقہ خاوند، محبوب یا کیا؟"

"فی الحال ایک بزنس پارٹنر ... یونانی ہے، مصر میں رہتا ہے اور یہودی ہے۔ ... مصری فلاحین جب ہل چلاتے ہیں تو کبھی کبھی کوئی دفن شُدہ مجسّمہ یا برتن زمین پر آ جاتا ہے۔ وہ اسے حکومت سے چھُپا کر گاؤں کے نمبردار کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں۔ نمبردار اُسے نزدیکی شہر کے کسی ڈیلر کو دے آتا ہے اور ڈیلر قاہرہ لے آتا ہے اور وہاں جانی موجود ہوتا ہے ... وہ فوراً مجھے اطلاع کرتا ہے اور میں قاہرہ پہنچ کر اُسے بیگ میں ڈال کر واپس آجاتی ہوں ..."

"جیسی سمگلر ہو گئی ہے؟"

"یہ تو کاروبار ہے"۔ وہ کندھے سکیڑ کر بولی اور ٹیلی ویژن پر رکھا بالشت بھر کا مجسّمہ اُٹھا کر مجھے تھما دیا۔"اسے محسوس کرو کتنا وزنی ہے ... سنگِ سیاہ سے بنا ہوا ہے"۔ وہ شیلف میں سے مصری فرعونوں کی ایک انسائیکلو پیڈیا نکال لائی اور چند صفحے اُلٹنے

کے بعد ایک تصویر میرے سامنے رکھ دی۔ دیکھو کیا یہ مجسمہ اور یہ تصویر ایک ہی فرعون
کی نہیں ہیں؟... ریمیسس نمبر ۲۔"

دونوں میں گہری مماثلت تھی۔

"ایک مجسمہ نادر تب ہی مانا جاتا ہے اگر اُس کی تاریخ اور شکل کا ٹھوس ثبوت
مہیا کیا جائے... ریسرچ میں کرتی ہوں اور پھر مصریات کے کسی ماہر سے اُس کے
بارے میں سرٹیفکیٹ حاصل کر لیتی ہوں... اور پھر جو میوزیم بھی زیادہ قیمت ادا کرے"

"یہ والا کتنے کا ہوگا؟"

"اگر کل ڈاکٹر ذمن اس پر متفق ہو جائے کہ مجسمہ اُسی فرعون کا ہے جس کی تصویر میں
نے تلاش کی ہے تو پھر ایک لاکھ ڈالر کا..."

"اور تم اِسے یونہی ٹیلی ویژن پر بیٹھا چھوڑ کر باہر چلی جاتی ہو۔"

"انشورنس مائی ڈیئر..." وہ اُنگلیاں نچا کر ہنسی۔

دُوسری تپائی پر ایک سُنہری بالوں والے قدرے نسوانی نوجوان کی تصویر تھی۔

"اور یہ کونسا جانی ہے؟"

"ہاں، یہ میرا سابقہ خاوند ہے... اس نے صرف میری دولت کے لالچ میں شادی
کی تھی۔ مجھے افریقہ لے جا کر ایک سات ایکڑ کے گھر میں بند کر دیا جہاں درجن بھر حبشی
ہر کونے کھدرے میں سے دانت نکالتے رہتے اور میں ایئر کنڈیشنڈ گھر میں سارا دن
پڑی رہتی... تمہیں پتہ ہے میں کام کئے بغیر نہیں رہ سکتی، بس علیحدہ ہو گئی..."
اُس نے غیر جذباتی انداز میں بتایا اور پھر قہقہہ لگا کر کہنے لگی "اصل بات یہ ہے کہ وہ
کچھ اتنا مرد بھی نہ تھا، خاص طور پر تمہارے آغاز کے بعد..."

وہ بھُولی نہیں تھی۔

"تم یُوں تنہا رہتے ہوئے اُکتا نہیں جاتیں جیسی؟"

"عام طور پر رُخسانہ میرے ساتھ ہوتی ہے لیکن وہ بیمار ہے غریب شے ہسپتال

میں داخل کروایا ہے، اُس کی دُم میں زخم آ گیا تھا۔"

"دُم میں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں سڑک پار کر رہی تھی تو کسی بدبخت ڈرائیور نے اُس کی دُم پر سے پہیہ
گزار دیا..." وہ چخ چخ کرتی ہوئی کہنے لگی... "اور کافی لوگے؟" وہ انتظار کئے
بغیر ایک اور پیالی بھر لائی۔ "اسے پیو اور چلے جاؤ، کل صبح کیسینو پلاتز آ جانا میں دفتر
سے چھُٹی کر لوں گی اور پھر پکنک کے لئے کہیں چلیں گے۔"

ہوسٹل کے دروازے کے سامنے کار روک کر اُس نے پہلے "ہوٹل ایڈلر" کی
کھڑکی کو دیکھا اور پھر میرے گال پر ہتھیلی رکھ کر کہنے لگی۔ "میں ہمیشہ کہتی ہوں کہ
میں مستنصر کو اتنے عرصے سے جانتی ہوں کہ ہم ساتھ ساتھ جوان ہوئے اور اب...
کیا یہ ونڈر فُل نہیں کہ ہم اس قدر قریبی دوست ہیں؟"

"ونڈر فُل"۔ میں نے مشینی انداز میں جواب دیا اور کار کا دروازہ کھول کر فٹ پاتھ
پر آ گیا۔ ہوسٹل کے اندر تمام روشنیاں گُل ہو چکی تھیں۔

میں اپنے ہال کمرے میں داخل ہُوا تو دروازہ کھُلنے کی آواز پر مختلف بستروں میں
سے عجیب ناقابلِ فہم سی بُڑبڑاہٹ سُنائی دی جیسے غلیظ جوہڑ میں کوئی خالی مٹکا ڈوب
رہا ہو، بُو بھی تھی، غلیظ جوہڑ ایسی... میں اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ اُوپر کے بستر میں
لیٹا مسافر کروٹیں بدل رہا تھا اور اُس کے آہنی سپرنگوں کی کسمساہٹ میرے دماغ
میں کھُب رہی تھی۔ پھر وہ آہستہ آہستہ کھانسنے لگا مگر ایک عجیب حیوانی آواز کے ساتھ
جیسے بُوڑھا مینڈک ٹرّانے کی ناکام کوشش کر رہا ہو۔ میں کمبل میں مُنہ لپیٹ کر
سونے کی کوشش کرنے لگا۔

رات کے کسی پہر اچانک میری آنکھ کھُل گئی۔ ایک شدید متلی آور بُو پھیل رہی تھی
اور پانی کے گرنے کی آواز جیسے کوئی ڈھیلا نلکا بہہ رہا ہو... میں نے سر اُٹھا کر اِدھر
اُدھر دیکھا۔ تاریک ہال کے وسط میں کھڑا ایک لرزتا ہوا جسم، سر جھکائے کچھ

بے اختیار سا ہو کر اپنا مثانہ خالی کر رہا تھا...

"ہے...،" میں چیخا۔ "تم ٹائلٹ میں نہیں جا سکتے؟"

وہ اُسی طرح کھڑا لرزتا رہا، اپنے آپ کو خالی کرتا رہا اور بڑبڑاتا رہا۔ بقیہ بستروں میں حرکت ہوتی مگر وہاں سے صرف ہلکی ہلکی ڈکار نما آوازیں آئیں، کوئی کچھ نہ بولا... میں مُنہ میں رُومال ٹھونس کر پھر لیٹ گیا۔

صبح آنکھ کھُلی تو ایک چُست جسم کی اُدھیڑ عمر عورت ایک لمبے برُش سے لکڑی کے فرش کا متاثر شدہ حصہ دھو رہی تھی، میں نے اُسے پچھلی شب کے بارے میں بتایا۔

"یہ بے چارے کچھ نہیں کر سکتے۔" وہ برُش کو فینائل کی بالٹی میں ڈبو کر تاسف سے کہنے لگی۔ "مجبور ہیں۔"

ناشتے کے لئے ڈائننگ رُوم میں داخل ہونے والا میں پہلا شخص تھا۔ میں نے میز پر ہاتھ پھیرا، اُس پر میل کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ ہال کی صفائی کرنے والی عورت اندر آئی۔ ایپرن باندھ کر کاؤنٹر کے پیچھے جھُکی اور پھر میری میز پر آکر کافی کا ایک مگ اور جام کی ایک پلیٹ رکھ دی... کافی یخ ہو چکی تھی اور اُس میں بھی بُو تھی، اور جام کا مزا کیچڑ ایسا تھا... آہستہ آہستہ ڈائننگ رُوم بھرنے لگا اور اس کے ساتھ ہی وہ مخصوص بساند جو اس عمارت کے رگ و پے میں تھی، تیز ہوتی گئی... میزوں کے گرد بیٹھے مسافر مجھے دیکھ رہے تھے، آنکھیں پھُولی ہوئی اور مُردہ چہرے بگڑے ہوئے جیسے ناقص آئینوں میں سے جھانک رہے ہوں یا ربڑ کے مجسّمے کو تندور میں ڈال کر فوراً نکال لیا جاتے... وہ سب اتنے بوڑھے تھے کہ ان میں بولنے کی سکت بھی نہ تھی۔ وہ متلی آور بساند اُن کے گلتے ہوئے بوسیدہ نیم مُردہ گوشت میں سے آرہی تھی... ایک بُوڑھا پاؤں گھسیٹتا ہُوا اور میرے سر پر کھڑے ہو کر کسی ذبح ہوتے ہوئے حیوان کی طرح غاں غاں کرنے لگا۔ میں شاید اُس کی مخصوص نشست پر بیٹھ گیا تھا۔ بُو بہت تیز تھی، میں اُٹھا اور ادائیگی کر کے باہر آگیا۔

کیسینو پلاٹز کے آس پاس ٹریفک کا شور تھا اور شیشے کی دیواروں میں بند دفتر میں جیسی دو ٹیلیفونوں پر بیک وقت گفتگو بھُگتا رہی تھی اور ساتھ ساتھ نوٹس بھی گھسیٹ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اُس نے دونوں چونگے مُنہ کے قریب لا کر کوئی مشترکہ معذرت کی اور فون بند کر دیئے۔

"جن جن شہروں میں تمہیں جانا ہے وہاں میں نے ٹیلیکس کر دیئے ہیں، رات ٹھیک سوئے؟"

میں نے پچھلی شب اور ڈائننگ رُوم کی کراہت آمیز تفصیل بتائی۔

"ہمارے ہاں اولڈ پیپلز ہوم تو موجود ہیں مگر اُن میں رہائش کے لئے بھی خاصی رقم درکار ہوتی ہے چنانچہ غریب اور بے آسرا بوڑھے اس قسم کے سستے اور خیرات سے چلنے والے ہوسٹلوں میں پڑے رہتے ہیں..." اُس نے ایک اخباری اور غیر متاثر انداز میں بتایا۔

"لیکن وہ صرف بوڑھے نہیں تھے، اُن کے جسموں سے زوال کی بُو اُٹھتی تھی، گوشت بوسیدہ ہو کر گرنے کو تھا۔"

"وہ مصنوعی جسم ہیں۔" جیسی بولی۔ "ڈاکٹر انہیں طرح طرح کے ٹیکوں اور دواؤں سے مصنوعی طور پر زندہ رکھتے ہیں... تمہیں معلوم ہے کہ سوئٹزرلینڈ ایک ویلفیئر سٹیٹ ہے اور ہم لوگوں کو آسانی سے مرنے نہیں دیتے... ویسے مجھے ایسی جگہوں کے بارے میں علم تو تھا لیکن یہ نہیں جانتی تھی کہ ان کے اندر بوڑھے لوگ اس قسم کی حیوانی زندگی بسر کرتے ہیں۔"

میں نے اُسے اپنے ہاں کے عمر رسیدہ لوگوں کے بارے میں بتایا جن کے چہرے غربت کے باوجود روشن رہتے ہیں اور جن کی موجودگی میں ہمیشہ سادگی کی آرام دہ مہک ہوتی ہے۔

"اصل فرق تنہائی یا ہمسائگی کا ہوتا ہے... یہ لوگ تنہا ہیں اور کوئی بھی ان کے

قریب نہیں جاتا۔ تمہارے ہاں کے بوڑھوں کو میں نے اکثر اپنی اولاد کے درمیان دیکھا ہے۔"

"تم بھی تو تنہا ہو جپسی۔"

"میں؟" وہ بے تحاشہ ہنس دی۔ "اتنے فون، فائلیں، دفتر اور پھر رخسانہ۔" فون کی گھنٹی بجی۔ "اوہ . . . میں پندرہ منٹ میں فارغ ہو جاؤں گی، تم اتنی دیر کے لئے اپنے آپ کو مصروف کر لو . . ." اور چونگا اٹھا کر کسی کاروباری گفتگو میں مگن ہو گئی۔

میں اخبار دیکھنے لگا۔

پندرہ منٹ بعد اُس نے دفتر بند کیا اور ایک بھاری بیگ میرے حوالے کر دیا۔ "اس میں تمہارا ڈِنر ہے۔" اور ہم باہر آکر کار میں بیٹھ گئے۔

"سب سے پہلے رُخسانہ کی خیریت معلوم کرتے ہیں۔"

رُخسانہ مزے میں تھی۔ چھوٹا سا شفاف ڈربہ، خوراک کے لئے چمکتی پلیٹیں اور پیالے اور ایک نوجوان نرس جو ہر دوسرے لمحے آکر اُسے "مائی ڈارلنگ بے بی" کہتے ہوئے تھپکتی اور چلی جاتی۔ اُس کی دُم پر ایک دو گرہ کی سفید پٹی بندھی ہوتی تھی۔ میرے ہوسٹل کا کوئی بھی بوڑھا اس ڈربے میں رہنے کے لئے رُخسانہ کے پاؤں چاٹتا . . . جپسی نے اُسے وٹامن کی چند گولیاں کھلائیں اور ہم جانوروں کے ہسپتال سے باہر آ گئے۔

"ذرا چھوٹی بہن سیمون کو مل آئیں، پچھلے تین ہفتوں سے میں اُدھر جا نہیں سکی۔"

سیمون نے بقول جپسی ایک لفنگے ملاح کے ساتھ شادی کر کے خاندان کی ناک کٹوا دی تھی اور اب ایک وسیع رہائش گاہ کے دروازے کے ساتھ ایستادہ ایک بوسیدہ سے جھونپڑے میں ہنسی خوشی رہتی تھی۔ ہم اندر داخل ہوئے تو تین ریچھ نما کتوں نے ہمیں باقاعدہ صوفوں پر گرا لیا، وہ بے حد وزنی تھے۔

سیمون نے اُنہیں جرمن میں بُرا بھلا کہا اور وہ کونے میں جا کر ایک کٹے ہوئے خرگوش کے لوتھڑے چبانے لگے۔ دونوں بہنوں میں مختصر سی گفتگو ہوئی میرا تعارف ہوا جس پر سیمون ایک خاص انداز میں کھانسی کہ اسے تو میں جانتی ہوں اور کافی کے ایک ایک مگ کے بعد ہم نے اجازت چاہی۔

"جھوٹ بولتی ہے کہ اس کا خاوند شپ پر گیا ہوا ہے، وہ لفنگا اسی شہر میں ایک عورت کے ساتھ رہ رہا ہے اور کبھی کبھار اسے ملنے آجاتا ہے . . . بس اب ڈاکٹر ذمن کے پاس ہو آئیں پھر پکنک پر چلیں گے۔"

ڈاکٹر ذمن کی سٹڈی میں فرعونوں کے مقبروں ایسا ماحول تھا۔ مصری مجسمے، تابوت، تصاویر اور شیلفوں میں مصریات کی ہزاروں کتابیں۔ جپسی نے اُسے اپنا مجسمہ دکھایا اور اپنی تحقیق کے بارے میں آگاہ کیا۔ ڈاکٹر ذمن نے مجسمے کو خوردبین کے نیچے رکھ کر دیکھا۔ تیزاب کا ایک قطرہ ٹپکا کر پتھر کی بو سونگھی اور کہنے لگے۔ "مادام آپ اگلے ہفتے رابطہ قائم کیجیئے گا۔ اس خاندان کے فرعونوں کے مکمل کوائف صرف برلن کی لائبریری میں ہی دستیاب ہیں، میں دو تین روز تک وہاں چلا جاؤں گا۔"

"اور تمام اخراجات میرے ذمے . . ." جپسی سٹڈی میں سے نکلتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی۔ "مجھے یقین ہے کہ تمام کوائف اس کی اپنی لائبریری میں موجود ہیں . . . بہرحال اگر یہ سرٹیفکیٹ بنا دے تو مجسمہ ایک لاکھ کا ورنہ ایک ہزار کا بھی نہیں . . . اور اب ہم پکنک کے لئے شہر سے باہر ایک کاٹج میں چلیں گے جو میرے بھائی کا ہے مگر ان دنوں خالی پڑا ہے . . ."

گرد آلود راستے کے آخر میں لکڑی کا ایک بوسیدہ پھاٹک تھا جو ذرا سا دھکیلنے پر کھل گیا۔ کاٹج کے آس پاس قدِ آدم گھاس سرسرا رہی تھی اور لکڑی کی دیواروں سے خودرَو بیلیں چمٹی ہوئی تھیں۔

"اُدھر دھوپ میں بیٹھتے ہیں۔" اُدھر ہماری آہٹ سے گھاس میں لرزش پیدا

ہوئی اور ایک طویل قامت سُنہری بالوں والی بھری بھری خاتون کھڑی ہوگئی، پھر بیٹھ گئی ۔ دوبارہ کھڑی ہوئی تو تولیے میں لپٹی ہوئی تھی ۔۔۔ جیسی نے ایک زہر آلود مسکراہٹ اُس کی جانب پھینکی اور دو چار فقروں کے تبادلے کے بعد میرا ہاتھ پکڑ کر باہر لے آئی "میرے بھائی کو جانے بڑا گوشت کیوں اتنا پسند ہے ... اُس کی داشتہ ہے، مجھے کیا پتہ تھا کہ یہ گوشت آج ہی دھوپ سینکنے یہاں آجائے گا۔"

کار میں دوبارہ بیٹھ کر وہ اُنگلی سے ناک تھپکنے لگی۔ "اب کہاں جائیں؟"

"دوپہر ہو چکی ہے، کھانا ہی کھانا ہے، یہاں کار میں بیٹھ کر ہی کھا لیتے ہیں۔"

"نہیں نہیں۔" اُس کی حاکمیت جاگ اُٹھی۔ "ہم کسی ونڈر فل مقام پر پکنک منائیں گے مثلاً ... مثلاً ..." اُس کا چہرہ یکدم کھِل اُٹھا اور آنکھیں شرارت سے چمکنے لگیں۔ "مجھے بالکل معلوم ہے کہ ہمیں پکنک کے لئے کہاں جانا ہے۔"

اوّلین تجربوں کا میدان سرسبز تھا۔ شاید وہی سفید نشست اور یقیناً وہی پُرسکون نہر جو جھیلوں کے درمیان بہتی تھی ... ینگ فرا کی چوٹی دوپہر کی دھوپ میں آئینہ بنی کھڑی تھی۔ سبزے کی تازہ مہک اور پانی کی نم آلود قربت ہواؤں میں تھی ... جیسی نے سفید نشست کی سطح پر اُنگلی پھیری، گرد تھی۔ وہ اس پر رُومال بچھا کر قدرے بے آرامی سے بیٹھ گئی۔ "آؤ بیٹھ جاؤ۔"

"میں اس منظر کو پہلی مرتبہ دن کی روشنی میں دیکھ رہا ہوں ..." میں نے اپنے پاؤں کی طرف دیکھا۔

"میں بھی اُس کے بعد پہلی مرتبہ یہاں آئی ہوں ..." وہ بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی۔ میں سفید نشست کے دوسرے سرے پر بیٹھ گیا مگر بے دلی کے ساتھ۔ زمین وہی تھی مگر اُس پر چند برس پیشتر بسنے والے خانہ بدوش کُوچ کر چکے تھے ... مجھے لگتا ہے کہ میں واپس بُوڑھوں کے ڈائننگ روم میں پہنچ گیا ہوں۔ "یہاں بوسیدگی ہے۔"

"یہاں نہیں، ہم میں ہے ..." وہ فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "آؤ چلیں۔"

نہر کے کنارے گھاس تھی، وہ ہمارے جسموں سے دبی تھی۔

کافی گرم تھی، میں نے گھونٹ بھرا اور ٹیلی ویژن پر رکھے فرعون کے سیاہ مجسمے کی طرف دیکھا۔ اُس کی تنہائی ہزاروں برس کی تھی ... جیسی اپنے جوتے اُتار کر صوفے پر نیم دراز کافی کی پیالی پر جھکی تھی، اس کی تنہائی کا آغاز تھا۔

"تم مجھے کہیں سے ایک بچہ لاکر نہیں دے سکتے؟" وہ سر اُٹھا کر بولی۔

میں چونک گیا۔ "تم یقیناً اپنی خواہش یاد رکھتی ہو۔"

"میں اُسے ایک شہزادے کی طرح پالوں گی۔"

"اور تمہیں اُس کے پالنے کی تفصیل بھی یاد ہے۔"

"نہیں مستنصر ... مجھے ایک سگرٹ دو۔" میں نے ایک سگرٹ سُلگا کر اُس کی اُنگلیوں میں رکھ دیا۔ "میں واقعی کسی بچے کو گود لینا چاہتی ہوں ... میں نے پاکستان میں بے شمار لاوارث بچے دیکھے ہیں۔ کیا تم اُن میں سے کسی ایک کو سوئٹزرلینڈ بھجوانے کا انتظام نہیں کر سکتے؟"

"تم بہت مصروف ہو اور بہت ہی خود مختار ... بچے کی پرورش کے لئے وقت اور غلامی چاہیئے۔"

وہ اُٹھ کر ٹہلنے لگی۔ "میں اتوار کو بالکل فارغ ہوتی ہوں اور اکثر شاموں کو بھی۔ ... تم نے دیکھا نہیں کہ میں رُخسانہ کی کس طرح دیکھ بھال کر رہی ہوں ..."

میں بے اختیار مُسکرا دیا۔ "کچھ فرق ہوتا ہے ایک کُتیا میں اور ایک انسانی بچے میں۔"

"انسان بھی تو ایک طرح کا جانور ہی ہے ناں ... میں اُسے بہترین خوراک اور لباس دُوں گی، دیکھ بھال کے لئے ایک نرس رکھ لوں گی، اُسے اور کیا چاہیئے ..."

"وہی جو ہوسٹل میں گھسٹنے والے غاں غاں کرتے بُوڑھے اپنی اولاد کو نہیں دے سکے۔"

"تم قنوطی ہو گئے ہو۔"

"میں تھک گیا ہوں ..."

اُس رات مجھے آس پاس کے بستروں میں کراہتے اور بھُولتے ہوئے جسموں پر بے حد ترس آیا۔ بے چہرہ اور بے گھر بوڑھے جو کبھی اپنے بچّوں کو بہترین لباس اور خوراک مہیا کر کے کہتے تھے، انہیں اور کیا چاہیئے ؟

اگلی صُبح میں نے کسی میز پر بیٹھنے کی بجائے کاؤنٹر پر ہی ناشتہ کر لیا... مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میری پُشت پر تمام بوڑھوں کی نیم مُردہ آنکھیں ہیں، یہ کہاں سے آ گیا، کھڑا ہو سکتا ہے، چل بھی سکتا ہے اور اس کی زبان بھی کام کرتی ہے ... راہداری میں سے گزُرتے ہوتے میں ایک بُڑھیا کو راستہ دینے کے لئے رُک گیا۔ سفید ہیٹ جس پر گلاب کا ایک پھُول لگا ہُوا تھا، شوخ لباس، اُونچی ایڑی کی جوتی اور جرابیں ۔ وہ پھُولدار چھتری کی نوک فرش پر جمائے ایک پاؤں گھسیٹ کر آگے کر رہی تھی۔

"کیا میں مدد کر سکتا ہوں؟"

"میں چل سکتی ہوں۔" اُس نے خفیف آواز میں کہا۔

میں کافی دیر کھڑا رہا مگر اس دوران اُس نے صرف دو تین قدم کا فاصلہ طے کیا۔ میں جُھک کر قریب سے گزُر گیا۔

باہر ایک نیم خنک دھوپ والی سوِس صُبح تھی۔

جیسی کے دفتر میں داخل ہوتے ہی کیسینو پلاتز کی ٹریفک کا شور مدھم ہو گیا...

وہ حسبِ معمول فون پر قہقہے لگا رہی تھی۔ میں تازہ اخبار کے ورق اُلٹنے لگا۔

میں نے تمہاری رہائش کے لئے ایک صاف ستھرا کمرہ تلاش کر لیا ہے۔" وہ فون رکھ کر سرکاری انداز میں بولی۔ "فوراً شفٹ کر جاؤ۔"

"میرا خیال ہے کہ میں مزید ایک شب اُن بُوڑھوں کے ساتھ گزُار لوں گا بعد کل صُبح یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

"کہاں ؟"

"انگلینڈ ... وہاں میرے چچا ہیں، چند روز پراٹھے اور پلاؤ کھا کر سیاحت کے لئے طاقت حاصل کروں گا اور پھر جرمنی اور ڈنمارک کی اُبلی ہوئی سبزیوں کی جانب لَوٹ آؤں گا۔"

"ٹھیک ہے اگر تم نے ارادہ کر لیا ہے تو ..." اُس نے فون آگے کر دیا۔ "انہیں اپنی آمد کی اطلاع کر دو۔"

"اپنے چچا ہیں جیسی اُنہیں اطلاع کرنے کی کیا ضرورت ہے ؟"

"نہیں مجھے فکر رہے گا کہ پتہ نہیں کہاں چلے گئے ہو، فون کر لو۔"

میں نے آپریٹر کو برمنگھم انگلینڈ کا نمبر دیا اور اُس نے لائن مِلادی۔ اُن کی بیٹی نے فون اُٹھایا۔

"مستنصر بول رہا ہوں، سوئٹزرلینڈ سے۔"

"جی بھائی جان ....." اُس نے صرف اتنا کہا اور دھاڑیں مار کر رونے لگی۔

"خالدہ، کیا بات ہے ؟ خیر تو ہے ؟"

"خیر نہیں ہے بھائی جان ... ساجد بھائی جہاز کے حادثے میں شہید ہو گئے ہیں۔"

"کب ؟"

"آج اُن کا دسواں ہے ..."

میں نے فون بند کر دیا۔

کوئٹہ کی وہ صُبح بھی ایسی ہی ہوگی، قدرے خنک اور چمکیلی جب کیپٹن ساجد نذیر نے اپنے فوجی ہوائی جہاز کے پہیوں کو زمین کی گرفت سے آزاد کیا۔ چند سو گز اُوپر جانے کے بعد زمین پر کھڑے لوگوں نے دیکھا کہ جہاز واپس آ رہا ہے اور پھر اُس کا ڈھانچہ اُن کے سامنے جل رہا تھا۔ ساجد کو جلتے ہوئے جہاز کو توڑ کر باہر نکالا گیا تو وہ ہوش میں تھا۔ اُس نے سٹریچر پر لیٹنے سے انکار کر دیا اور اپنے قدموں پر چلتا ہُوا جیپ تک گیا۔ جیپ ڈرائیو کرتا ہُوا ہسپتال پہنچا، طویل سیڑھیاں طے کیں اور

ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہو کر کہنے لگا "ڈاکٹر میں شدید درد محسوس کر رہا ہوں، مجھے کوئی انجکشن لگا دیں۔" اُس کے چوڑے کندھوں پر سجی خاکی وردی سُلگ رہی تھی، سیاہ ہو رہی تھی۔ جسم کا نوّے فی صد حصّہ جل چکا تھا۔ جلے ہوئے جسم کو سب سے بڑا خطرہ سیپٹک ہو جانے کا ہوتا ہے چنانچہ اُس کے بستر کے گرد پالی تھین کا ایک خیمہ نصب کر دیا گیا۔ اُس نے نرس سے کہا "میری ماں لاہور میں بیٹھی میرا انتظار کر رہی ہے، میں اگلے ہفتے چھٹی پر جا رہا تھا۔ میرا کوئی سگا بہن بھائی نہیں، ہاں خالہ زاد ہیں... میرے ایک بھائی جان ہیں جنہیں سیّاحت کا جنون ہے... وہ اس وقت یورپ میں ہوں گے کہیں..." اور بالآخر لامبے قد اور گھنگھریالے بالوں والا ساجد جس کی شرارتی آنکھیں اور ڈیشنگ شخصیت دیکھ کر مجھے زارِ روس کی فوج کے بیباک گھڑ سوار افسر یاد آجاتے تھے، موت کے زرد رُو پیکر کے آگے بازی ہار گیا۔

... ساجد اپنا جہاز روک دو۔ آسمانی بلاؤں نے کہا اور اُس نے روک دیا۔

میری آنکھیں خشک تھیں اور بدن کانپ رہا تھا۔

میں دفتر سے باہر آگیا... خاموشی تھی، جیسے تمام آوازیں بند ہو چکی ہوں... لوگوں کے مُنہ ہل رہے تھے مگر آوازیں نہیں تھیں... ٹریفک کا شور بھی نہیں تھا... چیزیں سیاہی مائل دکھائی دیتی تھیں... لوگ چل رہے تھے اور یہ لوگ کیوں زندہ ہیں... انہیں مر جانا چاہیئے... میں ان کا گلا گھونٹ دوں گا، یہ سب ساجد سے عمر میں بڑے ہیں... میں دروازہ کھولوں گا تو خالہ کہیں گی "ساجد چلا گیا"۔ میری ننگی پیٹھ پر دھوپ کی شدّت اُتری، اُس پر بھائی کا سایہ نہ تھا... بڑے پُل کے پار دریائے آر کے ساتھ جنگل نما ایک گھنا پارک تھا... میں نے ایک اونچے درخت کے تنے کے گرد اپنے بازو لپیٹے اور رونے لگا۔

میں اپنے بستر پر اوندھا لیٹا تھا، جپسی ہال میں داخل ہوئی "میرے ساتھ آؤ"

"تم نے فون پر کوئی بُری خبر سُنی ہے۔" اُس نے کار سٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

"اب مجھے بتاؤ۔" وہ مجھے اپنے ڈرائنگ رُوم کے ایک صوفے پر بٹھاتی ہوئی بولی۔

"ساجد... آئی ایم سوری، وہ کتنا خوبصورت نوجوان تھا۔"

میں نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ ساجد کے نام کے ساتھ "ہے" کی بجائے "تھا" کا لفظ سُنا اور مجھے جپسی بے حد بُری لگی۔ وہ میرے دُکھ میں شریک ہونے کی کوشش کرتی رہی۔ اُس مختصر ملاقات کا ایک ایک لمحہ بیان کرتی رہی جب اُسے دیکھ کر ساجد اپنا لمبا بازو ہلاتا ہُوا بستر سے اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا "ہیلو"۔ اور اُس کی شرارتی آنکھیں مُسکرا رہی تھیں۔

"میں ابھی وطن لَوٹنا چاہتا ہوں، ابھی..."

"تم اِس حالت میں پہنچ ہی نہیں سکتے... راستے میں رہ جاؤ گے... میں کافی بنا کر لاتی ہوں۔"

میرا جسم فالج زدہ تھا جیسے پھُول رہا ہو۔ جپسی سے کافی کا مگ لیتے ہوئے میں نے شکریہ کہا اور مُسکرایا بھی۔

اگلے روز برن تاریک تھا۔ بادل سروں پر اُترے ہوئے تھے۔ بے پناہ بارش تھی۔ میں ٹھٹھرتا بھیگتا پاکستانی سفارت خانے میں گیا کہ شاید وہاں کسی اخبار میں حادثے کی تفصیل نظر آجائے، کچھ بھی نہ تھا۔ "کیا نام بتایا تھا آپ نے اپنے بھائی کا؟"... ایک نوجوان سفارت کار نے پُوچھا۔ میں نے بتایا۔ اُس نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ "میرا ایک دوست ہے اسی نام کا لیکن وہ میجر ہے... شکر ہے، میں سمجھا شاید..." میں باہر نِکل آیا۔

بارش کا پانی سیاہ تھا، کوئلوں میں گھُلا ہُوا۔

اگلے تین روز جپسی مجھے ایک بیمار بچّے کی طرح بہلاتی رہی... اپنے تمام دوستوں کے پاس لے کر گئی۔ سوئٹزرلینڈ کے طول و عرض میں گھُماتی رہی مگر مجھے تمام

پہاڑ اور پانی سیاہ دکھائی دیتے۔ میں راتوں کو چیختا ہُوا اُٹھ بیٹھتا اور بیٹھا رہتا۔
برن کے سٹیشن پر جیسی اُنگلیاں ایک دوسرے میں پھنساتے ایک کُند ذہن طالب علم کی طرح کھڑی تھی۔ میں اورینٹ ایکسپریس میں سوار ہو گیا۔

ہوائیں مرگ

استنبول تک دو دن کا سفر مجھے یاد نہیں۔ صرف وہ قبر نما طویل سُرنگیں یاد ہیں، جن میں گاڑی ایک مُردہ جسم کی طرح داخل ہوتی تھی... میں سر جھکائے گم رہا... میں اُس وقت کہاں تھا، وہ لمحہ کونسا تھا جب ساجد کا جہاز کریش ہُوا... اُس کا بدن جلا... کونسا... میں کہاں تھا...

آج اتوار تھا، صُبح کے دس بجے تھے، ہم روم سے باہر آ رہے تھے۔

دس بجے تھے مگر دُھوپ میں ایک نامعلوم سی سیاہی گھُلی ہوئی تھی۔

ابدی شہر سے نکلنے والی سڑک کے دو رویہ سرو کے درخت پتھر کے بنے تھے کہ بالکل ساکت کھڑے تھے جیسے روم سے بغاوت کے جرم میں مصلوب غلاموں کے لاشے اکڑ رہے ہوں۔

ایک کھنڈر ہوتا ہُوا رُومی اکھاڑا نظر آیا۔ شکستہ اینٹوں میں گھاس اور سرکنڈے اور درمیان میں ایک نوجوان جس کی نگاہیں اپنے گرد مسمار ہوتی ہوئی عمارت میں کچھ تلاش کر رہی تھیں... گلیڈی ایٹر میدان میں مقابلے کے لئے کھڑا تھا مگر بغیر ہتھیار کے...

آج اتوار تھا، صُبح کے دس بجے تھے، ہم روم سے باہر آ رہے تھے۔

اور وہ سانس میں نے کہاں لئے جب اُس کے سانس ختم ہوئے... کونسے شہر میں... کونسی جگہ تھی جہاں میں تھا اور اُس وقت ساجد نہیں تھا... کونسا لمحہ... میں کہاں تھا؟

... دُھوپ صرف چھتوں پر تھی اور ایک مؤدّب خاموشی تھی جیسے گہرے کنوئیں میں جھانکنے سے سُنائی دیتی ہے، جیسے قبر کی تاریکی میں محسوس ہوتی ہو گی ... باہر کی دُنیا سے ایک کبوتر اُترا اور باغیچے میں بیٹھ گیا۔ اُس کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ بھی مجھے ناگوار گزری ۔ وہ کچھ دیر گردن پھُلا پھُلا کر اِدھر اُدھر دیکھتا رہا اور پھر شاید راہب خانے کے سناٹے سے تنگ آ کر اُڑا، پھڑپھڑاتا ہُوا جیسے ابھی گر جائے گا...

وہ گِر گیا۔

استنبول آ رہا تھا۔ دائیں ہاتھ پر بحیرہ مرمر، مچھیروں کی کشتیاں، بائیں طرف خانہ بدوشوں کے خیمے، پھر مچھیروں کے گاؤں، بلند اپارٹمنٹ، چٹانوں پر بنے لکڑی کے گھر۔ پھر شہر کی دیوار آئی، ستائیس سو برس سے زندہ شہر۔ سُنہری دروازے پر پر کپڑے سُوکھ رہے تھے، نیلی مسجد اور ٹوپ کاپی دکھائی دیتے اور گاڑی شاخ زریں کا چکر کاٹ کر سِرکسی سٹیشن پر کھڑی ہو گئی۔

سفر کے دوران اطالوی لڑکے فرانسسکو اور رکاردو اپنی دھیمی شرافت اور پُر وقار کم گوئی کی بنا پر میرے دوست بنے، وہ افغانستان جا رہے تھے۔ زیرِ زمین آبی محل کے قریب ہم نے ایک ہوٹل میں سامان رکھا اور "سلم ٹورز" کے دفتر سے ڈائرکٹ تہران جانے والی بس کے بارے میں معلومات حاصل کیں ... پرسوں شام، پانچ بجے ... ہم تینوں نے ٹکٹ خرید لئے۔

دوسرے روز میں اُن کو شہزادوں کے جزیروں میں لے گیا۔ چوک میں رنگین جھالروں والی سیاہ بگھیاں کھڑی تھیں۔ "اُوپر چوٹی پر چیل اور سرو کا گھنا جنگل ہو گا۔ خودرَو گھاس میں جنگلی پھُول ہوں گے۔" میں نے رکاردو کو بتایا، مگر وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ رہائشی مکان اُس جگہ کو ڈھانپ چکے تھے۔ دوسری طرف اُتر کر میں نے ڈھلوان پر جیکٹ بچھا دی۔

"یہاں سے بحیرہ مرمر اور اُس میں بکھرے خوبصورت جزیرے دکھائی دیتے تھے۔"

"کیا تمہیں یقین ہے؟" خوش شکل رکاردو نے گھروں کی چار دیواریوں میں سے

کہیں کہیں جھانکتے بحیرہ مرمر پر نگاہ ڈالی۔

"ہاں، ایسا تھا اور نیلے سمندر میں جھُولتی کشتیوں کے بادبانوں کے گلوں میں گھنٹیاں باندھ دینے کی خواہش سر اُٹھاتی تھی ..."

"اب تو کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔" فرانسسکو جسے میں دُنیا کا خوبصورت ترین جزیرہ دکھانے کا وعدہ کر کے یہاں لایا تھا، مایوسی سے بولا۔

"ہاں، کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔"

ہم نے اپنا پکنک لنچ ختم کیا اور اگلے سٹیمر سے استنبول واپس آ گئے۔

ہم اپنے سامان سمیت تین بجے ہی "سلم ٹورز" کے دفتر میں جا کر بیٹھ گئے۔ بیشتر مسافر آ چکے تھے اور بے حد باتونی ہو رہے تھے۔ ایک فِلی پینو لڑکا بار بار قہقہے لگا رہا تھا اور ہر مسافر سے اپنا تعارف کروا رہا تھا۔ ایک امریکی سیّاح بیئر کے ٹین خالی کر رہا تھا اور گٹار پر ایک کاؤبوائے گیت "قبرستان اوہ قبرستان" بڑے اُداس انداز میں گا رہا تھا۔ چار بجے کسی نے اندر آ کر نعرہ لگایا "بس آ رہی ہے۔" سب مسافر سامان گھسیٹتے ہوتے باہر نِکل آئے۔

بس کی پیشانی پر "استنبول، تہران ڈائرکٹ" کا بورڈ ہر کسی نے خصوصی توجہ سے پڑھا اور گہرے اطمینان کا اظہار کیا۔ نشستیں آرام دہ تھیں۔ روانگی سے پیشتر سلم ٹورز کے ترک منیجر نے مسافروں کی گنتی کی، سوچ میں پڑ گیا، رجسٹر پر اکتیس ٹکٹوں کا اندراج تھا اور مُسافر تینتیس تھے۔ ٹکٹ دوبارہ چیک کئے گئے ... سب کے پاس ٹکٹ تھے۔ اُس نے ٹکٹوں کی کاپی منگوائی، وہاں بھی اکتیس مُسافروں کی بُکنگ تھی۔ تیسری بار پھر مُسافر گِنے گئے اور ٹکٹ چیک ہوتے۔ بغیر ٹکٹ کوئی بھی نہ تھا۔ پھر بس کمپنی کے بُکنگ کلرک کو بُلایا گیا۔ اُس نے مسافروں اور اُن کی ٹکٹوں کا بغور مطالعہ شروع کیا اور بالآخر دو انگریز ٹورسٹوں پر برس پڑا۔ "تمہارے پاس پرسوں کی بُکنگ ہے، تم آج روانہ

ہونے والی بس میں کیوں سوار ہو گئے ہو؟" انہوں نے بہت منتیں کیں کہ ہمیں آج ہی لے چلو، ہمیں ہر صورت پرسوں تک تہران پہنچنا ہے مگر انہیں زبردستی اُتار دیا گیا۔

... رکاردو اور فرانسکو فوراً پچھلی نشستوں سے اُٹھے اور اُن کی خالی کردہ نشستوں پر براجمان ہو گئے، ڈرائیور کے عین پیچھے، ونڈ سکرین کے پاس۔

ڈرائیور نے چابی گھمائی تو سِلم ٹورز کا منیجر مسافروں سے مخاطب ہوا "کیا آپ میں سے کوئی صاحب اس سے پہلے تہران جا چکے ہیں؟"

میں نے ہاتھ کھڑا کر دیا۔

"تو پھر براہ مہربانی اس بس کو امیر کبیر سٹریٹ تک پہنچا دیجیے گا، ڈرائیور پہلی مرتبہ تہران جا رہا ہے۔"

مسافروں میں کھسر پھسر ہوئی کہ ڈرائیور کہیں اناڑی نہ ہو۔ فلی پینو کہنے لگا۔

"نہیں یونہی ترک حسِ مزاح کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔"

"تو خواتین و حضرات..." منیجر اُترنے سے پیشتر ہاتھ ہلاتے ہوئے گویا ہوا۔ "آپ کو تہران تک کا خوشگوار اور محفوظ سفر مبارک ہو اور سِلم ٹورز کو یاد رکھیے۔" اور بس سے نیچے اُتر گیا۔

بس چلی تو وہ انگریز سیاح ہمیں اتنی بے چارگی سے دیکھ رہے تھے جیسے ہم انہیں استنبول کے کسی چوک میں نہیں، موت کے منہ میں چھوڑ کر جا رہے ہیں۔

مسافر جیکٹیں اور سویٹر اُتار کر آرام سے بیٹھنے لگے۔ بس استنبول کے پُر ہجوم بازاروں میں سے گزر رہی تھی۔ پھر ہم ایک شاہراہ پر مُڑ گئے۔ میں اپنی نشست سے اُٹھ کر ڈرائیور کے عین پیچھے بیٹھے رکاردو اور فرانسکو کے پاس چلا گیا۔

"مشرق کی جانب یہ ہمارا پہلا سفر ہے... ہم اپنے جسموں میں سنسنی محسوس کر رہے ہیں۔"

"اور یہ ایک نہایت ہی پُراسرار سفر ہو گا" میں نے کہا۔ "پُراسرار اور پُرخطر..."

"نہیں"۔ فرانسکو چونکا۔ "ہمارے والدین تو ہمیں آنے ہی نہیں دیتے تھے۔"

"میں مذاق کر رہا تھا۔ میں کئی مرتبہ یہ سفر کر چکا ہوں، کبھی خراش تک نہیں آئی۔ ... بس استنبول سے باہر نکل لے تو میں واپس آ کر تمہارے ساتھ ایک سگریٹ پیوں گا۔"

میں اپنی نشست پر آ گیا۔

ہم باسفورس پر تعمیر کردہ نئے پُل کی جانب جا رہے تھے۔ سامنے ونڈ سکرین میں ایک سُرنگ نظر آئی۔ محسوس ہوا جیسے بس کی رفتار کچھ زیادہ ہے۔ سُرنگ میں ایک دو کاروں کو بھی اوورٹیک کیا اور ہم دوسری طرف روشنی میں نکل آئے۔ شاہراہ کے دونوں طرف فٹ پاتھ تھے اور اُن کے ساتھ آہنی ریلنگ۔

"مجھے استنبول کی سکائی لائن بے حد پسند ہے۔" میں نے ہم نشست فلی پینو سے کہا۔ "آخری مرتبہ دیکھ لوں۔" میں اپنی نشست سے اُٹھا۔ سامنے ایک پُل نظر آ رہا تھا اور اُس کے نیچے باسفورس کا سیاہی مائل پانی۔ اُسی لمحے میں نے ونڈ سکرین میں دیکھا کہ پُل اور ہماری بس کے درمیان ایک سُرخ ویگن نمودار ہو رہی ہے۔ وہ غلط ہاتھ پر مُڑ رہی تھی، تیز رفتار بس نے اُسے بچانے کی کوشش کی مگر پچھلے حصے میں جا ٹکرائی۔ "خدا کا شکر ہے ہم بچ گئے۔" کسی نے کہا کیونکہ بس پھر چل رہی تھی، مگر اب قدرے بے قابو ہو کر۔ ایک شدید دھچکے سے فٹ پاتھ پر چڑھی، ریلنگ کو توڑا اور پھر فضا میں تیرنے لگی... استنبول کی سکائی لائن آخری مرتبہ... بدن میں ایک خلائی کیفیت... میں نے اگلی نشست کو مضبوطی سے پکڑ لیا... نیچے سمندر تھا اور ہم جانے کتنی بلندی پر تھے... نیچے سمندر۔ سمندر... "میں مرنے لگا ہوں"... لیکن خوف نہیں تھا، ایک رگ و پے کے سُن اور لاپروا ہونے کا کُند احساس... ایٹم کے یہ ذرّے جن سے میرے ہاتھ، کان، آنکھیں لاپروائی سے اکٹھے ہوئے تھے اُسی طرح اب بکھر جائیں گے۔ "میں مرنے لگا ہوں"۔ تمہاری ہڈیاں بکھر جائیں گی اور جب تک یہ اکٹھی ہیں ان کو ساتھ لے کر چلو... ایک آوارہ گرد، ایک نافرمان اور نڈر بچے کی زندگی زندگی بسر کرتا

ہے، کسی کا حکم نہیں مانتا، اُس کا واحد مالک رنگ بدلتا آسمان ہوتا ہے...
صرف آسمان دکھائی دے رہا تھا اور استنبول کی عمارتیں تیزی سے حرکت کر رہی تھیں... اور آوارہ گرد اُس آدم کا بیٹا ہے جو ابھی ابھی زمین پر اُترا ہے اور خدا اسے دھوپ، بارش، دُھند، برف، گرمی، سردی، بھوکا یا بھرا ہُوا پیٹ دیتا ہے اور وہ لمحہ بہ لمحہ یہ سب وصول کرتا ہے اور کبھی نہیں سوچتا کہ مستقبل میں کیا ہوگا... کیا ہوگا، نیچے سمندر ہے۔ سمندر، سمندر...

بس شاید ایک لمحے کے لئے ایک ہی جگہ معلّق ہوئی، رُکی... کئی سو گز نیچے سمندر... ایک آوارہ گرد بے شک تہذیب یافتہ ہو یا جنگلی، زندگی میں ناکام ہو یا کامیاب، بہادر ہو یا بُزدل، وہ ایک بچہ ہے اور ڈرتا ہے اُس مرگ سے جو ہوا میں ہے اور زندگی کی حرارت کو کھا جاتے گی... مرگ جو ہوا میں ہے... بس شاید ایک لمحے کے لئے ایک ہی جگہ معلّق ہوئی، رُکی اور پھر ہوا میں گرنے لگی جیسے ایک پَر کٹے پرندے کو ہوا میں اُچھال دیا جائے تو وہ بالآخر نیچے گرنے لگتا ہے۔